معارف القرآن

11

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

سورۃ الشوریٰ ۔۔۔۔ تا ۔۔۔۔ سورۃ النجم

جِلد 11

تصنیف

اُستاذُ العُلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرّشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی و مُہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اِدارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور
غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبرز 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب ــــــــــــــــــــــــــــــــ معارف الفرقان جلد ⑪
نام مصنف ــــــــــــــــــــــــــــــــ مولانا محمود الرشید حدوٹی
ناشر ــــــــــــــــــــــــــــــــ ادارہ آب حیات ٹرسٹ
مطبع ــــــــــــــــــــــــــــــــ عبد اللہ زبیر پرنٹنگ پریس لاہور
طبع اول ــــــــــــــــــــــــــــــــ جنوری ۲۰۱۹ء
تعداد طبع اول ــــــــــــــــــــــــــــــــ ۱۰۰۰
اشاعت طبع دوم ــــــــــــــــــــــــــــــــ
تزئین طبع ثانی ــــــــــــــــــــــــــــــــ ادارہ آب حیات لاہور

معارف الفرقان جلد ⑪

اپنی بات: محمود الرشید حدوٹی	۱۱	اہل ایمان کو پہنچنے والی مصیبت	۶۰
سورۃ الشوریٰ	۱۳	گناہ کی سزا سے بچا نہیں جا سکتا	۶۳
تفسیر حروف مقطعات، اللہ کی بادشاہی	۱۴	سمندری جہاز، کشتیاں، اللہ کی نشانیاں	۶۴
عظمت خداوندی	۲۰	آیات الٰہیہ میں مجادلہ کرنیوالے	۶۶
معبودان باطلہ، قرآن کریم، جنتی و جہنمی	۲۱	اہل ایمان کے اوصاف جمیلہ	۶۶
خالق ارض و سماء	۲۶	ظالم اور مظلوم، صبر اور انتقام	۷۰
آسمان و زمین کی کنجیاں، رزق کی گھتیاں	۲۸	گمراہ لوگوں کا انجام اور احوال بد	۷۲
امت محمدیہ پر انعام	۲۹	آج کا کام کل پر مت چھوڑیے	۷۴
استقامت اور عدل کا حکم، کفار سے بیزاری	۳۱	نبی کا کام تبلیغ ہے	۷۶
آخرت کے طلبگار اور دنیا کے پرستار	۳۶	بیٹیاں اور بیٹے کون دیتا ہے؟	۷۸
معبودان باطلہ	۳۸	اللہ انسان سے کیسے بات کرتا ہے؟	۸۲
ظالموں اور اہل ایمان کا انجام	۴۰	قرآنی نور کے ذریعے ہدایت کے فیصلے	۸۵
اہل بیت عظام اور صحابہ کام	۴۱	صراط مستقیم اور صراط اللہ	۸۹
کفار مکہ کا نبی کریم ﷺ پر الزام	۵۲	**سورۃ الزخرف**	۹۱
قبول توبہ، گناہوں کی معافی	۵۵	قرآن لوح محفوظ میں	۹۳
اہل ایمان و اعمال صالحہ کی قبولیت دعا	۵۵	انبیاء کرام علیہم السلام، معاندین کا رویہ، خالق	۹۵
روزی فراخ نہ کرنے کی اہم وجہ	۵۷	انسانی سواری کے لیے اللہ کی نعمتیں	۹۷
مایوسی کے بعد بارش کا نزول	۵۸	مشرکین شرک کی انتہاؤں پر	۹۹
قدرت کی نشانیاں	۵۹	اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت	۱۰۰

مشرکین کی ایک بے ہودہ دلیل	۱۰۲	نصاریٰ کی گروہ بندی، انتظار قیامت	۱۴۹
اپنے آباؤاجداد کی پیروی	۱۰۴	دنیااوردین کے لیے دوستی	۱۵۱
انبیاء کرام علیہم السلام کی رسالت اور معاندین	۱۰۵	خوش نصیب بندگان خدا کو ندائے ربانی	۱۵۷
ابراہیم علیہ السلام کا شرک سے برأت کا اعلان	۱۰۷	اہل جنت کے لیے بیش بہا جنتی نعمتیں	۱۵۸
دعاؤں کے نسلوں میں اثرات	۱۰۸	دوزخ میں کافروں کی مایوسی و چیخ وپکار	۱۶۱
ناشکر گزاروں نے حق کو جادو گر قرار دیا	۱۱۳	اللہ کی صفات کمال وجلال	۱۶۵
حقانیت اسلام	۱۱۴	معبودان باطلہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے	۱۶۸
تقسیم معیشت کا قدرتی نظام	۱۱۷	**سورۃ الدخان**	۱۷۲
دنیا کی بے ثباتی اور فنائیت	۱۲۴	لیلۃ القدر میں نزول قرآن	۱۷۳
عذاب میں ایک دوسرے کی شرکت نافع نہیں	۱۲۷	رب ذوالجلال اور منکرین	۱۷۷
کفار مکہ کا ناپاک خیال	۱۲۸	فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام	۱۸۲
رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی	۱۳۰	تعظیم اوراستکبار میں فرق	۱۸۴
حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کے معجزات	۱۳۳	مجرمون کہا گیا کافروں کیوں نہیں کہا گیا	۱۸۵
موسیٰ کو اے ساحر! سے کیوں مخاطب کیا گیا	۱۳۵	نیکوکاروں پر آسمان وزمین کا رونا	۱۸۸
فرعونی چیخ وپکار اور پروپیگنڈہ	۱۳۶	مرینوالے پر زمین کا چالیس دن رونا	۱۹۱
انتقام اور غرقابی کا باعث	۱۳۹	فرعونی مظالم، فرعون کی سرکشی	۱۹۳
پرستاران غیر اللہ کے ڈھکوسلے	۱۴۱	کیا بنی اسرائیل کو سارے جہان پر فضیلت دی گئی؟	۱۹۴
نزول سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام	۱۴۴	کفار مکہ کا غلط عقیدہ	۱۹۶
نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتیں	۱۴۶	تبع حمیری اور قوم تبع	۱۹۷
معجزات عیسویہ اور حکمت الٰہیہ	۱۴۷	آسمان وزمین کی پیدائش، قیامت کا دن	۲۰۲

شجرۃ الزقوم	۲۰۴	خواہشات کا بندہ	۲۳۷
کافروں اور گناہ گاروں کی رسوائی کا منظر	۲۰۷	منکرین بعث بعد الموت کا رد	۲۴۰
اہل تقویٰ کیلیے جائے امن، باغات	۲۰۸	زمین و آسمان کا بادشاہ	۲۴۳
سندس اور استبرق کیا ہے؟	۲۰۹	کتاب حق، اہل ایمان، اہل کفر، قیامت	۲۴۵
حور العین کے حسن و جمال کا منظر	۲۱۰	تکبر اور بڑائی	۲۴۸
ہمہ قسم میوہ جات	۲۱۲	**سورۃ الاحقاف**	۲۵۲
موت کا ذائقہ ایک بار چکھنا ہے	۲۱۳	عظمت قرآن کریم	۲۵۳
قرآن کریم آسان یا مشکل؟	۲۱۴	مقصد تخلیق کائنات	۲۵۴
فتح و نصرت کا انتظار	۲۱۵	معبودان باطلہ قیامت کے دن برأت کرینگے	۲۵۶
سورۃ الجاثیہ	۲۱۶	تلاوت قرآن کریم، معاندین قرآن	۲۵۷
عظمت قرآن اور قدرت والے کی کبریائی	۲۱۸	رسول اللہ ﷺ کو مآل کار کا علم	۲۵۹
قرآن کا مزاح اڑانے والوں کیلیے ذلت آمیز عذاب	۲۲۳	بنی اسرائیل کا گواہ کون تھا؟ گواہی کیا تھی؟	۲۶۹
منکرین قرآن کیلیے عذاب عظیم	۲۲۵	کفار اہل ایمان، کتاب موسیٰ، ایمان پر ثابت قدمی	۲۷۲
منکرین قرآن کیلیے عذاب رجز الیم	۲۲۶	مدت حمل، مدت فطام اور کمال عمر	۲۷۴
تسخیر کائنات	۲۲۷	صدیق اکبر اور ان کے گھرانے کی شان	۲۸۲
ایام اللہ سے ناامیدی والوں کو درگزر کا حکم	۲۲۹	والدین کا نافرمان اور گستاخ	۲۸۳
عمل اپنا اپنا، جزا و سزا اپنی اپنی	۲۳۰	درجات اور درکات میں فرق	۲۸۶
بنی اسرائیل، کتاب، حکم، نبوت	۲۳۱	قوم عاد کے احوال	۲۸۸
شریعت اور مذہب	۲۳۳	عذاب لانے کا مطالبہ	۲۹۱
خواہشات پرست، ظالم، متقی، قرآن	۲۳۴	تند و تیز المناک آندھی کا عذاب	۲۹۲

طاقتوروں پر قدرت کا کوڑا برسا،	۲۹۵	اطاعت ربانی و نبوی، اپنے اعمال باطل نہ کرو	۳۴۷
بستیوں کی ہلاکت	۲۹۶	کافروں کے ساتھ صلح کی ممانعت، تعارض	۳۵۰
معبودان باطلہ نے پیروکاروں کی مدد کیوں نہیں کی؟	۲۹۷	دنیوی زندگی، لہو و لعب، کھیل تماشہ	۳۵۳
جب جنات نے قرآن کی تلاوت سنی	۲۹۸	**سورۃ الفتح**	۳۵۷
دلائل وحدانیت و قدرت باری تعالیٰ	۳۰۱	فتح مبین اور صلح حدیبیہ	۳۵۸
اولوالعزم انبیا کی طرح صبر	۳۰۳	فتح: انعامات کی برسات	۳۶۷
سورۃ محمد ﷺ	۳۱۲	بیعت الرضوان	۳۷۱
بدون ایمان اعمال صالحہ مردود	۳۱۴	پیچھے رہ جانے والوں کی مصنوعی باتیں	۳۷۸
جنگ اور جنگی حکمت عملی	۳۱۵	کفار کے لیے وعید، اللہ کی حاکمیت	۳۸۰
دین کی خدمت پر اللہ کی مدد آتی ہے	۳۱۹	غنیمت کی تلاش میں پیچھے رہ جانیوالے	۳۸۱
کفار کی ہلاکت و شقاوت	۳۲۴	معذور کے لیے رخصت	۳۸۲
کفار کا انجام، مسلمانوں کا صلہ، اہل مکہ	۳۲۵	بیعت الرضوان کے صلہ میں فتح خیبر	۳۸۳
کیا کفار کا کوئی مولیٰ نہیں؟ تعارض	۳۲۷	مغانم کثیرہ کا وعدہ	۳۸۵
جنت کی نہریں	۳۲۹	سنت اللہ یعنی دستور ربانی	۳۸۸
منافقین اور مسلمانوں کو رویہ	۳۳۲	قدرت والے کا حسن تدبیر	۳۹۰
عصمت مصطفےٰ ﷺ اور حکم استغفار	۳۳۵	مسجد حرام اور بیت اللہ کے اصل حقدار	۳۹۱
جہاد: مومنین اور منافقین کا طرز عمل	۳۳۷	غلبہ دین اسلام	۳۹۵
منافقین کا انجام	۳۴۰	اصحاب محمد ﷺ	۳۹۵
منافقین مرتدین کی کارستانیاں	۳۴۲	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مراتب و درجات	۴۰۰
امتحان اور آزمائش کا مقصد	۳۴۶	فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم	۴۰۱

سورۃ الحجرات	۴۰۹
رسول اللہ ﷺ کا ادب	۴۱۰
مجلس نبوی ﷺ کے آداب	۴۱۵
روضہ اقدس کے سامنے اونچا سلام کرنا	۴۱۶
فاسق کی خبر: تحقیق لازم	۴۱۹
صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب ایمان سے مزین	۴۲۱
دو مسلمان جماعتوں کے درمیان صلح	۴۲۳
رشتہ اخوت وبھائی چارگی کی اہمیت	۴۲۶
رشتہ اخوت کیلیے نقصان دہ باتوں سے اجتناب لازم	۴۲۸
معیار فضیلت تقویٰ ہے	۴۳۴
ایمان اور اسلام میں فرق	۴۳۸
سچے ایمان والے اور کچے ایمان والے	۴۴۱
سورۃ ق	۴۴۴
قرآن، صاحب قرآن اور منکرین	۴۴۵
آسمان، زمین اور پانی کی پیدائش	۴۴۸
کھجور کی فضیلت اور اقسام	۴۶۰
بندگان خدا کا رزق	۴۷۳
اصحاب الرس کا عبرت ناک منظر	۴۷۴
اصحاب الایکہ اور قوم تبع	۴۷۸
تخلیق اول اور تخلیق ثانی	۴۸۳
علم الٰہی، انسانی اعمال اور ان کی سزا	۴۸۵
تذکرہ جنت	۴۹۱
وَلَدَيْنَا مَزِيد کیا ہے؟	۴۹۳
امم سابقہ کی تباہی وبربادی	۴۹۵
طلوع وغروب آفتاب سے پہلے تسبیح	۴۹۸
فرض نمازوں کے بعد تسبیحات کی مشروعیت	۵۰۰
منادی، یوم ندا، مکان قریب	۵۰۵
قیامت کا ہنگامہ	۵۰۶
سورۃ الذاریات	۵۰۸
اللہ تعالیٰ کی قسمیں	۵۰۹
اعمال کی جزا وسزا مل کر رہے گی	۵۱۲
راستوں والے آسمان سے کیا مراد ہے؟	۵۱۴
کافروں کی متضاد آراء	۵۱۶
آخرت کے بارے کافروں کا سوال	۵۱۷
اہل ایمان وتقویٰ کی شان	۵۱۸
وقت سحر استغفار کی اہمیت	۵۲۲
سائل اور محروم کا حق	۵۲۶
اہل یقین کیلیے زمین میں نشانیاں	۵۲۸
انسانی وجود میں قدرت کی نشانیاں	۵۲۹
آسمان میں مخلوقات کا رزق	۵۳۱

یوم جزا کا وقوع یقینی ہے	۵۳۲	اہل تقویٰ کیلیے جنت اور نعمت ہائے جنت	۵۶۵
فرشتے ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں	۵۳۲	نیک اولاد قیمتی اثاثہ	۵۶۶
حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت	۵۳۵	جنتی پھل اور کھانے	۵۷۰
بڑھاپے میں اولاد باعث تعجب	۵۳۶	شراب طہور کے چھلکتے جام شیریں، غلمان	۵۷۲
ملائکہ کی اطمینان دہانی	۵۳۷	اہل جنت کو بیش بہا نعمتیں ملنے کی وجہ	۵۷۳
مٹیالے پتھروں کی بارش	۵۳۸	مبلغین کو اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے	۵۷۴
کفار کی بستی میں مسلمانوں کا ایک گھر	۵۴۰	کافر کا ذہن ہوتا ہے مگر عقل نہیں	۵۷۶
ایمان اور اسلام میں فرق	۵۴۰	کفار اور مشرکین کا آپریشن	۵۷۷
عبرت کی نشانی	۵۴۲	سرکشوں اور سازشیوں کیلیے شکنجہ تیار	۵۸۱
فرعون کی غرقابی کا عبرت ناک منظر	۵۴۳	قیامت سے پہلے عذاب	۵۸۲
نافرمانوں کیلیے اللہ کی پکڑ	۵۴۴	ثنائے رب جلیل کا حکم	۵۸۳
قدرت کی کاریگری اور توحید	۵۴۶	**سورۃ النجم**	۵۸۶
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی	۵۴۹	نبوت، وحی اور معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۵۸۷
جنات اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد	۵۵۰	بت اور بتکدے	۵۹۲
اللہ طلب گار رزق نہیں بلکہ عطا کرنیوالا ہے	۵۵۲	مشرکین عرب کی ٹیڑھی تقسیم	۵۹۶
ظالموں کا انجام	۵۵۳	مشرکین کے نام نہاد معبود	۵۹۷
سورۃ الطور	۵۵۵	اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت	۵۹۹
طور پہاڑ	۵۵۶	منکرین آخرت، ان کا مبلغ علم، عقائد باطلہ	۶۰۰
قسمیں اور جواب قسم	۵۵۹	کبائر سے اجتناب، اپنی بڑائی سے گریز	۶۰۳
قیامت کی ہولناکی اور دوزخ	۵۶۳	ولید بن مغیرہ کے بارے میں آیات	۶۰۸

صحیفہ ابراہیمی وموسوی کا پیغام	۶۱۰	عبرت ناک مناظر	۶۲۵
صحیفہ کسے کہتے ہیں؟	۶۱۱	وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى	۶۲۶
وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى	۶۱۱	اللہ کی کون کون سی نعمت میں شک کروگے	۶۲۷
آسمان سے نازل ہونے والی کتب	۶۱۲	نذیر سے مراد کون ہے؟	۶۲۹
صحف موسیٰ وابراہیم کا پیغام	۶۱۳	قیامت	۶۳۰
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى	۶۱۶	هٰذَا الْحَدِيْث سے کیا مراد ہے؟	۶۳۱
ہنسانے اور رلانے والا کون؟	۶۱۷	منکرین ومخالفین قرآن کو پیغام ربانی	۶۳۱
اللہ تعالیٰ کی کاریگری	۶۲۱	سمد کا کیا مطلب ہے؟	۶۳۲
مالداری اور مفلسی	۶۲۲	فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا	۶۳۲
شعریٰ ستارے کا رب	۶۲۳	☼	
قوم ھود	۶۲۵	☼☼	

اپنی بات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَا أَوْضَحَ لَنَا مِنْ بُرْهَانِهٖ، وَبَيَّنَ لَنَا مِنْ فُرْقَانِهٖ، وَهَدَانَا إِلَيْهِ مِنْ نُوْرِ كِتَابِهِ الَّذِیْ أَنْزَلَهٗ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللِّسَانِ الْعَرَبِیِّ الْمُبِيْنِ، وَأَنْهَجَ بِهِ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، وَجَعَلَهٗ مُهَيْمِنًا عَلٰی مَا قَبْلَهٗ مِنَ الْكُتُبِ الَّتِیْ أَنْزَلَهَا عَلَى النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْنَ أَمَّا بَعْدُ،

تمام کامل، مکمل اور اکمل تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں جس نے ہمارے لیے رشد وہدایت کی راہیں واضح فرمادیں، اپنے دلائل قاہرہ اور براہین واضحہ سے ہمیں روشناس فرمایا، برہان اور فرقان کے ہتھیاروں سے ہمیں لیس فرمایا، جس نے اپنی کتاب قرآن کریم کی بدولت ہمیں سرفراز فرمایا، نور قرآن سے ہمیں روشنی مہیا فرمائی، جو اپنے پیارے حبیب نبی کریم ﷺ کے قلب منور وتاباں پر نازل فرمایا۔

وہ ذات جس نے ساری زبانوں اور السنہ سے ممتاز زعربی زبان میں اپنی کتاب کو خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اس کتاب زندہ جاوید کو صراط مستقیم پر چلنے کے لیے مشعل بنایا، اس کتاب کو جس نے کتب سابقہ پر مہیمن اور نگہبان بنایا، وہ ذات جس نے اپنے بندگان کو اپنی کتاب کی خدمت میں شبانہ روز مصروف کار رکھا ہوا ہے۔

وہ ذات جس نے اس صحیفۂ آسمانی کی حفاظت کا اعلان فرمایا، اس کی صداقت وحقانیت کو مشکوک ثابت کرنے والے بڑے بڑے زبان دانوں اور شکوک وشبہات کے گڑھوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کو چیلنج دیا کہ اسے مٹاسکتے ہو تو مٹا کر دیکھو، اس کا مقابلہ کرسکتے ہو تو کرکے دیکھو، اس جیسی آیات، اس جیسی سورتیں، اس جیسے پیغامات لاسکتے ہو تو لے کر آؤ، مگر وہ علیم وخبیر ذات خود ہی کہتی ہے کہ ہنگامہ یوم النشور بپا ہوسکتا ہے، ایک دن انصاف وعدل کے پیمانے چھلکیں گے، ایک دن نیکی بدی

کا ترازو تلے گا، روز محشر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ طلوع ہو گا مگر اے اعدائے اسلام! اے دشمنان دین! اے منکرین کتاب ہدیٰ! تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس جیسا قرآن لا نہیں سکتے، اس جیسی کتاب دکھا نہیں سکتے، اس جیسی سورتیں سنا نہیں سکتے، اس جیسی عبارات بنا نہیں سکتے، اس کی ابدیت اور لابدیت کو ختم نہیں کر سکتے۔

بندہ عاجز و مسکین فقیر حدوٹی نے معارف الفرقان سوالی جوابی صورت میں تالیف کی ہے، رب تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں مجھے یقین ہے کہ وہ اس فقیر کے دست حقیر سے تحریر کی گئی اس متواضع تفسیر کو قبول فرما کر اس کی فلاح دنیوی واخروی کا ذریعہ بنائے گا، اس کی بارگاہ میں مایوسی تو ہے ہی نہیں کیونکہ وہ گبر و ترسا پر رحم کرتا ہے اور انہیں ہدایت کی دولت دے کر ابد الآباد کی جنت کا حقدار بنا دیتا ہے۔

اس وقت میں جب اس طباعت پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں کوشش یہی رہی کہ چھوٹے سائز میں طبع ہونے والی جلدوں کی مناسبت سے جلدیں اتنی ہی رہیں، اگر ان جلدوں کی تعداد کم کی جاتی تو پھر سیاق وسباق اور حوالہ دینے میں مشکل پیش آتی۔ اس لیے اس طباعت میں سابقہ طباعت کا خیال رکھا گیا ہے، ہاں اس طباعت میں تسلسل کے ساتھ مواد کا اضافہ شامل ہے، سابقہ کوتاہیوں کا بڑی حد تک ازالہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کمی بیشی معاف فرمادے۔

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۴ ستمبر ۲۰۱۸ء ۲۳ ذی الحج ۱۴۳۹ھ بروز منگل پانچ بجے قبیل نماز عصر

نظر ثانی: ۷ جنوری ۲۰۲۶ء ۱۷ رجب المرجب ۱۴۴۷ھ، بعد نماز مغرب

☆☆

سورۃ الشوریٰ (تعارف)

سوال سورۃ الشوریٰ کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ شوریٰ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے قرآن کریم کی ۴۲ ویں سورت ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۶۱ ویں سورت ہے، اس سورت میں پانچ رکوع، ۵۳ آیات، ۸۶۰ کلمات اور ۳۵۸۸ حروف ہیں، سورۃ شوریٰ مکی سورتوں میں سے ہے، مکی سورتوں میں عموما توحید، رسالت، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے، قیامت کے دن جزاوسزا ملنے کا ذکر پایا جاتا ہے، سورۃ الشوریٰ بھی انہی مضامین کو کہیں اجمال سے اور کہیں تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

وجہ تسمیہ : سورۃ مبارکہ کا نام "سورۃ شوریٰ" ہے چونکہ اسلام میں شوریٰ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور سورت مبارکہ میں اس کا ذکر ہے، مؤمنین کو نظام شوریٰ پر قائم رہنے کی تعلیم دی گئی ہے چونکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے دور راس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اہم مضامین: وحی اور رسالت کے موضوعات سے سورۃ مبارکہ کی ابتدا کی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے انبیا پر وہی وحی نازل کرتا ہے، جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے منتخب کرتا ہے تاکہ انسانیت کو شرک وگمراہی کی تاریکیوں سے نور ہدایت کی طرف لے آئے۔

سورۃ مبارکہ میں بعض مشرکین کی حالت پیش کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں یہ بہت بڑا بہتان ہے، قریب ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے، مشرکین گمراہی میں پڑے ہوتے ہیں جب کہ عالم بالا میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح وعبادت میں مشغول ہوتے ہیں چنانچہ یہ اہل زمین کے، اہل کفر اور اہل آسمان کے، اہل ایمان کا خوبصورت تقابل ہے۔

اس کے بعد سورۃ مبارکہ میں پھر سے وحی ورسالت کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے کہ دین واحد ہے، اسی دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا ہے اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے شرائع اگرچہ مختلف ہیں لیکن دین ایک ہی ہے اور وہ دین اسلام ہے نوح، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور سارے انبیاء علیہم السلام کو یہی دین دے کر بھیجا ہے۔

سورۃ مبارکہ میں قرآن کے مکذبین کی خبر بھی لی گئی ہے، اور منکرین بعث و جزا پر بھی بات ہوئی ہے، چنانچہ مکذبین و منکرین کو قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے جس دن سروں کے بال سفید ہو جائیں گے اور دل جسموں سے نکل کر اڑانے لگیں گے جب کہ وہ دنیا میں قیامت کو مذاق سمجھتے تھے اور قیامت کے جلدی آجانے کا مطالبہ کرتے تھے۔

دکھائی دینے والے عالم میں پائے جانے والے دلائل ایمان پر گفتگو کرنے کے بعد انسانیت کو قبولیت حق، انقیاد اور رب تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جانے کی دعوت دی گئی ہے کہ انسانیت اپنی فکر کرلے ایسا نہ ہو کہ اچانک قیامت آجائے پھر مال و اولاد کسی کام نہ آئے گی۔

سورۃ مبارکہ کے اختتام میں وحی اور قرآن پر بات کی گئی ہے جیسے صورت کی ابتدا میں وحی اور قرآن پر بات کی گئی ہے تاکہ ابتدا و اختتام میں مناسبت پیدا ہو جائے۔ (صفوۃ التفاسیر)

تفسیر حروف مقطعات، اللہ کی بادشاہی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۴﴾ الشوریٰ

جواب ترجمہ: حٰمٓ عٓسٓقٓ، اسی طرح وحی بھیجتا ہے آپ کی طرف اور ان کی طرف جو آپ سے پہلے تھے اللہ جو عزیز ہے حکیم ہے، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ برتر ہے بڑا ہے۔

خلاصہ تفسیر: حم، عسق، عبد المؤمن نے کہا: میں نے حسین بن فضل سے پوچھا حٰم کو عٓسٓقٓ سے کیوں الگ کیا گیا ہے؟ جبکہ كٓهٰيٰعٓصٓ، الٓمٓرٰ اور الٓمٓصٓ کو الگ الگ نہیں کیا گیا، انہوں نے فرمایا: کیونکہ حم عسق سورتوں کے درمیان ہے جن میں سے پہلی حم ہے تو یہ ما قبل اور بعد کے نظائر پر جاری ہوئی گویا حم مبتدا ہے اور عسق خبر ہے اور اس کی اخوات جن کو اکٹھے لکھا گیا ہے وہ ایک آیت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: حروف معجمہ سب کے سب ایک معنی میں ہیں، اس کی وجہ مِنْ حَيْثُ إِنَّهَا أُسُّ الْبَيَانِ وَقَاعِدَةُ الْكَلَامِ (یہاں سے بیان وکلام کی ابتدا ہوتی ہے) اس لیے کعیص کو متصل لکھا گیا ہے اور حم عسق کو منفصل کیونکہ کلام یہ کی گئی ہے حم سے مراد ہے حُمَّ مَا هُوَ كَائِنٌ، جو ہو کر رہنے والا ہے اس کا قصد کر لیا گیا ہے، جنہوں نے اس کے درمیان فعل مقدر مانا ہے انہوں نے الگ الگ کر کے لکھا ہے اور جنہوں نے درمیان میں فعل مقدر نہیں مانا انہوں نے اکٹھا لکھا ہے، بہر حال شیخ قشیری رحمہ اللہ کے بقول الگ الگ لکھنا اور اکٹھا کر کے لکھنا دونوں طرح سے جائز ہے۔ الجامع لاحکام القرآن)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قراءت میں حٰمٓ سٓقٓ ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ يَعْرِفُ الْفِتَنَ بِهَا ان کے ذریعے فتنوں کو پہنچانا کرتے تھے۔

ارطاۃ بن منذر رحمہ اللہ نے کہا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کی جبکہ ان کے پاس حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ موجود تھے، مجھے اللہ تعالیٰ کے فرمان حٰمٓ عٓسٓقٓ کی تفسیر کے بارے میں بتایئے، تو آپ نے اس سے اعراض کیا یہاں تک کہ اس نے تین دفعہ اپنے سوال کو دہرایا، تو پھر بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے اعراض کیا۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تجھے اس کے بارے میں آگاہ کرتا ہوں میں خوب جانتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر بیان کرنے سے کیوں اجتناب کیا! یہ آیت اہل بیت کے ایک فرد کے بارے میں نازل ہوئی جسے عبد الالہ یا عبد اللہ کہا جائے گا وہ مشرق کے دریاؤں میں سے ایک دریا پر فروکش ہو گا اس پر دو شہر بسائے گا، یہ دریا ان دونوں شہروں کو پھاڑ ڈالے گا۔

جب اللہ تعالیٰ ان کے ملک کے زوال اور حکومت کو ختم کرنے کا ارادہ کرے گا تو رات کی تاریکی میں ایک آگ بھیجے گا، جب صبح ہو گی تو وہاں سیاہی ہی سیاہی ہو گی، یہ آگ سب کچھ جلا کر خاکستر کر دے گی، گویا وہ شہر اس جگہ تھا ہی نہیں، اس کی مالکہ صبح کے وقت متعجب ہو گی یہ سب کچھ کیسے پلٹ دیا گیا، وہ دن ابھی بھی روشن ہی ہو گا یہاں تک کہ اس میں ہر جابر سرکش جمع ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ

اسے اور انہیں سب کو دھنسا دے گا، یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان حٰمٓ عٓسٓقٓ کی، یعنی اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ارادوں میں سے ایک ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں سے ایک آزمائش، اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ۔

سورۃ کے شروع میں پانچ حروف ہیں، ان میں سے دو الگ ہیں اور تین الگ ہیں، حٰمٓ سے مراد حُم ہے، یعنی ارادہ کیا گیا، ع سے مراد عَدلًا مِّنہُ، اس کی جانب سے عدل وانصاف، س سے سَیَکُونُ یعنی یہ کام عنقریب ہو گا، ق سے مراد وَاقِعٌ فِی هَاتَیْنِ الْمَدِینَتَیْنِ ان دو شہروں کے درمیان واقع ہو گا۔ (الجامع لاحکام القرآن)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ روایت اپنی تفسیر میں نقل کرنے سے پہلے اس پر حکم لگایا کہ ابن جریر رحمہ اللہ کی یہ روایت غریب ہے، عجیب ہے، منکر ہے، جب کہ علامہ طبری رحمہ اللہ نے جامع البیان فی تاویل القرآن میں یہ روایت نقل فرمائی ہے، انہوں نے اس روایت پر اس طرح کا کوئی حکم نہیں لگایا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے الجامع لاحکام القرآن میں یہ روایت نقل فرمائی ہے اس میں انہوں نے اس پر کوئی حکم نہیں لگایا بلکہ انہوں نے اس روایت کے ساتھ ملتی جلتی ایک اور روایت پیش کی ہے، جو صحابی رسول حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر الدر المنثور فی التفسیر بالماثور میں یہ روایت نقل کی ہے، انہوں نے بھی اس پر غرابت اور نکارت کا کوئی حکم نہیں لگایا، جب کہ اس کے بعد انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے جس پر انہوں نے ضعیف ہونے کا حکم لگایا ہے، علامہ عبد الرحمٰن الجوزی رحمہ اللہ نے زاد المسیر فی علم التفسیر میں یہ روایت نقل ہی نہیں کی، واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دَجلہ اور دُجیل، قُطرُبل اور صَرَّاہ کے درمیان ایک شہر آباد کیا جائے گا، جس میں زمین کے جابر حکمران جمع ہوں گے، وہ زمین جس میں خزانے جمع کیے جائیں گے، وہ اپنے مکینوں کے ساتھ زمین میں دھنس جائیں گے وہ زمین میں اس عمدہ کیل سے جلدی جائیں گے جو نرم زمین میں جاتا

ہے۔(الجامع لاحکام القرآن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عین کے بغیر حم سق پڑھا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یہ اسی طرح ہے۔(طبری) نافع رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے؛ حا اس کے حلم سے، میم اس کی مجد سے، عین اس کے علم سے، سین سناء سے اور قاف اس کی قدرت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم اٹھائی ہے۔

محمد بن کعب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم، اپنی مجد، اپنی علو، اپنی سنا اور اپنی قدرت کی قسم اٹھائی ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو عذاب نہیں دے گا جو خلوص دل سے لا الہ الا اللہ کی پناہ چاہتا ہے۔

جعفر بن محمد رحمہ اللہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: حاء رحمن سے، میم مجید سے، عین علیم سے، سین قدوس سے اور قاف قاصر سے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ سورتوں کے فواتح (ابتدائیے یا پیش لفظ، پیش آہنگ) ہیں۔

عبد اللہ بن بریدہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جو دنیا کو محیط ہے۔ قشیری نے ذکر کیا جبکہ الفاظ ثعلبی رحمہ اللہ کے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر پریشانی دیکھی جاسکتی تھی، آپ سے عرض کی گئی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کس چیز نے آپ کو غم گین کیا؟ فرمایا: مجھے ان امتحانات کے بارے میں بتایا گیا ہے جو میری امت میں واقع ہوں گے یعنی زمین میں دھنسنا، پتھروں کی بارش کرنا، آگ جو انہیں سمندر میں پھینک دے گی، پے در پے آیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا نکلنا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے متعلق ہے حاء سے مراد آپ کا حوض جس پر ہر کوئی وارد ہو گا، میم سے مراد آپ کی وسیع حکومت، عین سے مراد موجود عزت، سین سے مراد وہ بلندی جس کی گواہی دی جائے گی، قاف سے مراد مقام محمود میں آپ کا کھڑا ہونا اور کرامت و بزرگی کے مقام پر اپنے مالک و معبود کے قریب ہونا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ہر صاحب کتاب نبی کی طرف حٰمٓ عٓسٓقٓ وحی کی گئی، اسی وجہ سے فرمایا: یُوْحِیْٓ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ۔ مہدوی نے کہا: حدیث میں آیا ہے کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ کا معنی ہے متقدمین انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی گئی۔

عبد الرحمٰن الجوزی رحمہ اللہ نے عسق کے تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ عسق میں تین اقوال ہیں

① یہ قسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے قسم کھائی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے۔ (ابو طلحہ عن ابن عباس)

② یہ ناموں کے حروف ہیں، پھر اس میں پانچ اقوال ہیں۔ (۱) ع سے مراد علم اللہ (اللہ کا علم) س سے سناءہ (اس کی بلندی)۔ ق سے قدرتہ (اس کی قدرت) (عکرمہ، حسن، عن ابن عباس) (۲) اس میں ع سے مراد عذاب ہے، س سے مراد مسخ (شکلوں کی تبدیلی) ق سے مراد قذف ہے (ابو الجوزاء عن ابن عباس) (۳) ح سے مراد حرب (جنگ) ہے، میم سے مراد تحویل ملک (ملک کی تبدیلی) ع سے مراد عدُوٌّ مقہور یعنی مغلوب دشمن۔ س سے مراد استئصال بذریعہ قحط سالی، جیسے یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آنے والی قحط سالی، ق سے مراد زمینی بادشاہوں میں اللہ کی قدرت ہے۔ (عطاء) (۴) ع سے مراد عالم ہے، س سے مراد قدوس ہے، ق سے مراد قاہر ہے۔ (سعید بن جبیر) (۵) ع سے مراد عزیز (زبردست) س سے مراد السلام (سلامتی والا) ق سے مراد قادر قدرت رکھنے والا۔ (سدی)

③ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (قتادہ) (زاد المسیر فی علم التفسیر)

كَذٰلِكَ یُوْحِیْٓ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ: یعنی اس سورت میں جس طرح آیات ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام سورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی ہیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے رسولوں اور نبیوں کی طرف وحی کی گئی ہے، تاکہ لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دی جائے، ان باتوں کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے جن میں ان کے لیے بھلائی اور بہتری ہے، لوگوں کو نبوت اور پیغام نبوت کی طرف دعوت دی جائے، آخرت کی طرف بلایا جائے، اس لیے آپ دینی معاملات میں سے کسی معاملے کو مشکوک نہ سمجھیں۔

اس کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں، ایک قول ابو صالح رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جس طرح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حم عسق کی وحی کی ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبیوں کی طرف بھی حم عسق کی وحی کی تھی۔ دوسرا قول حضرت عطاء نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جس طرح ہم نے پہلے انبیاء کی طرف غیب کی خبریں وحی کی ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی غیب کی خبریں وحی کر رہے ہیں۔ تیسرا قول حضرت مقاتل رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ عذاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے، گویا کہ یوں کہا جارہا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ بات وحی کر رہے ہیں کہ ان لوگوں پر عذاب نازل ہونے والا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں گے، اسی طرح ہم نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے رسولوں کی طرف وحی کی تھی۔ (زادالمسیر)

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: وہ ذات عالی شان اپنی بادشاہی، اپنی سلطنت، اپنی حکومت میں زبردست ہے، اسے غلبہ حاصل ہے، وہ حکیم ذات ہے، اس کی کاریگریوں میں، اس کی صناعیوں میں، اس کی بوقلمونیوں میں حکمتیں ہی حکمتیں ہیں، اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اللہ تعالیٰ کے عزیز و حکیم ہونے کو پھر سے ثابت کیا جارہا ہے، اس بات کی مزید وضاحت فرمائی جارہی ہے کہ وہ ذات عالی شان عزیز و حکیم ہے" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کے قبضہ قدرت میں ہے نہ کسی چیز میں کسی کا ساجھا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے حیطہ اقتدار و اختیار سے باہر ہے۔ (تدبر قرآن)

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ: وہ بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہستی ہے، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہمسر ہو سکے، مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو مہلت دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو گئے اور اگر اس نے کسی کو عزت و شوکت بخشی ہے تو اس کو اتنا مغرور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کو دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ کر بیٹھے، اللہ کی بارگاہ بہت بلند اور اس کی ہستی بڑی عظیم ہے۔ (تدبر قرآن) اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے یہ اس کی مخلوق اور بادشاہی ہے، وہ اپنی مخلوق سے بہت ہی عالی، بلند اور اونچا ہے، وہ اپنی عظمت و کبریائی

کا یکے و تنہا مالک ہے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

عظمت خداوندی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ {۵} الشوری.

جواب ترجمہ: ایسا لگتا ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں گے، اور فرشتے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں، اور زمین والوں کے لیے استغفار کر رہے ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جو بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر: شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین کے شرک کے باعث آسمان چر کر گر جائیں ، حضرت عبد اللہ بن عباس وغیرہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے اوپر سے پھٹ پڑیں۔ (تفسیر القرآن لابن کثیر) حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس تسبیح کی عظمت کے پیش نظر آسمان بھی پھٹ جائیں یا فرشتوں کی کثرت ذکر کی تاثیر کی وجہ سے پھٹ پڑیں۔ (موضح القرآن)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں، ان غلط باتوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، اگر فوراً پکڑنا چاہے تو آسمان وزمین کا نظم درہم برہم ہو جائے جیسے سورۃ مریم میں ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی غلط نسبت کی تو ان کی اس بات سے ناراض ہونے کی وجہ سے قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کے بوجھ سے آسمان میں ایسی آواز پیدا ہوتی جیسی کسی چیز پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دینے سے ہوا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں ثقل والا بوجھ ہے اور اس میں کوئی استبعاد نہیں، کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ فرشتوں کے بھی اجسام

ہیں اگرچہ اجسام لطیفہ ہوں اور اجسام لطیفہ جب بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں تو ان کا بوجھ بڑھنا کوئی امر مستبعد نہیں۔(بیان القرآن)

مشاغل ملائکہ: فرشتے زمین والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ **سوال**: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے سب کے لئے دعا مغفرت کرتے ہیں خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر وغیرہ تو اس کا **جواب** یہ ہے کہ شرح مواقف میں ہے اَلْمَوْصُوْلَاتُ لَمْ تُوْضَعْ لِلْعُمُوْمِ بَلْ هِيَ لِلْعُمُوْمِ وَالْخُصُوْصِ کہ موصولات کی وضع صرف عموم کے لئے نہیں بلکہ عموم اور خصوص دونوں میں مشترک ہے تو یہاں (من) خصوص کے لئے ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ سورۃ المؤمن میں " وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (آیت : ۷) کہ فرشتے صرف ایمان والوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ مشرک کافر ہندوؤں سب کے لئے دعا مغفرت کرتے ہیں، بلکہ صرف ایمان والوں کے لئے ہی کرتے ہی۔

مولانا عبد الحق حقانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر اس " من " کو عموم کے لئے دعائے مغفرت مان لیں تو بھی مطلب یہ ہوگا فرشتے کفار کے لئے بھی دعا کرتے یعنی ہدایت کی لہٰذا اس پر کوئی اشکال نہیں۔(تفسیر حقانی، بحوالہ معارف الفرقان للقاسمی)

معبودانِ باطلہ، قرآن کریم، جنتی و جہنمی گروہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ {٦} وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ {٧} وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ {٨} اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ {٩} وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۭ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ {١٠} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز تجویز کر رکھے ہیں وہ اللہ کی نگاہ میں آپ ان کے ذمہ دار نہیں اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن عربی کی وحی بھیجی تاکہ آپ ام القریٰ اور اس کے آس پاس کے رہنے والوں کو ڈرائیں اور جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں جس میں کوئی شک نہیں، ایک فریق جنت میں ہو گا اور ایک فریق دوزخ میں، اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا اور لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے ظالموں کے لیے کوئی دوست ہے نہ کوئی مددگار، کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں سو اللہ ہی کارساز ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جس کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے، وہ اللہ میرا رب ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ سے فرماتے ہیں کہ اے محمد میرے حبیب ﷺ آپ کی قوم کے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا اور معبود تجویز کر لیے اور وہ ان کی دوستی اور عبادت میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے افعال کو شمار کر رہے ہیں اور ان کے اعمال کو محفوظ کرنے والے ہیں تاکہ قیامت کے روز ان کو ان کی سزا دی جائے اور اے میرے حبیب ﷺ آپ ﷺ ان کے اعمال کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں، آپ ﷺ تو ان کو ڈرانے والے ہیں، جو پیغام آپ ﷺ کو دیا گیا ہے اسے ان لوگوں تک پہنچا دیں آپ ﷺ کا فرض پہنچانا اور ہماری ذمہ داری حساب لینا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں اسی طرح ہم نے میرے حبیب ﷺ اس قرآن کو عربی زبان میں وحی کیا ہے کیونکہ جو لوگ آپ کے مخاطب ہیں وہ عرب لوگ ہیں اور ہم نے اس قرآن کی وحی ان کی زبان میں کی ہے تاکہ وہ اس کے دلائل کو سمجھ جائیں اس لئے کہ ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے سب کو ان کی قومی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان کے سامنے کھول کر بیان کریں اسی طرح آپ ﷺ کی طرف بھی بھیجا ہے تاکہ آپ ﷺ ام القریٰ یعنی اہل مکہ اور اس کے ارد گرد والے لوگوں کو ڈرائیں۔ **وَمَنْ حَوْلَهَا** سے تمام لوگ مراد ہیں۔ (جامع البیان)

وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ: اور اس لئے آپ کو پیغمبر بنایا ہے تاکہ آپ ﷺ موقف حساب میں

لوگوں کے جمع ہونے کے دن اللہ کی سزا سے لوگوں کو خبر دار کریں اور بعض نے کہا کہ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ سے مراد ان مشرکین کو جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں مراد ہے، سدی رحمہ اللہ سے یوم الجمع، کا معنیٰ یوم القیامۃ، نقل کیا گیا ہے۔ لَا رَيْبَ فِيهِ، یعنی اس دن میں کوئی شک نہیں۔

فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں ایک جماعت جنت میں جائے گی اور یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کا رسول جو کچھ لے کر آیا انہوں نے اس کی اتباع اور پیروی کی اور ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلائی ہوئی آگ میں جائے گا اللہ تعالیٰ کی یہ آگ اہل جہنم پر خوب بھڑکائی جائیگی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اللہ کا انکار کیا اور جو اللہ کے رسول لے کر آئے اس کی مخالفت کی۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

یونس رحمہ اللہ نے شفی اصبحی رحمہ اللہ سے اور انہوں نے ایک صحابی رسول سے یہ نقل کیا کہ جناب رسول اللہ ﷺ گھر سے نکل کر ہمارے ہاں تشریف لائے اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ ہم نے کہا نہیں مگر یہ کہ آپ ﷺ ہمیں بتلا دیں ، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ رب العالمین کا خط ہے، اس میں اہل جنت کے نام ہیں اور ان کے باپوں اور قبائل کے نام ہیں، پھر ان کے آخر تک اجمال کیا گیا ہے اس میں کبھی بھی اضافہ اور کمی نہ ہو گی۔

اصحاب رسول ﷺ نے پوچھا پھر ہم عمل کیوں کرتے ہیں؟ اگر اس معاملہ سے فراغت ہو چکی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سیدھا راستہ اختیار کرو اور قریب قریب عمل اختیار کرو اور قریب قریب عمل اختیار کرو، اس لئے کہ جنتی آدمی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہو گا خواہ کوئی بھی عمل اس دوران میں کرتا رہے اور آگ والے کا خاتمہ اہل نار کے عمل پر ہو گا خواہ جونسا عمل پہلے کرتا رہے، تمہارا رب بندوں کی تقدیر سے فارغ ہو چکا، پھر جناب نبی مکرم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو پھینک دیا اور فرمایا تمہارا رب مخلوق سے فارغ ہو چکا، ایک فریق جنت میں اور ایک فریق بھڑکتی آگ میں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا سبحان اللہ پھر ہم کیوں کام کرتے اور تھکتے ہیں؟ جناب نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ عمل کا دارومدار اس کے خاتمہ پر ہے۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

یونس رحمہ اللہ نے عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو اس طرح جھاڑا جیسے پرانی مشک کو جھاڑا جاتا ہے اور ان سے ان کی تمام اولاد کو نکالا چنانچہ وہ کیڑوں کی مانند نکلے، پھر ان کو دونوں مٹھیوں کے اندر پکڑا اور فرمایا یہ بدبخت اور یہ خوش نصیب ہیں پھر ان دونوں کو ڈال دیا، پھر ان دونوں کو مٹھی میں پکڑا اور فرمایا فریق فی الجنہ و فریق فی السعیر۔

عمرو بن حارث رحمہ اللہ نے بن حجیرہ رحمہ اللہ سے بیان کیا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ اے میرے رب! تیری مخلوق وہ ہے جن کو تو نے پیدا کیا اور ان میں ایک فریق کو جنتی اور ایک فریق کو جہنمی بنایا، آپ نے سب کو جنت میں کیوں نہ داخل کر دیا؟ اللہ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے بازو اٹھاؤ انہوں نے اٹھائے اور عرض کی اے میرے رب میں نے اٹھائے، اللہ نے فرمایا اور بلند کرو انہوں نے اور اونچے کیے اور کوئی کمی نہ چھوڑی اور عرض کی اے میرے رب! میں نے اونچے کر دیے اللہ نے فرمایا اور اونچا کرو میں نے اونچے کر دیئے اب اونچے کرنے میں خیر نہیں اللہ نے فرمایا اسی طرح میں اپنی تمام مخلوق کو جنت میں داخل کروں گا سوائے ان لوگوں کے جن میں کوئی خبر نہیں (جامع البیان فی تاویل القرآن)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اگر اللہ چاہتے تو تمام مخلوق کو ہدایت پر اکٹھا کر دیتے اور ان کو ایک ہی ملت بنانا چاہتے تو ایک ہی امت بنا دیتے، محاورے میں اھل ملۃ واحدۃ کا مطلب وہ جماعت جو ایک ہی دین پر ہو۔

وَلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ: لیکن اللہ جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت میں اس کو داخل کر دیتے ہیں یعنی اللہ نے ان سب کو ایک ہی امت نہیں بنایا بلکہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہا اپنی رحمت میں داخلے کی توفیق بخشی۔

وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: وہ دین کہ جو اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکر بھیجا اور جو لوگ اللہ کا انکار کرنے والے ہیں، یہ ظالم لوگ ہیں، قیامت کے روز ان کا کوئی دوست نہیں ہو گا جو ان سے دوستی لگائے اور نہ کوئی مددگار ہو گا جو اللہ کے عذاب سے انہیں چھڑائے، یہ بات اللہ نے اپنے رسول

ﷺ کو بطور تسلی فرمائی اس لئے کہ آپ ﷺ اپنی قوم کے اعراض کی وجہ سے غمزدہ تھے اور اس میں اللہ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے دل میں کوئی رنجیدگی والی بات ان لوگوں کی وجہ سے نہ لائیں، جنہوں نے آپ ﷺ کی بات سے منہ موڑا ہے اور آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا اس میں آپ کو یہ اطلاع دی کہ بندوں کے معاملات اللہ کے قبضہ اختیار میں ہیں اور وہ جس کو چاہتا ہے حق کی طرف اس کی رہنمائی کر دیتا ہے اور جس کے متعلق اس کا یہ ارادہ نہ ہو وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور یہ چیز اس کے سوا کسی اور کے قبضہ میں نہیں۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کیا ان مشرکین نے اوروں کو اپنا کارساز بنالیا ہے کہ جن سے یہ دوستی کرنے والے ہیں۔

فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ ہی اپنے اولیاء کا سچا دوست ہے اسی کو کارساز بنانا چاہیے نہ کہ اور باطل معبودوں اور بتوں کو اور نہ ان کو جو ان کے لئے ذرا بھر نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور اللہ ہی کی ذات موت کے بعد مردوں کو زندہ کرنے والی ہے پھر وہ ان سب کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا اور اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، وہ موت کے بعد اپنی مخلوق کو زندہ کرنے اور اس کے علاوہ اور حالت میں بنانے کی قدرت رکھتا ہے اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ: فرمایا اے لوگو تم جس چیز کے اندر اختلاف کرو اور اپنے درمیان اس کا فیصلہ اللہ کی ذات پر چھوڑ دو اللہ تمہارے درمیان اس کے متعلق اپنے حکم سے فیصلہ فرمانے والے ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ: اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو فرمارہے ہیں کہ آپ ﷺ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ یہ میرے رب کی صفات ہیں، جب کہ تمہارے ان معبودوں جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو انہیں تو کسی بات پر قدرت نہیں ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ: میں نے تو اپنے معاملات میں اسی پر بھروسہ کیا اور اپنے سارے اسباب کو اس کے حوالے کر دیا اور اسی پر مجھے اعتماد ہے اور میں اپنے معاملات میں اسی کی طرف رجوع

کرتا ہوں اور اپنی لغزشوں میں اسی کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔

خالق ارض وسماء

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ کا کیا مطلب ہے؟

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ {۱۱}الشوریٰ

جواب ترجمہ: وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے ہیں، اور مویشیوں کے بھی جوڑے بنائے ہیں۔ اسی ذریعے سے وہ تمہاری نسل چلاتا ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، سب کچھ دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کا اور زمین کا پیدا فرمانے والا ہے اس کی تخلیق میں کوئی بھی شریک نہیں ہے اور اس نے تم کو بھی پیدا فرمایا ہے تمہاری جانوں سے تمہارے جوڑے بنائے ہیں یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا سے لے کر آج تک جو نسلاً بعد نسل بنی آدم پیدا ہو رہے ہیں اور جو پیدا ہوں گے ان میں یہ سلسلہ رکھا ہے کہ مرد بھی پیدا فرمائے ہیں اور عورتیں بھی، مرد عورتوں کے جوڑے ہیں اور عورتیں مردوں کے، اسی طرح اس نے مویشیوں میں بھی کئی قسمیں پیدا فرمائیں اور ان میں بھی نر و مادہ پیدا کیے جن سے ان کی نسلیں چل رہی ہیں۔

یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ (وہ اس تخلیق کے ذریعے تمہاری تکثیر فرماتا ہے) اور اس کی قدرت سے تمہاری نسلیں چلتی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ اس کا معنیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ تمہیں پیدا کرتا ہے، یعنی رحم مادر میں، بعض اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ تمہیں پیدا کرتا ہے ماں کے پیٹ میں، زجاج تکثیر کا معنیٰ مراد لیتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں یعنی تمہیں پیدا کرتا ہے اور ماں کے رحم میں پرورش دیتا ہے اور بعض نے کہا فِیْہِ سے مراد ہے پیٹ میں، فراء اور ابن کیسان نے کہا ہے فِیْہِ بہ کے معنیٰ میں ہے اور اسی طرح زجاج کہتے ہیں یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ کا معنی ہے تمہیں اس کے ذریعہ بڑھاتا ہے یعنی تمہیں خاوند بیوی

جوڑے بنا کر بڑھاتا ہے کیونکہ بیویاں نسل کا سبب ہیں بعض نے کہا فِيْهِ میں "ھاء" جعل کے لیے ہے اور جعل اس پر دلالت کرتا ہے گویا کہ فرمایا وہ تمہیں پیدا کرتا ہے اور بنانے میں تمہیں زیادہ کرتا ہے۔ (انوار البیان)

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ: اللہ کی طرح کوئی بھی چیز نہیں ہے، خالق تعالیٰ شانہٗ کا وجود حقیقی ہے، وہ ہمیشہ سے ہے، جس کی کوئی ابتدا نہیں، وہ ہمیشہ رہے گا، جس کی کوئی انتہاء نہیں، وہ اپنی ذات اور صفات میں تنہا ہے، بے مثال ہے، اس کی ذات کی طرح کوئی ذات نہیں، اس کی صفات کی طرح کسی کی صفات نہیں، صفات کے اعتبار سے اگر کوئی لفظ کسی کے لیے بول دیا گیا ہے تو وہ محض اشتراک لفظی کے اعتبار سے ہے، حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بھی متوحد اور یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی متفرد ہے اور اپنے اسماء میں بھی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف تجسیم کی نسبت کرتے ہیں یا اس کے لیے مکان اور زمان اور جہت تجویز کرتے ہیں اور جو اسے تشبیہ اور تعطیل سے متصف کرتے ہیں وہ سب گمراہ ہیں خالق شانہٗ کی توحید کے منکر ہیں خالق اور مخلوق کی صفات میں کوئی مشابہت نہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس بات میں جو اعتقاد رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام بزرگی والا ہے اپنی عظمت و کبریائی اور مالکیت میں اور اپنے اسماء حسنیٰ میں اور اپنی صفات میں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوقات کے بالکل مشابہ نہیں ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے مشابہ ہے لہٰذا حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی مشابہت نہیں ہے کہ قدیم ذات کی صفات بلند ہیں اور بزرگی والی ہیں، بخلاف مخلوق کی صفات کے کیونکہ مخلوق کی صفات تو اغراض ہیں اور اعراض جدا نہیں ہو سکتیں اور اللہ تعالیٰ اعراض و اغراض سے منزہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات تو قدیم ہے۔

اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی حق ذات کا یہ ارشاد کافی ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ بعض محققین علماء نے کہا ہے توحید ایسی ذات کو یقین سے مان لینے کا نام ہے کہ جو ذات کسی اور ذات کے مشابہ نہیں ہے اور کسی صفت سے معطل ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے ایک اور بیان کا اضافہ کیا ہے کہتے ہیں اللہ کی ذات جیسی کوئی ذات نہیں ہے نہ اس کے نام جیسا کوئی نام ہے اور نہ اس کے فعل جیسا کوئی فعل ہے اور نہ اس کی صفت جیسی کوئی صفت ہے مگر صرف لفظی موافقت۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند ہے کہ اس میں کوئی صفت نئی پیدا شدہ ہو جیسا کہ یہ محال ہے کہ کسی فانی ذات کی کوئی قدیم صفت ہو یہ اہل حق اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔ (انوار البیان)

آسمان وزمین کی کنجیاں، رزق کی گتھیاں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۱۲} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اسی کے اختیار میں ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، وہ رزق بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہے اور کم کر دیتا ہے بیشک وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، جو ذات آسمانوں اور زمین کی خالق ہے اور جس کے قبضے میں موت وحیات کا سلسلہ ہے اور جس نے مخلوقات کے جوڑے پیدا کیے اور جس نے انسانوں کو اپنی قدرت اور حکمت سے پھیلایا کیا اس کے سوا کوئی اور ذات بھی ہو سکتی ہے جو آسمانوں اور زمین کی مالک اور حکمران ہو اور آسمانوں اور زمینوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے ہاتھ میں دے دی جائیں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی اور ذات کون سی ہو سکتی ہے، زمین کی حرکت اس کے قبضے میں ہے، سیارے اسی کے حکم سے چلتے ہیں، سورج اور چاند جیسے کُرّے اسی کے حکم کے پابند اور محو گردش ہیں، پانی اسی کی قدرت سے بہتا اور نباتات اسی کے حکم سے اگتی ہیں، بارشیں اسی کے حکم سے ہوتی ہیں، سمندر اسی کے حکم سے موتی اگلتا ہے اور ساحلوں پر بسنے والی مخلوق کو تازہ گوشت کی غذا بہم پہنچاتا ہے۔ (تدبر قرآن) اس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے رزق کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ: یہاں فرمایا جارہا ہے کہ وہ رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: بیشک وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے، کائنات میں کوئی تبدیلی اس کی قدرت اور علم کے بغیر نہیں ہوتی، جس کو وسیع رزق ملتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور جس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے وہ بھی اسی کی قدرت سے ہے، اس لیے امیدیں اسی سے باندھنی چاہئیں اور اسی کا ہمیشہ شکر ادا کرنا چاہیے، رزق تنگ ہو جائے تو کبھی یہ بدگمانی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو شاید اس کی خبر نہیں اور جس کو بے پایاں رزق مل رہا ہے اس کو بدمست نہیں ہونا چاہیے کہ شاید یہ میری بدمستی اللہ تعالیٰ کے علم میں نہیں، جو اس سے مانگتا رہے گا اس کے خزانے اس کے لیے کھل جائیں گے اور جو بدمست ہو جائے گا ایک نہ ایک دن اس کا عدل اس کی سزا کا باعث بن جائے گا۔ (تدبر قرآن)

امت محمدیہ پر انعام

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ {۱۳} الشوری.

جواب ترجمہ: اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ طے کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا، اور جو (اے پیغمبر) ہم نے تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم دین کو قائم کرو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ (پھر بھی) مشرکین کو وہ بات بہت گراں گزرتی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو کوئی اس سے لو لگاتا ہے اسے اپنے پاس پہنچا دیتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے جو انعام اس امت پر کیا ہے اس کا ذکر یہاں فرماتا ہے کہ تمہارے لئے جو شرع مقرر کی ہے وہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دنیا کے سب سے پہلے پیغمبر اور دنیا کے سب

سے آخری پیغمبر اور ان کے درمیان کے اولوالعزم پیغمبروں کی تھی۔

یہاں جن پانچ پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے انہی پانچ کا ذکر سورۃ احزاب میں بھی کیا گیا ہے فرمایا وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (الأحزاب:۷) اور جب ہم نے انبیاء کرام علیہم السلام سے ان کا پختہ عہد لیا اور آپ سے، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے، اور ان سے ہم نے سخت پختہ عہد لیا۔

وہ دین جو تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک طور پر ہے وہ اللہ واحد کی عبادت ہے جیسے اللہ جل وعلا کا فرمان ہے، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلا أَنَا فَاعْبُدُونِ (الانبیاء ۲۵) اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس میری ہی عبادت کرو۔

حدیث میں ہے ہم انبیاء علیہم السلام کی جماعت آپس میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں ہم سب کا دین ایک ہی ہے جیسے علاتی بھائیوں کا باپ ایک ہوتا ہے الغرض احکام شرع میں گو جزوی اختلاف ہو۔ لیکن اصولی طور پر دین ایک ہی ہے اور وہ توحید باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (الْمَائِدَة:۴۸) تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے شریعت وراہ بنادی ہے۔ یہاں اس وحی کی تفصیل یوں بیان ہو رہی ہے کہ دین کو قائم رکھو جماعت بندی کے ساتھ اتفاق سے رہو اختلاف اور پھوٹ نہ کرو پھر فرماتا ہے کہ یہی توحید کی صدائیں ان مشرکوں کو ناگوار گذرتی ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے جو مستحق ہدایت ہوتا ہے وہ رب کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ اس کا ہاتھ تھام کر ہدایت کے راستے لا کھڑا کرتا ہے اور جو از خود برے راستے کو اختیار کر لیتا ہے اور صاف راہ چھوڑ دیتا ہے اللہ بھی اس کے ماتھے پر ضلالت لکھ دیتا ہے۔

جب ان کے پاس حق آگیا حجت ان پر قائم ہو چکی۔ اس وقت وہ آپس میں ضد اور بحث کی بنا پر مختلف ہو گئے۔ اگر قیامت کا دن حساب کتاب اور جزا سزا کے لئے مقرر شدہ نہ ہوتا تو ان کے ہر بد عمل کی سزا انہیں یہیں مل جایا کرتی۔

استقامت اور عدل کا حکم، کفار سے بیزاری کا اعلان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ {۱۴} فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ {۱۵} وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ {۱۶} اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ {۱۷} يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ {۱۸} اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ {۱۹} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور یہ لوگ متفرق نہیں ہوئے مگر ضد اضدی میں اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آگیا، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے وقت متعین تک ایک بات پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور بلاشبہ ان کے بعد جنہیں کتاب دی گئی وہ اس کی طرف سے شک میں پڑے ہیں جو تردد میں ڈالنے والا ہے۔ سو آپ اس کی طرف بلایئے اور جیسا آپ کو حکم ہوا ہے مستقیم رہیے، اور ان کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجیے، اور آپ فرمایئے کہ اللہ نے جو کتابیں نازل فرمائیں میں ان پر ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا کہ تمہارے درمیان عدل رکھوں، اللہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی نہیں اللہ ہمیں اور تمہیں جمع فرمائے گا اور اسی کی طرف جانا ہے، اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد اس کی دعوت کو مان لیا گیا ہے ان کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل

ہے اور ان پر غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے، اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب کو اور میزان کو نازل فرمایا اور آپ کو کیا پتہ ہے عجب نہیں کہ قیامت قریب ہو، جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ اس کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے، خبردار اس میں شک نہیں کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ بندوں پر مہربان ہے وہ رزق دیتا ہے جسے چاہے اور وہ قوی ہے عزیز ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں نے اپنے دینوں میں تفریق کر کے اس وقت گروہ بندی کرلی جب ان کے پاس اس بات کا علم آچکا کہ جس بات کا اللہ نے ان کو حکم دیا ہے اور نوح علیہ السلام کو وہ چیز دے کر مبعوث فرمایا ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ دین حق کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ اندازی مت کرو۔

قتادہ رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر اس طرح نقل کی گئی ہے کہ تم اپنے آپ کو تفریق سے بچاؤ بیشک وہ ہلاکت کا باعث ہے اور **بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ** کا مطلب یہ ہے کہ حسد کی بنا پر اور عداوت کی وجہ سے دنیا کی طلب میں ایک دوسرے سے ضد اختیار کی۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ : اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اگر تیرے رب کی یہ بات سبقت نہ کر چکی ہوتی کہ وہ ان کو جلد عذاب نہ دے گا بلکہ ان کو وقت مقررہ تک کے لئے مؤخر کر دے گا اور یہ مقررہ اجل علماء کے بیان کے مطابق قیامت کا دن ہے، تو تیرا رب ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان ان کے حق میں فیصلہ کو نپٹا چکا ہوتا جس حق کے ساتھ اس نے اپنے پیغمبر نوح علیہ السلام کو بھیجا اس کے بعد کہ لوگوں نے اس بات کو جان لیا وہ فیصلہ یہ کہ اہل باطل کو ہلاک کر دے گا اور اہل حق کو ان پر غالب کر دے گا۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ : بیشک وہ لوگ جن کو اللہ نے ان اختلاف کرنے والوں کے بعد اپنی کتاب و توراۃ و انجیل عنائیت فرمائی وہ اس دین کے بارے میں

جس کی وصیت اس نے نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی اس نے آپ ﷺ کی طرف کی اور تم دونوں کو اس کے قائم کرنے کا حکم دیا وہ لوگ اس کے متعلق نہایت شک میں مبتلاء ہیں، سدی رحمہ اللہ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ سے یہود و نصاریٰ ہی مراد لیتے ہیں۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے میرے حبیب ﷺ جس دین کی آپ ﷺ کی طرف وحی کی اور نوح علیہ السلام کو اس کی وصیت کی اور وہ وہ دین آپ ﷺ کے لئے مقرر ہوا اس کی طرف آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو دعوت دیں اور اس پر عمل میں استقامت اختیار کریں اور اس سے ٹیڑھا پن مت اختیار کریں اور اس پر اسی طرح ثابت قدمی دکھایئے جیسا آپ ﷺ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اے میرے حبیب ﷺ حق میں شک کرنے والے لوگوں کی خواہشات پر مت چلیے یہ وہ حق ہے جس کو اللہ نے آپ ﷺ کے لیے مقرر کیا اور ان لوگوں کے لئے جو گزشتہ زمانوں میں کتاب کے وارث بنائے گئے کہ کہیں آپ ان کی اتباع میں اسی طرح شک نہ کرنے لگ جائیں جس طرح وہ شک میں مبتلاء ہیں۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اے میرے حبیب ﷺ آپ ﷺ ان سے یہ بات صاف کہہ دیں کہ اللہ نے جو کتاب بھی اتاری ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں خواہ کوئی ہو توراۃ ہو یا انجیل زبور ہو یا صحف ابراہیم علیہ السلام میں ان میں سے کسی کی بھی تکذیب نہیں کرتا جیسا تم میں سے بعض گروہ بعض کتابوں کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرتے ہیں۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ : اے میرے حبیب ﷺ آپ ﷺ ان سے اس طرح کہہ دیں کہ اے گروہو! مجھے تو میرے رب نے تمہارے مابین عدل کا حکم دیا ہے اور میں تمہارے درمیان اس حق کو لے کر چل رہا ہوں جس کا اس نے مجھے حکم دیا اور جس طرف دعوت دینے کے لئے مجھے مقرر فرمایا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کا یہ مطلب ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ کے پیغمبر ﷺ کو ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا چنانچہ آپ ﷺ وفات تک عدل کرتے رہے، عدل اللہ کی وہ میزان ہے جو زمین پر

اتاری گئی اور اسی کے ذریعے مظلوم ظالم سے اپنا حق لیتا ہے اور کمزور طاقت ور سے اور عدل کے ذریعے اللہ سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کرتے ہیں اور عدل کے ذریعے حد سے بڑھنے والے کو لوٹاتے اور توبیخ کرتے ہیں چنانچہ ہمیں بیان کیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام فرمایا کرتے تھے تین باتیں جس میں پائی جائیں وہ مجھے بہت پسند ہے ① وہ آدمی جو فاقہ اور مالداری میں میانہ روی اختیار کرنے والا ہو۔ ② دوسرا وہ شخص جو رضامندی اور غصہ میں عدل پر قائم رہے۔ ③ اور ظاہر و باطن میں جو شخص خشیت اختیار کرے اور تین باتیں جس میں ہوں وہ اس کے لئے مہلک ہیں ① وہ بخل کرے جس کی پیروی کی جائے ② ایسی خواہش کہ جس کے پیچھے بھاگا جائے۔ ③ خود پسندی اور چار باتیں ایسی ہیں جس کو وہ مل گئیں دنیا اور آخرت کی بھلائی اس کو مل گئی ① ذکر والی زبان ② شکر والا دل ③ صبر والا بدن ④ ایمان والی بیوی۔

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ : یعنی اللہ ہمارا مالک اور تمہارا مالک ہے اے اہل کتاب توراۃ و انجیل کے دعویدارو ہمیں ان اعمال کا ثواب ملے گا جو ہم نے کمائے ہیں اور تمہیں ان اعمال کا بدلہ ملے گا جو تم نے کمائے ہیں۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ : یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، مجاہد رحمہ اللہ سے، لاحجۃ کا معنیٰ لا خصومۃ نقل کیا گیا ہے یعنی کوئی جھگڑا نہیں، ابن زید رحمہ اللہ سے اس کا یہ معنیٰ نقل کیا گیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ : اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ہمیں جمع فرمائے گا اور حق کے ساتھ اس بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں ہم نے اختلاف کیا اور اسی ہی کی بارگاہ میں ہم نے موت کے بعد لوٹنا اور رجوع کرنا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ : اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ وہ لوگ جو اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑتے ہیں، وہ دین جس کو اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکر بھیجا ہے، اس کے بعد کہ لوگوں نے اس کو قبول کرلیا اور ان لوگوں میں سے بھی جو کتاب

کے وارث بنائے گئے، دین میں داخل ہو گئے تو ایسے لوگوں کا فضول جھگڑ ارب کے ہاں کچھ کام نہیں دے گا، اس آیت میں دَاحِضَةٌ کا لفظ ہے، یہ دَحَضَ سے بنا ہے، اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کا زائل ہونا اور پھسلنا، دَحَضَ بِرِجلِهِ کا معنی ہے، اس کا پیر پھسل گیا اور وَالشَّمسُ زَالَت کا معنی ہے: دھوپ زائل ہو گئی، وَالحُجَّةُ دُحُوضًا کا معنی ہے: دلیل باطل ہو گئی۔ (فیروزآبادی)

وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: اور ان پر اللہ کا غصہ ٹوٹے گا اور ان کے لئے آخرت میں سخت عذاب ہو گا اور وہ آگ کا عذاب ہے، مفسرین رحمہم اللہ نے بیان کیا کہ یہ آیت یہود کے اس گروہ کے بارے میں اتری جنہوں نے اپنے دین کے سلسلے میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا کیا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ گمراہ ہو جائیں اور اسلام سے دوبارہ کفر کی طرف پھر جائیں۔ قتادہ رحمہ اللہ سے اس کا مطلب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو کہتے تھے کہ ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے اور ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے ہے اس لیے ہم تم سے بہتر ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ جس نے اس کتاب کو یعنی قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان یعنی عدل کو اتارا تاکہ انصاف کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے اور اللہ کے حکم کے ساتھ ان میں فیصلہ کیا جائے جس کا اس نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ سے میزان کا معنیٰ عدل ہی نقل کیا گیا ہے، قتادہ سے بھی میزان کا معنیٰ عدل میں کیا گیا ہے۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ: کونسی چیز آپ لوگوں کو معلوم کرائے شاید کہ وہ گھڑی جس میں قیامت کا قیام ہو وہ قریب ہو مگر

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جلد آنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں جن کو اس کی آمد پر یقین نہیں، ان کا گمان یہ ہے کہ قیامت نہ آئیگی، رہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ: وہ لوگ جن کو قیامت کی آمد پر یقین ہے اور اس میں اللہ نے جمع ہونے کا وعدہ کیا ہے وہ لوگ اس کی آمد پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ اس کی

آمد سے ڈر رہے ہیں اور اس کے قیام پر خود خوف زدہ ہیں کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ان کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں اور ان لوگوں کو قیامت کی آمد پر حق الیقین ہے وہ اس کی آمد پر شک نہیں کرتے۔(جامع البیان)

اَلَآ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍۢ بَعِیْدٍ: ہاں وہ لوگ جو کہ ان کے ساتھ قیامت کے قائم ہونے میں جھگڑا اور مجادلہ کرتے ہیں وہ لوگ ہدایت کے رستے سے ہٹنے والے اور حق کے سیدھے رستے سے ٹیڑھا راستہ اختیار کرنے والے ہیں جو کہ صحیح راہ سے بہت دور ہے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں خبردار کر رہے ہیں کہ دلائل وبراہین قائم ہونے کے باوجود انکار پر اصرار کرنے والے دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ : اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ قوی ہے عزیز ہے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے نیک بندوں کو بھی کھلاتا ہے اور کفار وفجار کو بھی کھانے کی چیزیں دیتا ہے، کفار کی معصیت کی وجہ سے وہ اپنا رزق نہیں روکتا مہربانی کی یہ ایک صورت ہے اور اس کے علاوہ اس کی بہت سی مہربانیاں ہیں دنیا میں بھی ان کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی مہربانی کا مظاہرہ ہوگا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے لطیف کی تشریح کرتے ہوئے آٹھ دس معانی لکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تھوڑے عمل پر بہت زیادہ ثواب دیتا ہے اور ایک یہ ہے کہ اس نے طاقت سے زیادہ اعمال کا مکلف نہیں بنایا اور ایک یہ ہے کہ وہ سوال رد نہیں فرماتا اور امیدوار کو ناامید نہیں کرتا۔

وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ: وہ قوی ہے اور عزیز ہے، اس کی مہربانی اور دادودہش کو کوئی نہیں روک سکتا۔

آخرت کے طلب گار اور دنیا کے پرستار

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ {۲۰} الشوریٰ

جواب ترجمہ: جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرتا ہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کردیں گے اور جو شخص دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرتا ہے ہم اس میں سے اسے دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی بھی حصہ نہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ: حرث اصل میں زمین میں بیج ڈالنے کو کہا جاتا ہے، پھر اس کا استعمال اعمال کے ثمرہ اور نتیجہ میں ہونے لگا، یہاں مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اعمال کے ذریعے آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو ہم اسے آخرت میں ثواب دیں گے بلکہ اس میں اضافہ اور زیادتی کریں گے، اس کے اجر و ثواب میں اضافہ کرتے رہیں گے بلکہ سات سو گنا تک بڑھادیں گے، بلکہ اس سے بھی زیادہ کردیں گے، ہم اس کے لیے طاعات و خیرات کی راہوں میں آسانیاں کرتے رہیں گے۔

مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں ”اس آیت کریمہ میں آخرت کے طلب گاروں اور دنیاداروں کی نیتوں کا اور اعمال کا اور ان کا جو بدلہ ملے گا اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے یعنی دنیا میں ایمان سے متصف ہے اور اعمال صالحہ میں لگا رہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میرے اعمال کا آخرت میں ثواب دیا جائے اللہ تعالیٰ اسے بہت زیادہ ثواب دے گا ایک نیکی کی کم از کم دس نیکیاں تو لکھی ہی جاتی ہیں اور ایک نیکی کا عوض سات سو گنا دینے کا قرآن مجید میں ذکر ہے كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ سات سو گنا ثواب بتانے کے بعد وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ بھی فرمادیا

حضرت علماء کرام نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ نیکیوں میں اضافہ ہونا اور بڑھا چڑھا کر ان کا ثواب ملنا کوئی سات سو پر منحصر نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ دے گا جس کی تفصیلات احادیث شریف میں وارد ہوئی ہیں علم و عمل پھیلانے والوں اور دین کا چرچا کرنے والوں اور اعمال صالحہ کو آگے بڑھانے والوں کا ثواب تو بہت ہی زیادہ ہے، جب تک معلمین و مبلغین کے بتائے ہوئے اعمال اور پڑھائے ہوئے امور کے مطابق لوگ عمل کرتے رہیں گے۔

ان حضرات کو ان کے عمل کا بھی ثواب ملتا رہے گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں سے کچھ

بھی کمی نہ ہو گی جس طرح دانہ ڈالنے کے بعد کھیتی بڑھتی ہے اور ایک دانہ بونے سے بہت سے دانے حاصل ہو جاتے ہیں اسی طرح آخرت کے اعمال میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے آخرت کے لیے عمل کرنے والوں کے عمل کو آخرت کی کھیتی سے تعبیر فرمایا کہ یہ لوگ دنیا کے طالب ہیں دنیا ہی کو چاہتے ہیں اسی کے لیے عمل کرتے ہیں ہم انہیں دنیا میں سے کچھ دے دیں گے جتنا وہ چاہتے ہیں اتنا دیں یا اس سے کم و بیش دیں۔

بہر حال جو کچھ ملے گا تھوڑا ہی ہو گا آخرت کے اجر و ثواب کے مقابلے میں تو کسی دنیا دار کا بڑے سے بڑا حصہ پاسنگ کے درجہ میں بھی نہیں آسکتا جتنی بھی دنیا مل جائے تھوڑی ہی ہو گی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ طالب دنیا کو دنیا مل ہی جائے جو کچھ ملے گا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اور چونکہ اصلی دنیا دار مومن نہیں ہوئے اس لیے آخرت میں انہیں کچھ بھی نہیں ملنا۔ (انوار البیان)

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا: جو شخص دنیا کی کھیتی کا طلب گار ہو گا اسے دنیا میں سے کچھ نہ کچھ دے دیا جائے گا، جو شخص اپنے اعمال کے ذریعے دنیا کے مال و متاع کا طلب گار ہو گا، اس کا آخرت پر ایمان نہیں ہو گا تو ہم نے جو اس کی قسمت میں لکھا ہے اتنا اسے دنیا میں مل جائے گا، جس کا مقصد زندگی صرف دنیا ہو گا، ایسے شخص کے لیے آخرت کا ثواب نہیں ہو گا اور نہ ہی اس کے لیے آخرت کی نعمتیں ہوں گی۔

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ: طلب گار دنیا کی بد نصیبی کا یہ عالم ہو گا کہ عارضی اور فانی دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ اسے مل کر رہے گا، لیکن ہمیشہ ہمیش کی زندگانی، غیر متناہی زندگی جہاں گزارنی ہے وہاں وہ خائب و خاسر رہے گا، اسے آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فائز المرامی کے لیے کچھ ہاتھ نہ آئے گا، یہ وہ دنیا کے طالب ہیں جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں۔

معبودان باطلہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ {۲۱} الشوریٰ

جواب ترجمہ: کیا ان کے لیے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین میں وہ چیزیں مشروع کر دی ہیں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی، اگر فیصلہ کی بات طے شدہ نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور بلاشبہ ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کیا ان مشرکین کے لئے ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مزین کرکے بنایا ہو کہ جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی، جیسے شرک اوراللہ کی نافرمانی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ شرکاء سے مراد ان کے بت ہیں، ان کی طرف اس کی اضافت اس لیے کی گئی کیونکہ انہوں نے انہیں اللہ کا شریک بنایا تھا، ان کی طرف شرع کی نسبت واضافت کی گئی باوجودیکہ یہ جمادات ہیں، یہ نسبت مجازی ہے، کیونکہ یہی بت ان کی گمراہی کا سبب بنے تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ اے میرے رب بے شک انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔

اگر یہ اللہ کی طرف سے بات پہلے ملے نہ ہو چکی ہوتی کہ وہ ان کو دنیا کے اندر جلد عذاب نہ دے گا اور اس کی وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ: یہ بات اگر پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی کہ ان کی سزا قیامت تک کے لئے مؤخر کی جائیگی، تو اہل ایمان اور کافروں کے درمیان دنیا میں ہی فیصلہ کر دیا جاتا، کہ کافروں کو دردناک عذاب ملے گا جیسا اللہ نے فرمایا، کہ

وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ: اللہ کا انکار کرنے والے ظالموں کو قیامت کے دن دردناک عذاب سے دوچار ہونا ہوگا، کافروں کو اللہ کی طرف سے دیے جانے والے بہت سے عذابوں کا قرآن کریم میں ذکر موجود ہے، کہیں عذاب عظیم آیا ہے، کہیں عذاب مہین آیا ہے، کہیں عذاب غلیظ آیا ہے، کہیں جہنم کی دہکتی اور شعلہ زن آگ میں ہمیشہ رہنے کا ذکر آیا ہے، لیکن عذاب الیم ایسا عذاب ہے جس کا نام سنتے ہیں انسان پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے، انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے، سارے

عذابوں میں اوپر کے درجے کا عذاب یہی ہو گا جسے جگہ جگہ عذاب الیم سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا کہ یہ ایسا دردناک ہو گا کہ اسے بھی درد دیا گیا ہے۔

ظالموں اور اہل ایمان کا انجام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ {۲۲} الشوریٰ

جواب ترجمہ: آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے ڈر رہے ہوں گے حالانکہ وہ ان پر واقع ہو کر رہے گا، اور وہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ جنتوں کے باغیچوں میں ہوں گے وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہو گا یہ بڑا فضل ہے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ: اللہ اپنے حبیب ﷺ کو فرما رہے ہیں اے حبیب ﷺ آپ ﷺ اللہ کے منکروں کو قیامت کے دن اس حالت میں دیکھیں گے کہ دنیا میں کیے جانے والے خبیث اعمال پر اللہ کی سزا سے وہ لوگ خوفزدہ ہوں گے حالانکہ ان ڈرنے والوں پر وہ عذاب اترنے والا ہے اور انہوں نے بہر حال اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور امر و نہی میں دنیا میں وہ اس کے حکموں پر چلتے رہے وہ آخرت میں باغات میں ہوں گے، روضات یہ روضۃ کی جمع ہے یہ ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں نباتات کی کثرت ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا معنیٰ اس طرح نقل کیا گیا کہ وہ جنت کے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ جنت کے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ: اللہ تعالیٰ مؤمنوں، نیک اعمال کرنے والوں کو فرما رہے ہیں کہ انہیں ان کے رب کے ہاں وہ کچھ ملے گا جو ان کا من کرے گا اور جی چاہے گا۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ: یہاں اسم اشارہ کا مشار الیہ اہل ایمان کی نعمتوں والی حالت ہے، یعنی یہ

انعامات، یہ فیوضات، یہ کرامات، یہ عنایات، یہ جنتی باغات کی چھاؤں، یہ جنت کی بیش بہا نعمتیں، جنہیں دنیا میں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے ان کے چرچے سنے نہیں، کسی دل پر ان کا کھٹکا گزرا نہیں، جن نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندے، اپنے جنتی مہمان کو سرفراز فرمایا یہ بڑی نعمتیں ہیں، انہیں نعیم اکبر کہا جانا چاہیے یہ سب فضل عظیم و کبیر ہے۔

اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ {۲۳} الشوریٰ

جواب ترجمہ: یہ ہی ہے جس کی بشارت اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے آپ فرما دیجیے کہ میں اس پر تم سے کسی عوض کا سوال نہیں کرتا بجز رشتہ داری کی محبت کے۔ اور جو کوئی شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس کے لیے اس میں زیادہ خوبی کر دیں گے اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے قدر دان ہے۔

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: فرمایا یہ وہ اطلاع و خوشخبری ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ایمان اور اعمال صالحہ والے بندوں کو دیتے ہیں، کہ ان لوگوں کے لیے چاہے وہ مرد مومن اور مومنہ ہوں ان کے لیے بیش بہا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں

قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى: اللہ فرما رہے ہیں کہ اے میرے پیغمبر آپ ﷺ ان لوگوں کو کہہ دیں، جو قیامت کے سلسلے میں آپ کی قوم کے مشرک لوگ شک میں مبتلاء ہیں کہ میں اس حق پر جس کی میں تم کو دعوت دیتا ہوں اور وہ نصیحت جو میں تم کو کرتا ہوں اس پر تم سے کسی ثواب اور بدلے کی اور مالی عوض کہ جو تم کو ادا کرنا پڑے اس کا طلب گار نہیں، سوائے حق قرابت کے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ کی آیت کے اس حصہ میں مختلف آراء ہیں ① اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے اس قرابت کے حق کو جو تم پر بنتا ہے اسے اداء کرو اور میرے اور اپنے مابین صلہ رحمی کرو۔

ابو کریب رحمہ اللہ نے طاؤس رحمہ اللہ سے اس آیت کے متعلق ذکر کیا کہ اس کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا، ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد آل محمد کے قرابت دار ہیں، اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تو نے جواب میں جلد بازی کی، قریش کے تمام بطون میں جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری تھی یہ آیت اتری، قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہنے لگے کہ الا المودۃ سے مراد وہ قرابت داری ہے جو ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھی اس کو ملانے کا حکم دیا۔

علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق اس طرح سے تفسیر نقل کی کہ تمام قبائل قریش میں جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری تھی جب انہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے انکار کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو جب تم نے میری بیعت سے انکار کیا ہے تم میری قرابت کی حفاظت کرو اور کوئی عرب تم سے بڑھ کر میری حفاظت و نصرت کا حقدار نہیں۔

محمد بن سعد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو فرمایا کہ میں تمہارے مالوں میں سے کوئی چیز نہیں مانگتا لیکن میں تم سے یہ مطالبہ کرتا ہوں اس قرابت کی بنیاد پر جو میرے اور تمہارے درمیان ہے کہ مجھے دکھ مت دو تم میری قوم کے لوگ ہو تمہارا زیادہ حق ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری بات کو قبول کرو۔

ابن حمید رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں عظمت والے تھے ہر بطن قریش میں آپ کا نسبی تعلق تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں اپنی دعوت پر تم سے کوئی چیز نہیں مانگتا بس یہی چاہتا ہوں کہ تم میری قرابت کا لحاظ کر کے میری حفاظت کرو، قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کا یہی مطلب ہے۔

یعقوب رحمہ اللہ نے ابو مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں معزز نسب والے تھے قریش کا کوئی خاندان ایسا نہیں تھا کہ جس سے آپ کا نسبی تعلق نہ ہو تو اللہ نے فرمایا کہ آپ لوگوں سے یہ فرمائیں کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے اس حق قرابت کو ادا کرو جو میرا تم پر بنتا ہے اور میری حفاظت کرو۔

ابو حصین رحمہ اللہ، عبد اللہ بن احمد رحمہ اللہ نے ابو مالک رحمہ اللہ سے اس آیت کی یہ تفسیر ذکر کی ہے کہ جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ بنو زہرہ میں سے تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی بنو مخذوم میں سے تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری قرابت کے لحاظ سے تم میری حفاظت کرو۔

ابن المثنیٰ رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا کہ جناب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میری قرابت کو جانتے ہو اس لئے جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس میں میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو۔

بشر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اس قرآن پر کسی اجر کا مطالبہ نہ کریں، سوائے اس بات کے کہ وہ قرابت کے اعتبار سے آپ کے ساتھ صلہ رحمی کریں اور قریش کے تمام بطون میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی قرابت تھی۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ سے تفسیر آیت مروی ہے کہ قربیٰ سے مراد قریش ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم ہی میں سے ایک آدمی ہوں تم میرے دشمنوں کے خلاف میری اعانت کرو اور میری قرابت کی حفاظت کرو اور جو دین میں لیکر آیا ہوں اس کی دعوت پر میں تم سے کسی مالی اجر کا طلبگار نہیں سوائے اس کے کہ رشتہ داری کی محبت کا تم لحاظ کرو اور میرے دشمنوں کے خلاف تم میری معاونت کرو۔

دوسرا قول: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے پیروکار مسلمانوں کو کہہ دیں کہ میں اس دعوت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میری قرابت کا حق ادا کرو۔

محمد بن عمارہ رحمہ اللہ نے سدی رحمہ اللہ سے اور اس نے ابو دیلم رحمہ اللہ سے نقل کیا جب علی بن حسین رضی اللہ عنہما کو گرفتار کر کے لایا گیا اور ان کو دمشق کی سیڑھیوں پر کھڑا کیا گیا تو ایک شامی نے کہا کہ اس اللہ کا

شکر ہے کہ جس نے تم کو قتل کیا اور تمہاری جڑ کاٹ دی اور فتنہ کو منقطع کر دیا تو علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے اس کو کہا کیا تم نے قرآن پڑھا ہے اس نے کہا جی ہاں! انہوں نے کہا کہ کیا تم نے، آل حٰم، کو نہیں پڑھا اس نے کہا یہ نہیں پڑھا، قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى، اس نے کہا کیا تم وہی ہو انہوں نے جواب دیا جی ہاں۔

ابو کریب رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ انصار نے کہا کہ ہم نے یہ یہ کام کیے گویا انہوں نے فخر کیا تو ان کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یا عباس رضی اللہ عنہما نے (یہ عبد السلام نامی راوی کو شک ہے) نے کہا کہ ہمیں تم پر فضیلت حاصل ہے، انصار کیا تم ذلیل نہیں تھے اللہ نے میری وجہ سے تم کو عزت دے دی، تو انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم گمراہ نہیں تھے؟ پس اللہ نے میری وجہ سے تم کو ہدایت دے دی انہوں نے کہا جی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم کیا کہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کہو کہ کیا تمہاری قوم نے تمہیں نہیں نکالا؟ ہم نے تم کو ٹھکانا دیا کیا انہوں نے تمہاری تکذیب نہیں کی؟ ہم نے تمہاری تصدیق کی، کیا انہوں نے تمہیں بے یار و مدد گار نہیں چھوڑا پھر ہم نے تمہاری مدد کی۔

راوی کہتے ہیں کہ آپ یہ بات فرماتے رہے یہاں تک کہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارے مال اور جو کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ سب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حاضر ہے تو پھر یہ آیت اتری، قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

تیسرا قول: اس کا معنٰی یہ ہے کہ تم کہہ دو کہ اے لوگو جو کچھ میں لیکر آیا ہوں اس پر میں کچھ اجر طلب نہیں کرتا پس میں یہی چاہتا ہوں کہ اللہ سے محبت کرو اور نیک عمل اور اطاعت سے اس کا قرب حاصل کرو۔ چوتھا قول: اس کا معنٰی یہ ہے کہ اپنی قرابتداری کا لحاظ رکھو۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح قول اور ظاہر قرآن کے مطابق پہلا قول ہے کہ قرابت سے مراد قریش کی قرابت ہے کہ ان کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تمہارے ساتھ جو میری قرابت ہے

اس کی بناء پر مجھ سے محبت کرو اور میرے اور تمہارے درمیان جو رحم کا رشتہ ہے اس کے مطابق صلہ رحمی کرو۔

وجہ ترجیح : یہاں المودۃ کے بعد القربی پر فی داخل ہوا اگر اس سے آپ کے قرابت دار مراد ہوئے تو پھر اس کی تعبیر اس طرح ہوئی اِلَّا اَن تُؤَدُّوا قَرَابَتِی ، یا اس کا مطلب تقرب الی اللہ ہوتا تو پھر کلام میں فی کے آنے کا کوئی معنیٰ نہیں پھر تعبیر اس طرح ہوئی اِلَّا الْمَوَدَّةَ الْقُرْبٰی اگر اس سے مراد مودت رسول کا امر ہوتا تو پھر تعبیر یہ ہوئی اِلَّا الْمَوَدَّةَ الْقُرْبٰی اگر اس سے مراد تقرب الی اللہ ہوتا تو پھر اس کی تعبیر اِلَّا الْمَوَدَّةَ الْقُرْبٰی ہوتی فی نے داخل ہو کر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا معنیٰ یہ ہے اِلَّا مَوَدَّتِی فِی قُرَیش مِّنکُم یعنی میں بس اپنی محبت کا تم سے طلبگار ہوں جو میری تمہارے ساتھ قرابتداری کی وجہ سے ہے گویا اَلْمَوَدَّةُ کا الف لام وہ اضافت کے بدلہ میں آیا ہے جس طرح کہ اس آیت میں، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاوٰی، النازعات آیت نمبر ۴۱۔، الا یہاں مستثنیٰ منقطع ہے اور معنیٰ کلام کا اس طرح کہ تم کہہ دو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم سے قرابت میں محبت کا سوال کرتا ہوں۔ اس اَلْمَوَدَّةُ کا لفظ اس معنیٰ کے اعتبار سے منصوب ہے۔

شیخ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ”شیعہ نے اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ کہہ دیں میں تم سے اس قرآن کے بیان کرنے پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی مگر یہ کہ تم میرے اہل حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کرو، یہ میں تم سے سوال کرتا ہوں یعنی مَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کا معنی اہل بیت سے محبت کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ استدلال عقلاً نقلاً دونوں طرح باطل ہے۔

عقلاً اس لیے باطل ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اس وقت تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ہجرت کے تیسرے سال کے آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح ہوا رمضان ۴ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی اور ۵ھ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، تو جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے مکہ مکرمہ میں اس وقت تو حضرت حسن

رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وجود ہی نہیں ہے ان کے والدین کا نکاح ہی نہیں ہوا تو ہم کیسے مانیں کہ مَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کا معنی ہے کہ تم اہل بیت حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کرو۔

اور نقلاً اس لیے باطل ہے کہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا کہ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ یہ آیت اہل بیت سے محبت کے سلسلے میں ہے، فرمایا ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا ہاں! اتنی بات ہے کہ تم قرابت داری کا تو کچھ لحاظ کرو مجھے تکلیف نہ پہنچاؤ۔

تو آیت کریمہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے جو شیعہ نے نکالا ہے، باقی رہی محبت اہل بیت کے ساتھ تو اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے ساتھ محبت، ازواج مطہرات کے ساتھ محبت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت ضروری ہے، تو فرمایا تم میری بات مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی مگر صلہ رحمی کا دامن تو نہ چھوڑو۔ (ذخیرۃ الجنان)

مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”بعض علماء نے، اَلْمَوَدَّةُ فِي الْقُرْبٰى، سے رشتہ داروں سے محبت کیے ہیں اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں چاہتا ماسوا اس کے کہ میرے اہل بیت یعنی حضرت فاطمہ اور ان کی اولاد سے محبت کرو، یہ تفسیر اگرچہ بعض تابعین سے منقول ہے مگر آیت کی یہ تفسیر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے خصوصاً جب یہ آیت مکی ہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نہیں ہوا تھا کجا یہ کہ ان کے ہاں اولاد ہوتی اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس بلند مقام پر کھڑے ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے اس مقام پر سے یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو نبی کی شان سے گری ہوئی بات ہے، علاوہ ازیں قرآن مجید میں جس قدر انبیاء علیہم السلام کے قصے مذکور ہیں سب نے، اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ کا نعرہ لگایا ہے اور کسی نے بھی اپنے مخالفین سے ایسی عرض و گزارش نہیں کی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بلندی شان کے ساتھ یہ بات کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خدمت کے معاوضہ

میں قوم سے اپنی اولاد کی محبت و عظمت کے لیے کوئی درخواست نہیں کی، اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں کہ اپنی جگہ آل رسول مقبول ﷺ کی محبت و عظمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ایسا خیال کوئی بدبخت گمراہ ہی کر سکتا ہے۔

حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و محبت کا ساری کائنات سے زائد ہونا جزو ایمان بلکہ مدار ایمان ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ جس کو جس قدر نسبت قریبہ رسول اللہ ﷺ سے ہے اس کی تعظیم و محبت بھی اسی پیمانے سے واجب و لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کہ انسان کی صلبی اولاد کو سب سے زیادہ نسبت قربت حاصل ہے اس لیے ان کی محبت بلاشبہ جزو ایمان ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ متعدد قسم کی نسبتیں قربت اور قرابت کی حاصل ہیں ان کو فراموش کر دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حب اہل بیت و آل رسول ﷺ کا مسئلہ امت میں کبھی زیر اختلاف نہیں رہا، باجماع و اتفاق ان کی محبت و عظمت لازم ہے، اختلافات وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں دوسروں کی عظمتوں پر حملہ کیا جاتا ہے، ورنہ آل رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے عام سادات خواہ ان کا سلسلہ نسب کتنا ہی بعید بھی ہو، ان کی محبت و عظمت عین سعادت و اجر و ثواب ہے اور چونکہ بہت سے لوگ اس میں کوتاہی برتنے لگے، اسی لیے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے چند اشعار میں اس کی سخت مذمت فرمائی۔ وہ اشعار یہ ہیں اور در حقیقت یہی جمہور امت کا مسلک و مذہب ہے۔

يَا رَاكِبًا قِفْ بِالْمُحَصَّبِ مِنْ مِنًى ... وَاهْتِفْ بِسَاكِنِ خَيْفِهَا وَالنَّاهِضِ

سَحَرًا إِذَا فَاضَ الْحَجِيْجُ إِلَى مِنًى ... فَيْضًا كَمَا نَظْمِ الْفُرَاتِ الْفَائِضِ

إِنْ كَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ ..... فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ أَنِّي رَافِضِيٌّ

ترجمہ: یعنی اے شہ سوار، منیٰ کی وادی محصب کے قریب رک جاؤ، اور جب صبح کے وقت عازمین حج کا سیلاب ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح منیٰ کی طرف روانہ ہو تو اس علاقے کے ہر باشندے اور ہر راہ رو سے پکار کر یہ کہہ دو کہ اگر صرف آل محمد ﷺ کی محبت ہی کا نام رفض ہے تو اس کائنات

کے تمام جنات وانسان گواہ رہیں کہ میں بھی رافضی ہوں۔(معارف القرآن)

علامہ جاراللہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں ،پھران سے امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں چند روایات اھل بیت النبی ﷺ کی فضیلت میں نقل فرمائی ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ، مَاتَ شَهِيدًا، جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا وہ شہادت کی موت مرا۔ أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مَغْفُورًا لَهُ، خبر دار!جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت میں فوت ہوا اس کی بخشش کر دی گئی۔ أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ تَائِبًا، خبر دار!جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اس کی توبہ قبول کرلی گئی۔أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مُؤْمِنًا مُسْتَكْمِلَ الْإِيمَانِ، خبر دار! جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا وہ مومن فوت ہوا، اس حال میں فوت ہوا کہ اس کا ایمان مکمل تھا۔

أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ بَشَّرَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ بِالْجَنَّةِ ثُمَّ مُنْكَرٌ وَنَكِيرٌ، خبر دار!جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا اسے ملک الموت جنت کی خوشخبری دیتا ہے، پھر منکر نکیر فرشتے اسے جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ يُزَفُّ إِلَى الْجَنَّةِ كَمَا تُزَفُّ الْعَرُوسُ إِلَى بَيْتِ زَوْجِهَا، خبر دار!جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا اسے بناؤ سنگھار کے ساتھ جنت کی طرف لیجایا جاتا ہے جیسے دلہن کو اس کے خاوند کے گھر کی طرف لیجایا جاتا ہے۔ أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ فُتِحَ لَهُ فِي قَبْرِهِ بَابَانِ إِلَى الْجَنَّةِ، خبر دار!جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا اس کی قبر میں دو دروازے جنت کی طرف کھول دیے جاتے ہیں۔

أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ جَعَلَ اللهُ قَبْرَهُ مَزَارَ مَلَائِكَةِ الرَّحْمَةِ، خبر دار! جو شخص آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا اس کی قبر کو اللہ تعالیٰ رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ بنا دیتے ہیں۔ أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ عَلَى السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، خبر دار!جو شخص

آل محمد ﷺ کی محبت پر فوت ہوا وہ اہل سنت والجماعت کے طریقے پر فوت ہوا۔

أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَكْتُوبًا بَيْنَ عَيْنَيْهِ آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ، خبر دار! جو شخص آل محمد ﷺ کے بغض پر فوت ہوا وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان یہ لکھا ہو گا کہ "یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہے"۔

أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ كَافِرًا، خبر دار! جو شخص آل محمد ﷺ کے بغض پر فوت ہوا وہ کافر ہو کر مرا۔ أَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلَى بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ لَمْ يَشُمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ خبر دار! جو شخص آل محمد ﷺ کے بغض پر فوت ہوا وہ جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکے گا۔ (الکشاف، الکبیر)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آل محمد ﷺ وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ آپ ﷺ کے ساتھ متعلق ہے، ہر وہ شخص جس کے معاملات نبی کریم ﷺ کے ساتھ زیادہ سخت اور زیادہ کامل ہیں وہ آپ ﷺ کی آل میں شامل ہے، اس میں کوئی شک شبہ کی بات نہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان مراسم و تعلقات بہت زیادہ تھے، یہ بات تو نقل متواتر سے معلوم ہے، پس یہ بات ضروری ہے کہ وہ آپ ﷺ کے آل ہوں۔

لفظ آل کے مفہوم میں لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے، یہ کہا گیا کہ آل سے مراد آپ ﷺ کے اقارب ہیں، یہ بھی کہا گیا کہ آل سے مراد آپ ﷺ کی امت ہے، اگر ہم ان لوگوں کو قرابت پر محمول کریں تو بھی یہ آل ہیں، اگر ہم انہیں امت پر محمول کریں جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول فرمایا تو بھی یہ آل ہیں، ہر تقدیر کے اعتبار سے یہ آل ہیں، لیکن ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ لفظ آل کے تحت داخل ہیں اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔ (مفاتیح الغیب)

جب ہم بنظر انصاف دیکھتے اور پرکھتے ہیں تو ہمیں نبی کریم ﷺ کے بے شمار ارشادات ایسے ملتے ہیں جن میں حضر علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے، انہیں آپ ﷺ نے اپنے لیے ایسا قرار دیا تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام، آپ کی زوجہ جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، تاریخ اسلام اوراحادیث رسول ﷺ اس پر گواہ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي يُؤْذِينِي مَا يُؤْذِيهَا فاطمہ میرا ٹکڑا ہے، مجھے وہ چیز تکلیف دیتی ہے جو فاطمہ کو تکلیف دیتی ہے، اخبار متواترہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ علی رضی اللہ عنہ، فاطمہ رضی اللہ عنہا، حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے، یہ سب فضائل ان کے حق میں ثابت ہیں تو ایک مسلمان اور سنی کے لیے ان کی محبت ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔

ان پاکباز ہستیوں کو اہل بیت میں شامل کیا گیا، ان پر آپ ﷺ نے اپنی چادر ڈال کر فرمایا تھا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں، یہ آل رسول ہیں، آل رسول ﷺ کے فضائل امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے ہم نے نقل کر دیے ہیں، اہم ترین بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا درود شریف میں ذکر ہے، ہر نماز میں مسلمان آخری تشہد میں آل رسول پر درود شریف بھیجتا ہے۔

یہ خصوصیت جو اھل بیت رسول ﷺ کو حاصل ہے یہ ان کی انفرادی شان ہے، یہ مقام ان کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، سب کے کمالات واوصاف اپنی اپنی جگہ مسلمہ ہیں، مگر یہ تعظیم، توقیر اور شرف کہ نمازوں میں پیغمبر ﷺ پر درود شریف کے ساتھ ان کے اھل بیت پر درود شریف یہ شرف انہی ہستیوں کو ملا، یہ امت محمدیہ میں بلکہ ساری امتوں میں انہی کا خاصہ ہے اور خاصہ کسی چیز کا وہ ہوتا ہے جو کسی اور میں نہ پایا جائے۔

یہاں یہ بات بہت ہی مسرت انگیز ہے جو امام رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائی، وہ کہتے ہیں کہ مودت فی القربیٰ میں ایک عظیم منصب پایا جاتا ہے جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ تھے جنہیں السابقون کے لقب سے ملقب کیا گیا، پہلے پہل وہ لوگ مسلمان ہوئے، انہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں السابقون قرار دیا ہے، یہ سابقون اللہ تعالیٰ کے انتہائی قریبی ہیں، قرآن کریم کی سورہ الواقعہ میں کہا گیا کہ السابقون ہی اللہ کے مقربین ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب بن گیا، یوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مودت فی القربیٰ میں داخل ہو گئے، اس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ یہ آیت آل رسول

ﷺ کی محبت پر دلالت کرتی ہے، اصحاب رسول ﷺ کی محبت پر دلالت کرتی ہے، یہ مرتبہ اور مقام اللہ تعالیٰ نے اہل سنت والجماعت کو ہی نصیب فرمایا ہے کہ وہ ایک طرف عترت رسول ﷺ (آل رسول ﷺ) کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کے گن گاتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت تو اس فرمان رسول ﷺ کو بھی دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا کہ مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَ فِيهَا نَجَا میرے اہل بیت کی مثال سفینہ نوح کی ہے، جو اس پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا۔ اہل سنت اس فرمان نبوی ﷺ پر بھی بدل وجان ایمان رکھتے ہیں، جس میں فرمایا گیا کہ أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں، ان میں تم نے جس کی بھی پیروی کی تم نے ہدایت پالی۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ اس وقت دریائے تکلیف میں ہیں، ہمیں شبہات وشہوات کی موجوں نے گھیر رکھا ہے، دریا کے اس سوار کو دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک ایسی کشتی کی جو عیبوں اور سوراخوں سے محفوظ ہو، دوسری ایسے ستاروں کی جو دکھائی دے رہے ہوں، طلوع ہوں، تاباں ہوں، پھر جب یہ بندہ ایسی کشتی پر سوار ہو گا تو اس کی نگاہ ایسے ستاروں پر پڑے گی، پھر اسے اپنی سلامتی اور حفاظت کا یقین آئے گا، اسی طرح ہم اہل سنت والجماعت سفینہ حب آل محمد ﷺ پر سوار ہیں، جنہوں نے اپنی نگاہیں صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے ستاروں پر مرکوز کر رکھی ہیں، اس لیے اللہ کی ذات سے آس وامید ہے کہ سلامتی اور سعادت کے ساتھ دنیا وآخرت دونوں جہاں میں محفوظ رہیں گے۔

جن لوگوں نے اھل بیت النبی ﷺ اور اصحاب النبی ﷺ کے درمیان تفریق کی ہے، جنہوں نے خانہ ساز روایات کو سامنے رکھتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتبے اور مقام کو کم کرنے کی جسارت کی ہے انہی لوگوں نے امت میں خرابی پیدا کی ہے، ورنہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں ہی برگزیدہ طبقے ہیں، اہل سنت دونوں طبقوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا: یعنی جو آدمی کوئی نیکی کمائے اور وہ اس طرح کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جس میں وہ اللہ کی ایمان کے ساتھ اطاعت کرے تو فرمایا وہ خوبی اس کے عمل کو بڑھا دیگی اور ہم اس کو ایک کی بجائے دس اور جہاں تک چاہیں گے بدلہ دینگے۔ یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (مفاتیح الغیب) سدی رحمہ اللہ نے يَّقْتَرِفْ کو يَعمَلُ کے معنیٰ میں لیا ہے۔

یونس رحمہ اللہ نے اس آیت کا یہ معنیٰ کیا کہ جو آدمی کوئی بھلائی کرے گا ہم اس میں اضافہ کر دینگے اقترف عمل کو کہا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ: غفور کا معنیٰ گناہوں کو بخشنے والا اور شکور کا معنیٰ نیکیوں کو کئی گنا بڑھانے والا ہے، اللہ تعالیٰ غفور اس شخص کے لیے ہے جو توبہ تائب ہو اور شکور اس شخص کے لیے ہے جو اللہ کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں جاتا، اسی لیے تو وہ بہت سی سیئات کو معاف کر دیتا ہے، جو تھوڑی سی نیکیوں کو زیادہ کر دیتا ہے، نیکوکار کی نیکی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا اور قبول کرتا ہے، شکور شکر میں مبالغے کو کہا جاتا ہے، یہ اطاعت میں شمار کیا جاتا ہے اور اس پر بہت زیادہ اجر دیا جاتا ہے۔

کفار مکہ کا نبی کریم ﷺ پر الزام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ۬ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ {۲۴} الشوریٰ

جواب ترجمہ: کیا وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے سو اگر اللہ چاہے آپ کے دل پر مہر لگا دے، اور اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو اپنے کلمات کے ذریعہ ثابت کرتا ہے، بلاشبہ وہ سینوں کی چیزوں کا جاننے والا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: ان آیات میں ایسے معاندین و متکبرین کا ذکر ہے جو اپنے عناد

و تکبر میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ قبول حق تو درکنار وہ اللہ رب العزت پر افتراء و بہتان پر دازی سے بھی باز نہیں آتے، تو ان کے رد کے ساتھ یہ بیان کیا جارہا ہے، اللہ رب العزت یہی چاہتا ہے کہ حق اور باطل میں دنیا کے سامنے امتیاز کر دیا جائے اور دلائل حق کے ذریعہ باطل کو مٹا دیا جائے، اسی مقصد کے لیے بعثت انبیاء علیہم السلام ہے اور اسی غرض کے لیے کتابیں اور صحیفے نازل کیے گئے اور ان سب کی تکمیل رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے ذریعے کی گئی۔

ارشاد فرمایا گیا، یہ لوگ تو حق و صداقت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کیا کرتے بلکہ یہ لوگ تو آپ ﷺ کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے خدا پر جھوٹ و بہتان باندھا ہے کہ نبوت اور وحی الٰہی کا دعوی کر رہے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ کی زبان فیض ترجمان سے علوم و معارف خرق عادت کے طور پر معجزانہ انداز سے ظاہر اور جاری ہیں اور بطور خرق عادت معجزانہ شان سے ایسے علوم و معارف کا کسی زبان سے جاری ہونا یہ خود دلیل ہے کہ وہ اللہ کی وحی اور اس کی طرف سے عطا کردہ علوم ہیں اور یہ بھی بات ثابت ہے کہ بارگاہ خداوندی سے علوم و معارف کی عطا صرف صادق و برگزیدہ ہی کو ہو سکتی ہے۔

اس آیت میں افتراء اور کذب کے دو لفظ ہیں، افترا کا معنی ہے: اپنی طرف سے بات گھڑ کر کسی کی طرف منسوب کرنا اور کذب کا معنی ہے: خلاف واقعہ بات کو بیان کرنا خواہ کسی سے سن کر بیان کرے یا اپنی طرف سے گھڑ کر بیان کرے، کفار کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور آپ ﷺ قرآن مجید کی آیات تلاوت کر کے یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے، سو آپ ﷺ کا یہ کہنا جھوٹ ہے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا: پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ آپ ﷺ کے دل پر مہر لگا دے، یعنی اگر اللہ چاہتا تو آپ ﷺ کے دل پر ایسی مہر لگا دیتا کہ آپ ﷺ کسی چیز کا ادراک نہ کر سکتے، نہ کسی حرف یا لفظ کا تلفظ کر سکتے حتیٰ کہ آپ ﷺ کوئی بات نہ کر سکتے، پس اگر آپ ﷺ بالفرض اللہ پر افترا کرتے تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے دل پر ایسی مہر لگا دیتا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل پر ایسی مہر نہیں لگائی تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں باندھا اور کفار کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ (تبیان القرآن)

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ : جھوٹے اور افتراء پرداز پر باطنی علوم اور حکمتوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، تو اگر اللہ چاہے تو آپ ﷺ کے قلب پر مہر کر دے اور بند لگادے جس کے بعد ایسے شخص کی زبان سے علم و حکمت کی کوئی بات ہی جاری نہ ہو، مگر پھر بھی وحی الٰہی اور علوم و معارف کا یہ سلسلہ جاری رہنا آپ ﷺ کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں تین قول ہیں، ① حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو آپ ﷺ کے قلب پر مہر لگادے، جس کے باعث آپ ﷺ کو قرآن کریم بھلادے۔ ② حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مشرکین مکہ کی ایذاؤں اور تکالیف کے خلاف آپ ﷺ کے قلب اطہر پر صبر کا بند لگادے، جس سے آپ ﷺ کو ان کی زبانوں سے نکلنے والے اس جملے کہ ”اس نے جھوٹ گھڑ لیا ہے“ کی تکلیف نہ ہو۔ (زادالمسیر) ③ شیخ قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کافروں کے دلوں اور ان کی زبانوں پر مہر لگادے، انہیں دنیا میں ہی عذاب دے دے، تو یہاں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے مگر اس سے مراد کفار ہیں۔ (قرطبی)

شیخ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے اس جملے کی بہت ہی خوبصورت تفسیر فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے دل کو اس طرح محفوظ کر دیں کہ آپ ﷺ کے قلب اطہر میں ان لوگوں کی ایذا دینے والی اور تکلیف پہنچانے والی بات داخل ہی نہ ہو سکے۔ (بحر العلوم)

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ : اور اللہ تعالیٰ اسی طرح باطل کو مٹایا کرتا ہے اور حق کو ثابت و مضبوط کیا کرتا ہے اپنے کلمات و احکام سے جو دلائل شرعیہ سے بھی اور دلائل تکوینیہ و معجزات سے اس طرح ثابت کیے جاتے ہیں کہ کسی بھی منکر کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ رہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ : بیشک وہ پروردگار دلوں کی باتیں اور احوال بھی خوب جاننے والا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت سے کسی کے نہ اقوال و افعال مخفی ہیں اور نہ ہی عقائد وہ سب پر مطلع ہے اور اس پر سزا دینے کی بڑی قدرت رکھتا ہے۔

قبول توبہ، گناہوں کی معافی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ{۲۵} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور وہ ایسا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور برائیوں کو معاف فرماتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ: فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ یہ اس کے فضل و کرم سے ہوتا ہے، اس کا فضل و کرم ہوتا ہے تو وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، جبکہ وہ معاصی اور گناہوں سے پکی توبہ کریں، صدق، سچائی اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں، اس وقت سے پہلے پہلے توبہ کریں جس وقت توبہ قبول نہیں ہوا کرتی، حدیث شریف میں ہے کہ غرغرہ یعنی نزاع کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور احسان کے ساتھ اپنے بندوں کے چھوٹے بڑے وہ گناہ معاف فرما دیتا ہے جنہیں وہ معاف کرنا چاہتا ہے، بڑے گناہوں کی سزائیں بھی شریعت نے مقرر فرمائی ہیں۔

وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ: فرمایا کہ تم جو بھی کچھ عمل کرتے ہو وہ اسے جانتا ہے، اسے سچی توبہ کا بھی علم ہے اور صرف زبانی توبہ کو بھی جانتا ہے، وہ گھات لگائے ہوئے ہے، وہ باریک بین ہے، وہ تمام انسانی اعمال و حرکات و سکنات پر مطلع ہے، وہ نیکیاں کرنے پر اجر عظیم دے گا اور برائیاں کرنے پر سزا دے گا۔

اہل ایمان و اعمال صالحہ کی قبولیت دعا اور فضل مزید

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ{۲۶} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے ان کی دعا قبول فرماتا ہے اور اپنے فضل سے ان کے اعمال میں اضافہ فرماتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے، نیک اعمال میں یہ بھی داخل ہے کہ دعا کرنے والا حرام روزی سے بچتا ہو، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے اور نیک اعمال بجالانے والے بندوں کی نیکیوں پر انہیں ثواب بھی دیتا ہے۔

وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اہل ایمان کے اعمال میں اضافہ فرماتا ہے یعنی مختصر سے عمل کا بہت زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے اور ایک عمل کئی گنا کر کے خوب بڑھا چڑھا کر ثواب عطا فرماتا ہے، جو وہ لوگ اپنی دعاؤں میں اور اپنے اعمال کے ذریعے طلب کرتے ہیں وہ بھی انہیں دیا جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر بھی انہیں نوازا جاتا ہے۔

نکتہ: یہاں ایمان والوں اور نیک کام کرنے والوں کی دعا قبول کرنے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا گیا، اس کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر کی دعا قبول نہیں کرتے، اس میں ایک قول یہ بھی کیا گیا کہ اللہ کافر کی دعا بھی رد نہیں کرتے، کیونکہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر فرمایا پریشان حال کی دعا کون قبول کرتا ہے؟ جب وہ اس سے مانگتا ہے، اُس مقام پر مومن کا ذکر نہیں بلکہ مطلق پریشان حال بندے کا ذکر ہے، جس میں مسلمان اور کافر سبھی شامل ہیں، یہاں اہل ایمان اور نیکوکاروں کی دعا کی خصوصیت ذکر کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تخصیص علی سبیل التشریف ہے، ان کی عظمت اور بلندی مرتبہ کی وجہ سے، جب کہ کافر کے لیے قبولیت دعا علی سبیل الاستدراج ہے، یعنی اسے اس کی بداعمالیوں میں مزید ڈھیل اور چھوٹ دینے کے لیے۔

وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: فرمایا کہ کافروں کے لیے سخت عذاب ہے وہ دنیا کی زندگی سے دھوکہ نہ کھائیں اور آخرت کے عذاب سے ڈریں، انہیں جہنم میں ڈال کر عذاب دیا جائے گا، جو سخت ہوگا، جہنمیوں کو دوزخ میں دیے جانے والے عذاب کے بارے پڑھ کر انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

روزی فراخ نہ کرنے کی اہم وجہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ {۲۷} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی فراخ کر دے تو وہ زمین میں بغاوت کرنے لگیں اور لیکن وہ نازل فرماتا ہے ایک اندازہ کے ساتھ وہ جو چاہتا ہے، بلاشبہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے دیکھنے والا ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ: فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے خاص اندازہ کے مطابق رزق عطا فرماتا ہے اگر وہ بندوں کے لیے رزق کو پھیلا دے یعنی بہت زیادہ دے دے اور سبھی کو بہت زیادہ مال مل جائے تو زمین میں بغاوت کرنے لگیں، تکبر کرنے لگیں، زمین میں فساد پھیلانے لگیں، ایک دوسرے پر غلبے اور تسلط کے لیے کوششیں شروع کر دیں، رزق کی فراوانی کے باعث وہ دوسروں پر مسلط ہونے کی کوشش کریں، جیسے انسانی فطرت ہے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، وہ اپنی مشیت اور ارادے کے مطابق رزق اتارتا ہے۔

اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ: وہ اپنے بندوں کے تمام پوشیدہ و مخفی امور سے باخبر ہے، وہ سب کو باریک بینی سے دیکھ رہا ہے، اس نے ہر شخص کے لیے وہ مقدر کر رکھا ہے جو اس کے شایان شان ہے، کسی کو فقیر کر دیتا ہے اور کسی کو مالدار و غنی کر دیتا ہے، کسی سے فراوانی روک دیتا ہے اور کسی کو فراوانی عطا کرتا ہے، جس طرح اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے وہ ایسا کرتا چلا جاتا ہے، ورنہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ تین چیزوں کی کوئی انتہاء نہیں ہے ایک امن، دوسری صحت اور تیسری کفایت۔

کچھ لوگ زیادہ پیسے والے ہیں کچھ کم پیسے والے ہیں کچھ فقیر ہیں اور مسکین ہیں سب کو اس نے اپنی حکمت کے مطابق پیدا فرمایا ہے اور ہر ایک کو اپنی حکمت کے مطابق موجودہ حال میں رکھا ہے وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ (انوار البیان)

مایوسی کے بعد بارش کا نزول

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ {۲۸} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے ناامید ہونے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے، اور وہ ولی ہے مستحق حمد ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ: فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے لیے اس وقت بارش برساتا ہے جب وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں وہ بارش بھی برساتا ہے رحمت بھی پھیلاتا ہے بارش میں دیر ہوتی ہے تو بندے ناامید ہو جاتے ہیں اور جب بارش ہو جاتی ہے تو خوش ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت پھیل جاتی ہے اس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ زمین پر بارش برساتا ہے، جو خشک سالی میں بندوں کی ضروریات پوری کرتی ہے، اگرچہ بارش کے لیے جس طرح لفظ غیث استعمال ہوتا ہے اسی طرح لفظ مطر بھی استعمال ہوتا ہے، مگر یہاں اس میں خاص نکتہ ہے اللہ نے غیث کا لفظ استعمال فرمایا، جس سے مقصود بندوں کو فائدہ پہنچانا ہے، ورنہ مطر کے نزول میں کبھی کبھار نقصان بھی ہو جاتا ہے، فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، کوہستانی زمینوں میں پھسلن کے ساتھ ساتھ لینڈ سلائیڈنگ ہو جاتی ہے، انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں، جہاں کچے مکانات ہیں وہ بارش کی وجہ سے ڈھے جاتے ہیں، جو انسان نے ایک ایک پائی پیسہ جمع کر کے مشکل سے تعمیر کیے ہوتے ہیں، جس طرح ایک چڑیا اپنے گھونسلے کے لیے تنکا تنکا دور دراز سے لاتی اور اپنا آشیانہ بناتی ہے انسان کو بھی اس سے کہیں زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے، وہ بارش کے پانی سے گر جاتا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا: نکتہ: یہاں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بارش اتارتا ہے جب اس کے بندے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، مایوسی کی قید کیوں لگائی گئی؟ حالانکہ مایوسی کے بغیر بھی بارش کا نزول ہوتا ہے، اس میں یہ نکتہ ہے کہ بندے کو کمال نعمت یاد آئے، کیونکہ مایوسی کے بعد کسی نعمت

کاملنا یہ بہت زیادہ خوشی، مسرت اور شادمانی کا سبب ہوتا ہے، اس میں زیادہ شکر کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ: اللہ اپنی رحمت پھیلاتا ہے یعنی بارش کی برکات اوراس کے منافع ہر چیز میں ظاہر فرماتا ہے، کھیت وکھلیان ہوں، پہاڑ وصحراہوں، شہر ودیہات ہوں، اس بارش سے انسانی چہرے کھل کھلانے لگتے ہیں، لہلہاتی فصلوں پر نکھار آتا ہے، نباتات کو فائدہ پہنچتا ہے، حیوانات کو فائدہ پہنچتا ہے۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں بارش جیسی نعمت کا ذکر کیا ہے، جب کہ اس کی بیش بہا نعمتیں اور بھی ہیں، ان کا ذکر نہیں کیا، اس میں نکتہ یہ ہے کہ بارش اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جس میں لوگ متفق الرائے ہیں، ان میں بارش کے نعمت خداوندی ہونے میں اختلاف نہیں ہے، کیونکہ بارش ہی انسانی زندگی کا سبب ہے، اسی کے ذریعے انسانی زندگی اوران کے جانوروں کی زندگی کا دارومدار ہے، لوگوں کے لیے خالص غذا اسی سے تیار ہوتی ہے، جانوروں کی خوراک وغذا اسی سے تیار ہوتی ہے۔

وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ: اللہ تعالیٰ ولی ہے کارساز ہے، مخلوق کی حاجتیں پوری فرماتا ہے اور اس کے سارے افعال لائق ستائش ہیں وہ بہر حال تعریف کا مستحق ہے۔

قدرت کی نشانیاں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں کا اور زمین کا پیدا فرمانا، اور ان جانوروں کا پیدا فرمانا جو اس نے ان دونوں میں پھیلا دیئے ہیں، اور وہ ان کے جمع کرنے پر جب چاہے قادر ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آسمانوں اور زمینوں میں پھیلی ہوئی رنگارنگ مخلوقات، انفسی اور آفاقی نشانیاں یہ سب عجائب وغرائب قدرت میں سے ہے، آسمانوں کی بلندی اور زمینوں کی پستی یہ سب ہی چیزیں ایک کاریگر، ایک صانع کا پتہ دیتی ہیں، یہ سب کچھ اس کی عظمت شان پر دلیل ہے۔

وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ: آسمان اور زمین کے اندر جو جاندار چیزیں پیدا فرمائی اور پھیلائی ہیں ان کو وجود بخشنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیوں میں سے ہے، زمین کی پشت پر رینگ کر چلنے والی مخلوق دکھائی دیتی ہے، فضاؤں میں ہوا کے دوش پر اڑتے پرندے دکھائی دیتے ہیں، اب تو پرندے کیا انسان بھی ٹنوں کے حساب سے بنے ہوئے جہازوں میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں پہنچ جاتے ہیں، جنات بھی انہی فضاؤں میں رواں دواں ہیں، ملائکہ کی راہیں بھی یہی فضائیں ہیں، آسمانوں سے اترتے ہیں اور زمین پر پھیل جاتے ہیں، ہوائی جہازوں میں سوار انسانوں کے کاندھوں پر بھی یہ ملائکہ موجود ہیں، کالے رنگ کے پتھر پر کالے رنگ کی چیونٹی اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی مخلوقات کا وجود یہ سب اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ: آسمانوں اور زمین میں پھیلی ہوئی ان نشانیوں کے بارے میں کوئی یہ مت سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو کیسے جمع کرے گا، اللہ جب چاہتا ہے سب کو جمع کر دیتا ہے اور جمع کر دے گا، اس کے لیے رنگا رنگ پھیلی ہوئی ان چیزوں کو جمع کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب بکھرے ہوؤں کو میدان محشر میں جمع کرے گا۔

اہل ایمان کو پہنچنے والی مصیبت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ {۳۰} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے اور بہت سے کاموں سے تو وہ درگزر ہی کرتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: فرمایا کہ تم سے جس کسی کو جو بھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر گناہ پر تکلیف نہیں بھیجتا اگر ہر گناہ کی وجہ سے مصیبت بھیجی جائے تو ہو سکتا ہے کہ آرام و راحت کا نمبر ہی نہ آئے بہت سے گناہوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرماتا ہے لہٰذا ان کی وجہ سے کوئی مصیبت نہیں آتی۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی بھی بندہ کو کوئی ذرا سی تکلیف یا بڑی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے وہ ان گناہوں سے زیادہ ہوتے ہیں جن پر مواخذہ ہوتا ہے۔ (رواہ الترمذی)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مومن مرد اور مومن عورت کو جان و مال اور اولاد میں تکلیف پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ جب وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اس کا کوئی گناہ بھی باقی نہ ہو گا۔ (رواہ الترمذی)

معلوم ہوا کہ اہل ایمان پر جو تکلیفیں آتی ہیں ان سے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے کیونکہ آخرت میں گناہوں پر جو عذاب ہے وہ بہت سخت ہے دنیا میں جو تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں وہ معمولی چیزیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے لیے کوئی بلند مرتبہ دینے کا فیصلہ فرما دیتا ہے لیکن وہ اپنے عمل سے اس مرتبہ تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے تکلیف میں مبتلا فرما دیتا ہے یہ تکلیف اس کے مال جان اور اولاد میں پہنچ جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس پر صبر عطا فرما دیتا ہے یہاں تک کہ اس مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے لیے پہلے سے مقرر کر دیا گیا تھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ۱۲۸ از احمد و ابو داؤد بحوالہ تفسیر انوار البیان)

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ مصائب و آلام پر یہاں بہت سی روایات لائے ہیں عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان پر جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، حتیٰ کہ اس کانٹے سے جو اس کو چبھتا ہے۔ (بخاری، مسلم، نسائی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے، خواہ وہ تھکاوٹ ہو یا مرض ہو یا فکر ہو یا غم ہو یا اذیت ہو یا پریشانی ہو یا اس کو کوئی کانٹا چبھا ہو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس آیت کی خبر دوں جو اللہ کی کتاب میں سب سے افضل

ہے، ہمیں رسول اللہ ﷺ نے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (الشوریٰ:۳۰) کی تفسیر میں یہ بتایا: اے علی! تم پر جو بیماری آتی ہے یا کوئی سزا ملتی ہے، یا دنیا میں کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ کریم ہے کہ وہ تم کو دوبارہ پھر آخرت میں سزا دے اور اللہ تعالیٰ نے جس گناہ کو دنیا میں معاف فرمادیا تو اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ حلیم ہے کہ وہ معاف کرنے کے بعد دوبارہ سزا دے۔ (مسند احمد، مسند ابویعلیٰ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندے کے گناہ زیادہ ہوں اور اس کے ایسے اعمال نہ ہوں جن سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہوسکے تو اللہ عزوجل اس کو غم میں مبتلا کردیتا ہے تاکہ وہ غم اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔ (مسند احمد، مسند البزار)

حسن بصری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوگئے، انہوں نے کہا: میرا یہی گمان ہے کہ بیماری میرے کسی گناہ کے سبب سے ہے اور جن گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف کردیتا ہے وہ بہت ہیں اور پھر یہ آیت تلاوت کی: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ:۳۰) (شعب الایمان للبیہقی)

ربیع بن زیاد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: کتاب اللہ میں ایک آیت ہے جس نے مجھ کو غم زدہ کردیا، انہوں نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے؟ میں نے کہا: وہ یہ ہے: من یعمل سوءا یجز بہ۔ (النساء:۱۲۳) جس شخص نے کوئی بُرا کام کیا اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔

انہوں نے کہا: میں تم کو فقیہ سمجھتا تھا، بیشک مومن پر جو مصیبت بھی آتی ہے خواہ اس کا قدم پھسلے یا اس کو کوئی پریشانی ہو یا اسے کسی لکڑی سے خراش آئے، وہ اس کے کسی نہ کسی گناہ کے سبب آتی ہے اور جن گناہوں کو اللہ تعالیٰ ویسے ہی معاف فرمادیتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ الاٰیہ کی تفسیر میں کہا: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی ﷺ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ ابن آدم کو جب بھی کسی لکڑی سے خراش آئے یا اس کا قدم پھسلے یا اس کو کوئی پریشانی ہو تو وہ اس کے کسی گناہ کے سبب سے ہوتی ہے اور جن گناہوں کو

اللہ تعالیٰ ویسے ہی معاف فرما دیتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔(شعب الایمان للبیہقی، المرض والکفارات لابن ابی الدنیا، کتاب الزہد)

حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ایک فاحشہ عورت تھی، اس کے پاس سے ایک مرد گزرا، اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس عورت نے کہا کہ چھوڑو، بیشک اللہ تعالیٰ شرک کو لے گیا اور اسلام کو لے آیا، اس شخص نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور پیٹھ موڑ کر چل دیا اور مڑ کر اس کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ اس کا چہرہ دیوار سے ٹکرا گیا، پھر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر اس واقعہ کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا: تم وہ بندے ہو جس کے ساتھ اللہ نے خیر کا ارادہ کیا ہے اور بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کے گناہ کی سزا جلدی دیتا ہے اور جب وہ کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ کو قائم رکھتا ہے، حتیٰ کہ قیامت کے دن اس کو اس کی پوری سزا دیتا ہے۔(شعب الایمان، ابن حبان، الاسماء والصفات)

صاحب انوار البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یاد رہے کہ وَمَا اَصَابَكُمْ میں جو خطاب ہے یہ عام مومنین سے ہے لہٰذا یہ اشکال پیدا نہیں ہوتا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تو معصوم تھے ان پر تکلیفیں کیوں آئیں ان حضرات کو جو تکلیفیں پہنچیں گناہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ رفع درجات کی وجہ سے پہنچیں۔ (انوار البیان)

گناہ کی سزا سے بچا نہیں جا سکتا

جواب اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ {۳۱} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور تم زمین میں عاجز بنانے والے نہیں ہو، اور تمہارے لیے اللہ کے سواء کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے انسانو! تم اپنے آپ کو اپنے رب سے بچا نہیں سکتے ہو، اس گناہ کی سزا سے تم بچ نہیں سکتے ہو جس کا تم نے ارتکاب کیا اور اس کا سزا دینے کا ارادہ ہو، اسی طرح اس

کو تھکا کر زمین میں کہیں بھاگ جاؤ اس سزا سے بچنے کے لئے جو تمہاری معصیت کی وجہ سے تمہیں مل رہی ہو، یہاں تک کہ تم پر اس کو قدرت نہ رہے ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ تم جہاں بھی ہو اس کے قبضہ میں ہو اور اس کی مشیت تم پر جاری ہونے والی ہے اور تمہارا کوئی دوست نہیں جو تم سے دوستی کرتے ہوئے اس کو روک سکے جبکہ اللہ تم کو تمہارے گناہ پر سزا کا ارادہ فرمالے اور نہ تمہارا کوئی اس کے سوا مددگار ہے کہ جب وہ تم کو سزا دے تو اس سے بچانے میں وہ تمہاری مدد کرے یا اس سے انتقام لے پس تم اس کی نافرمانیوں سے بچتے رہو اور جس بات کا اس نے تم کو حکم دیا یا روکا ہے اس میں اس کی مخالفت سے بچو کیونکہ اس کی سزا کو کوئی روک نہیں سکتا جس پر اس کی سزا اتر پڑے۔

سمندری جہاز، کشتیاں، اللہ کی نشانیاں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ {۳۲}اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ {۳۳} اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ {۳۴}الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے کشتیاں ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح ہیں، اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے، سو یہ کشتیاں سمندر کی پشت پر رکی ہوئی رہ جائیں، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے۔ یا وہ انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے ہلاک فرمادے، اور بہت سوں کو معاف کردے۔

خلاصہ تفسیر: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود پر ایک اور نشانی ذکر کی ہے جو اس کے قادر و حکیم ہونے پر دلالت کرتی ہے اور وہ پہاڑ جیسے بڑے بڑے جہازوں کا سمندر میں تیرنا ہے جن میں خوراک اور دیگر سامان لادا ہوتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ: الجوار: جاریۃ کی جمع ہے بمعنی کشتی، اسے جاریۃ اس لیے کہتے ہیں چونکہ کشتی بھی سطح سمندر پر جاری رہتی ہے، الاعلام: علم کی جمع ہے، بلند و بالا پہاڑ کو کہا جاتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت باہرہ اور سلطنت عظیمہ پر دلالت کرنے والی علامات میں سے ایک پہاڑوں جیسے جہازوں کا سطح سمندر پر چلنا ہے، جو اپنی ضخامت اور حجم کے ساتھ تیرتے رہتے ہیں۔

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ: اگر اللہ چاہے ہواؤں کو روک دے پھر یہ جہاز ساکن ہو کر رہ جائیں، ایک جگہ سے ہلنے نہ پائیں۔ رواکد: رکی ہوئی، ٹھہری ہوئی، رکد الماء سے ہے، رکا ہوا پانی۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ : ان جہازوں اور کشتیوں کے چلنے میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں ہر اس مؤمن شخص کے لیے جو سختیوں میں صبر کرنے والا ہوتا ہے اور آسودہ حالی میں اللہ کا شکر ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی آزمائشوں اور بلاؤں پر زیادہ صبر کرنے والا اور عطایا پر زیادہ شکر کرنے والا۔

بحری جہاز قدرت باری تعالیٰ کے عظیم دلائل میں سے ہے، ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: سمندر میں چلنے والے جہازوں کا ذکر اس لیے کیا گیا چونکہ ان میں قدرت خداوندی کے عظیم دلائل ہیں، چنانچہ پانی جسم لطیف رکھتا ہے اس میں معمولی سی ثقیل چیز بھی ڈوب جاتی ہے، جب کہ بحری جہاز اپنے اوپر بھاری اور ثقیل چیزیں اٹھائے ہوتا ہے، اللہ نے پانی میں ایسی طاقت رکھ دی ہے جو اسے اپنی سطح پر اٹھائے رکھتا ہے اور ڈوبنے سے روکے رکھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کو جہازوں کے چلنے کا سبب بنا دیا ہے، جب جہازوں کو روکنا چاہتا ہے ہوا کو روک دیتا ہے اور جہاز اپنی جگہ سے ہلنے نہیں پاتا۔ (البحر المحیط ج ۷ ص ۵۰۲)

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ: یوبقھن: وہ انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے ہواؤں کو تند و تیز آندھیوں میں بدل دے جو ان جہازوں کو پانی میں غرق کر کے رکھ دیں اور ان جہازوں میں سوار لوگوں کو بھی سمندر برد کر دیں بسبب اس کے کہ جو انہوں نے گناہ کر رکھے ہیں۔

وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ: بہت سارے گناہوں کو اللہ تعالیٰ درگزر کر دیتا ہے اور انسانوں کو نجات دے دیتا ہے اور ہلاکت سے بچ جاتے ہیں۔

آیات الٰہیہ میں مجادلہ کرنیوالوں کی کوئی جائے پناہ نہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ {۳۵} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور وہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو ہماری آیات میں جھگڑتے ہیں ان کے لیے کوئی بھی بچنے کی جگہ نہیں ہے۔

خلاصہ تفسیر: اور اس لیے تاکہ ان کفار کو علم ہو جائے جو باطل کے سہارے اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی ٹھکانا اور پناہ گاہ نہیں اور اللہ کے عذاب سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔ محیص: بھاگنے کی جگہ عذاب سے چھٹکارا۔

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی تاکہ کفار جب سمندر کے بیچوں بیچ ہوں اور چاروں طرف سے تیز ہواؤں نے انہیں گھیر رکھا ہو تو اس وقت انہیں معلوم ہو جائے کہ اب ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں اور اللہ کے سوا انہیں ہلاکت سے کوئی بچانے والا نہیں۔ یوں انجام کار تاکہ وہ خالص اللہ کی عبادت کریں۔ (القرطبی)

اہل ایمان کے اوصاف جمیلہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ {۳۶} وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ {۳۷} وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ {۳۸} وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ {۳۹} وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ {۴۰} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور تم کو جو بھی چیز دی گئی ہے سو وہ دنیاوالی زندگی کا سامان ہے، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جو کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آجائے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے رب کے حکم کو مانا اور نماز قائم کی اور ان کے کام آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو وہ اپنا دفاع کرتے ہیں۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اے لوگو! تمہیں دنیا کی نعمتوں اور رونقوں میں سے جو کچھ دیا گیا ہے تو یہ نعمتیں اور رونقیں ختم ہو جانے والی ہیں تم اپنی زندگی تک ان سے نفع اٹھا سکتے ہو پھر ختم۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى: اللہ تعالیٰ کے پاس جو ثواب اور نعمتیں ہیں وہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بدرجہا افضل ہیں چونکہ آخرت کی نعمتیں دائمی اور غیر منقطع ہیں، لہٰذا تم فانی چیز کو دائمی چیز پر فوقیت مت دو۔

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ سب نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کریں اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش رہیں۔

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ: یہی وہ مؤمنین ہیں جو کبیرہ گناہوں سے دور رہتے ہیں جیسے شرک، قتل، والدین کی نافرمانی وغیرہ۔ الفواحش: فاحشۃ کی جمع ہے، ایسا گناہ جس کی قباحت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی ہو، جیسے زنا، قتل شرک وغیرہا۔ والفواحش: ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: فواحش سے مراد زنا ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ: اور جب انہیں کسی پر غصہ آتا ہے تو وہ اسے درگزر کر دیتے ہیں۔ صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: غصہ کے وقت معاف کر دینا اور بردباری سے کام لینا مکارم اخلاق میں سے ہے،

لیکن شرط یہ ہے کہ حلم و برداشت مروت میں مخل نہ ہو اور وہاں غصہ واجب بھی نہ ہو، جیسے مثلاً اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ حدود کو توڑا جارہا ہو تو ایسی جگہ غصہ کرنا واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ جس شخص کو غصہ دلایا جائے اور اسے غصہ نہ آئے تو وہ گدھا ہے انسان نہیں۔ شاعر کہتا ہے :

وَحِلمُ الفَتیٰ فِی غَیرِ مَوضِعِهٖ جَهلٌ نوجوان کا غیر مقام میں غصہ کرنا جہالت ہے۔ (الصاوی)

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ: جو لوگ اپنے پروردگار کی دعوت قبول کرتے ہیں یعنی توحید و ایمان قبول کرتے ہیں، بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت ایمان دی جو انہوں نے بخوشی قبول کرلی۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور وہ آداب و شرائط کا لحاظ رکھ کر نماز ادا کرتے ہیں اور اوقات پر نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ: اور وہ اپنے معاملات کے بارے میں آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے، وہ دین و دنیا کے کسی بھی کام پر مشاورت کے بعد ہی حتمی قدم اٹھاتے ہیں۔ مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے دین کا ہو یا دنیا کا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہمات امور میں برابر اصحاب رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں مشورہ کرتے تھے حروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مسائل و احکام کی نسبت بھی، بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی، یہ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت ان کاموں میں ہے جو مہتم بالشان ہوں اور جو قرآن و سنت میں منصوص نہ ہوں، جو چیز منصوص ہو اس میں رائے و مشورہ کے کوئی معنی نہیں اور ہر چھوٹے بڑے کام میں اگر مشورہ ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل و عابد ہو، ورنہ اس کی بیوقوفی یا بددیانتی سے کام خراب ہو جانے کا اندیشہ رہے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہے وہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی طرف سے اسے عطا کیا گیا ہے، اس کا اپنا کچھ نہیں ہے، اس لیے اس مال سے صدقہ کرتا رہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ: جو آدمی ان پر ظلم وزیادتی کرتا ہے اس سے انتقام لیتے ہیں، ظلم کے آگے سر نہیں جھکا لیتے، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ اپنے آپ کو زیر دست کسی کے سامنے کرنے کو ناپسند کرتے ہیں، تاکہ فساق وفجار ان پر جری نہ ہو جائیں۔ (القرطبی)

ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: مؤمنین کے اور فضائل بیان ہوئے اور یہ ان کا وصف شجاعت ہے، یہ وصف معاف اور درگزر کرنے کے وصف کے منافی نہیں ہے چونکہ یہ اپنے مقام پر ہے اور وہ اپنے مقام پر ہر وصف اپنے مقام پر محمود ہے۔ (ابو السعود)

نکتہ: یہاں ان کی بدلہ لینے پر تعریف کی گئی ہے کیونکہ جس نے بدلہ لیا اور حق لیا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حد سے تجاوز نہ کیا اگر وہ ولی دم تھا تو اس نے قتل میں اسراف نہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمان بردار ہے اور ہر مطیع قابل تعریف ہے

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا: ظلم وزیادتی کا بدلہ یہ ہے کہ انتقام کا ہم مثل ہونا واجب ہے، انتقام میں زیادتی نہ ہو، برائی کو سیئہ کہا جاتا ہے چونکہ برائی کے مرتکب پر ناگواری ہوتی ہے۔ (ابن کثیر) اگر کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے تو مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اتنی ہی تکلیف ظالم کو پہنچا دے جتنی اس نے پہنچائی تھی لیکن آگے اس بات کی بڑی فضیلت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ انسان بدلہ لینے کے بجائے صبر کرکے معاف کر دے۔ (توضیح القرآن)

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ: جس نے ظلم کو معاف کر دیا اور اس نے اپنے دشمن کے ساتھ صلح کر دی اللہ تعالیٰ اس پر اسے اجر وثواب عطا کرے گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے عدل یعنی قصاص کو مشروع کیا ہے اور معاف کر دینے کی بھی بڑی فضیلت ہے چنانچہ جو شخص معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اجر وثواب کو ضائع نہیں کرتا جیسا کہ حدیث میں آیا: اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے معاف کر دینے پر عزت ومرتبہ عطا کرتا ہے۔ (الصاوی ۴، ۴۱)

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظلم میں ابتدا کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور انتقام میں حد سے بڑھ جانے والے کو بھی ناپسند کرتا ہے۔

ظالم اور مظلوم، صبر اور انتقام

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ {۴۱} اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۴۲} وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ {۴۳} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد (برابر کا) بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو کوئی صبر سے کام لے، اور درگزر کر جائے تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ (الشوریٰ)

مفسر قرآن علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں مسلمان جب کافر سے بدلہ لے لے تو اس بدلہ لینے پر اس مسلمان کو ملامت کرنے کا کوئی جواز نہیں بلکہ اس کافر سے بدلہ لینے کی وجہ سے اس مسلمان کی تعریف اور تحسین کی جائے گی اور اگر مسلمان کسی ظالم مسلمان سے بدلہ لے پھر بھی اس کو ملامت نہیں کی جائے گی، پس کافر سے بدلہ لینا واجب ہے اور مسلمان سے بدلہ لینا مباح ہے اور مسلمان کو معاف کر دینا مستحب ہے۔ (تفسیر قرطبی)

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ عام مسلمان اپنے اوپر زیادتی کرنے والے کو خود سزا دے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر حکومت کے بجائے مسلمان خود اپنا بدلہ لے تو اس کی تین صورتیں ہیں:

① اگر مسلمان کے بدن میں کوئی زخم آیا ہو یا اس کا کوئی عضو ضائع ہوا ہو اور قاضی کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہو کہ یہ شخص اپنا قصاص لینے کا مجاز ہے تاہم قاضی اس کو منع کرے گا کہ وہ از خود قصاص نہ لے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہ کرے تاکہ کہیں خونریزی کا دروازہ نہ کھل جائے اور اگر حکام کے نزدیک اس کے قصاص لینے کا حق ثابت نہ ہو اور وہ قصاص لے لے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا قصاص لینا جرم نہیں ہو گا اور حکام اور قانون کے نزدیک یہ جرم ہو گا اور اس کو گرفتار

کر کے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

② اگر کسی کے جرم کی سزا حد ہو جیسے زنا کی حد یا چوری کی حد تو کسی عام آدمی کو یہ سزا دینے کا حق نہیں ہے، اگر حاکم کے نزدیک اس کا جرم ثابت نہیں ہوا اور عام آدمی نے اس کو سزا دی تو اس کو پکڑ کر سزا دی جائے گی کیونکہ عام آدمی کو اپنے ہاتھ میں قانون لینے کا حق نہیں ہے اور نہ عام آدمی کو حد جاری کرنے کا حق ہے اور اگر حاکم کے نزدیک اس کا جرم ثابت ہو اور کسی نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہو تو اب دوبارہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ اب اس کا وہ محل قائم نہیں رہا جس پر حد جاری ہو سکتی ہے اور اگر اس کی حد کوڑے مارنا تھی تو پھر اس کو کوڑے مارے جائیں گے کیونکہ اس پر حد جاری ہونے کا محل باقی ہے۔

③ اگر کسی مسلمان کا دوسرا مسلمان پر مالی حق ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سے بزور اپنا حق وصول کر لے، مثلاً اس کی طرف تنخواہ نکلتی ہو یا اس کا اس پر قرض ہو یا دین ہو، یہ اس صورت میں ہے کہ مقروض یا مدیون کو اس کے حق کا علم ہو اور اگر اس کو علم نہ ہو تو اگر صرف اس سے مطالبہ کرنے سے اس کا حق مل سکتا ہو تو پھر اس کو پکڑنا یا گرفتار کرنا جائز نہیں ہے اور اگر محض مطالبہ سے اس کا حق نہ مل سکتا ہو کیونکہ مقروض یا مدیون اس کے حق سے انکار کرتا ہو اور اس کے پاس اپنے حق پر گواہ نہ ہوں تو امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اب بھی اس کو پکڑنا یا اس کو گرفتار کرنا جائز ہے اور امام حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں اس کو گرفتار کرنا جائز نہیں ہے (مقروض سے مراد ہے جس نے اپنی ضرورت کے لیے نجی قرضہ لیا ہو اور مدیون سے مراد ہے جس نے مدت معین کے ادھار پر کوئی چیز خریدی ہو)۔ (تبیان القرآن)

علامہ غلام رسول سعیدی سورۃ شوریٰ کی آیت ۴۲ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ فرمایا: مواخذہ کرنے کا جواز ان لوگوں کے خلاف ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور روئے زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے" یعنی جو لوگ اسلحہ کے زور پر لوگوں کا مال چھین لیتے ہیں اور جبراً بھتہ لیتے ہیں، حکومت پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے مواخذہ کرے اور ان لوگوں کو ڈاکہ ڈالنے اور جبراً بھتہ لینے سے روکے۔

مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ظلم اور بغاوت سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ علانیہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، کھلے عام شراب پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں اور دیگر گناہ کرتے ہیں، حکومت پر لازم ہے کہ ان کو لگام دے اور ان کی ناک میں نکیل ڈالے۔ مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد مشرکین ہیں جو ہجرت سے پہلے مکہ میں مسلمانوں پر ظلم کرتے تھے اور ناحق سرکشی کرتے تھے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت ہر قسم کے ظلم کرنے والوں کے لیے عام ہے۔ (تبیان)

ان آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے یعنی جس نے اذیت اور تکلیف برداشت کرنے پر صبر کیا اور اس کو معاف کر دیا جس نے اس کے اپر ظلم کیا تھا اور اس سے بدلہ نہیں لیا اور اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا تو اس کا یہ صبر کرنا عزائم امور سے ہے اور یہ ایسا کام ہے جس کا بندہ کو عزم کرنا چاہیے، کیونکہ یہ ایسا کام ہے جس کی دنیا میں تعریف اور تحسین کی جاتی ہے اور آخرت میں اس پر اجر عظیم ملتا ہے۔

اس آیت میں "عزم" کا لفظ ہے، علامہ حسین بن راغب اصفہانی اس کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عزم کا معنیٰ ہے: دل میں کسی کام کا پکا اور پختہ ارادہ کر لینا، خواہ کوئی اس کام سے کتنا ہی روکے میں یہ کام ضرور کروں گا، اس لیے جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اصالۃً فرض کیا ہے ان کو عزیمت کہتے ہیں اور کسی پیش آمدہ مشکل یا عارض کی بناء پر اس فرض میں جو آسانی کر دی جاتی ہے اس کو رخصت کہتے ہیں جیسے وطن میں ظہر، عصر اور عشاء میں چار رکعات فرض ہیں، یہ عزیمت ہے اور سفر کی مشقت کی وجہ سے ان اوقات میں دو رکعاف فرض ہیں، اس کو رخصت کہتے ہیں۔ (المفردات)

گمراہ لوگوں کا انجام اور احوال بد

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ {۴۵} وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ {۴۶} الشوریٰ

جواب ترجمہ: اور اللہ جس کو گمراہ کرے اس کے لیے اس کے بعد کوئی چارہ ساز نہیں اور جب ظالم لوگ عذاب کو دیکھیں گے تو اے مخاطب تو انہیں اس حال میں دیکھے گا کہ یوں کہہ رہے ہوں گے کیا واپس کیے جانے کا کوئی راستہ ہے؟ اور تو انہیں اس حال میں دیکھے گا کہ وہ دوزخ پر پیش کیے جا رہے ہوں گے ذلت کی وجہ سے جھکے ہوئے چھپی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوں گے، اور ایمان والے کہیں گے بلاشبہ پورے خسارہ میں پڑ جانے والے وہ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے گھر والوں سے قیامت کے دن خسارہ میں پڑ گئے، خبر دار اس میں شک نہیں کہ ظالم لوگ دائمی عذاب میں رہیں گے، اور ان کے لیے اللہ کے سوا مددگار نہ ہوں گے جو ان کی مدد کریں اللہ کو چھوڑ کر، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کر دیتا ہے پھر اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا اور نہ ہی حق کی طرف اسے کوئی ہدایت دینے والا ہوتا ہے۔

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ: اور تم کفار کو دیکھو گے جب وہ دوزخ کے عذاب کے مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔ ماضی کا صیغہ تحقق پر دلالت کرتا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ: عذاب کی ہولناکیاں دیکھ لینے کی وجہ سے واپس دنیا میں آنے کا مطالبہ کریں گے، یقولون وہ اللہ تعالیٰ سے کہیں گے، چنانچہ انہیں اس مطالبے کا جواب نہیں دیا جائے گا، چنانچہ کہیں گے: کیا یہاں کوئی راستہ ہے جو واپس دنیا کی طرف لے جائے؟ تاکہ وہاں جا کر ہم ایمان لائیں، نیک اعمال بجالائیں۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: واپس دنیا میں لوٹنے کا مطالبہ کریں گے تاکہ دنیا میں آکر طاعت خداوندی بجالائیں تاہم ان کے اس مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔ (الجامع)

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ: اے مخاطب! تو دیکھے گا کہ انہیں دوزخ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، ذلت و رسوائی سے سر جھکائے ہوئے ہوں گے۔

يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ: خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے چوری چوری کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہوں گے جیسے واجب القتل انسان کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ تلوار سے اس کی گردن اڑادی جائے اور وہ کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے، وہ نظریں بھر کر دیکھنے کی جسارت نہیں کر سکے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: دُزدِیدَہ نگاہوں سے دیکھیں گے۔ قتادہ رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شدت خوف کی وجہ سے کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔ (التفسیر الکبیر)

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: مؤمنین جنت میں کہیں گے جب کفار کو عذاب میں پڑے دیکھیں گے: حقیقت میں خسارہ وہی ہے جس میں یہ لوگ پڑے ہیں، دوزخ میں داخل ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں رکھا ہے۔

اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ: خبردار یہ لوگ دائمی عذاب میں ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔ عذاب مقیم ایسا دائمی عذاب جو کبھی بھی ختم نہیں ہو گا۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: ان کے اعوان و انصار نہیں ہوں گے جو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے ان کی مدد کریں جیسا کہ دنیا میں انہیں امید تھی۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ: اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کر دیتا ہے پھر اس کے لیے راستہ نہیں بچتا جس کے ذریعے دنیا میں وہ حق تک پہنچنے پائے اور ایسا بھی راستہ نہیں بچتا جس کے ذریعے وہ آخرت میں جنت میں پہنچ پائے چونکہ نجات کا راستہ بند کر دیا گیا، ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کر دیتا ہے پھر اس کے پاس خلاصی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ (مختصر ابن کثیر۔ صفوۃ التفاسیر)

آج کا کام کل پر مت چھوڑیے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ {۴۷} الشوری.

جواب ترجمہ: (لوگو) اپنے پروردگار کی بات اس دن کے آنے سے پہلے پہلے مان لو جسے اللہ کی طرف سے ٹالا نہیں جائے گا، اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی، اور نہ تمہارے لیے پوچھ گچھ کا کوئی موقع ہو گا۔

خلاصہ تفسیر: یہ آیت ہے جو بندہ کی اس بات پر مذمت کرتی ہے کہ بندہ کہتا ہے میں یہ کام عنقریب کروں گا، یوں وہ اس کام کو آنے والے وقت تک مؤخر کرتا رہتا ہے، اس کام کو ٹالتا چلا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قیامت آجانے سے پہلے پہلے تم اللہ کے احکام کو قبول کرلو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری میں لگ جاؤ۔ جب قیامت کا دن آجائے گا تو کوئی اسے لوٹانے والا نہ ہو گا۔ اس دن تمہیں کہیں جائے پناہ نہ ملے گی اور نہ تم کہیں چھپ کر اپنے آپ کو بچا سکو گے اور اللہ سے غائب ہو سکو گے۔

اگر یہ مشرکین پھر بھی اعراض کریں اور ایمان نہ لائیں گو آپ کو اس پر رنج و ملال کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ آپ سے ان کی روگردانی اور اعراض کی باز پرس کی جائے۔ آپ کے ذمے تو صرف اللہ کا پیغام ہدایت پہنچا دینا ہے ان کا حساب ہم پر ہے سو قیامت کے روز ہم ان سے ذرے ذرے کا حساب لیں گے۔ (احسن البیان)

علامہ عبدالکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اَلاِستِجَابَۃُ للّٰہِ اَلوَفَاءُ بعَھدِہٖ، وَالقِیَامُ بحَقِّہٖ، وَالرُّجُوعُ عَن مُّخَالَفَتِہٖ إِلَی مَوَافَقَتِہٖ، وَالاِستِسلَامُ فی کُلِّ وَقتٍ لحُکمِہٖ. وَالطَّرِیقُ الیَومُ إِلَی الاستِجَابَۃِ مَفتُوحٌ. وَعَن قَرِیبٍ سَیُغلَقُ البَابُ عَلَی القَلبِ بَغتَۃً، وَیُؤخَذُ فَلتَۃً

الاستجابۃ للہ کا مطلب ہے اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرنا، اس کے حق کے لیے کھڑا ہونا، اور اس کی مخالفت چھوڑ کر ان کاموں کی طرف پھرنا جو اس کے حکم کے مطابق ہیں، ہمہ وقت اس کے حکم کے سامنے اپنے کو سرنڈر کرنا، استجابت کی طرف جانے والا راستہ آج کھلا ہوا ہے اور عنقریب یہ دروازہ دل پر بند ہو جائے گا، اور اچانک پکڑا جائے گا۔ (تفسیر قشیری)

شیخ محمد امین ہروی الشافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَالمَعنٰی: أَجِیبُوا دَاعِیَ اللّٰہِ، وَھُوَ رَسُولُہُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ وَآمِنُوا بِہِ، وَاتَّبِعُوہُ فِیمَا جَاءَکُم بِہِ مِن عِندِ اللّٰہِ تَعَالٰی، مِن قَبلِ أَن یَّأتِیَ یَومٌ لَّا یَستَطِیعُ أَحَدٌ أَن یَّرُدَّہُ، إِذَا جَاءَ بِہِ اللّٰہُ

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو، اور اللہ کی طرف دعوت دینے والے اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ ہیں، تم لوگ آپ ﷺ پر ایمان لاؤ اور جو کچھ آپ ﷺ اللہ کی طرف تمہارے پاس لے کر آئے ہیں اس کی پیروی کرو، اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ کوئی اسے لوٹا نہ سکے جب اللہ اسے لائے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ مرنے سے پہلے مرنے کی تیاری کی جائے، آنے والے وقت کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ حال کو کام میں لایا جائے۔

نبی کا کام تبلیغ ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَۃً فَرِحَ بِہَا ۚ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ فَاِنَّ الۡاِنۡسَانَ کَفُوۡرٌ {۴۸} الشوریٰ

جواب ترجمہ: پس اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا آپ کے ذمہ صرف پہنچانا ہے، اور بلاشبہ بات یہ ہے کہ جب ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیتے ہیں تو اس پر خوش ہوتا ہے اور اگر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انہیں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو بلاشبہ انسان ناشکری کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا: اس تفصیل کے بعد بھی اگر مشرکین ایمان سے روگردانی کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے انکار کریں، آپ ﷺ کی دعوت کے باوجود وہ دعوت پر لبیک نہ کہیں بلکہ اس سے منہ موڑ لیں جس کی طرف آپ ﷺ انہیں دعوت دے رہے ہیں تو

فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا: اے میرے حبیب ﷺ ! ہم نے آپ ﷺ کو ان کے اعمال پر نگران اور محاسب بنا کر نہیں بھیجا۔

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ: آپ کے ذمہ تو اپنے رب تعالیٰ کی رسالت کی تبلیغ ہے اور آپ نے اس منصب کو نبھا دیا۔ ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے، جس میں آپ ﷺ کے لیے مانوسیت ہے اور آپ کے فکر مند ہونے کا ازالہ ہے۔ (البحر المحیط) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ انسان کے مزاج میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا: انسان سے جنس انسان مراد ہے چونکہ آگے ان تصبھم آرہا ہے، معنی: جب ہم مختلف نعمتوں صحت، مال، امن وغیرہ کے ساتھ انسان کا اکرام و عزت کرتے ہیں تو وہ تکبر کرنے لگتا ہے اور اترانے لگتا ہے۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ: اگر انسان پر کوئی مصیبت، آزمائش قحط وغیرہ پڑ جائے بسبب اس کے اپنے برے اعمال اور گناہوں کے تو وہ انکار اور ناشکری میں مبالغہ کرنے لگتا ہے، اسے نعمت اور آسودگی بھول جاتی ہے اور آزمائش و تنگی ہی یاد رہتی ہے۔

صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اوپر نعمت کے احسان کے بیان کی ابتدا اِذَا کے ساتھ کی گئی ہے جب کہ مصیبت و بلا کا بیان اِن کے ساتھ کیا گیا ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ نعمت و آسودگی کا حصول متحقق ہوتا ہے، جب کہ آزمائش و مصیبت تو کبھی کبھی پیش آتی ہے، نیز رب تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب رہتی ہے۔

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: دنیا کی نعمتیں اگرچہ عظیم و کثیر ہی کیوں نہ ہوں آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ پانی کی حیثیت، اسی لیے دنیا کی نعمتوں کے عطا کو "ذوق" چکھنے سے تعبیر کیا ہے۔ واضح کر دیا کہ انسان دنیا میں اس حقیر مقدار (معمولی سی) کے مل جانے پر اترانے لگتا ہے، پھولا نہیں سماتا، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، عجب و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے اس کی ساری مرادیں اور تمنائیں پوری ہو گئی ہیں، یہ اس لیے کہ وہ دنیا اور آخرت کے حالات سے جاہل ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر، صفوۃ التفاسیر)

بیٹیاں اور بیٹے کون دیتا ہے؟

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ {۴۹} اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ {۵۰} الشوریٰ

جواب ترجمہ: سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے، وہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، لڑکیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ یا پھر ان کو ملا جلا کر لڑکے بھی دیتا اور لڑکیاں بھی اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ یقیناً وہ علم کا بھی مالک ہے قدرت کا بھی مالک۔

خلاصہ تفسیر: علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ خالق مالک اور متصرف زمین و آسمان کا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا، جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے، جو چاہے پیدا کرے اور بنائے، جسے چاہے صرف لڑکیاں دے جیسے حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صرف لڑکیاں عطائی فرمائیں اور جسے چاہے صرف لڑکے ہی عطا فرماتا ہے جیسے ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صرف لڑکے ہی عطا فرمائے اور جسے چاہے لڑکے لڑکیاں سب کچھ دیتا ہے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹے بھی عطاء فرمائے اور بیٹیوں سے بھی نوازا، اور جسے چاہے اسے اولاد نہیں دیتا جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام، یوں یہ چار قسمیں ہوئیں، لڑکیوں والے لڑکوں والے، دونوں والے اور دونوں سے خالی ہاتھ۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ: وہ علیم ہے ہر مستحق کو جانتا ہے، قادر ہے جس طرح چاہے فرق رکھتا ہے پس یہ مقام بھی مثل اس فرمان الٰہی کے ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ تاکہ ہم اسے لوگوں کے لئے نشان بنائیں یعنی دلیل قدرت بنائیں اور دکھا دیں کہ ہم نے مخلوق کو چار طور پر پیدا کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام صرف مٹی سے پیدا ہوئے نہ ماں نہ باپ، حضرت حوا صرف مرد سے پیدا ہوئیں باقی کل انسان مرد عورت دونوں سے، سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ صرف عورت سے بغیر مرد کے پیدا کئے گئے۔

یوں آپ کی پیدائش سے یہ چاروں قسمیں ہو گئیں۔ پس یہ مقام ماں باپ کے بارے میں تھا اور وہ مقام اولاد کے بارے میں اس کی بھی چار قسمیں اور اس کی بھی چار قسمیں، سبحان اللہ یہ ہے اس اللہ کے علم وقدرت کی نشانی۔ (تفسیر ابن کثیر)

نکتہ: بیٹی کا ذکر پہلے بیٹے کا بعد میں کیوں؟ حضرات مفسرین نے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۹ میں ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ یہاں اللہ نے بیٹی کا ذکر پہلے اور بیٹے کا ذکر بعد میں کیوں فرمایا ہے؟ اس کی کچھ وجوہات مفسرین کرام نے یہ بیان فرمائی ہیں

① بیٹے کا پیدا ہونا خوشی کا باعث ہے اور بیٹی کا پیدا ہونا غم کا باعث ہے، اگر پہلے بیٹے کا ذکر فرماتا اور پھر بیٹی کا تو انسان کا ذہن خوشی سے غم کی طرف منتقل ہوتا اور جب پہلے بیٹی دینے کا ذکر فرمایا اور پھر بیٹا دینے کا تو انسان کا ذہن غم سے خوشی کی طرف منتقل ہو گا اور یہ کریم کی عطا کے زیادہ لائق ہے۔

② جب اللہ تعالیٰ پہلے بیٹی دے گا تو بندہ اس پر صبر اور شکر کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور جب اس کے بعد اللہ تعالیٰ بیٹا دے گا تو بندہ جان لے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا احسان ہے، پھر اس کا شکر اور اس کی اطاعت زیادہ کرے گا۔

③ عورت کمزور اور ناقص العقل اور ناقص الدین ہوتی ہے، اس لیے عورت کے ذکر کے بعد مرد کے ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ جب عجز اور حاجت زیادہ ہو تو اللہ کی عنایت اور اس کا فضل زیادہ ہوتا ہے۔

④ عموماً باپ کے نزدیک بیٹی کا وجود حقیر اور ناگوار ہوتا ہے، زمانہ جاہلیت میں عرب بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے بیٹیوں کے ذکر کو بیٹوں کے ذکر پر مقدم کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ لوگوں کے نزدیک بیٹی حقیر اور ناگوار ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیٹی مرغوب اور پسندیدہ ہے، اس لیے اس نے بیٹی کے ذکر کو بیٹے کے ذکر پر مقدم فرمایا۔ (بحوالہ تبیان القرآن)

مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ مشاہدے کی بات ہے کہ آج بھی کتنے لوگ ہیں کہ ان کے لڑکے ہیں لڑکیاں نہیں اور لڑکیاں ہیں لڑکے نہیں۔ اس کی مرضی ہے لڑکیاں دے یا لڑکے دے یا جوڑے جوڑے دیتا ہے ان کو لڑکے اور لڑکیاں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو لڑکے بھی دیئے اور لڑکیاں بھی دیں، آج بھی اکثریت کے ہاں لڑکے بھی ہیں، لڑکیاں بھی ہیں۔ ایسے بھی ہیں دو لڑکے اکٹھے پیدا ہوتے ہیں، ایسے بھی ہیں دو لڑکیاں اکٹھی پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے بھی ہیں لڑکا لڑکی اکٹھے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے اس میں مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے وَيَجْعَلُ مَن يَّشَآءُ عَقِيمًا اور کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بانجھ، نہ لڑکا دے نہ لڑکی دے۔

دنیا میں کتنے مرد عورتیں ایسی موجود ہیں جو سارا زور لگا بیٹھے ہیں، کیا دوائیاں، کیا ڈاکٹر، کیا حکیم، سب کو دکھا بیٹھے ہیں، دم دورد والوں سے دم تعویذ کرا بیٹھے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جب رب تعالیٰ ہی نے نہیں دینا تو کون دے گا؟ یہاں پر ایک بات سمجھ لیں کہ یہ جو جملہ ہے اَوۡيُزَوِّجُهُمۡ ذُكۡرَانًا وَّاِنَاثًا اس سے شیعہ کے ایک فرقہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مرد کا مرد کے ساتھ نکاح اور عورت کا عورت کے ساتھ نکاح جائز ہے اور اس کا ترجمہ اس طرح سے کرتے ہیں، یا ان کا نکاح کرا دے مردوں سے یا عورتوں سے۔ لَاحَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الۡعَلِيِّ الۡعَظِيۡمِ

بھئی! بات تو تخلیق کی ہو رہی ہے، پیدا کرنے کی ہو رہی ہے، نکاح کا تو مسئلہ ہی بیان نہیں ہو رہا ہے۔ مگر جب ذہن ٹیڑھا ہو جائے تو آدمی صحیح بات کو بھی ٹیڑھا بنا دیتا ہے، یہاں تو مسئلہ خلقت کا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے جس کو چاہے لڑکیاں اور جس کو چاہے لڑکے عطا کرتا ہے یا جوڑے جوڑے دیتا ہے، لڑکے اور لڑکیاں۔ اور جس کو چاہے بانجھ کر دے۔ اور اگر وہ چاہے تو بانجھ کی اصلاح کر دے بچہ عنایت کر دے۔

جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو عطا فرمایا، حضرت زکریا علیہ السلام کا نکاح چوبیس پچیس سال کی عمر میں ہوا، ایک سو بیس سال عمر مبارک ہو گئی۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین سو بیس سال عمر عطا فرمائی تھی اور بیوی کی عمر ۹۹ سال ہو گئی نہ بچی ہوئی نہ بچہ۔

حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسمے پھل دیکھ کر دعا کی اے پروردگار! مریم علیہا السلام کو بے موسمے پھل دے سکتا ہے تو مجھے بھی اولاد عطا فرما یرثنی ویرث من آل یعقوب (مریم:٦) جو میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو، میری دینی خدمت کا وارث بنا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور عین نماز میں گفتگو شروع ہوگئی، پیغمبر کے نماز میں فرشتے کے ساتھ گفتگو کرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی، کیوں؟ رب تعالیٰ کی نماز ہے اور پیغام بھی رب تعالیٰ کا فرشتہ دے رہا ہے، ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ کہنے لگے میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا؟ بیوی میری بانجھ ہے اور میں انتہائی بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔ فرمایا اسی طرح ہوگا۔

زکریا علیہ السلام نے کہا کہ مجھے کوئی نشانی بتلادو جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ میری بیوی باامید ہوگئی ہے، فرمایا ابتک اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ آپ کلام نہیں کریں گے لوگوں کے ساتھ تین رات تک صحیح سلامت۔

ذکر کے لئے زبان چلے گی، نماز تسبیح کے لئے زبان چلے گی مگر لوگوں کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکوگے، جب گفتگو کرنے سے زبان رک جائے تو سمجھ لینا کہ میری بیوی بامید ہوگئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا، وہ جوان ہوا، آنکھوں سے دیکھا، سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۹۰ میں ہے وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اور ہم نے اچھا کیا اس کیلئے اس کی بیوی کو۔ یہ جملہ بتلا رہا ہے کہ خرابی بیوی میں تھی ہم نے اس کی بیوی کو ٹھیک کر دیا۔ تو رب تعالیٰ بانجھ کو بھی درست کر سکتا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان)

بیٹیاں اور بیٹے خالص عطائے خداوندی ہے، آج بھی انسان اگر ملاحظہ ومشاہدہ کرے تو اسے بہت سے مقامات پر ایسے لوگ مل سکتے ہیں جن کے پاس پراپرٹیاں، جائیدادیں موجود ہیں، دنیا کی ہر نعمت ان کے ہاں دستیاب ہے، مال ودولت سے بینک بھرے ہوئے ہیں، مگر اولاد کی دولت سے محروم ہیں، بڑے بڑے لوگ جو دوسروں کو اولاد دینے کے سہانے سپنے دکھاتے اور جنتر منتر چلاتے ہیں ان کے گھروں کے آنگن سونے سونے دکھائی دیتے ہیں، ان کے ہاں اپنی اولاد کوئی نہیں ہے، ان میں ڈاکٹر، حکیم، طبیب، شفاخانوں کے مالکان تک موجود ہیں جو دوسروں کو اولاد ہونے کے طریقے بتاتے ہیں، نسخے مہیا کرتے ہیں، تعویذ دیتے ہیں، دم کرتے ہیں مگر اپنی حالت قابل رحم ہے کہ گھر میں اولاد نہیں ہے۔

اور میرا رب جس کو دینے پر آتا ہے تو وہ دولت دیکھتا ہے اور نہ ہی بینک بیلنس، وہ غربت دیکھتا ہے نہ امیری، وہ لاؤلشکر دیکھتا ہے اور نہ تنہائی وہ نوازتا ہے تو پھر نوازتا ہی چلا جاتا ہے، آج میڈیا کا دور ہے، ذرائع مواصلات اس قدر سبک رفتار ہیں کہ شاید اس سے پہلے دنیا کے ایک گوشے کی خبر دوسرے گوشے تک اس قدر تیزی سے نہیں پہنچتی تھی جس قدر آج پہنچتی ہے، ہسپتالوں میں کئی مقامات پر پانچ پانچ بچوں کے جنم ہونے کی اطلاعات بھی ذرائع مواصلات نے دی ہیں، تین بچوں کی ولادت کی خبریں تو عام ہیں، دو جڑواں بچوں کی ولادت کی خبریں بھی عام ہیں۔

ایک مسلمان کو اپنے رب کے بارے میں ایمان وعقیدہ مضبوط رکھنا چاہیے کہ زمین و آسمان میں وہی متصرف و مختار ہے اور وہی ہر چیز کا خالق ہے، اولاد دینا اور اولاد سے محروم کرنا بھی اسی کے اختیار میں ہے، اس معاملے، بلکہ ساری کائنات کے نظام میں کوئی دخیل نہیں، وہ جسے چاہتا ہے صرف بیٹیاں عطا کرتا ہے جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام اور جسے چاہتا ہے صرف بیٹے ہی عطا کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں نعمتیں عطا فرما دیتا ہے جیسا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کے چار صاحبزادے ابراہیم، قاسم، طیب اور طاہر تھے اور چار ہی صاحبزادیاں زینب، ام کلثوم رقیہ اور فاطمہ تھیں۔ اور جسے چاہتا ہے دونوں نعمتوں ہی سے محروم کر دیتا ہے اور وہ ساری عمر اس آرزو میں جیتے ہیں اور آخر اس آرزو کو اپنے سینوں ہی میں لے کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اللہ انسان سے کیسے بات کرتا ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ {۵۱}الشوری.

جواب ترجمہ: اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ اس سے (روبرو) بات کرے۔ سوائے

اس کے کہ وہ وحی کے ذریعے ہو، یا کسی پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیج دے، اور وہ اس کے حکم سے جو وہ چاہے وحی کا پیغام پہنچا دے۔ یقیناً وہ بہت اونچی شان والا، بڑی حکمت کا مالک ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں کسی انسان سے اللہ تعالیٰ روبرو ہو کر ہم کلام نہیں ہوتا، البتہ تین طریقوں سے کوئی طریقہ اختیار فرماتا ہے، ایک کو وحی سے تعبیر فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات فرمانا چاہتا ہے، وہ کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے، دوسرے کو پردے کے پیچھے سے تعبیر فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی صورت نظر آئے بغیر کوئی بات کانوں کے ذریعے ہی سنادی جاتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ ہوا تھا، اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنا کلام کسی فرشتے کے ذریعے کسی پیغمبر کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اگر آپ نبی ہیں تو آپ اللہ سے بات کیوں نہیں کرتے اور اللہ کو دیکھتے کیوں نہیں؟ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھا، آپ کی تائید میں یہ آیت نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی بشر کے لیے یہ بات حاصل نہیں کہ اللہ سے بات کرے بجز تین طریقوں کے، ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو الہام فرمادے یعنی قلب میں کوئی بات ڈال دے یا خواب میں کوئی بات بتادے (مفسرین نے وحیاً کا مصداق بتاتے ہوئے یہ دو صورتیں لکھی ہیں)

یا اللہ تعالیٰ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر کلام فرمایا تھا یا کسی فرشتہ کو بھیج دے جو اللہ کا پیغام لے کر آجائے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی مشیت کے مطابق کسی رسول کو بطور وحی پیغام پہنچادے یہ تین صورتیں اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی ہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے۔ (معالم التنزیل، انوار البیان)

اللہ تعالیٰ بشر کے ساتھ تین صورتوں میں گفتگو کرتا ہے۔ بشر پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر ہو۔ بشر کی شان ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے مگر تین صورتیں ہیں الا وحیاً مگر وحی کے ذریعے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حارث بن ہشام ابو جہل کے سگے بھائی تھے۔ ۸ ھ میں مسلمان ہو گئے، مخلص مسلمانوں میں سے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا حضرت! کیف تاتیک الوحی " آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی وقت تو مجھے فرشتہ نظر نہیں آتا اور دل میں مثل صلصلۃ الجرس جیسے گھنٹی لگاتار بجتی رہے تو آواز آتی ہے۔ ایسے ہی دل کے اندر وحی آتی ہے۔ اس کو تم یوں سمجھو کہ جیسے تار گھر میں گئے ہوں تو دیکھا سنا ہو گا کہ کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے۔ اس کو ہم تو نہیں سمجھ سکتے لیکن جو اس فن کے ماہر ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ایسے ہی اس گھنٹی کی طرح آواز کو آنحضرت ﷺ سمجھتے تھے۔

دوسری صورت: او من ورآء حجاب یا پردے کے پیچھے سے جیسے معراج والی رات کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ کہتا ہے جن میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شریک ہیں کہ معراج والی رات اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ جو کلام کیا ہے وہ پردے کے پیچھے سے کیا ہے آنکھوں کے ساتھ رب تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوا۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتداً تو معراج والی رات پردے کے پیچھے سے کلام ہوا ہے لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ نے پردہ اٹھا کر آپ کو دیدار کرایا ہے۔

یا تم اس طرح سمجھو کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رب تعالیٰ کوہ طور پر ہم کلام ہوتے تھے پردے کے پیچھے سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی رب ارنی انظر الیک (سورہ الاعراف) اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار کرا دے۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا لن ترانی " آپ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ تو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا دیدار نہیں کرایا، ہاں! قیامت والے دن سب دیکھیں گے۔ (ذخیرہ الجنان)

تیسری صورت: اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا یا بھیجے پیغام پہنچانے والے کو فیوحی بانہ مایشاء پس اللہ تعالیٰ وحی بھیجتا ہے اپنے حکم کے ساتھ جو چاہے، فرشتہ کبھی تو اصل شکل میں آتا تھا اور کبھی انسانی شکل میں، آنحضرت ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل شکل میں دو دفعہ دیکھا ہے۔ ایک اس وقت جب آپ غار حرا میں تھے۔ فرمایا جبرئیل علیہ السلام کے چھ سو پر تھے اور دوسری مرتبہ معراج والی رات سدرۃ

المنتہیٰ کے پاس دیکھا، ان دو مواقع کے سوا جب بھی جبرئیل علیہ السلام آتے تھے کسی انسان کی شکل میں آتے تھے۔ کبھی حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں کبھی کسی دیہاتی کی شکل میں آتے تھے۔ (ذخیرہ الجنان)

بخاری شریف میں روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے صحن میں تشریف فرما تھے۔ صحابہ کرام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، ایک آدمی آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں کے ساتھ گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات شروع کر دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جوابات دیتے رہے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ جبرئیل آئے ہوں اور مجھے پتا نہ چلا ہو مگر اس دفعہ میں بھی نہیں پہچان سکا۔

میں نے اس کو کوئی دیہاتی ہی سمجھا فَاِنَّهٗ جِبْرَئِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ پس بیشک وہ جبریل تھے تمہارے پاس آئے تھے تمہیں دین سکھانے کے لئے، تو اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ گفتگو کرتا ہے ان تین طریقوں کے ساتھ۔ یا تو دل میں القا کرتا ہے یا پس پردہ یا فرشتہ بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ۔

قرآنی نور کے ذریعے ہدایت کے فیصلے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ {۵۲} الشوری.

جواب ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تمہارے پاس اپنے حکم سے ایک روح بطور وحی نازل کی ہے۔ تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم لوگوں کو وہ سیدھا راستہ دکھا رہے ہو۔

خلاصہ تفسیر: اور جس طرح ہم نے آپ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف وحی بھیجی اسی طرح آپ کی طرف بھی روح یعنی نبوت کی وحی بھیجی۔ بعض مفسرین نے روح سے نبوت اور بعض حضرات نے روح سے قرآن مراد لیا ہے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ روح سے مراد قرآن کریم اور اس کے احکام ہیں، کیونکہ وہ انسان کے لئے روحانی زندگی کا باعث ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ روح سے مراد حضرت جبرئیل (علیہ السلام) ہوں جنہیں روح القدس بھی کہا جاتا ہے اور قرآن کریم کے نزول کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہی کو واسطہ بنایا ہے۔ (توضیح القرآن)

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ اس روح کے اترنے سے پہلے آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ اس میں ایک تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ باقی تمام انبیاء کی طرح نبوت ملنے سے پہلے آپ کو گمان تک نہ تھا کہ آپ کو رسالت و نبوت کے لیے منتخب کیا جا چکا ہے۔ اور عنقریب آپ پر اس ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جانے والا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس عظیم ذمہ داری کا آپ کو گمان تک نہ تھا اس کی تیاری سے متعلق آپ کیسے فکر مند ہو سکتے تھے۔

کسی بھی بڑی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے یقیناً آدمی اس کے لیے تیاری کرتا ہے اور اس کے لیے فکر مند بھی ہوتا ہے۔ اور پھر لوگ بھی اس کی فکر مندی کو دیکھتے ہیں اور اس کی تیاری سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی جان پہچان کے لوگوں نے کبھی آپ کو اس کے لیے فکر مند ہوتے نہ دیکھا اور نہ کبھی کسی نے ایسے لوگوں سے آپ کی ملاقات دیکھی جنھیں سابقہ کتابوں کا عالم کہا جا سکتا ہے۔ اور یا وہ مذہب کے بارے میں کچھ بھی جانتے تھے۔

اس لیے آپ پر یہ الزام لگانا کہ آپ نے اس کتاب کو خود گھڑ لیا ہے انتہا درجے کی کم عقلی اور بیخبر ی کی بات ہے۔ نبوت سے پہلے کبھی کسی نے آپ سے ایک ایسا جملہ تک نہ سنا تھا جس کا تعلق اسلام کے عطا کردہ بنیادی عقائد سے ہو۔ یا آپ نے نبوت کے بعد جن حقائق کی طرف دعوت دینا شروع کی ہے

ان میں سے کسی حقیقت سے ہو۔

آپ کا تو حال یہ تھا کہ آپ امی ہونے کی وجہ سے کتاب کے تصور سے بھی آگاہ نہ تھے۔ کیونکہ آپ نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کے لوازم و مقتضیات کیا ہیں؟ بلاشبہ ہر پیغمبر وحی سے پہلے بھی اپنی فطرتِ سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اجمالی ایمان اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایمان کی تفصیل کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کیسی ہے اس کی صفات کیا ہیں، اس کے کون سے حقوق ہیں جن کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ملائکہ، نبوت، کتبِ الٰہی اور آخرت سے متعلق وہ تفصیل نہیں جانتا۔

لیکن فی الجملہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس، اس کا خوف، اس سے محبت، اس کی وحدانیت جیسی کیفیات سے وہ بہرہ ور ہوتا ہے ایسی ہی کیفیت آپ کی بھی تھی تو آپ ان باتوں کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے کس طرح منصوبہ بندی کرسکتے تھے اور کس طرح ان حقائق پر مشتمل کتاب مرتب کرنے کے لیے فکر مند ہوسکتے تھے جنہیں آپ جانتے نہ تھے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے آپ کو ایمان کی دولت سے بہرہ ور کیا، وحی کے ذریعے ایمان کی تفصیلات آپ کو بتائیں اور آپ کے دل میں ایک ایسی روشنی پیدا کردی جس نے آپ کے سینہ کو جگمگا دیا اور آپ لوگوں کے اندر چلتے پھرتے مینارہ نور بن گئے۔

اسی طرح آپ کو کتاب عطا فرمائی جس نے زندگی سے متعلق ہر سوال کا جواب دیا، ہر گتھی کو کھولا، اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی واضح کیے اور بندوں کے بھی۔ اور انسان کا اپنے خالق و مالک سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا۔ اور اجتماعی زندگی کے لیے ایسا نظام زندگی دیا جس نے زندگی کی ہر چول اپنی جگہ بٹھا دی۔ اور اخلاق کا ایسا نظام دیا جس نے تمام انسانی رشتوں کی نوک پلک سنوار دی۔

اور یہی مشعل ہاتھ میں لے کر آپ نے انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو منور کر دیا۔ خاندانی زندگی کا شعور اس نے دیا، معاشرتی زندگی کے اصول اس نے فراہم کیے، معاشی زندگی کی حدود اور

آداب سے اس نے آگاہ کیا، عدل کے تقاضوں کی گرہیں کھولیں اور حکومت جیسے نازک کام کے لیے ایسے لوگ تیار کیے جنہوں نے شہنشاہی میں فقیری کر کے دکھائی۔ اور اس کتاب اور آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تربیت نے اس اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف رہنمائی کی جو آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ (روح القرآن)

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ: آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے یعنی نبوت ملنے سے پہلے آپ کو یہ پتہ نہ تھا کہ اللہ کی کتاب کیا ہے اور نہ آپ کو ایمانیات کا تفصیلی علم دیا گیا تھا جب آپ کو نبوت عطا کی گئی اللہ کی کتاب نازل ہوئی اور ایمان کی تفصیلات بتادی گئیں اس وقت آپ کو اللہ کی کتاب کا اور ایمانیات کا علم ہوا گو اجمالی ایمان پہلے سے حاصل تھا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَالصَّوَابُ أَنَّهُمْ مَعْصُومُونَ قَبْلَ النُّبُوَّةِ مِنَ الْجَهْلِ بِاللهِ وَصِفَاتِهِ وَالتَّشَكُّكِ فِي شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ. وَقَدْ تَعَاضَدَتِ الْأَخْبَارُ وَالْآثَارُ عَنِ الْأَنْبِيَاءِ بِتَنْزِيهِهِمْ عَنْ هَذِهِ النَّقِيصَةِ مُنْذُ وُلِدُوا، وَنَشْأَتِهِمْ عَلَى التَّوْحِيدِ وَالْإِيمَانِ، بَلْ عَلَى إِشْرَاقِ أَنْوَارِ الْمَعَارِفِ وَنَفَحَاتِ أَلْطَافِ السَّعَادَةِ، وَمَنْ طَالَعَ سِيَرَهُمْ مُنْذُ صِبَاهُمْ إِلَى مَبْعَثِهِمْ حَقَّقَ ذَلِكَ،

اور صحیح بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت ملنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں جہالت اور کسی قسم کے شک وشبہ سے پاک ہوتے ہیں۔ ولادت سے ہی اس قسم کی نقائص سے پاک ہونے کے بارے میں خود انبیائے کرام علیہم السلام سے احادیث و آثار کثرت سے مروی ہیں، ان کی نشو ونما توحید وایمان ہی پر ہوتی ہے بلکہ انوارات ومعارف اور سعادت کے الطاف کے ساتھ ہوتی ہے جس نے ولادت سے نبوت تک ان کی سیرتوں کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ (قرطبی)

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا: اور لیکن ہم نے آپ کو قرآن دیا اور اس قرآن کو ایک نور بنادیا جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت دیں۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: اور بلاشبہ آپ سیدھے راستہ کی ہدایت بتاتے ہیں جس میں

کوئی کجی نہیں ہے۔ (انوار البیان)

خلاصہ کلام یہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ڈیوٹی اللہ کی طرف سے یہ لگائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتے رہے، حق کی بلاتے رہیں۔

صراط مستقیم اور صراط اللہ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ {۵۳} الشوریٰ

جواب ترجمہ: جو اللہ کا راستہ ہے، وہ اللہ جس کی ملکیت میں وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔ یاد رکھو کہ سارے معاملات آخر کار اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے۔

خلاصہ تفسیر: جس راستے کو گزشتہ آیت میں صراط مستقیم کہا گیا، اسی صراط مستقیم کو صراط اللہ یہاں کہا جارہا ہے، گویا کہ صراط مستقیم اور صراط اللہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا اور الگ الگ نہیں ہیں، جو صراط مستقیم پر گامزن ہو گا گویا کہ وہ صراط اللہ پر رواں دواں ہے، اور جو صراط مستقیم سے ہٹے گا، اعراض کرے گا پگڈنڈیوں پر چلے گا گویا کہ وہ صراط مستقیم سے دور ہٹ چکا ہے۔

سورۃ شوریٰ کے آخری الفاظ یہ کہ سارے معاملات کا انجام کار اللہ کی طرف ہے، علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں آخری آیت کے دوران تحریر فرمایا ہے کہ ونزد محققان بازگشت ھمہ امور در ھمہ اوقات واحوال بحضرت اوست وبار تفاع حجب ووسائط مشاھدہ این معنی دست دھد صورت کثرت حجب وحدتست غیبت مامانع نور حضور دیدہ دل باز کشاو ببین سر الی اللہ تصیر الأمور وذلک لان اللہ مبدأ کل ومرجعہ ومصیرہ اما بالفناء الاختیاري او بالفناء الاضطراری

یعنی اہل تحقیق کے نزدیک تمام اوقات اور جملہ احوال میں ہر کام کی بازگشت اسی کی جناب میں ہے۔ جب پردے اٹھتے ہیں اور وسائط دور ہوتے ہیں تب اس مفہوم کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ ہے اور انتہا بھی اسی تک ہے، اب چاہے کوئی اپنی مرضی اور اختیار سے اپنے آپ کو اس کی رضا میں فنا کر دے، ورنہ اضطرار اتو ایسا ہو کر رہے گا، عقل مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس چیز سے مفر نہ ہو اسے خوشی سے قبول کر لیا جائے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ایک جنازے کی تدفین میں شریک ہوئے، جب اس پر مٹی ڈال دی گئی تو اتنا روئے کہ آنسوؤں سے مٹی تر ہو گئی۔ پھر فرمایا اے مردمان! آخر دنیا نگری گورست اول آخرت گورست چہ مہ نازید بعالے آخرش اینست یعنی گوروچوں نمی ترسید از عالمے کہ اولش اینست یعنی گور۔ (روح البیان) اے لوگو! دنیا کا انجام قبر ہے اور آخرت کی ابتدا قبر ہے، اس جہان پر ناز کرنا کتنی حماقت ہے جس کا انجام قبر ہے اور اس جہاں سے کیوں نہیں ڈرتے ہو جس کی پہلی منزل قبر ہے۔

الحمدللہ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج سورۃ الشوریٰ کی تفسیر مکمل کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول اور منظور فرمائے اور میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے اسے صدقہ جاریہ بنائے، بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے اسے مشعل راہ بنائے، گم گشتگان راہ کو جادہ مستقیم کی طرف آنے کا ذریعہ بنائے، تشنگان قرآن و سنت کے لیے اسے سیرابی کا ذریعہ بنائے، آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ وآلہ واصحابہ الصلوٰۃ والتسلیم

خادم اسلام، **محمود الرشید حدوٹی عباسی**

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور۔ ۲ مارچ ۲۰۱۸ء

بروز جمعۃ المبارک بعد از اذان جمعہ ساڑھے بارہ بجے دوپہر

اضافات و ترمیمات: ۱۱ جون ۲۰۲۶ء بروز جمعرات، علی الصبح

حال وارد کاشانہ فقیر۔ حدوٹ۔ مری

سورۃ الزخرف (تعارف)

سوال سورۃ الزخرف کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الزخرف مکہ میں نازل ہوئی اس میں ۸۹ آیات اور ۷ رکوع ہیں اور تین ہزار چار سو حروف ہیں، تلاوت کی ترتیب میں یہ قرآن کریم کی ۴۳ ویں سورت ہے اور نزول کی ترتیب میں ۶۲ ویں سورت ہے، سورۃ الزخرف بھی مکی سورتوں کی طرح اسلامی عقائد، اصول وضوابط ایمان جیسے مضامین پر مشتمل ہے، اس میں بھی باقی مکی سورتوں کی طرح توحید ورسالت، بعث وجزا کے موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔

وجہ تسمیہ: سورۃ مبارکہ کا نام "سورۃ الزخرف" ہے، کسی چیز کے کامل حسن کو زخرف کہتے ہیں، اسی لیے صانع کو زخرف کہتے ہیں، رونق، زینت، چمک، سنگار یہ سب بھی اس کے معانی ہیں، جب بات کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو " زخرف القول " جھوٹی اور ملمع کی ہوئی بات کو کہتے ہے۔ (تیسر القرآن) سونے کو زخرف کہا جاتا ہے، اور کسی چیز پر سونے کی ملمع کاری کی جائے تو اس کو مزخرف کہتے ہیں، زمین پر رنگ بہ رنگ کا سبزہ اور پھول کھلے ہوں تو اس کو بھی مزخرف کہتے ہیں۔

سورۃ الزخرف میں ایک شاندار مثال بیان کی گئی ہے اور یہ مثال ختم ہو جانے والی دنیا کی ہے، چنانچہ یہ دنیا بظاہر بڑی آراستہ ومزین لگتی ہے، اس کی مثال بیان کی گئی ہے کسی آراستہ چمکتی ہوئی چیز کے ساتھ جس سے اکثر لوگ دھوکا کھا جائیں۔

اسی طرح اس دنیا کی عارضی چمک دمک سے بھی بہت سارے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں حالانکہ یہ دنیا اللہ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا نیکوکاروں کو بھی دی ہے اور فساق وفجار کو بھی، اچھے لوگ بھی اس دنیا میں اپنا حصہ لیتے ہیں اور برے لوگ بھی، رہی بات آخرت کی، سو اللہ تعالیٰ آخرت کی چمک دمک اور آرائشیں صرف اپنے پرہیز گار بندوں کو سونپے گا، دنیا دار فانی ہے اور آخرت دار بقا ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

مضامین سورۃ: سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں، یہ

دلائل اس وسیع و عریض کائنات سے تعلق رکھتے ہیں، آسمان و زمین میں پائے جاتے ہیں، پہاڑوں، صحراؤں، سمندروں، دریاؤں، آسمان سے برستے پانی، پانی کی سطح پر چلتے جہازوں اور اللہ تعالیٰ کے انسان کے لیے مسخر کیے ہوئے جانوروں میں بھی اس کی قدرت و وحدانیت کے دلائل موجود ہیں۔

سورۃ مبارکہ میں جاہلی معاشرہ کی منظر کشی بھی کی گئی ہے کہ جاہلی معاشرہ خرافات اور توہمات کا ملغوبہ تھا، چنانچہ اہل جاہلیت بیٹیوں کو ناپسند کرتے تھے اس کے باوجود اللہ کے لیے بیٹیاں پسند کرتے تھے، یہ ان کی انتہا درجے کی جہالت اور بے وقوفی ہے، ان کا گمان تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، چنانچہ آیات مبارکہ نے ان خرافات دنیا کی درستی کی تعلیم دی ہے۔

سورۃ مبارکہ میں اختصار کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر بات کی گئی ہے تاہم مشرکین کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کی ملت پر قائم ہیں، سورۃ مبارکہ میں ان کے اس دعویٰ کی تکذیب کی گئی ہے اور اس دلچسپ امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے آدمی ہیں جنہوں نے بتوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔

سورۃ مبارکہ میں مشرکین کے ایک کمزور و باطل شبہ پر تنقید کی گئی ہے، مشرکین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اعتراض کرتے تھے اور یہ تجویز پیش کرتے تھے کہ رسالت کسی مالدار اور صاحب جاہ و مرتبہ کو کیوں نہیں ملی، کیا ایک یتیم و فقیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ملنا تھا؟ آیات میں کھول کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ جاہ و ثروت انسانی کرامت و شرافت کے لیے میزان نہیں ہے، یہ دنیا حقیر و ذلیل ہے، اگر چاہے کفار پر اس کے دروازے کھول دے اور اپنے مؤمن بندوں پر بند کر دے۔

سورۃ مبارکہ میں موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا قصہ بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس قصہ سے اوپر بیان کی گئی حقیقت کی تاکید مقصود ہے، یہ وہی ظالم فرعون ہے جو اپنی بادشاہت پر دھوکا کھا گیا اور موسیٰ علیہ السلام پر فخر و کبر کرنے لگا جیسے یہ رؤسا قریش حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تکبر ظاہر کرتے تھے، دونوں کا نتیجہ غرق و تباہی ہوا، سورۃ مبارکہ کے آخر میں آخرت کے احوال اور شدائد بیان کیے گئے ہیں، اس ضمن میں اشقیا مجرمین کی حالت بھی بیان کی گئی ہے، جب کہ وہ دوزخ کی آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ (صفوۃ التفاسیر)

قرآن لوح محفوظ میں

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

حٰمٓ {۱} وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ {۲} اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ {۳} وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ {۴} اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ {۵} الزخرف

جواب ترجمہ: حٰمٓ، قسم ہے واضح کتاب کی، ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے، تاکہ تم سمجھو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمارے پاس لوح محفوظ میں بڑے اونچے درجے کی حکمت سے بھری ہوئی کتاب ہے۔ کیا ہم نصیحت کو تم سے اس وجہ سے ہٹالیں گے کہ تم حد سے بڑھ جانے والے ہو۔

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہیں جو اعجاز قرآن پر تنبیہ کے لیے لائے جاتے ہیں۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: یہ قسم جو اللہ نے اٹھائی ہے یعنی میں اس قرآن کی قسم اٹھاتا ہوں جو بالکل واضح اور جلی ہے، جو ہدایت کے راستے کو گمراہی کے راستے سے ممتاز کرتا ہے اور انسانیت جن شرعی احکام و دلائل کی محتاج ہے وہ انہیں بیان کرتا ہے۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: یہ مقسم علیہ ہے، یعنی ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا، جو کمال فصاحت و بلاغت پر مشتمل ہے، اس کا اسلوب محکم ہے اور بیان معجز ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ:** تاکہ تم اس کے احکام سمجھ سکو، اور اس کے معانی میں تدبر کرو، اور تاکہ تم اس بات کو سمجھ جاؤ کہ قرآن کا حکیمانہ اسلوب بشری طاقت سے باہر ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم اٹھائی ہے کہ یہ قرآن عربی زبان میں ہے جو کہ بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے، اس وضاحت سے مقسم اور مقسم علیہ میں مناسبت پیدا ہو گئی ہے، اس امر پر تنبیہ کرنے کے لیے قرآن سے اعلیٰ کوئی چیز نہیں ہے لہٰذا اس کی قسم اٹھائی، یہ چیز قرآن کے شرف و مرتبے اور عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ (حاشیہ زادہ علی البیضاوی ج ۲ ص ۳۸۸)

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا: یہ قرآن ہمارے پاس لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ: بلند شان والا اور عظیم مرتبے والا ہے، زبردست حکمت والا اور اونچے مرتبے والا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ملاء اعلیٰ میں قرآن کا شرف بیان کیا، تاکہ اہل زمین بھی اس کے شرف و عظمت کا اقرار کریں، آیت کا معنی: قرآن ہمارے پاس لوح محفوظ میں بڑے مرتبے اور مقام پر ہے اور شرف و فضل والا ہے۔ (مختصر ابن کثیر ج۳، بحوالہ صفوۃ التفاسیر)

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا: استفہام انکاری ہے، کیا ہم تم سے اس نصیحت کو اس بات پر ہٹا لیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو؟ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی سرکشی اور نافرمانی میں خواہ کتنے ہی حد سے گزر جاؤ لیکن ہم تمہیں قرآن کے ذریعہ نصیحت کرنا نہیں چھوڑیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت و تبلیغ کا کام کرتا ہو اسے ہر شخص کے پاس پیغام حق لے کر جانا چاہیے اور کسی گروہ یا جماعت کو تبلیغ کرنا محض اس بنا پر نہیں چھوڑنا چاہیے کہ وہ تو انتہا درجے کے ملحد بے دین یا فاسق و فاجر ہیں انہیں کیا تبلیغ کی جائے۔ (معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ) صَفْحًا: روگردانی، عربی مقولہ ہے ضَرَبْتُ عَنْهُ صَفْحًا میں نے اس سے اعراض کیا، اسے چھوڑ دیا۔

اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ: اس وجہ سے کہ حقیقت میں تم تکذیب و عصیان میں حد سے تجاوز کر جانے والے ہو؟ نہیں بلکہ ہم تمہیں نصیحت اور وعظ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تم راہ حق کی طرف لوٹ آؤ۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس وقت اوائل مشرکین اس قرآن کو رد کیا اگر اس وقت اٹھا لیا جاتے تو مشرکین ہلاک کر دیئے جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے قرآن کا نزول جاری رکھا یہاں تک کہ بیس سال تک انہیں اس کی طرف بلایا جاتا رہا۔ (التفسیر الکبیر، صفوۃ التفاسیر)

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: قتادہ رحمہ اللہ کا قول لطیف المعنی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم اور رحمت کی بدولت مشرکین کو خیر کی طرف بلانا نہیں چھوڑا اگرچہ مشرکین اس سے روگردانی کرتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم دیتا رہا تاکہ وہ شخص اس سے ہدایت حاصل کرے جس کے مقدر میں ہدایت لکھ دی گئی ہے، اور جس کے مقدر میں بدبختی اور شقاوت لکھ دی گئی ہے اس پر تاکہ حجت قائم ہو جاتے۔ (مختصر ابن کثیر، صفوۃ التفاسیر للصابونی)

خلاصہ یہ کہ مشرکین، مخالفین اور معاندین کی چاہت پر ہم قرآن کریم کو تم سے روک نہیں سکتے کہ انہیں کوئی حکم نہ دیا جائے اور انہیں ان کی شنیع حرکات سے روکا ٹوکا بھی نہ جائے، ایسا نہیں ہو گا بلکہ مشرکین، مخالفین اور معاندین کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی تلاوت بھی ہوتی رہے گی، قرآن کی تفسیر بھی ہوتی رہے گی، قرآن اللہ کے پیغام کے طور پر پیغمبر سناتے رہیں گے۔

انبیاء کرام علیہم السلام، معاندین کا رویہ، خالق ارض وسماوات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ {٦} وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ {٧} فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ {٨} وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ {٩} الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ {١٠} وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ {١١} الزخرف

جواب ترجمہ: اور ہم نے پہلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے، اور ان کے پاس جو بھی کوئی نبی آتا تھا اس کا مذاق بناتے تھے۔ پھر ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو زور آوری میں خوب بڑھ کر تھے اور پہلے لوگوں کی یہ حالت گزر چکی ہے۔ اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ انہیں عزیز علیم نے پیدا فرمایا۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنا دیا اور تمہارے لیے اس نے راستے بنا دیئے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ: نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے یعنی کتنے زیادہ انبیاء علیہم السلام ہم نے پچھلی امتوں میں بھیجے ہیں۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: ان کے پاس جو نبی بھی آیا اس کا مذاق اڑایا، صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے اور معنی ہے: اے محمد! آپ تسلی رکھیں اور غمگین نہ ہو، جو مشکلات آپ کو پیش آ رہی ہیں آپ سے پہلے انبیا کو بھی پیش آئی ہیں۔ (الصاوی)

فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا: ہم نے ایسی قوم کو بھی ہلاک کیا ہے جو کفار مکہ سے زیادہ طاقتور اور سرکش تھی۔ وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ: قرآن میں ان کی ہلاکت کے قصے گزر چکے ہیں تاکہ ان کے بعد آنے والے مکذبین کے لیے عبرت اور نصیحت بن جائیں۔

امام فخر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کفار مکہ کفر و تکذیب میں اپنے سے پہلی امتوں کے نقش قدم پر چلے ہیں، انہیں ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ان پر بھی پہلی امتوں جیسا عذاب نازل ہو سکتا ہے، ہم نے ان کے قصے عبرت کے لیے بیان کر دیے ہیں۔ (التفسیر الکبیر)

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ: اے محمد! اگر ان مشرکین سے آپ سوال کریں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو اس عجیب و غریب شکل و صورت میں پیدا کیا ہے؟

لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ: وہ ضرور کہیں گے کہ صرف ایک اللہ نے جو غالب اور علم والا ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے خالق اور موجد ہونے کا اقرار کریں گے لیکن بعد میں اس کے ساتھ غیر اللہ کی عبادت کرنے لگ جاتے ہیں، یہ ان کی جہالت اور نافرمانی ہے۔ (تفسیر القرطبی، صفوۃ التفاسیر) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات جلیلہ بیان فرمائی ہیں جو اس کی کمال قدرت اور حکمت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا: وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونے کی طرح پھیلا دیا، اسی پر تمہیں قرار و سکون ملتا ہے اس پر تم چلتے ہو اور سوتے ہو۔

وَجَعَلَ لَـكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا: زمین میں تمہارے لیے راستے بنائے تم اپنے اسفار میں ان راستوں پر چلتے ہو۔ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ: تاکہ تم خالق و حکیم ذات کی قدرت کی طرف راہ پاؤ، وہی تو ہے جو اس عجیب نظام کا چلانے والا ہے۔

وَالَّذِىۡ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ: اسی نے اپنی قدرت سے آسمان سے متعین مقدار اور وزن کے ساتھ پانی نازل کیا جو بحسب حاجت اور بحسب کفایت ہوتا ہے۔ بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی اتنی مقدار میں جو نفع پہنچاتی ہے، نقصان و ضرر نہیں پہنچاتی۔ (تفسیر البیضاوی، صفوۃ التفاسیر)

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا: اس پانی کے ذریعے ہم مردہ و بنجر زمین کو سبزہ کے ساتھ زندہ کر دیتے ہیں۔
كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: وہی تو ہے جس نے حیوانات اور نباتات وغیرہ کی مختلف انواع و اقسام پیدا کیں۔
ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ازواج بمعنی انواع و اقسام ہے، جیسے میٹھا، کٹھا، سفید، سیاہ، نر و مادہ۔ (حاشیۃ الجمل علی الجلالین، صفوۃ التفاسیر)

انسانی سواری کے لیے اللہ کی نعمتیں

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ {۱۲} لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ {۱۳} وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ {۱۴} الزخرف

جواب ترجمہ: اور جس نے تمام اقسام کو پیدا فرمایا اور تمہارے لیے کشتیاں اور جانوروں میں سے وہ چیزیں پیدا فرمائیں جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پشتوں پر بیٹھ جاؤ پھر اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو جب تم اس پر بیٹھ جاؤ اور تم یوں کہو پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے لیے مسخر فرما دیا اور ہم اس کو قابو میں کرنے والے نہ تھے۔ اور بیشک ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: اللہ تعالیٰ نے جوڑے پیدا کیے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: تمام قسم کی اصناف پیدا کیں، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: جس نے موسم سرما، موسم گرما، رات، دن، آسمان، زمین، سورج، چاند، جنت اور جہنم کو پیدا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا: حیوانوں میں سے مذکر اور مونث پیدا کیے؛ یہ ابن عیسیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا: نباتات کے جوڑے مراد ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ۔ (ق) مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ۔ (لقمان: ۱۰) ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد ایمان و کفر، نفع و نقصان، فقر و غنا اور صحت و بیماری ہیں جو انسان میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ: اور تمہارے لیے سمندر کے بیڑے مسخر

کر دیئے ہیں اور خشکی میں اونٹ مسخر کر دیئے ہیں، جو تمہارے اسفار کے دوران سواری کے کام آتے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ نے بحری جہازوں اور اونٹوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا اور تمہارے کام میں لگا دیا، ان سے کام لینا تمہارے لیے آسان کر دیا، تم اونٹوں کا گوشت کھاتے ہو اور ان پر سواری بھی کرتے ہو۔ (مختصر ابن کثیر، صفوۃ التفاسیر)

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ: تاکہ تم اس سواری کی پشت پر جم کر بیٹھ سکو، خواہ وہ سواری کشتی ہو یا اونٹ ہو۔

ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ: تاکہ جب تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کی اس نعمت جلیلہ کو یاد کرو اور پھر اپنے دلوں سے اس کا شکر ادا کرو۔

وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا: اور تاکہ تم اپنی زبانوں سے سوار ہوتے وقت کہو: پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری پر سوار ہونا ہمارے لیے آسان کر دیا۔

وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ: ورنہ ہم تو اس پر سوار ہونے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، اگر اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے مسخر نہ کر دیتا ہمارے لیے اس پر سوار ہونا دشوار کام تھا۔

وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ: بلاشبہ ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اور موت کے بعد اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

بیضاوی کے حاشیے میں لکھا ہے: ذکر نعمت سے اس کا تصور مراد نہیں اور یہ بھی مراد نہیں کہ یہ نعمت دل میں کھٹکے بلکہ مراد یہ ہے کہ اتنی بات یاد رہے کہ یہ نعمت علیم و حکیم اور قادر ذات کی تدبیر سے حاصل ہوئی ہے جو کہ رب تعالیٰ کی طاعت و عبادت کا تقاضا کرتی ہے، حقیقت میں جو شخص اس بات میں غور و فکر اور تدبر کرتا ہے کہ وہ سواری جس پر یہ سوار ہونا چاہتا ہے چاہے بحری بیڑا ہو یا جانور ہو (یا آج کی مروجہ سواریاں ہوں) وہ راکب کی بنسبت قوت و جثہ میں کہیں بڑھ کے ہے، بایں ہمہ وہ سواری راکب کے لیے مسخر ہے اور سوار اسے جس طرف چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ (حاشیہ بیضاوی، صفوۃ التفاسیر)

اسی طرح جو شخص اس بات میں غور و فکر کرتا ہے کہ سمندر اور ہوا کو اللہ نے پیدا کیا اور ان دونوں کو اس کے کام میں لگا دیا یا باوجود یہ کہ شدید خوف اور خطرات لاحق ہوتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی

عظمت و کبریائی کی معرفت میں ڈوب جاتا ہے، اس کی قدرت اور حکمت کا اعتراف کرنے لگتا ہے، یہ استغراق اسے یوں کہنے پر مجبور کرتا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۔ (حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی، صفوۃ التفاسیر)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سواری پر بیٹھ کر پڑھنے کی دعا ہے۔ چنانچہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ آپ سواری پر بیٹھتے وقت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور سوار ہونے کا پورا مستحب طریقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ سواری پر پاؤں رکھتے وقت بسم اللہ کہے، پھر سوار ہو جانے کے بعد الحمد للہ اور اس کے بعد یہ کلمات سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ تک (قرطبی) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر آپ کسی سفر پر جا رہے ہوتے تو مذکورہ کلمات کے بعد یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔ (قرطبی)

اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ (مسلم)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي إِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے، یہ بات مشینی سواریوں پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح جانوروں اور چوپایوں پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کا خام مواد پیدا نہ کرتا، یا اس میں وہ خواص و آثار نہ رکھتا یا انسانی دماغ کو ان خواص کے دریافت کرنے کی طاقت نہ بخشتا تو ساری کائنات مل کر بھی ایسی سواریاں پیدا نہ کر سکتی تھی۔ (معارف القرآن)

مشرکین شرک کی انتہاؤں پر

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ {۱۵} الزخرف

جواب ترجمہ: اور ان (مشرک) لوگوں نے یہ بات بنائی ہے کہ اللہ کا خود اس کے بندوں میں سے

کوئی جزء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلم کھلا ناشکرا ہے۔

خلاصہ تفسیر: مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں،، یہاں سے ان کے اس عقیدے کی تردید کی جارہی ہے اور اس کے خلاف چار دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اولاد ہونا ناممکن ہے، اس لئے کہ اولاد ماں باپ کا جزء ہوتی ہے، کیونکہ وہ ان کے نطفے سے پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کوئی جزء نہیں ہو سکتا وہ ہر قسم کے اجزا سے پاک ہے۔ لہذا اس کی کوئی اولاد نہیں ہو سکتی۔ (توضیح القرآن)

اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ {١٦}وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ {١٧}اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ{١٨} الزخرف

جواب ترجمہ: کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں پسند کیں اور تمہیں بیٹوں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو جب اس (بیٹی) کی (ولادت) خوشخبری دی جاتی ہے جو اس نے خدائے رحمن کی طرف منسوب کر رکھی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے۔ اور کیا (اللہ نے ایسی اولاد پسند کی ہے) جو زیوروں میں پالی پوسی جاتی ہے اور جو بحث مباحثے میں اپنی بات کھل کر بھی نہیں کہہ سکتی؟

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ: ان کی حالت پر انکار و تعجب ہے یعنی کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بیٹیاں بنائی ہیں اور تمہیں بیٹوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے؟ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مشرکین پر انتہا درجے کا انکار اور رد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ: شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ ان مشرکین کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ اپنے لئے بیٹیوں کی ولادت کو عار سمجھتے

ہیں اور اگر کسی کے یہاں کوئی لڑکی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اس پر بہت مغموم ہوتا ہے، اب یہ عجیب بات ہے کہ بیٹی کو خود اپنے لئے تو عیب سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی بیٹیاں ہیں، اس عقیدے کی رو سے فرشتے مؤنث قرار پاتے ہیں، حالانکہ وہ مؤنث نہیں ہیں۔

مفتی صاحب لکھتے ہیں " اگرچہ عورت ہونا حقیقت میں کوئی عیب یا عار کی بات نہیں ہے، لیکن عام طور سے عورتوں کی صلاحیتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں، کیونکہ ان کی زیادہ توجہ زیورات اور زیب وزینت کی طرف رہتی ہے، اور اپنی بات کو خوب واضح کر کے کہنے کی صلاحیت بھی اکثر ان میں کم ہوتی ہے، لہذا اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کو کوئی اولاد رکھنی منظور ہوتی تو وہ مؤنث ہی کا کیوں انتخاب فرماتا۔ (توضیح القرآن)

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یعنی ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ اگر ان کو بتایا جائے کہ ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو ان کے گھر میں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ چہروں پر مایوسی کی سیاہی پھیل جاتی ہے۔ دل غم واندوہ سے بھر جاتا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایسی جنس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں انہیں حیا نہیں آتی، ان کی بیوی، بیٹی جنے تو گھر میں آنا جانا بند کر دیتے ہیں، ان کی چہیتی بیگم ان کو چڑیل کی مانند ڈراؤنی نظر آنے لگتی ہے۔ ایک عرب عورت اپنے خاوند کی اس بے رخی کو یوں بیان کرتی ہے:

مَا لابِی حَمزَۃَ لَا یَاتِینَا　　یَظِلُّ فِی البَیتِ الَّذِی یَلِینَا
غَضبَانَ اَن لَّا نَلِدُ البَنِینَا　　وَاِنَّمَا نَاخُذُ مَا اُعطِینَا

یعنی میرے خاوند ابو حمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ اب وہ ہمارے ہاں آتا ہی نہیں اور ساتھ والے مکان میں ہی رہتا ہے۔ وہ اس لئے غضب ناک ہے کہ ہم بیٹے کیوں نہیں جنتیں۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہمیں جو ملتا ہے وہی ہم لیتی ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

کیسی ناانصافی ہے کہ رحمٰن اور رحیم رب کی طرف تو وہ اس بات کی نسبت کریں کہ فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں، جب خود انہیں بیٹی کی ولادت کی اطلاع دی جاتی ہے تو ان کے چہرے کوئلے کی طرح سیاہ

ہو جاتے ہیں، وہ غم واندوہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ ھم وکرب کے گہرے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں، یہ بے انصاف لوگ اللہ کے لیے وہ چیزیں کیسے اور کیونکر پسند کرتے ہیں جن کا خود نام تک سننا پسند نہیں کرتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان تمام نسبتوں سے، ان واہیات باتوں سے منزہ، مبرا اور پاک ہے، اللہ کافروں اور مشرکوں کے منہ سے نکلنے والی ان ہفوات اور ہرزہ سرائیوں سے بہت ہی بلند وبالا ہے۔

مشرکین کی ایک بے ہودہ دلیل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ {۱۹} وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ {۲۰} اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ {۲۱} الزخرف

جواب ترجمہ: اور ان لوگوں نے فرشتوں کو عورتیں قرار دے دیا جو اللہ کے بندے ہیں، کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے، ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جاتا ہے اور ان سے باز پرس ہو گی۔ اور ان لوگوں نے کہا کہ اگر رحمان چاہتا تو ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کرتے، انہیں اس بات کی کچھ بھی تحقیق نہیں وہ محض اٹکل سے بات کرتے ہیں۔ کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کتاب دی ہے جس سے وہ دلیل پکڑتے ہیں؟

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ: مشرکین کا ایک اور کفر ہے جو ان کے شنیع قول کے ضمن میں ہے یعنی مکار عرب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فرشتے (جو اللہ تعالیٰ کے کامل بندے ہیں اور اللہ کے ہاں عزت والے ہیں) مونث (لڑکیاں) ہیں۔

اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ: جس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں کو پیدا کر رہا تھا کیا اس وقت مشرکین ادھر حاضر تھے یہاں تک کہ انہیں پتہ چل گیا کہ فرشتے مونث ہیں؟ یہ مشرکین کی جہالت اور ڈھیٹ پن ہے۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ: ہم فرشتوں کو حکم دیں گے کہ مشرکین کے نامہ ہائے اعمال

میں ان کی جھوٹی گواہی لکھ لیں، پھر قیامت کے دن اس بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا، یہ تہدید کے ساتھ شدید وعید بھی ہے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے کفار عرب کی طرف سے تین شنیع اقوال نقل کیے ہیں۔ ① مشرکین نے اللہ کی طرف اولاد منسوب کی۔ ② اللہ کی طرف لڑکیوں کی نسبت کی نہ کہ لڑکوں کی۔ ③ انہوں نے مقرب فرشتوں کو مونث قرار دے دیا، ان تین دعاوی پر مشرکین کے پاس کوئی دلیل نہیں، کوئی حجت نہیں، قرآن کریم نے ان اقوال کی تکذیب کی ہے، وہ پھر بھی گمراہی میں بڑھتے گئے اور سمجھتے تھے کہ ہماری گمراہی اللہ کی رضامندی سے ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ: یہ بات قریش کے مشرکین نے کہی تھی کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم اس کے علاوہ کسی کی بھی پوجا پاٹ اور بندگی نہ کرتے، ان مشرکین قریش کی یہ دلیل بودی اور باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حجت قائم کر دی ہے، اس نے اتمام حجت کے لیے اپنے عظیم الشان رسول بھیجے، اس نے اتمام حجت کے لیے اپنی عظیم الشان، مدلل، مفصل کتابیں نازل فرمائیں، اس لیے ان مشرکین کا قضاوقدر کو دلیل پکڑنا یہ ابطل الباطل دلیل ہے، حالانکہ انہیں اللہ کے رسول تشریف لا کر ڈرا چکے ہیں، اس لیے ان کے منہ سے نکلنے والی اس بے حیثیت دلیل کی کوئی وقعت نہیں ہے اور نہ ہی یہ قابل قبول ہے، جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کا علم انہیں خود بھی نہیں ہے وہ محض ہوا میں تیر چلاتے ہیں، وہ اٹکل اور اندازے سے باتیں کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی خیر کی بات یا کوئی بہترین دلیل موجود ہی نہیں ہے۔

صاحب تدبر قرآن فرماتے ہیں کہ اپنی اس حماقت کی تائید و تصویب میں مشرکین جو شرعی دلیل پیش کرتے یہ اس کا حوالہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان کو پوجنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کو ان کی عبادت پسند ہے۔ اگر یہ چیز اس کو پسند نہ ہوتی تو اس کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی مشیت کے زور سے اس کو روک دیتا اور ہم ان کی عبادت نہ کر پاتے۔

جواب میں فرمایا کہ یہ محض ان کی اٹکل پچو باتیں ہیں، اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے، خدا کی پسند ناپسند کے جاننے کا یہ ذریعہ نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی برائی کے کرنے کی ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر چور، ہر زانی، ہر بدمعاش اپنی چوری اور بدمعاشی کے جواز بلکہ استحسان کی تائید میں پیش کر سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اپنی مشیت کے زور سے اس کو روک دیتا لیکن جب اس نے اس کو نہیں روکا تو اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کی مرضی سے کیا اور ہمارا یہ فعل اس کو پسند ہے۔ (تدبر قرآن)

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ: مشرکین پر ایک اور رد ہے، یعنی بھلا کیا ہم نے ان کو قرآن سے پہلے کوئی کتاب دی تھی جسے تھامے ہوئے ہیں اور اس کی توجیہات پر عمل کرتے ہیں؟ امام فخر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کیا انہوں نے قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب میں یہ باطل پایا ہے یہاں تک کہ اس پر کاربند ہو گئے اور اسے تھام لیا؟ (التفسیر الکبیر)

اپنے آباؤ اجداد کی پیروی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ {۲۲} الزخرف.

جواب ترجمہ: نہیں، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کے مطابق ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر: امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں امت ہر اس گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں جو کسی چیز میں مجتمع ہو اور اس کا کوئی جامع ہو، خواہ اس کا جامع دین واحد ہو یا زمان واحد ہو یا مکان واحد ہو، خواہ کسی چیز نے اس کو تسخیراً اور جبراً جمع کیا ہو یا اختیاراً جمع کیا ہو۔ تسخیراً جمع کرنے کی مثال یہ آیت ہے، وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اپنے پروں سے اڑنے والا ہر پرندہ تمہاری مثل ایک امت (گروہ) ہے۔ (سورۃ الانعام ۳۸)

یعنی ان میں سے ہر گروہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص طبیعت میں مسخر کیا ہوا ہے، جیسے مکڑیوں کا

گروہ بالطبع جالا بنانے والا ہے، یا بالطبع خوراک کا ذخیرہ بنانے والا ہے جیسے چیونٹیاں، یا گھونسلا بنانے والا ہے جیسے چڑیا اور اس طرح کے اور پرندے یا پھلوں اور پھولوں کا رس چوس کر ایک چھتے میں جمع کرنے والا ہے جیسے شہد کی مکھیاں۔

اور یا وہ گروہ اپنے اختیار سے ایک نظریہ پر قائم ہونے والا ہو، اس کی مثال یہ آیت ہے كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (البقرہ:۲۱۳) یعنی سب لوگوں کا ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ اور نظریہ تھا، وہ سب کفر اور گمراہی میں متفق اور مجتمع تھے، اسی طرح یہ آیت ہے وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً (ھود:۱۱۸) اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کی ایک امت بنا دیتا۔ یعنی سب لوگوں کو اللہ پر ایمان لانے میں مجتمع اور متحد کر دیتا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقے پر، ایک مذہب پر اور ایک دین پر پایا۔

وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے طریقے اور راستے پر چلنے والے ہیں۔ ان لوگوں نے عقلی اور نقلی دلائل کی پیروی نہیں کی، انہوں نے فکر و نظر سے کام نہیں لیا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی رسالت اور معاندین کی بد سلوکی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ {۲۳} قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ {۲۴} فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ {۲۵} الزخرف

جواب ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے جس کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یوں کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے طریقوں کا اقتداء کرنے والے ہیں، ان کے پیغمبر نے کہا کیا اگرچہ میں تمہارے پاس اس سے بڑھ کر ہدایت والی

چیز لایا ہوں جس پر تم نے اپنے دادوں کو پایا ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ جس چیز کو دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں، سو ہم نے ان سے انتقام لے لیا۔ سو دیکھ لیجیے جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ : جس طرح یہ کفار بغیر کسی حجت و برہان کے اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ان سے پہلے مکذبین بھی ایسا ہی کرتے تھے، ہم نے آپ سے پہلے جس امت میں جو رسول بھی مبعوث کیا۔

اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ: مگر یہ کہ اس بستی کے آسودہ حال لوگوں جنہیں عیش و عشرت نے اترانے پر مجبور کر دیا تھا اور نفسانی خواہشات اور لہو و لعب کی راہ حق میں مشقت برداشت کرنے سے انہیں اندھا کر دیا تھا، نے کہا: ہم نے اپنے اسلاف کو ایک دین اور ایک ملت پر پایا ہے اور ہم انہی کے راستے پر چلتے ہیں اور ان کی تقلید کرتے ہیں۔

بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے اور اس بات پر دلالت بھی ہے کہ اس طرح کی تقلید پرانی گمراہی ہے چونکہ ان کے اسلاف ایسی سند نہیں تھے جس پر اعتماد کیا جائے، آیت میں مترفین یعنی آسودہ حال لوگوں کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے چونکہ عیش کوشی نے ان کو اندھی تقلید سے باہر نکلنے ہی نہیں دیا۔ (تفسیر البیضاوی) یہاں مقتدون: کہا اور اوپر مھتدون: کہا، یہ محض تفنن کے لیے ورنہ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ: ہر نبی نے اپنی قوم سے کہا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب سے ڈرایا: کیا تم اپنے آباؤ اجداد کی اقتدا کرتے رہو گے، اگر میں تمہارے پاس ایسا دین لے کر آؤں جو تمہارے آباؤ اجداد کے دین سے زیادہ ہدایت والا اور زیادہ راہ راست پر لانے والا ہو؟

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ : تم توحید، ایمان، بعث و نشور جن تعلیمات و عقائد کو لے کر آئے ہو ہم انہیں ماننے والے نہیں ہیں۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ: ہم نے تکذیب کرنے والی امتوں سے انتقام لیا اور انہیں انواع و اقسام کے عذاب سے دوچار کیا، دیکھو ان کا مآل و حال کیا ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شرک سے براءت کا اعلان

سوال ان آیات کا ترمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ{۲۷}اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ{۲۷} الزخرف

جواب ترجمہ: اور جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ بلاشبہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس ذات کے جس نے مجھے پیدا فرمایا، سو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے ہدایت دیتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے قریب مشرکین کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے ان کے علاقہ کے لوگ بت پرست بھی تھے اور ستارہ پرست بھی، ان کا باپ بھی مشرک بت پرست تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کو توحید کی دعوت دی لیکن ان لوگوں نے نہ مانا اور حق کو قبول نہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واضح طور پر اعلان فرمادیا کہ

اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ: میں تمہارے معبودوں سے بری اور بیزار ہوں، میں ان کی پوجا اور پرستش نہیں کروں گا جس طرح تم ان کی پوجاپاٹ میں لگے ہوئے ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا

اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ: میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا اسی نے مجھے ہدایت دی اور مجھے ہدایت پر رکھے گا لفظ فَطَرَنِيْ میں تعریض ہے کہ تم لوگ حماقت کے کام میں لگے ہوئے ہو، تمہیں بھی اسی نے پیدا کیا جس نے مجھے پیدا کیا لہٰذا پیدا کرنے والے کی عبادت کرو۔

فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ وہ ذات مجھے اپنے دین کی طرف راہنمائی کرے گی اور وہی ذات مجھے اطاعت کی توفیق عطا کرے گی، وہ ذات عالی مجھے دین حق پر ثابت قدمی اور استقامت عطا کرے گی، سَيَهْدِيْنِ کے شروع میں یہاں ''س'' تاکید کے لیے ہے، سوف کے معنیٰ میں نہیں ہے، یہاں ماضی کی بجائے مضارع کا صیغہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہ استمراری کام ہے۔

دعاؤں کے نسلوں میں اثرات

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ وہ کون سا کلمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں باقی چھوڑا تھا؟

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ {۲۸} الزخرف

جواب ترجمہ: اور اس نے اپنے بعد میں آنے والی اولاد میں باقی رہنے والا کلمہ چھوڑ دیا تاکہ وہ باز آئیں۔

خلاصہ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لوگوں کو توحید کی دعوت دی، اللہ کو ایک ماننے کی دعوت دی تو انہوں نے انکار کر دیا، جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے برأت کا اعلان کر دیا تھا، پھر اس توحیدی عقیدہ کو صرف اپنے تک ہی نہ رہنے دیا بلکہ اپنے بعد میں آنے والوں کو بھی یہ پیغام دے گئے کہ وہ اس عقیدہ توحید پر قائم رہیں، اپنی اولاد کے لیے دعائیں بھی کرتے رہے کہ وہ عقیدہ توحید پر قائم رہیں، ان کی ان دعاؤں کا اثر ہی تھا کہ ان کی اولاد میں اہل توحید کی ایک بڑی تعداد ہر دور میں موجود رہی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک بھی ایسے لوگ اولاد ابراہیمی میں موجود رہے جو فطرف سلیم رکھتے تھے، وہ اتنا طویل ترین عرصہ گزرنے کے باجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عقیدہ توحید پر ڈٹے رہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ اور گفتگو کو آپ کے خاندان میں باقی رہنے والا بنا دیا تو وہ آپ کی اولاد اور اولاد کی اولاد ہے یعنی وہ ورثہ در ورثہ غیر اللہ کی عبادت سے برأت کا اظہار کرتے رہے اور انہوں نے اس معاملہ میں ایک دوسرے کو وصیت کی۔ عقب اسے کہتے ہیں جو بعد میں آتا ہے، سدی رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہے، حضرت ابن عباس نے کہا: فی عقبہ سے مراد ہے فی خلفہ کے بعد آنے والوں میں کلام میں (ا)۔ تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام یوں ہو گی فَإِنَّهُ سَيَهْدِيْنِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ یعنی انہیں بات کہی ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پلٹ آتے اور وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ یہ بات ان کے لیے اس لیے فرمائی تاکہ وہ

غیر اللہ کی عبادت سے توبہ کریں، حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: کلمہ سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔

② قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ ایسے افراد ہوں گے جو قیامت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں گے۔

③ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: کلمہ سے مراد ہے لا تعبدوا الا اللہ (ہود:۲۶) ④ عکرمہ نے کہا: اس سے مراد اسلام ہے ⑤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (الحج:۷۸)

قرظی رحمہ اللہ نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو جو وصیت کی وہ یہ تھی يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ (بقرہ:۱۳۲) اسے ان کی اولاد میں باقی رہنے والا کلمہ بنا دیا ہے۔

ابن زید نے کہا: کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا فرمان: اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (البقرہ) ہے اور یوں پڑھا هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (الحج:۷۸) ایک قول یہ کیا گیا ہے: کلمہ سے مراد نبوت ہے۔

ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا: نسلوں میں وہ کلمہ باقی رہا جو کئی زمانوں تک قائم رہا اور آپ کی ان دو دعاؤں کی بدولت ہوا جو آپ علیہ السلام نے مانگی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں قبول فرمایا تھا، ان دو دعاؤں کا ان آیات میں ذکر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: ٹھیک ہے مگر ان میں سے جو ظالم ہوا اس کے لیے کوئی عہد نہیں۔ (سورۃ البقرہ ۱۲۴)

دوسری دعا ابراہیم علیہ السلام نے یہ مانگی تھی کہ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراھیم ۳۵) مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: پہلی دعا یہ تھی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (الشعراء ۸۴) ہر امت نے آپ کی تعظیم کی وہ آپ کی اولاد میں سے تھے یا غیروں میں سے تھے جو ان لوگوں میں سے تھے جو حضرت سام یا حضرت نوح علیہ السلام میں آپ کے ساتھ جمع ہوئے تھے۔ (تفسیر قرطبی)

ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا: یہاں عقب کا ذکر معنی میں ملا ہوا ہے یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو احکام میں داخل ہیں اور ان پر عمریٰ (عمر بھر کے لیے کسی کو کوئی چیز نفع اٹھانے کے لیے دینا) محبوس کرنے

کے احکام مرتب ہوتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: أَيُّمَا رَجُلٍ أَعْمَرَ عُمْرَى لَهُ وَلِعَقِبِهِ فَإِنَّهَا لِلَّذِي أُعْطِيهَا لَا تَرْجِعُ إِلَى الَّذِي أَعْطَاهَا لِأَنَّهُ أَعْطَى عَطَاءً وَقَعَتْ فِيهِ الْمَوَارِيثُ جو چیز کسی نے کسی کو عمر بھر کے لیے دی تو وہ چیز اس شخص کی ہے اور اس کی اولاد کی ہے، جس نے وہ چیز دی ہے اس کی طرف وہ نہ لوٹے گی کیونکہ اس نے ایسے انداز میں چیز دی ہے جس میں میراث جاری ہوتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ گیارہ الفاظ کے لیے آتا ہے۔ ① ولد، جب اسے مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہے جو مرد اور اس کی بیوی سے پایا جائے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہوں اور یہ میراث لڑکے کی اولاد پر شرعی اور لغوی طور پر جاری ہوگی، لڑکی کی اولاد پر جاری نہیں ہوگی، اس لیے کہ وہ دوسری قوم سے بھی ہوسکتے ہیں، اسی لیے وہ اس لفظ کے تحت نہیں آئیں گے۔

② دوسرا لفظ بنون ہے اگر کوئی آدمی یہ کہتا ہے: یہ میرے بیٹے کے لیے وقف ہے، تو یہ حکم معین بچے سے تجاوز نہ کرے گا اور نہ ہی اس سے متعدد افراد مراد لیے جائیں گے اگر اس نے ولدی کا لفظ استعمال کیا تو وہ اس سے متجاوز ہوگا اور اولاد میں سے ہر فرد کے لیے حکم ثابت ہوگا اگر اس نے بنی کا لفظ ذکر کیا تو اس میں مذکر اور مونث سب شامل ہونگے۔

③ ذریۃ: یہ لفظ ذرأ اللہ الخلق سے ماخوذ ہے اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ الخ

④ عقب: لغت میں اس کا معنی ہے کوئی شے جب کسی شے کے بعد ہو وہ اس کی جنس سے ہو یا اس کی جنس سے نہ ہو، یہ جملہ کہا جاتا ہے: اعقب اللہ بخیر یعنی اللہ تعالیٰ نے سختی کے بعد خوشحالی دی، اعقب الشیب لسواد، سیاہ بالوں کے بعد سفید بال آئے۔ عقب یعقب عقوبا وعقبا اسی وجہ سے انسان کی اولاد کو اس کی عقب کہتے ہیں معقاب من النساء وہ عورت جو مونث کے بعد مذکر جنے اسی طرح ہمیشہ سلسلہ رہے۔ عقب الرجل۔ اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد جو اس کے بعد رہے۔ عاقبۃ سے مراد اولاد ہوتی ہے۔

ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد بچے اور بچے کی اولاد ہے، دوسرے علماء نے وہ کہا جو سدی

سے مروی ہے صحاح میں ہے: عقب ایڑی کو کہتے ہیں یہ مئونث ہے عقب الرجل سے مراد اولاد اور اولاد کی اولاد ہے۔

⑤ نسلی، ہمارے علماء کے نزدیک یہ ولدی اور ولد ولدی کے قول کی طرح ہے، اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل ہے ان کا داخل ہونا ضروری ہے کیونکہ نسل کا معنی نکلنا ہے بچیوں کی اولاد ایک اعتبار سے نکلی ہے وَلَمْ يَقْتَرِنْ بِهِ مَا يَخُصُّهُ كَمَا اقْتَرَنَ بِقَوْلِهِ عَقِبِي مَا تَنَاسَلُوا، اس کے ساتھ وہ مقترن نہیں ہو گا جو اسے خاص کرے جس طرح نسلی عقبی کے ساتھ مقترن ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض علماء نے کہا: نسل، ولد اور عقب کے معنیٰ میں ہے اس میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں مگر اس صورت میں کہ صدقہ وقف کرنے والا یہ کہے نَسْلِي وَنَسْلُ نَسْلِي جس طرح وہ یہ کہے: عَقِبِي وَعَقِبُ عَقِبِي مگر جب وہ یہ کہے ولدی یا کہے عقبی تو اس میں بیٹیاں داخل نہ ہوں گی۔

⑥ آل ہے اور آل وہی اہل ہیں۔ ⑦ اھل ساتواں لفظ ہے، ابن قاسم نے کہا: یہ دونوں (آل اور اہل) برابر ہیں اس سے مراد عصبات، بھائی، بیٹیاں اور پھوپھیاں ہیں اس میں خالائیں داخل نہیں ۔

⑧ قرابۃ اس میں چار اقولا ہیں (۱) امام مالک نے محمد بن عبدوس کی کتاب میں کہا: اس سے مراد قریب ترین پھر قریب ترین ہیں، یہ اجتہاد کے قاعدہ کی بنا پر ہے اس میں بیٹیوں اور خالاؤں کی اولاد شامل نہیں (۲) باپ اور ماں کی جانب سے قریبی اس میں داخل ہیں، یہ علی بن زیاد نے کہا۔

(۳) اشہب نے کہا: مردوں اور عورتوں کی جانب سے ہر ذی رحم اس میں شامل ہے۔ (۴) ابن کنانہ نے کہا: اس میں چچے، پھوپھیاں، خالو، خالائیں اور بھانجیاں داخل ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قُلْ لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى (الشوری : ۲۳) کی تفسیر میں کہا: مگر یہ کہ تم اس رشتہ کو جوڑ دو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، کہا: قریش کا کوئی خانوادہ نہیں تھا مگر اس کے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رشتہ داری تھی۔

⑨ العشیرہ: صحیح جامع حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ

استعمال فرمایا ہے، جیسے ارشاد ہے وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (الشعراء ۲۱۴) جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا تو نبی کریم ﷺ نے قریش کے خاندانوں کو دعوت دی، چونکہ عشیرہ کا اطلاق قریبیوں اور غیر قریبیوں سب پر ہوتا ہے، جب کہ یہ لفظ اجتہادی طور پر خاص قریبیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

⑩ قوم: اسے عصبات میں خصوصاً مردوں پر بولا جاتا ہے عورتیں اس میں شامل نہیں جب کہ لفظ قوم مردوں اور عورتوں دونوں کو جامع ہے اگرچہ شاعر نے کہا:

وَمَا أَدْرِي وَسَوْفَ إِخَالُ أَدْرِي ... أَقَوْمٌ آلُ حِصْنٍ أَمْ نِسَاءُ

لیکن یہ ارادہ کیا کہ جب آدمی مدد کے لئے اپنی قوم کو بلاتا ہے تو مرد مراد لیتا ہے اور جب حرمت کے لئے انہیں بلاتا ہے تو اس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوتی ہیں صفت اسے عام کرتی ہے اور قرینہ اسے خاص کرتا ہے۔

⑪ موالی: امام مالک نے کہا، اس میں اس کے اپنے موالی کے ساتھ اس کے باپ اور بیٹے کے موالی بھی داخل ہوتے ہیں۔ ابن وہب نے کہا، اس میں موالی کی اولاد بھی شامل ہوتی ہے۔ ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا، خلاصہ کلام یہ ہے اس میں ہر وہ فرد داخل ہو گا جو ولاء کی وجہ سے وارث بنتا ہے۔ کہا : یہ کلام کی فصول اور اصول ہیں جو قرآن کے ظاہر اور اس سنت کے ساتھ مرتبط ہیں جو قرآن کی وضاحت کرنے والی ہے۔ (تفسیر قرطبی)

بندہ نے اس مقام پر امام قرطبی رحمہ اللہ کی بیان کردہ تمام تفاصیل ذکر نہیں کی ہیں، بلکہ موضوع سے متعلق باتیں خلاصہ کے طور پر لی ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کی ہیں، ورنہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس مقام پر اچھی خاصی بحث کی ہے، حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کو بھی خوب عالم آشکار کیا ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے علاوہ اپنی اولاد کو دین صحیح پر کاربند کرنے اور رکھنے کی فکر بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انہوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو صحیح دین پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

لہٰذا جس صورت سے ممکن ہو اولاد کے اعمال و اخلاق کی اصلاح میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا ضروری بھی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی اور یوں تو اولاد کی اصلاح کے بہت سے طریقے ہیں جنہیں حسب موقع اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ نے لطائف المنن والاخلاق میں لکھا ہے کہ اولاد کی اصلاح کے لئے زیادہ کارگر عمل یہ ہے کہ والدین ان کی دینی اصلاح کے لئے دعا کا اہتمام کریں۔ افسوس ہے کہ اس آسان تدبیر سے آج کل غفلت عام ہوتی جارہی ہے اور اس کے انجام بد کا مشاہدہ خود والدین کرتے رہتے ہیں۔ (معارف القرآن)

ناشکر گزاروں نے حق کو جادو گر قرار دیا

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ {۲۷} وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ {۲۸} الزخرف

جواب ترجمہ: بلکہ میں نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو سامان دے دیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور رسول مبین آگیا، اور جب ان کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ جادو ہے اور بیشک ہم اس کے منکر ہیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ: بلکہ میں نے مکہ والوں کو اور ان کے آباؤاجداد (جو کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے) کو عمر اور نعمت کی مدد سے فائدہ پہنچایا، مگر انہوں نے مہلت سے دھوکا کھالیا اور وہ عیش کوشی میں مشغول رہے، خواہشات کی اتباع کرتے رہے اور کلمہ توحید کو چھوڑ دیا۔

حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ: یہاں تک کہ ان کے پاس رسول آیا جس نے پیغام رسالت دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات کی اسے تائید حاصل تھی۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: نظم آیت کی وجہ یہ ہے کہ جب مشرکین آباؤاجداد کی

اندھی تقلید پر ڈٹ گئے اور حجت وبرہان میں غور وفکر نہ کیا تو طویل مہلت سے دھوکا کھا گئے اور دنیا کی عیش وعشرت سے دھوکے میں پڑ گئے، چنانچہ انہوں نے حق سے روگردانی کرلی۔(الکبیر، صفوۃ التفاسیر)

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ: اور جب ان کے پاس قرآن آگیا تاکہ انہیں غفلت سے بیدار کرے اور انہیں توحید کی طرف ہدایت دے تو وہ سرکشی اور گمراہی میں آگے بڑھتے ہی گئے اور قرآن کے بارے میں کہنے لگے یہ تو جادو ہے۔

وَاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ: اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں، ہم تصدیق نہیں کرتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں، سَمَّوا القُرآنَ سِحراً وَّ كَفَرُوا بِهٖ وَاستَحقَرُوا الرَّسُولَ عَلَيهِ السَّلَامُ، فَضَمُّوا إِلَى كُفرِهِمُ السَّابِقِ مُعَانَدَةُ الحَقِّ وَالإِستِهَانَةِ بِهٖ مشرکین نے قرآن کو جادو قرار دے کر اسے ماننے سے انکار کیا اور رسول کریم ﷺ کی توہین و تحقیر کی اور اور اپنے پہلے کفر کے ساتھ اب حق کے ساتھ عناد اور آپ ﷺ کی توہین بھی شامل کر دی۔ (تفسیر ابی السعود)

حقانیتِ اسلام

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ {۳۱} الزخرف

جواب ترجمہ: اور کہنے لگے کہ یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

خلاصہ تفسیر: مکہ کے کافر نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت پر ایک بے ہودہ قسم کا شبہ یہ بھی ظاہر کرتے تھے کہ یہ قرآن کریم اللہ نے مکہ اور طائف جیسی دو بڑی بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کر دیا ہوتا تو کیا بات تھی، ان کے خیال میں منصب نبوت پر فائز ہونے کے لیے مال و دولت کی ریل پیل ہونا ضروری تھا، تاج وسلطنت کا قلمدان ہونا ضروری تھا، اسی لیے وہ نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر قرآن کریم کے اترنے کو عجیب خیال کرتے تھے، اسی لیے موشگافیاں اور ہرزہ سرائیاں کرتے تھے۔

امام تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں قریتین سے مراد دو شہر تھے، ایک مکہ اور دوسرا طائف، رجل عظیم سے مراد بڑا آدمی، جو مال کے اعتبار سے بھی آگے ہو، اور شوکت

وجاہ کے لحاظ سے بھی سب سے فائق اور برتر ہو۔

مکہ والوں میں سے اگر کوئی شخص ان لوگوں کے نزدیک اس منصب جلیلہ پر فائز کیا جانا تھا تو وہ ولید بن مغیرہ تھا، اور طائف والوں میں سے اگر کوئی شخص اس منصب عظیم پر فائز کیا جاتا تو عروہ بن مسعود ثقفی تھا۔

اگر انسان تھوڑی توجہ دے اور غور کرے تو آج بھی لوگ اس طبقہ کو وہ مرتبہ اور مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں جن کے سینے میں قرآن کریم جیسی عظیم دولت موجود ہوتی ہے، اس طرح ان لوگوں کے ہاں اس شخص کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوتی جس کے سینے کے سفینے میں قرآنی حروف والفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور مفاہیم کی بھی کئی ڈکشنریاں اور تفسیریں محفوظ ہوتی ہیں، یہ لوگ مال و دولت کے لحاظ سے فائق شخص کو اہمیت دیتے اور مرتبے اور مقام کے لحاظ سے بلند سمجھتے ہیں۔

مکہ کے کفار اللہ کی تقسیم پر اعتراض کرتے تھے، اپنے خیال کے مطابق وہ دنیوی جاہ و جلال کے مالک شخص کو اس منصب پر فائز دیکھنا پسند کرتے تھے، حالانکہ یہ اللہ کی تقسیم ہے دنیا کے مراتب و مقامات میں بھی اللہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے تقسیم فرمائی ہے، کوئی شاہ ہے اور کوئی گدا، کوئی راہبر ہے اور کوئی پیروکار، کوئی مفلس اور قلاش ہے اور کوئی امیر و مالدار، کوئی زردار ہے اور کوئی زوردار، کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم، کوئی جابر ہے اور کوئی مجبور، کوئی قاہر ہے اور کوئی مقہور، یہ فرق مراتب اس دنیا میں اس نے رکھے ہیں۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کفار نے حضور ﷺ کی شان میں کہا تھا وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی (یعنی دولت مند) پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ حالانکہ نبی اگر ہمیشہ صاحب سلطنت اور صاحب مال ہوا کرتے تو ان کا اتباع سلطنت اور مال کی وجہ سے ہوتا اور اس سے حق ظاہر نہ ہوتا۔

حق کا ظہور، اسلام کا دین الٰہی ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حضور ﷺ نہ صاحب سلطنت و حکومت تھے نہ پڑھے لکھے تھے نہ کوئی اور کمال عرفی رکھتے تھے۔ پھر دفعتہً بڑے

بڑے سلاطین بڑے بڑے اہل کمال کی آپ کے سامنے گردنیں جھک گئیں۔ جس طرح خانہ کعبہ اگر وادی غیر ذی زرع میں نہ ہوتا اور کسی شاداب اور تروتازہ مقام پر ہوتا تو اس کی حقانیت ایسی ظاہر نہ ہوتی یہی وسوسہ ہوتا کہ ظاہری شادابی کے سبب لوگ وہاں جارہے ہیں۔ بخلاف اس وقت کے کہ سنگستان خشک میں ہے پھر اس کی طرف لوگ مشقتیں اٹھا اٹھا کر جاتے ہیں اور جو ایک مرتبہ ہو آیا اس کو پھر ہوس ہے۔ یہ کیا بات ہے جس سے یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ اس میں غیبی کشش ہے۔ (اشرف التفاسیر)

آیت کریمہ میں قریتین سے مراد مکہ اور طائف ہے، مکہ کو ام القریٰ بھی کہا جاتا ہے، جو وسط دنیا کہلاتا ہے، یہاں سے ارض کو پیدا کرنے کا آغاز کیا گیا، یہی وہ شہر ہے جس کی قسم اللہ نے قرآن کریم میں کھائی ہے، اسی شہر کو بلد امین کہا گیا ہے، اس شہر کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل ابو قبیس کے دامن میں نبی کریم ﷺ حضرت عبد اللہ کے گھر میں جنم افروز ہوئے تھے۔

اسی جبل ابو قبیس کے پڑوس میں صفا اور مروہ نامی دو پہاڑیاں ہیں، اسی مکہ میں تاجدار انبیاء ﷺ آخری نبی بن کر جلوہ افروز ہوئے، اسی شہر کے بارے میں قرآن کریم نے بتایا کہ یہ وادی غیر ذی زرع تھی، یعنی ایسی بستی جس میں کوئی سرسبز وشادابی نہیں تھی، کوئی ہریالی اور نخلستان نہیں تھے، اسی شہر میں عظمت والے نبی ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت اپنی بیوی اور بیٹے اسماعیل کو لاکر رہائش پذیر کیا تھا جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

مکہ ہی سے چند میل کی مسافت پر طائف نامی ایک شہر ہے، یہ شہر مکہ کی بہ نسبت سرسبز وشاداب اور معتدل آب وہوا والا شہر ہے، یہ وہی شہر ہے جس کے وڈیروں اور سرداروں کو نبی کریم ﷺ اس وقت دعوت دینے نکلے تھے جب مکہ والوں نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔

مکہ والوں کے نزدیک اس وقت اگر کوئی شخص کسی مرتبے اور مقام پر فائز ہونے کا مستحق تھا تو وہ ولید بن مغیرہ تھا اور طائف والوں میں سے اگر کوئی شخص اس منصب پر فائز ہو سکتا تھا تو وہ عروہ بن مسعود ثقفی تھا۔

تقسیم معیشت کا قدرتی نظام

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ {۳۲} الزخرف.

جواب ترجمہ: بھلا کیا یہ لوگ ہیں جو تمہارے پروردگار کی رحمت تقسیم کریں گے ؟ دنیوی زندگی میں ان کی روزی کے ذرائع بھی ہم نے ہی ان کے درمیان تقسیم کر رکھے ہیں اور ہم نے ہی ان میں سے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تمہارے پروردگار کی رحمت تو اس (دولت) سے کہیں بہتر چیز ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ ہم نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے کی امداد کا محتاج ہو اور تمام لوگ اسی باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے ہوئے پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس آیت نے کھول کر یہ بات بتلادی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم معیشت کا کام (اشتراکیت کی طرح) کسی با اختیار انسانی ادارے کے سپرد نہیں کیا جو منصوبہ بندی کے ذریعہ یہ طے کرے کہ معاشرے کی ضروریات کیا ہیں؟

انہیں کس طرح پورا کیا جائے؟ وسائل پیداوار کو کس تناسب کے ساتھ کن کاموں میں لگایا جائے اور ان کے درمیان آمدنی کی تقسیم کس بنیاد پر کی جائے؟ اس کے بجائے یہ تمام کام اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بنا کر دنیا کا نظام ہی ایسا بنادیا ہے جس میں اگر (اجارہ داریوں وغیرہ کے ذریعہ) غیر فطری رکاوٹیں پیدا کی جائیں تو وہ نظام خود بخود یہ تمام مسائل حل کر دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

باہمی احتیاج کے اس نظام کو موجودہ معاشی اصطلاح میں طلب و رسد کا نظام کہا جاتا ہے، طلب و

رسد کا قدرتی قانون یہ ہے کہ جس چیز کی رسد کم ہو اور طلب زیادہ اس کی قیمت بڑھتی ہے لہٰذا وسائل پیداوار اس چیز کی تیاری میں زیادہ نفع دیکھ کر اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب رسد طلب کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے چنانچہ اس چیز کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی اور وسائل پیداوار اس کے بجائے کسی اور ایسے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں جس کی ضرورت زیادہ ہو۔

اسلام نے طلب و رسد کی انہی قدرتی قوتوں کے ذریعہ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا کام لیا ہے اور عام حالات میں تقسیم معیشت کا کام کسی انسانی ادارے کے حوالہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے خواہ کتنے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر لئے جائیں لیکن ان کے ذریعہ معیشت کی ایک ایک جزوی ضرورت کا احاطہ ممکن نہیں اور اس قسم کے معاشرتی مسائل عموماً ایسے ہی قدرتی نظام کے تابع چلتے ہیں۔

زندگی کے بیشتر معاشرتی مسائل اسی طرح قدرتی طور پر خود بخود طے پاتے ہیں، اور انہیں حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کرنا زندگی میں ایک مصنوعی جکڑ بند پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ دن کا وقت کام کے لئے ہے اور رات کا سونے کے لئے کسی معاہدہ عمرانی یا انسانی منصوبہ بندی کے تحت طے نہیں پائی، بلکہ قدرت کے خودکار نظام نے خود بخود یہ فیصلہ کر دیا ہے۔

اسی طرح یہ مسئلہ کہ کون شخص کس سے شادی کرے طبعی مناسبتوں کے فطری نظام کے تحت خود بخود انجام پاتا ہے اور اسے منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا، یا مثلاً یہ بات کہ کون شخص علم و فن کے کس شعبہ کو اپنا میدان بنائے، اسے طبعی ذوق اور مناسبت کے بجائے حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کر دینا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور اس سے نظام فطرت درہم برہم ہو سکتا ہے۔

اسی طرح نظام معیشت کو بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ہر شخص کے دل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اس کے لئے زیادہ مناسب ہے اور جسے وہ بہت طریقے سے انجام دے سکتا ہے چنانچہ ہر شخص خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو اپنے کام پر خوش ہے اور اسی کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتا ہے۔

البتہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اسلام نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کر دے، بلکہ ذرائع آمدنی میں حلال و حرام کی تفریق کر کے سود، سٹہ، قمار اور ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دے دیا ہے پھر جائز آمدنی پر بھی زکوٰۃ و عشر وغیرہ کے واجبات عائد کر کے ان خرابیوں کا انسداد کر دیا ہے جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود بھی اگر کبھی اجارہ داریاں قائم ہو جائیں تو ان کو توڑنے کے لئے حکومت کی مداخلت کو جائز رکھا ہے۔ (معارف القرآن)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ معاشی مساوات کی حقیقت کے زیر عنوان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ معاشی مساوات (اس معنیٰ میں کہ دنیا کے تمام افراد کی آمدنی بالکل برابر ہو) نہ مطلوب ہے نہ ممکن العمل۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر رکن پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور کچھ حقوق دیئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت سے یہ تناسب رکھا ہے کہ جس کے ذمہ جتنے فرائض ہیں اس کے اتنے ہی حقوق ہیں، انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کے ذمہ چونکہ فرائض سب سے کم ہیں کہ وہ شرعاً حلال و حرام اور ناجائز و جائز کے مکلف نہیں ہیں اس لئے ان کے حقوق بھی سب سے کم ہیں چنانچہ انسان کو ان کے معاملہ میں وسیع آزادی عطا کی گئی ہے کہ وہ ان سے چند معمولی سی پابندیوں کے ساتھ جس طرح چاہے نفع اٹھا سکتا ہے۔

چنانچہ بعض حیوانات کو وہ کاٹ کر کھاتا ہے بعض پر سواری کرتا ہے، بعض مخلوقات کو پامال کرتا ہے مگر اسے ان مخلوقات کی حق تلفی نہیں سمجھا جاتا، اس لئے کہ ان مخلوقات پر چونکہ فرائض کم ہیں اس لئے ان کے حقوق بھی کم ہیں۔ پھر کائنات میں سب سے زیادہ فرائض انسان اور جنات پر عائد کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو آخرت کے عذاب کے مستحق ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات

کو حقوق بھی دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عطا کئے ہیں۔

پھر انسانوں میں یہ لحاظ ہے کہ جس کی ذمہ داری اور فرائض دوسروں سے زیادہ ہیں، اس کے حقوق بھی زائد ہیں، انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی ہے، چنانچہ ان کو بہت سے حقوق بھی دوسروں سے زائد عطا کئے گئے ہیں۔

نظام معیشت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی رعایت رکھی ہے کہ ہر شخص کو اتنے معاشی حقوق دیئے جائیں جتنے فرائض کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے، اور ظاہر ہے کہ فرائض میں یکسانیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن اور ان میں تفاوت ناگزیر ہے۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کے معاشی وظائف و فرائض دوسروں سے بالکل مساوی ہوں اس لئے کہ معاشی وظائف و فرائض انسانوں کی فطری صلاحیتوں پر موقوف ہیں جن میں جسمانی طاقت، صحت، دماغی قویٰ اور عمر، ذہنی معیار، چستی اور پھرتی جیسی خبریں داخل ہیں اور یہ بات ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ان اوصاف کے اعتبار سے انسانوں میں یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اشتراکی حکومت کے بس میں بھی نہیں۔

جب انسانوں کی صلاحیتوں میں تفاوت ناگزیر ہے تو ان کے فرائض میں بھی لازماً تفاوت ہو گا اور معاشی حقوق چونکہ انہی فرائض پر موقوف ہیں اس لئے معاشی حقوق یعنی آمدنی میں بھی تفاوت ناگزیر ہے کیونکہ اگر سب کی آمدنی بالکل مساوی کر دی جائے اور فرائض میں تفاوت رہے تو اس سے کبھی عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔

اس لئے کہ اس صورت میں بعض لوگوں کی آمدنی ان کے فرائض سے زیادہ اور بعض کی ان کے فرائض سے کم ہو جائے گی جو صریح ناانصافی ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ آمدنی میں مکمل مساوات کسی بھی دور میں قرین انصاف نہیں ہو سکتی لہٰذا اشتراکیت اپنی ترقی کے انتہائی دور (مکمل کمیونزم) (اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ فی الحال تو آمدنی کی مکمل مساوات ممکن نہیں، لیکن اگر اشتراکیت کے ابتدائی اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے تو ایک وقت ایسا

آجائے گا جب آمدنی میں مکمل مساوات یا املاک میں مکمل اشتراک پیدا ہو جائے گا اور یہ مکمل کمیونزم کا دور ہو گا) میں بھی جس مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں نہ قابل عمل ہے اور نہ قرین عدل و انصاف۔

البتہ یہ طے کرنا کہ کس کے فرائض زیادہ اور کس کے کم ہیں، اور ان کی مناسبت سے اسے کتنے حقوق ملنے چاہئیں ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے اور انسان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکے۔

بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور تجربہ کار انجینئر نے ایک گھنٹہ میں اتنی آمدنی حاصل کرلی ہے جو ایک غیر ہنر مند مزدور نے دن بھر منوں مٹی ڈھو کر بھی حاصل نہیں کی، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قطع نظر اس سے کہ مزدور کی دن بھر کی آزاد محنت ذمہ داری کے اس بوجھ کے برابر نہیں ہو سکتی جو انجینئر نے اٹھا رکھا ہے، انجینئر کی یہ آمدنی صرف اس ایک گھنٹے کی محنت کا صلہ نہیں بلکہ اس میں سالہا سال کی اس دماغ سوزی، عرق ریزی اور جانفشانی کے صلے کا ایک حصہ بھی شامل ہے جو اس نے انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت اور پھر اس میں تجربہ و مہارت حاصل کرنے میں برداشت کی ہے۔

اشتراکیت نے اپنے ابتدائی دور میں آمدنی کے اس تفاوت کو تسلیم تو کرلیا ہے چنانچہ تمام اشتراکی ممالک میں آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان تنخواہوں کا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ٹھوکر یہاں کھائی ہے کہ تمام وسائل پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے کر وسائل کے لئے فرائض کا تعین اور پھر ان کی مناسبت سے ان پر آمدنی کی تقسیم بھی تمام تر حکومت ہی کے حوالہ کر دی ہے۔

حالانکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا فرائض اور حقوق کے درمیان تناسب باقی رکھنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے چنانچہ اشتراکیت کے طریق کار کے تحت ملک بھر کے انسانوں کی روزی کا تعین حکومت کے چند کارندوں کے ہاتھ میں آگیا ہے اور انہیں یہ اختیار مل گیا ہے کہ جس شخص کو جتنا چاہیں دیں، جتنا چاہیں روک لیں۔

اول تو اس میں بد دیانتیوں اور اقربانوازیوں کو ایک بڑا میدان مل جاتا ہے جس کے سہارے افسر شاہی پھلتی پھولتی ہے، دوسرے اگر حکومت کے تمام کارندوں کو فرشتہ بھی تصور کر لیا جائے اور وہ فی الواقع یہی چاہیں کہ ملک میں آمدنی کی تقسیم حق و انصاف کی بنیاد پر ہو تو ان کے پاس آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور کے فرائض میں کتنا تفاوت ہے، اور اس کی نسبت سے ان کی آمدنیوں میں کتنا تفاوت قرین انصاف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ انسانی عقل کے ادراک سے قطعی ماورا ہے اس لئے اسے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ آیت زیر بحث وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ، میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس تفاوت کا تعین ہم نے انسانوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ دنیا میں ہر شخص کی ضروریات دوسرے کے ساتھ وابستہ کر کے نظام ایسا بنا دیا ہے کہ ہر شخص اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔

یہاں بھی باہمی احتیاج پر مبنی طلب و رسد کا نظام ہر شخص کی آمدنی کا تعین کرتا ہے، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض میں نے اپنے ذمہ لئے ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو اور یہ زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے، لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا کا یہی مطلب ہے کہ ہم نے آمدنی میں تفاوت اس لئے رکھا ہے تاکہ ایک شخص دوسرے سے کام لے سکے ورنہ سب کی آمدنی برابر ہوتی تو کوئی کسی کے کام نہ آتا، ہاں البتہ بعض غیر معمولی حالات میں بڑے بڑے سرمایہ دار طلب و رسد کے اس قدرتی نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجرت پر کام کریں۔

اسلام نے اول تو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے وسیع احکام کے ذریعہ نیز اخلاقی ہدایات اور تصور آخرت کے ذریعہ ایسی صورتحال کو پیدا ہونے سے روکا ہے، اور اگر کبھی کسی مقام پر یہ صورت پیدا ہو جائے تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ ان غیر معمولی حالات کی حد تک وہ اجرتوں کا

تعین کر سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف غیر معمولی حالات کے لئے ہے اس لئے اس مقصد کے لئے تمام وسائل پیداوار کو حکومت کے حوالہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ (معارف القرآن للمفتی)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اسلامی مساوات کا مطلب کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا ارشادات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آمدنی میں مکمل مساوات نہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے، نہ عملاً کہیں قائم ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے، اور نہ یہ اسلام کو مطلوب ہے۔ البتہ اسلام نے جس مساوات کو قائم کیا ہے وہ قانون، معاشرت اور ادائے حقوق کی مساوات ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قدرتی طریق کار کے تحت جس شخص کے جتنے حقوق متعین ہو جائیں انہیں حاصل کرنے کے قانونی، تمدنی اور معاشرتی حق میں سب برابر ہیں۔

اس بات کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں کہ ایک امیر یا صاحب جاہ و منصب انسان اپنا حق عزت کے ساتھ با آسانی حاصل کر لے اور غریب کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور ذلیل و حقیر ہونا پڑے۔ قانون امیر کے حقوق کی حفاظت کرے اور غریب کو بے یار و مددگار چھوڑ دے، اسی کو حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا: وَاللّٰهِ مَا عِنْدِی اَقْوٰی مِنَ الضَّعِیْفِ حَتّٰی آخُذَ الحَقَّ لَهُ وَلَا عِنْدِی اَضْعَفُ مِنَ القَوِی حَتّٰی آخُذَ الحَقَّ مِنْهُ خدا کی قسم! میرے نزدیک ایک کمزور آدمی سے زیادہ قوی کوئی نہیں تاوقت کہ میں اس کا حق اسے نہ دلوادوں اور میرے نزدیک ایک قوی آدمی سے زیادہ کمزور کوئی نہیں جب تک کہ میں اس سے (کمزور) کا حق وصول نہ کرلوں۔

اس طرح ٹھیٹھ معاشی نقطہ نظر سے اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر شخص کو کمائی کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور اسلام اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ چند بڑے بڑے دولت مند مال و دولت کے دہانوں پر قابض ہو کر اپنی اجارہ داریاں قائم کرلیں اور چھوٹے تاجروں کے لئے بازار میں بیٹھنا دوبھر بنادیں، چنانچہ سود، سٹہ، قمار، ذخیرہ اندوزی اور اجارہ دارانہ تجارتی

معاہدوں کو ممنوع قرار دے کر نیز زکوٰۃ، عشر، خراج، نفقات، صدقات اور دوسرے واجبات عائد کر کے ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے جس میں ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے کمائی کے مناسب مواقع حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس سے ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر ہو سکتی ہے، اس کے باوجود آمدنی کا جو تفاوت باقی رہے وہ درحقیقت ناگزیر ہے اور جس طرح انسانوں کے درمیان حسن و جمال، قوت و صحت، عقل و ذہانت اور آل و اولاد کے تفاوت کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح اس تفاوت کو بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ (معارف القرآن)

دنیا کی بے ثباتی اور فنائیت

سوال ان آیات کی تفسیر بیان کیجیے۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ {۳۳} وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ {۳۴} وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ {۳۵} وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ {۳۶} وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ {۳۷} حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ {۳۸} الزخرف.

جواب ترجمہ: اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک ہی طریقہ پر ہو جائیں گے تو ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمان کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور گھروں کے لیے دروازے بھی اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔ اور سونے کے لیے بھی، اور یہ سب کچھ صرف دنیا والی زندگی کا سامان ہے۔ اور آپ کے رب کے پاس آخرت متقیوں کے لیے بہتر ہے۔ اور جو شخص رحمن کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اور بلاشبہ وہ ان کو راستہ سے روکتے ہیں، اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں، یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا کہ اے

کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب والی دوری ہوتی سو تو برا ساتھی تھا۔

خلاصہ تفسیر: مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ (اور یہ کافر لوگ مال و دولت کی زیادتی کو نبوت کی صلاحیت کی شرط سمجھتے ہیں حالانکہ نبوت ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے اس کی صلاحیت کی شرط بھی عظیم الشان ہونی چاہئے) اور (دنیا کی دولت و جاہ ہمارے نزدیک اس قدر حقیر ہے کہ) اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب قریب) تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جاویں گے (یعنی کافر ہو جائیں گے) تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں (اور خدا کے نزدیک سخت مبغوض ہیں) ہم ان (سب) کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر چڑھا (اترا) کرتے اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی (چاندی کے کر دیتے) اور تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی (کر دیتے، یعنی کچھ چاندی کی کچھ سونے کی۔

مگر یہ سامان سب کفار کو اس لئے نہیں دیا کہ اکثر انسانوں کی طبیعت میں مال و متاع کی حرص غالب ہے اور اس مفروضہ صورت میں کفر اس مال و متاع کے حصول کا یقینی سبب بن جاتا، پس چند تھوڑے سے آدمیوں کو چھوڑ کر قریب قریب سبھی کفر اختیار کر لیتے، اس لئے ہم نے تمام کافروں کو مال و دولت کی یہ وسعت نہیں دی، ورنہ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو ہم ایسا ہی کرتے اور ظاہر ہے کہ دشمن کو قدر و وسعت کی چیز نہیں دیا کرتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی مال و متاع حقیقت میں کوئی عظیم الشان چیز نہیں، پس وہ نبوت جیسے منصب عظیم کے لئے صلاحیت کی شرط بھی نہیں ہو سکتی اس کے بجائے نبوت کی شرط وہ اعلیٰ درجہ کے ملکات ہیں جو اللہ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوتے ہیں اور یہ ملکات محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح جمع ہیں، پس نبوت ان ہی کے لئے زیبا تھی نہ کہ مکہ اور طائف کے رئیسوں کے لئے) اور (حقارت دنیا کی ایک بالکل ظاہر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ سب (ساز و سامان جس کا اوپر ذکر ہوا) کچھ بھی نہیں، صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (پھر فنا، آخر فنا) اور آخرت (جو ابدی ہے اور اس لئے اس سے

بہتر ہے وہ) آپ کے پروردگار کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔ (تفسیر بیان القرآن)

کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے مالدار کو نبی کیوں نہ بنا دیا گیا؟ ان آیات میں اس کا دوسرا جواب دیا گیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک نبوت کے لئے کچھ شرائط صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے لیکن مال و دولت کی زیادتی کی بنا پر کسی کو نبوت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مال و دولت ہماری نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام لوگوں کے کافر بن جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم سب کافروں پر سونے چاندی کی بارش کر دیتے اور صحیح ترمذی کی ایک حدیث میں آنحضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شُرْبَةَ مَاءٍ (یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی درجہ رکھتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا) اس سے معلوم ہوا کہ نہ مال و دولت کی زیادتی کوئی فضیلت کی چیز ہے نہ اس کی کمی انسان کے کم رتبہ ہونے کی علامت ہے۔ البتہ نبوت کے لئے کچھ اعلیٰ درجہ کے اوصاف ضروری ہیں وہ سرکار دو عالم ﷺ میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اس لئے یہ اعتراض بالکل لغو اور باطل ہے۔ (معارف القرآن)

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ الخ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی نصیحت یعنی قرآن اور وحی سے جان بوجھ کر اعراض کرے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو دنیا میں بھی اس کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اسے نیکیوں سے روک کر برائیوں پر ابھارتا رہتا ہے اور آخرت میں بھی جب یہ شخص قبر سے اٹھے گا تو یہ شیطان اس کے ساتھ ساتھ ہوگا یہاں تک کہ دونوں جہنم میں داخل ہو جائیں۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد سے اعراض کی اتنی سزا دنیا میں مل جاتی ہے کہ انسان کی صحبت خراب ہو جاتی ہے اور شیاطین، خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، اس کو بھلائیوں سے دور اور برائیوں سے قریب کرتے رہتے ہیں وہ کام سارے گمراہی کے کرتا ہے مگر سمجھتا یہ ہے کہ بہت اچھا کر رہا ہے (قرطبی)

عذاب میں ایک دوسرے کی شرکت نافع نہیں ہوگی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ{۳۹}اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ{۴۰} الزخرف

جواب ترجمہ: اور آج جب تم ظلم کر چکے ہو تو تمہیں یہ بات ہر گز کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔ کیا آپ بہروں کو سنا دیں گے یا اندھوں کو ہدایت دے دیں گے اور ان لوگوں کو جو صریح گمراہی میں ہیں۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ: تمہارا عذاب میں مشترک ہونا تمہیں ہر گز نفع نہیں پہنچائے گا اور نہ ہی تمہارے عذاب میں ذرہ برابر بھی کمی کرے گا چونکہ تم ظلم پر قائم رہے۔ ہر ایک کا حصہ بھرپور ہوگا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس مصیبت میں عام طور پر چھوٹے بڑے سب شریک ہوں تو کچھ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے، مشہور ہے "مرگ انبوہ جشنے دارد" مگر دوزخ میں تمام شیاطین الانس والجن اور تابعین و متبوعین کا عذاب میں شریک ہونا کسی کو کچھ فائدہ نہ دے گا، عذاب کی شدت ایسی ہوگی کہ اس طرح کی سطحی باتوں سے تسلی اور تخفیف نہیں ہو سکتی حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ "یعنی کافر کہیں گے کہ انہوں نے ہم کو عذاب میں ڈلوایا، خوب ہوا یہ بھی نہ بچے، لیکن اگر دوسرا بھی پکڑا گیا تو اس کو کیا فائدہ"۔ (تفسیر عثمانی)

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی قسم کی تکلیف بہت سے آدمیوں کو ایک ساتھ ہو رہی ہو تو اس سے ہر ایک کے دل میں تکلیف کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے کہ اس تکلیف میں میں تنہا نہیں ہوں، بلکہ دوسرے بھی میرے ساتھ شریک ہیں، لیکن دوزخ میں ایسا نہیں ہوگا، کیونکہ ہر ایک کی تکلیف اتنی زیادہ ہوگی کہ دوسروں کے اسی تکلیف میں مبتلا ہونے کے احساس سے بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ (توضیح القرآن)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں انسان کی ایک فطرت یہ ہے کہ جب وہ تکلیف میں تنہا ہوتا ہے تو تکلیف کا احساس زیادہ ہوتا ہے اور اگر اس کے ساتھ بہت سے لوگ کسی تکلیف میں ہوں تو رنج کا احساس کم ہوتا ہے: لیکن دوزخ میں ایسا نہیں ہوگا اب بے شمار لوگ عذاب کی بھٹی میں تپ رہے ہوں گے، لیکن عذاب میں لوگوں کا شامل ہونا ان کے رنج و غم میں کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔

تسہیل میں لکھا ہے: مشرکین کو عذاب میں ان کا مشترک ہونا نفع نہیں پہنچائے گا، جب وہ دوزخ میں اپنے جیسوں کو عذاب میں دیکھیں گے، تو اس سے انہیں ذرہ برابر بھی راحت نصیب نہیں ہوگی، ورنہ دنیا میں جب کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی جیسی مصیبت میں مبتلا دیکھتا ہے، تو طبعاً مصیبت و درد میں کمی محسوس کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس توہم کو بھی ختم کر دیا کہ دوزخ میں اشتراک بھی ان کے لیے باعث راحت نہیں ہوگا۔ (التسہیل، صفوۃ التفاسیر)

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: اے میرے حبیب ﷺ! کیا آپ ﷺ ان کفار کو سنانے پر قدرت رکھتے ہیں جو بہرے اور اندھے ہیں اور جو کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں؟ یہ چیز آپ ﷺ کے اختیار میں نہیں ہے، اس لیے آپ تنگ دل نہ ہوں کہ یہ کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں: آیت میں حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے ﷺ مشرکین کو ایمان کی طرف لانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے، بہت محنت کرتے لیکن مشرکین تھے کہ ہر دن ان کی سرکشی، گمراہی اور حق سے دوری میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔

کفار مکہ کا ناپاک خیال

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ {۴۱} الزخرف

جواب سو اگر ہم آپ کو دنیا سے اٹھالیں تو بھی ہم ان سے بدلہ لینے والے ہیں۔

خلاصہ تفسیر: قریش کے شرارتی لوگوں کا خیال یہ تھا کہ دین اسلام، توحیدی پیغام اور نبوی شریعت یہ سب نبی کریم ﷺ کی ذات سے وابستہ چیزیں ہیں، آپ ﷺ اکیلے ہیں، ان کے نظام اور پیغام

کو پھیلانے اور سنبھالنے والا ان کے بعد کوئی نہیں ہو گا، اس سارے پیغام اور نظام کا دارو مدار، مرکز و محور آپ ﷺ کی ذات ہی ہے، ان کے بعد کچھ بھی نہیں رہے گا۔

یہی کچھ سوچ کر وہ آفتاب اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتے تھے، وہ آپ ﷺ کی ذات کے درپے آزار تھے، آپ ﷺ کا خاتمہ چاہتے تھے، تاکہ سراج منیرہ کے اوجھل ہو جانے سے یہ پھیلنے والی روشنی بھی ختم ہو جائے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ ان کے دماغوں میں پائے جانے والے غلط خیالات فرسودہ قرار دے رہے ہیں، کہ رسول اللہ کو جھٹلانے، دعوت توحید کا انکار کرنے کا خمیازہ اسی قوم کو بھگتنا پڑتا ہے جس کی طرف اس نبی کو بھیجا جاتا ہے، جوں جوں ان کی شر انگیزیاں عروج پر پہنچتی ہیں، جوں جوں وہ اللہ کے بھیجے ہوئے لوگوں کی مخالفت و معاندت میں اپنی حدود عبور کر جاتے ہیں توں توں ان کا انجام قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ کے فرستادے انہیں مسلسل سمجھائے چلے جاتے ہیں کہ ہم اللہ کی طرف سے تمہاری طرف آئے ہیں، مگر وہ اپنے خیالات سے ذرا باز آنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

دوسرے کافروں کی طرح مکہ کے قریش کا بھی یہی خیال تھا اور انہیں یہی فکر دامن گیر تھی کہ حضرت نبی کریم ﷺ کو کسی طرح ختم کر دیا جائے، رسول کریم ﷺ انہیں برے اعمال اور برے افکار سے باز رہنے کی تلقین مسلسل کیے جا رہے تھے، وہ اس طرف دھیان دینے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ مثبت سوچنے کی بجائے منفی سوچ اختیار کیے ہوئے تھے۔

یہ ان کی عقل و فہم ہی کا قصور تھا کہ وہ غلط سوچ پروان چڑھا رہے تھے، اللہ تعالیٰ یہاں واضح فرما رہے ہیں کہ اگر ہم اپنے نبی کو اٹھا لیں، وہ دنیا سے پردہ کر جائیں، یا ہجرت کر کے یہ علاقہ چھوڑ جائیں تو بھی مخالفین انتقام کی آگ سے بچ نہیں پائیں گے، چاہے جزوی صورت میں ہو یا ان کے تمام سرغنے موت کے منہ میں دھکیل دیے جائیں یا اللہ کی گرفت مکمل شکل و صورت میں نمودار ہو جائے، پھر اس کے بعد ان کی بیخ و بن اکھاڑ دی جائے، اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے، کوئی طاقت اور کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

انسانی آنکھوں نے دیکھا، مکہ سے مدینہ تک ہجرت کے دوران شاہراہ ہجرت کے پتھروں اور سنگریزوں نے دیکھا کہ منصوبہ ساز کس طرح کے خطرناک منصوبے بنا رہے تھے، پھر مدینہ میں کس طرح کے منصوبے بن رہے تھے، مگر اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کے گرد اپنی حفاظت کا پہرہ قائم کر دیا تھا، مدینہ پہنچنے کے اگلے ہی سال قدرت والے نے اپنی لاٹھی برسائی اور بدر کے کھلے میدان میں، کھلے آسمان تلے کافروں کے بڑے بڑے سرغنے قتل کر دیے گئے، یہ ان کے لیے عذاب کی ایک صورت تھی، پھر ستر کو پابہ زنجیر کر کے نبوت کے قدموں میں ڈال دیا گیا، پھر فدیہ کی شکل میں انہیں ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ بھاری بھر کم فدیہ دے کر انہوں نے ان لوگوں سے اپنی جان خلاصی پائی جنہیں ان لوگوں نے اپنی گھروں سے، اپنے شہر سے، اپنے دیس سے، اپنے خانماں سے بے خانماں کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور نبیوں کو بھیجتے ہیں، انسانی رشد وہدایت کے لیے، اگر وہ مان جائیں تو دنیا اور آخرت میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے، اگر وہ لوگ اللہ اور رسول اللہ کی مخالفت کرتے ہیں تو دنیا میں اللہ انہیں پکڑتا ہے یا پھر آخرت میں انہیں عذاب دیا جائے گا، جسے کبھی قرآن عذاب عظیم کہتا ہے، کبھی عذاب الیم کہتا ہے، کبھی عذاب مہین کہتا ہے، کہیں شعلہ زن دوزخ ہے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ (سو اگر ہم آپ کو لے جائیں) یعنی دنیا سے اٹھالیں یا مکہ معظمہ سے نکال کر لے جائیں تو ان لوگوں کا پھر بھی عذاب سے چھٹکارہ نہیں، ہم ان سے انتقام لے لیں گے آپ کے سامنے ہو جسے ہم آپ کو دکھا دیں یا آپ کے بعد ہو ہمیں سب پر قدرت ہے، یعنی انہیں کفر کی سزا ضرور ملے گی۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ غزوہ بدر میں جو مشرکین مکہ کو شکست ہوئی قتل بھی ہوئے قیدی بھی ہوئے آیت کریمہ میں اس انتقام کا تذکرہ ہے۔ (انوار البیان)

رحمت دوعالم ﷺ کو تسلی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَوۡ نُرِيَنَّكَ الَّذِىۡ وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَيۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ{۴۲}فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِىۡۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ{۴۳}وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ وَلِقَوۡمِكَ وَسَوۡفَ تُسۡـَٔـلُوۡنَ

{۴۴}وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ {۴۵} الزخرف

جواب ترجمہ: یا ہم آپ کو وہ چیز دکھا دیں، جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے سو بلاشبہ ہم ان پر قدرت رکھنے والے ہیں، سو آپ کی طرف جو وحی کی گئی ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہیے، بلاشبہ آپ صراط مستقیم پر ہیں، اور بلاشبہ یہ قرآن شرف ہے آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے اور عنقریب تم سے سوال کیا جائے گا۔ اور اپنے رسولوں میں سے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے ان سے دریافت کر لیجیے کیا ہم نے رحمن کے سوا دوسرے معبود تجویز کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے؟

اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ: اے میرے حبیب ﷺ! یا ہم آپ ﷺ کو وہ عذاب دکھا دیں جس کا ہم نے مشرکین کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے آپ کی زندگی کے اندر ہی تو ہم اس پر بھی قدرت رکھتے ہیں، وہ ہمارے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ ہمیں عاجز کر کے کہیں جا نہیں سکتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب نبی کریم ﷺ کو میدان بدر میں دکھا دیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت کا معنی ہے: اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ ہم ان سے انتقام لیں اور انہیں عذاب دیں آپ کی زندگی میں یا آپ کی وفات کے بعد، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی روح قبض نہیں کی حتیٰ کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں اور مشرکین کو پیشانیوں کے بل گرا کر دکھا دیا۔ (مختصر ابن کثیر، صفوۃ التفاسیر)

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ: اے میرے حبیب ﷺ! جو قرآن ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اسے مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: بیشک آپ واضح، حق اور سیدھے راستے پر ہیں جو جنت میں پہنچانے والا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ: حقیقت میں یہ قرآن عظیم آپ کے لیے اور آپ کی قوم قریش کے لیے شرف عظیم ہے، چونکہ یہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا اور انہی میں سے

ایک آدمی پر نازل ہوا، یہ ایک بڑی نعمت تھی عنقریب تم سے اس نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

تسہیل میں لکھا ہے: آیت میں ذکر: بمعنی شرف ہے اور نبی ﷺ کی قوم قریش اور سارے عرب ہیں، چنانچہ انہوں نے اسلام کے ذریعے دنیا و آخرت کا شرف حاصل کیا، اتنی بات ہی کافی ہے کہ عرب نے مشرق و مغرب کو فتح کیا، ان میں خلافت چلی اور انہی میں بادشاہت رہی۔ (التسہیل، صفوۃ التفاسیر) یہ قرآن ہر ماننے والے کے لیے شرف ہے، یہ آیت اللہ کے اس فرمان کی نظیر ہے، لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (سورۃ الانبیا۔ ۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارا شرف ہے کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ: علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ علیٰ سبیل الفرض ہے اور کلام میں حذف بھی ہے اور تقدیری عبادت یوں ہے! اِن كُنتَ يَا مُحَمَّدُ! شَاكًّا فِي اَمرِ التَّوحِيدِ فَاسأَل الاية: یعنی اے میرے حبیب ﷺ! اگر آپ توحید کے معاملہ میں شک کرتے ہوں تو آپ سے پہلے جو رسول ہوئے ہیں ان سے سوال کر لیجیے۔

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ: کیا یہاں پیغمبروں میں سے کوئی ایسا ہوا ہے جس نے غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دی ہو؟ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ: (سورۃ یونس ۹۴) اگر آپ ہماری نازل کردہ کتاب کے متعلق شک کرتے ہوں تو ان لوگوں سے سوال کر لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے تھے (یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو)

ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں وَالمُرَادُ بالآيَةِ الاِستِشهَادُ بِإِجمَاعِ الأَنبِيَاءِ عَلَى التَّوحِيدِ، وَالتَّنبِيهُ عَلَى أَنَّهُ لَيسَ بِبِدعٍ اِبتَدَعَهُ حَتَّى يُكَذَّبُ وَيُعَادَى آیت سے مراد اس امر پر استشہاد پیش کرنا مقصود ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا توحید پر اجماع ہے اور اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی بدعت نہیں گھڑلی یہاں تک کہ آپ کی تکذیب کی جائے اور آپ سے عداوت کا سلوک کیا جائے۔ (تفسیر ابی السعود ۵: ۴۵، صفوۃ التفاسیر)

ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں وَيَظْهَرُ أَنَّ الْخِطَابَ لِلسَّامِعِ، وَالسُّؤَالُ هُنَا مَجَازٌ عَنِ النَّظَرِ فِي أَدْيَانِ الْأَنْبِيَاءِ، هَلْ جَاءَتْ عِبَادَةُ الْأَوْثَانِ فِي مِلَّةٍ مِّنْ مِّلَلِهِم؟ بظاہر سامع سے خطاب یہ اور آیت میں سوال، ادیان انبیاء علیہم السلام میں نظر و فکر کرنے سے مجاز ہے، کیا کسی ملت میں بتوں کی عبادت کی اجازت دی گئی؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے شعرا اپنی شاعری میں درودیوار سے سوال کر لیتے ہیں جیسے مثلاً: سَلِ الأَرضَ مَن شَقَّ أَنهارَكَ، وَغَرَسَ أَشجارَكَ، وَجَنَى ثِمارَكَ؟ فَإِنَّهَا إِن لَّم تُجِبكَ حِوَاراً أَجَابَتكَ اِعتِبَاراً، زمین سے پوچھو کس نے دریا کھود کر بہادیے، کس نے درخت لگائے، کس نے پھل اتارے؟ اگرچہ ان سوالات کے جوابات میں تمہیں کوئی بھی آواز سنائی دے یقیناً اعتبار ہی تمہارے سوال کا جواب ہو گا، یہ سب باب مجاز میں ہے۔ (البحر المحیط ۸:۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ {۴۶} فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ {۴۷} وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ {۴۸} الزخرف

جواب ترجمہ: اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کی قوم کے بڑے لوگوں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا لہٰذا موسیٰ نے کہا کہ بیشک میں رب العالمین کا رسول ہوں، سو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آئے تو یکایک وہ ان نشانیوں پر ہنسنے لگے، اور ہم انہیں جو بھی کوئی نشانی دیتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی اور ہم نے انہیں عذاب کے ساتھ پکڑا تاکہ وہ باز آجائیں۔

ربط و تعلق: قریش مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں کہہ دیا تھا کہ یہ خود ساختہ کلام ہے، یہ اساطیر الاولین ہیں، پہلے لوگوں کے قصے اور کہانیاں ہیں، جو کچھ ان کی زبانوں پر مچلتا تھا اسے باہر پھینکتے تھے، وہ اعتراض کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت سے کیوں سرفراز فرمایا گیا ہے، کسی مالدار، صاحب جاہ و صاحب مال آدمی کو یہ منصب جلیل

کیوں نہیں سونپا گیا؟

یہاں ایک پہلی امت کے احوال بیان کیے جارہے ہیں، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستایا، انہیں آزمائشوں سے دوچار کیا، فرعون جیسے متکبر انسان کا ذکر ہے، جو خدائی کا دعویدار تھا، اس واقعہ میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ عناد، طغیان اور سرکشی کی شاخیں ایک ہی درخت سے پھوٹتی اور پروان چڑھتی اور معاشرے میں تباہی وبربادی لاتی ہیں، اس وقت جن لوگوں کو خطاب کیا جارہا ہے یہ اہل مکہ ہیں، ان سے پہلے فرعون تھا، مال ودولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ دہشت ووحشت کی علامت تھا، ملک وملت وسلطنت اس کے قدموں کے نیچے تھی، اس نے دنیا کی چمک دمک کے سامنے دین اور علمبردار دین کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی، اس نے باوجود یکہ دو پیغمبروں کو یہ منصب سونپا گیا کہ تم فرعون کی طرف جاؤ اوا سے نرم لب ولہجہ میں میرا پیغام پہنچاؤ، مگر فرعون نے سر تسلیم خم کرنے اور اطاعت رسول کی بجائے تکبر ونافرمانی سے کام لیا۔ یہ واقعہ بیان کرنے سے مقصود نبی کریم، رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ: اللہ کی قسم ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف معجزات دے کر بھیجا جو ان کی سچائی پر دلالت کرتے تھے۔

فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا: میں اللہ کا رسول ہوں جو تمہاری طرف آیا ہوں اور مجھے بھیجا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صرف ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاؤں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ: جب موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو ان کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس پڑے۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ اس لیے ہنسے تاکہ اپنے ماتحتوں کو یہ یقین دلائیں کہ یہ معجزات جادو ہیں اور وہ اس جیسے جادو پر قدرت رکھتے ہیں۔ (القرطبی ۱۶:۹۷) یہاں اس قصہ کے بیان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، کہ قوم موسیٰ نے ان معجزات کو دیکھتے ہی انکار کیا، موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید سے استشہاد مقصود ہے، کہ انہوں نے اول وہلہ میں استہزا وتمسخر اڑایا،

ذرا تامل نہیں کیا۔

وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا: ہم نے جو بھی عذاب کی نشانی لائے مثلاً جیسے طوفان، ٹڈی دل، جوئیں وغیرہ تو وہ پہلی نشانی سے زیادہ واضح اور اس سے بڑھ کر تھی۔ صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی ہے: وہ نشانیاں اعجاز میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی تھیں، دیکھنے والا گمان کرتا تھا کہ وہ دوسری نشانی سے بڑی ہے۔ (الصاوی ۴:۵۱)

وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: ہم نے مختلف قسم کے عذاب کی انہیں سزا دی تاکہ وہ کفر و تکذیب سے حق کی طرف لوٹ آئیں، خرافات خود ساختہ کو چھوڑ کر توحید کو تسلیم کریں۔

موسیٰ علیہ السلام کو اے ساحر! سے کیوں مخاطب کیا گیا؟

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ یہاں ساحر کیوں کہا؟

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ {۴۹} الزخرف

جواب ترجمہ: اور وہ یہ کہنے لگے کہ: اے جادوگر! تم سے تمہارے پروردگار نے جو عہد کر رکھا ہے اس کا واسطہ دے کر اس سے ہمارے لیے دعا کرو، ہم یقیناً راہ راست پر آجائیں گے۔

خلاصہ تفسیر: جب قوم فرعون نے عذاب کا معائنہ کر لیا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے جادوگر! چونکہ پہلے بھی وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہتے تھے اب بھی انہوں نے آپ کو اپنی عادت کے مطابق جادوگر کہا اور ایک قول یہ ہے کہ وہ علماء کو جادوگر کہتے تھے تو بر سبیل تعظیم کہا: اے جادوگر! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے جادوگر کا معنیٰ ہے: اے عالم! اور ان کے دور میں جادوگر بہت عظیم شخص ہوتا تھا اور وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور ان کے نزدیک جادوگر نا مذمت کی صفت نہیں تھی، اس کی ایک اور توجیہ یہ ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ اے وہ شخص جو ہم پر اپنے جادو کی وجہ سے غالب آگیا۔

انہوں نے کہا: آپ ہمارے لیے اس عہد کے وسیلہ سے دعا کیجئے جو آپ کے پاس ہے، یعنی آپ ہمیں یہ بتائیے کہ اگر ہم ایمان لے آئیں تو یہ عذاب ہم سے دور ہو جائے گا اور اس عہد کی بناء پر آپ

اپنے رب سے سوال کیجئے کہ وہ ہم سے یہ عذاب دور کر دے، پھر بیشک آئندہ ہدایت پر قائم رہیں گے۔(تبیان القرآن)

بعض اہل علم کا قول ہے کہ تعظیم و توقیر کیلئے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادو گر کہا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک جادو ایک عظیم الشان علم تھا، گویا انہوں نے یوں کہا: اے عالم کامل اور ماہر علم۔ (مظہری)وہ زمانہ ایسا تھا جس میں جادو گروں کا بڑا زور تھا، مصر میں جادو گروں کا طوطی بولتا تھا، جادو گروں کی عزت کی جاتی تھی، احترام کیا جاتا تھا، تعظیم بجالائی جاتی تھی، اس لیے انہوں نے مشکل کی گھڑی میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا تو اے ساحر! کہہ کر خطاب کیا۔

فرعون کی قوم مصائب و آلام میں گرفتار ہے، رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کرتے ہیں لیکن اس وقت بھی اے رسول کے الفاظ سے آپ کو خطاب نہیں کرتے بلکہ ایھا الساحر کہہ کر آپ کو پکارتے ہیں۔

بعض علما نے فرمایا ہے کہ ساحر اُن کے نزدیک بڑا معزز اور محترم ہوا کرتا تھا، سحر کو وہ اشرف العلوم تصور کرتے تھے، یہاں ایھا الساحر تحقیر کے لئے نہیں بلکہ احترام کے لئے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے علما کا خیال ہے کہ غرور و سرکشی میں وہ اتنا بڑھ چکے تھے کہ اپنی انتہائی بے بسی کے باوجود آپ کو جادو گر کہہ کر پکارتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام معمولی دل گردے کے تو آدمی نہ تھے کہ اتنی سی بات پر خفا ہو جاتے، آپ نے ان کی اس بد تہذیبی کے باوجود دعا مانگی، عذاب ٹل گیا لیکن نہ انہوں نے حق کو قبول کرنا تھا اور نہ کیا، نیز مکمل بربادی جو ان کا مقدر بن چکی تھی اس کی طرف وہ آہستہ آہستہ یوں بڑھ رہے تھے کہ ادھر سے انعامات ہوتے ہیں اور ادھر سے سرکشی، ادھر سے پیہم عفو و درگزر، ادھر سے مسلسل کفر طغیان، حتی کہ جب وہ غرق ہوئے تو ان کی اس تباہی پر کسی کو حیرت نہ ہوئی۔(ضیاء القرآن)

فرعونی چیخ و پکار اور پروپیگنڈہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ {۵۰} وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ {۵۱} اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ {۵۲} فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ {۵۳} فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ {۵۴} الزخرف

جواب ترجمہ: سو جب ہم نے ان سے عذاب ہٹا دیا تو یکایک وہ عہد کو توڑ رہے ہیں۔ اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرا دی، اس نے کہا کہ اے میری قوم کیا میرے لیے مصر کا ملک نہیں ہے؟ اور یہ نہریں جاری ہیں میرے نیچے، کیا تم نہیں دیکھتے؟ بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو ذلت والا ہے، اور وہ واضح طور پر بات بھی نہیں کر سکتا، سو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے، یا اس کے ساتھ فرشتے آجاتے لگاتار جماعتیں بنا کر، سو اس نے اپنی قوم کو مغلوب کر لیا سو انہوں نے اس کی اطاعت کی، بلاشبہ وہ لوگ فاسقین تھے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ: جب ہم نے ان کے اوپر سے عذاب اٹھا دیا موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی بدولت تو فوراً انہوں نے عہد توڑ دیا اور حسب سابق کفر و عصیان پر ڈٹے رہے۔ قسمیں کھا کھا کر باندھے گئے عہد و پیمان کو انہوں نے توڑ ڈالا۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ: یعنی فرعون نے قبطیوں کے بڑے بڑے سرداروں اور چودھریوں کو بلایا جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے اور اندیشہ محسوس کیا کہ قبطی اس پر ایمان نہ لے آئیں، ”المقتطف فی عیون التفاسیر“ کے مطابق فرعون نے قبطیوں کے مجمع میں بذات خود آواز لگائی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ: فخریہ انداز میں کہنے لگا: کیا مصر کا وسیع و عریض ملک میری ملکیت نہیں ہے؟ اور دریائے نیل سے نکالی گئی بہت ساری نہریں میرے محلات کے نیچے سے نہیں بہتیں؟ ملک مصر چالیس فرسخ طول اور چالیس فرسخ عرض میں پھیلا ہوا تھا، (بحر العلوم) قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: فرعون کی نہروں میں سے چار بڑی تھیں: نہر فلک، نہر

طولون، نہر دمیاط اور نہر تینس یہ ساری دریائے نیل سے نکالی گئی تھیں۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر، الصاوی ۴:۵۱) قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: فرعون کے باغات اور نہریں اس کے محلات کے نیچے تھیں۔ (البحر المحیط ۸:۲۲) مصر کی نہریں فرعون کے زیر انتظام تھیں اور جمہور عوام کو نظر آتی تھیں، یہ ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی تھیں، اس لیے لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ (فی ظلال القرآن) ایک قول یہ کیا گیا کہ نہریں اس کے تخت کے نیچے سے رواں دواں تھیں، یہ بھی لکھا گیا کہ ان نہروں کی لگام فرعون کے ہاتھ میں تھی، وہ جب چاہتا ان نہروں کو روک دیتا تھا۔ (قرطبی) قشیری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ استدراج کے طور پر مدعی نبوت کے ہاتھ پر خارق عادت چیزیں جاری تھیں۔

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ: کیا تم میری عظمت اور میری بادشاہت کی وسعت اور موسیٰ کی قلت و ذلت نہیں دیکھ رہے؟ فرعون نے اپنے مال کی کثرت اور اپنے عیش و عشرت کی فراوانی سے اپنی فضیلت پر استدلال کیا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ جب میں افضل ہوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں، میں ہی حق پر ہوں۔

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ: بلکہ میں تو اس حقیر و ضعیف سے بہتر ہوں جس کے پاس نہ عزت ہے نہ مرتبہ ہے اور نہ حکومت ہے، وہ تو اپنی ضروریات و حاجات پوری کرنے کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے چونکہ اس کی کوئی عزت ہے ہی نہیں، اس کی مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔

وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ: اس کی زبان میں فصاحت کا ہونا بھی ناممکن ہے وہ تو اپنا مدعا و مقصود بھی واضح طریقہ سے بیان نہیں کر سکتا، بھلا وہ رسالت کے لیے کیسے صلاحیت رکھتا ہے؟ ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: فرعون نے یہ باتیں دراصل موسیٰ علیہ السلام پر افترا کے طور پر کہیں اور لوگوں کی نظر میں آپ علیہ السلام کی تنقیص کی چونکہ آپ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ لکنت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ختم کر دی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی: **وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ** (سورۃ طٰہٰ۔) تفسیر ابی السعود ۵:۴۶) میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ پائیں۔

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ: اللہ نے اس پر سونے کے کڑے کیوں نہیں ڈالے جو اس کی

عزت و شریعت اور اس کی نبوت پر دلالت کرتے ؟ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ لوگ جب کسی آدمی کو اپنا سردار بنانا چاہتے اسے سونے کے دو کڑے پہناتے اور اس کے گلے میں سونے کا ہار ڈالتے تھے اور اس کی سیادت اور سرداری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ (القرطبی ۱۶:۱۰۰، المقتطف فی عیوان لتفاسیر)

اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ: یا اس کے ساتھ فرشتے آتے جو اس کی خدمت بجالاتے اور اس کے ساتھ ہوتے اور اس کی سچائی کی گواہی دیتے۔

ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب فرعون نے عزت و بادشاہت کے اوصاف بیان کر کے اپنی تعریف کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موازنہ کیا، آپ علیہ السلام کے نقائص میں بیان کیا کہ یہ کمزور ہے اور اس کے پاس اعوان و انصار نہیں، پھر اس نے خود اعتراض کر ڈالا کہ اگر یہ سچا ہے تو اس کے رب نے اسے سلطنت کیوں نہیں دی، اسے سونے کے کڑے کیوں نہیں پہنائے اور اس کے ساتھ اس کے اعوان و انصار بنا کر فرشتے کیوں نہیں بھیجتے۔ (البحر المحیط ۸:۲۲)

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ: یوں فرعون نے اپنی قوم کو بے وقوف بنالیا چونکہ ان کے پاس عقل مندی نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی، چنانچہ فرعون انہیں جس گمراہی اور باطل کی دعوت دیتا تھا اس کی قوم نے فوراً اس کا کہا مان لیا اور اس کی اطاعت کر لی۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: قوم نے اس کی بات اس لیے مان لی چونکہ وہ تھے ہی فاسق لوگ اور اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلے ہوئے تھے، فرعون بڑا فاسق تھا، یوں چھوٹے فاسقوں نے بڑے فاسق کی پیروی کر لی، جنس جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔

انتقام اور غرقابی کا باعث

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا کا کیا مطلب ہے؟

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ {۵۵} فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ {۵۶} الزخرف

جواب ترجمہ: چنانچہ جب انہوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو

غرق کر دیا۔ پھر ہم نے انہیں آئندہ آنے والوں کے لیے سلف اور نمونہ بنا دیا۔

خلاصہ تفسیر: اٰسَفُوْنَا: انہوں نے ہمیں غضب و غصہ دلایا، یہ اَسَفٌ سے نکلا ہے جس کے لغوی معنٰی ہیں افسوس، لہٰذا اس جملے کے لفظی معنٰی ہوئے "پس جب انہوں نے ہمیں افسوس دلایا" اور افسوس بکثرت غصہ کے معنٰی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کا با محاورہ ترجمہ عموماً اس طرح کیا جاتا ہے کہ "جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا۔" اور چونکہ باری تعالیٰ افسوس اور غصہ کی انفعالی کیفیات سے پاک ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کام ایسے کئے جس سے ہم نے انہیں سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (روح المعانی بحوالہ تفسیر معارف القرآن)

علامہ راغب اصفہانی اس کا معنٰی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اسف کا معنی ہے: غم و غصہ اور کبھی یہ صرف غم اور صرف غضب کے معنٰی میں بھی آتا ہے اور اس کا حقیقی معنٰی ہے: انتقام لینے کے لیے خون کا جوش میں آنا، اگر انسان کو اپنے سے کم مرتبہ اور کمزور شخص پر غصہ آئے تو اس کو غضب کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور اگر اپنے سے طاقتور شخص پر افسوس ہو تو اس کو غم کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

اسف کا حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر اطلاق محال ہے، اس لیے یہاں پر اسف کا معنی ہے: کراہت کا اظہار کرنا اور کسی چیز کو ناپسند کرنا اور اس سے ناراض ہونا، سو اس آیت کا معنٰی ہے: پس جب انہوں نے ہمیں ناراض کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا یعنی ان کو سزا دی اور اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت موسیٰ کو غضب ناک کیا اور ان کو متأسف کیا اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے کو غضب ناک کرنا در حقیقت اللہ کو غضب ناک کرنا ہے۔ (المفردات)

فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ: انجام کار ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں غرق کر دیا اور سب کے سب ڈوب مرے، ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا۔ مفسرین کہتے ہیں: فرعون نے اپنی عظمت، سلطنت اور اپنے تخت تلے بہتی ہوئی نہروں سے دھوکا کھایا اور تکبر کیا، اس نے جس جنس پر فخر و تکبر کیا اسی جنس کے عذاب میں بھی مرا، نہروں پر فخر کیا اسی پانی میں ڈوب مرا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص کسی چیز پر فخر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں اسے ہلاک کرتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ: ہم نے فرعون کو بعد میں آنے والے کفار کے لیے نمونہ بنادیا یعنی عذاب و تباہی کے استحقاق میں فرعون نمونہ بن گیا، مثلاً اس سے عبرت حاصل کریں ورنہ ان کا بھی یہی حال ہو سکتا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی فرعون کفار قریش کے لیے نمونہ بن گیا ہے وہ بھی دوزخ میں جائیں گے اور وہ بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت بن گیا۔ (تفسیر القرطبی ۱۶:۱۰۲)

پرستارانِ غیر اللہ کے ڈھکوسلے

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ {۵۷} وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ {۵۸} اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ {۵۹} وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ {۶۰} الزخرف

جواب ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو اچانک آپ کی قوم کے لوگ اس کی وجہ سے چیخ رہے ہیں، اور انہوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ ان لوگوں نے یہ بات جو آپ سے بیان کی ہے صرف جھگڑنے کے طور پر ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں، وہ نہیں ہیں مگر ایک ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنادیا، اور اگر ہم چاہتے تو زمین میں تم سے فرشتے پیدا کر دیتے جو یکے بعد دیگرے رہا کرتے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ: جب قرآن میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا ذکر آیا اور اللہ کے علاوہ معبودانِ باطلہ کی مثال بیان کی گئی یکایک مشرکین قریش چیخ اٹھے۔ مفسرین کہتے ہیں: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (سورۃ الانبیاء۔ ۹۸) تم اور اللہ کے علاوہ جن معبودان کی تم عبادت کرتے ہو سب دوزخ کے ایندھن میں ہوں گے۔

یہ مثال بیان کرنے والا عبداللہ ابن زِبعریٰ تھا، جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ الانبیاء کی آیت

۹۸ کے بارے میں جھگڑا کیا تھا، تو ابن زِبعریٰ کہنے لگا: کیا یہ حکم صرف ہمارے ہی لیے ہے یا سب امتوں کے لیے ہے؟ رسول کریم ﷺ نے جواب دیا: یہ تمہارے لیے تمہارے خداؤں کے لیے اور ساری امتوں کے لیے ہے۔

یہ سن کر ابنِ زِبعریٰ کہنے لگا: رب کعبہ کی قسم! میں تو آپ سے جھگڑا کروں گا، کیا نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت نہیں کرتے؟ کیا یہود حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت نہیں کرتے؟ کیا بنو ملیح ملائکہ کی عبادت نہیں کرتے؟ اگر یہ سارے لوگ دوزخ میں جائیں گے تو ہم خوش ہیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ دوزخ میں ہوں گے، یہ کہنے پر اس کے لوگ خوش ہوئے، ہنسنے لگے، ان کی آوازیں بلند ہونے لگیں، اسی سے متعلق قرآن کریم کہتا ہے اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ، اس پر سورۃ الانبیاء کی یہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى، اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (سورۃ الانبیاء۔ ۱۰۱) بیشک جن لوگوں کے متعلق ہمارا بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے وہ دوزخ سے دور رہیں گے۔ (الصاوی، صفوۃ التفاسیر، المقتطف فی عیون التفاسیر)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر ابن زبعریٰ آیت کریمہ میں غور و فکر کرتا اسے اعتراض ہی نہ سوجھتا۔ (تفسیر ابی السعود ۵:۴۷) چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ : مَا لایا گیا ہے اس کی بجائے مَنْ تَعْبُدُوْنَ : نہیں فرمایا۔ چنانچہ مَا تو غیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے، آیت میں اس سے مراد بت ہیں مسیح علیہ السلام عزیر علیہ السلام اور فرشتے مراد نہیں ہیں، اگرچہ لوگوں نے انہیں بھی خدا بنالیا ہو۔ (القرطبی ۱۶:۱۰۳)

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ: یعنی ہمارے معبودان بہتر ہیں یا عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام؟ اگر عیسیٰ علیہ السلام دوزخ میں ہوں گے تو ہمارے معبودان بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا: مشرکین کے اس قول کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لڑنا چاہتے ہیں اور دشمنی و مخالفت ان کا مقصد ہے، وہ حق کی طلب میں نہیں ہیں۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ: بلکہ یہ لوگ سخت جھگڑالو ہیں اور باطل پر اڑے ہوئے ہیں، علامہ صابونی

تسہیل کے حوالے سے لکھتے ہیں یعنی مشرکین نے آپ کے لیے یہ مثال محض جھگڑا کرنے کے لیے بیان کی ہے اور بلاوجہ جدل ان کا مقصد ہے۔

جَدَلٌ: مناظرہ میں مد مقابل پر غلبہ کا قصد کرنا خواہ غلبہ حق کے ساتھ ہو یا باطل کے ساتھ۔ ابن زبعریٰ اور اس جیسے معترضین پر یہ بات مخفی نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اس قول حَصَبُ جَهَنَّمَ میں داخل نہیں ہیں، لیکن انہوں نے مغالطے کا ارادہ کیا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف بیان کیا کہ وہ تو بس جھگڑنے والے لوگ ہیں۔ (التسہیل ۴:۳۲، صفوۃ التفاسیر)

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک بندہ ہیں اللہ تعالیٰ نے جس پر نبوت کا انعام کیا ہے اور بنی اسرائیل کے لیے مثال بنا دیا ہے یعنی ایک آیت اور عبرت بنا دیا ہے جس کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کیا جاتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ نہ تھا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ معجزات عطا کئے وہ مردوں کو زندہ کرتے، مادرزاد اندھوں، برص کے مریضوں اور تمام قسم کے امراض سے تندرست کر دیتے جبکہ ان کے زمانہ میں اس قسم کی شان کسی اور کو نہ دی گئی جبکہ اس زمانہ میں بنی اسرائیل بہترین مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے سب سے محبوب بندے تھے جبکہ لوگ ان سے درجہ میں کم تھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہ تھا، ایک قول یہ کیا گیا ہے، جس بندے پر انعام کیا گیا سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے جبکہ پہلا قول زیادہ نمایاں ہے۔ (قرطبی)

وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: ہم نے انہیں نشانی اور عبرت بنا دیا ہے بنی اسرائیل کے لیے تاکہ وہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کریں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ماں سے پیدا کیے گئے ہیں، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے ان کو عجیب عبرت بنا دیا ہے چونکہ ہم نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے جیسے آدم کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا کر دیا۔ (القرطبی ۱۶:۱۰۵)

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ: اگر ہم چاہیں تمہارے بدلے میں فرشتے پیدا کر دیں جو زمین میں رہیں اور وہی تمہارے جانشین ہوں۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: تمہاری جگہ فرشتے زمین کو آباد کریں۔ (القرطبی ۱۶:۱۰۵)

نزول سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ {٦١} الزخرف

جواب ترجمہ: اور یقین رکھو کہ وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ اس لیے تم اس میں شک نہ کرو، اور میری بات مانو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ (الزخرف)

خلاصہ تفسیر: حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا تھا، وہ قیامت کے قریب آسمان سے اتریں گے، ان کے قیامت سے پہلے زمین پر اترنے کو قیامت کی نشانی بتایا گیا ہے۔

حضرات مفسرین کرام ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے آسمان سے زمین پر نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر ارشادات میں یہ بات موجود ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر آنے کے بعد دجال کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں تاکیدی الفاظ استعمال فرمائے ہیں، جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ سیدنا عیسی بن مریم علیہ السلام قیامت کی علامت اور نشانی ہیں، اسے تسلیم کرنے اور ماننے کو ہی صراط مستقیم کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وَإِنَّهُ أَيْ عِيسٰى لَعَلَمٌ لِلسَّاعَةِ شَرْطٌ مِنْ أَشْرَاطِهَا تُعْلَمُ بِهِ فَسُمِّيَ الشَّرْطُ الدَّالُّ عَلَى الشَّيْءِ عِلْمًا لِحُصُولِ الْعِلْمِ بِهِ، (تفسیر کبیر ۲۷:۶۴۰) اور بیشک وہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں، اس لیے کہ انہی کی آمد سے قیامت کے وقوع کا علم ہو گا، اس لیے شرط دال علی الشی کو علامت قرار دیا ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے قیامت کا علم ہو گا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشہور یہی ہے کہ حضرت سیدنا عیسی علیہ السلام دمشق میں اتریں گے، جب کہ لوگ صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوں گے، امام مہدی رحمہ اللہ مصلیٰ امامت پر

ہوں گے، عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر وہ پیچھے ہٹ جائیں گے، تاکہ عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھائیں، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی کو آگے کریں گے کہ ان کی اقتدا میں نماز ادا کریں، اور عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی سے کہیں گے کہ اس نماز کی اقامت آپ کے لیے کہی گئی ہے۔

بعض روایات کے مطابق حضرت سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بیت المقدس کے قریب افیق نامی ٹیلہ پر نازل ہوں گے، یہ ٹیلہ سوق حمیدیہ میں اموی جامع مسجد کے مشرقی کنارے پر ہے، جس پر سفید رنگ کا مینار بنا ہوا ہے، جس پر صبح کے وقت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانی ہیں، وہ قیامت کے واقع ہونے کی نشانی اور دلیل ہیں، علم للساعۃ کی یہ تفسیر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ میں تواتر سے موجود ہے کہ سیدنا عیسیٰ قیامت سے پہلے امام عادل، منصف حاکم بن کر اتریں گے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس ساری بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ حاصل یہ ہے کہ ان کا پہلی مرتبہ آنا خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور ماں کی گود ہی سے بولنا شروع کیا اور اللہ کی ربوبیت اپنی عبدیت کے اقرار اور اعتراف سے بولنے کا آغاز فرمایا اور پھر نبوت و رسالت ملنے کے بعد عجیب و غریب معجزات دکھلائے۔

اور پھر جب دشمنوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا، تاکہ اپنے باپ آدم علیہ السلام کی طرح چند روز آسمان پر رہیں اور زمانہ آئندہ میں قیامت کے قریب آسمان سے زمین پر نازل ہوں اور ان کا یہ دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہو گا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے اس اعتبار سے وہ من وجہ اپنے باپ کی طرح چند روز کے لیے آسمان پر چلے گئے اور آیات قرآنیہ اور احادیث صریحہ سے حضرت آدم علیہ السلام کا آسمان سے زمین پر ہبوط (اترنا) اور نزول (اترنا) قطعی طور پر ثابت ہے۔

اسی طرح قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے زمین پر نزول و ہبوط اپنے باپ آدم

علیہ السلام کے ہبوط کا نمونہ ہو گا اور اس طرح آسمان سے ہبوط اور نزول قرب قیامت کی علامت ہو گا ان کے نزول سے لوگ سمجھ لیں گے کہ قیامت بالکل قریب آلگی ہے۔

آیات قرآنیہ سے اور احادیث نبویہ سے تفصیلاً یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ دجال لعین کے خروج کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام علی نبینا وعلیہ افضل الصلاۃ والسلام آسمان سے نزول فرمائیں گے اور دجال کو قتل فرمائیں گے اور زمین کو دجال اور اس کے متبعین کی خباثت وفساد اور یہودیوں کی ناپاکیوں اور گندگیوں سے پاک کریں گے، جس طرح عیسیٰ علیہ السلام اسی جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر گئے ہیں، اسی جسد عنصری کے ساتھ آسمان سے نازل ہوں گے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ جب انقراض عالم کی مدت قریب ہو گی تو عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بنی آدم علیہ السلام میں سے ہیں اور بعض اعتبارات سے اپنے باپ آدم علیہ السلام کا نمونہ ہیں، اس لیے اول ان کو خدا تعالیٰ نے کفار کے شر سے بچا کر ایک مدت معینہ کے لیے آسمان پر اٹھالیا، اور چونکہ کوئی انسان آسمان پر فوت نہ ہو گا، بلکہ زمین ہی پر مرے گا۔

لہذا جب عیسیٰ علیہ السلام کی اجل مقررہ اور مدت حیات اختتام کو پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ ان کو آسمان سے زمین پر نازل کرے گا، تاکہ ان کی موت زمین پر آئے اور جس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دینے کے لیے وہ مبعوث ہوئے تھے، جیسا کہ ارشاد ہے وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ان ہی کے قدموں میں دفن ہونے کی سعادت نصیب ہو گی۔

چنانچہ قیامت کے قریب دجال کے قتل کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب مدفون ہوں گے، اور بعض مؤرخین مثلاً علامہ سمہودی رحمہ اللہ کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ حجرۂ شریفہ میں جو ایک قبر کی جگہ باقی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے آگے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین شریفین سے سمت مشرق میں واقع ہے۔ (معارف للکاندھلوی رحمہ اللہ)

نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے نازل کرنے کی حسب ذیل حکمتیں ہیں:

① یہود کے اس زعم اور دعویٰ کا رد کرنا کہ انہوں نے حصرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا ہے، اللہ تعالیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل کر کے ان کے جھوٹ کو ظاہر فرمادے گا۔

② جب ان کی مدت حیات پوری ہونے کے قریب ہو گی تو زمین پر ان کو نازل کیا جائے گا تا کہ ان کو زمین میں دفن کیا جائے کیونکہ جو مٹی سے بنایا گیا ہو اس میں یہی اصل ہے کہ اس کو مٹی میں دفن کیا جائے۔

③ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آپ کی امت کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ آپ کو ان میں سے کر دے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کو باقی رکھا حتیٰ کہ آپ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے، احکام اسلام کی تجدید کریں گے اور آپ کا نزول دجال کے خروج کے زمانہ کے موافق ہو گا، سو آپ اس کو قتل کریں گے۔

④ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے نصاریٰ کے جھوٹے دعووں کا رد ہو گا جو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کرتے رہے، وہ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور یہ کہ یہودیوں نے ان کو سولی دی اور وہ مرنے کے بعد تین دن بعد زندہ ہو گئے۔ ⑤ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بشارت دی تھی اور مخلوق کو آپ کی تصدیق اور اتباع کی دعوت دی تھی، اس لیے خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے۔ (تبیان القرآن)

فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا: قیامت کے بارے میں شک مت کرو، لامحالہ قیامت آکر رہے گی، حدیث میں ہے: عنقریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان انصاف پسند حکم و قاضی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے۔ (بخاری)

وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ان لوگوں سے فرما دیجیے: میرے راستے کی اتباع کرو اور میری لائی ہوئی شریعت پر چلو، بلاشبہ میں تمہیں جس دین کی طرف بلا رہا ہوں یہی سیدھا دین اور سیدھا راستہ ہے۔

معجزات عیسویہ اور حکمت الٰہیہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ

جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ {٦٣} إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ {٦٤} الزخرف

جواب ترجمہ: اور شیطان تمہیں ہر گز نہ روک دے بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور جب عیسیٰ واضح معجزات لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تمہارے لیے بعض وہ باتیں بیان کروں جن میں تم اختلاف کرتے ہو سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بلاشبہ اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، سو تم اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ: یعنی شیطان کے وسوسوں سے دھوکا مت کھاؤ، ہوشیار ہو کہ شیطان تمہیں اتباع حق سے روک نہ دے چونکہ شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اسی نے تو تمہارے باپ آدم کو جنت سے نکالا تھا اور ان سے نور کا لباس چھین لیا تھا۔ ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ شیطان تمہیں میری اتباع سے نہ روکے۔ (المقتطف) شیطان تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے وہ کہیں تمہیں کسی بڑی آزمائش میں نہ پھنسا دے۔

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ: اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزات لے کر آئے اور واضح شریعت لائی تو انہوں نے (بنی اسرائیل میں) اعلان کیا کہ تمہارے پاس وہ شریعت لایا ہوں جس کا حکمت تقاضا کرتی ہے۔ بینات سے مراد معجزات اور شریعت کی روشن باتیں ہیں۔

قَالَ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا، حکمت سے مراد حکمت الٰہیہ اور شریعت واضحہ ہے۔

وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ: میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ دین کے جن معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو تاکہ میں انہیں واضح کر دوں۔ ابن جوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یوں کہا: بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ: بعض کا لفظ لائے کل کا لفظ نہیں لائے چونکہ انبیائے کرام علیہم السلام امور دین بیان کرتے ہیں امور دنیا نہیں بیان کرتے۔ (التسہیل ۴:۳۲) طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی امور دینیہ نہ کہ دنیویہ۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۲۹۵) دنیا کی باتیں انبیاء کرام کے وظائف میں سے نہیں ہے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا کہ أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ کہ تم

اپنے دنیا کے امور کو بہتر جانتے ہو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ : یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر بجالا کر اور نواہی سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرو، لہٰذا میں جو شرعی ذمہ داریاں تم تک پہنچاتا ہوں ان میں میری اتباع کرو، میری مخالفت کرنے سے ڈرو۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ : اللہ تعالیٰ ہی رب اور معبود ہے، اس کے سوا کوئی رب نہیں، خالص اسی کی اطاعت وعبادت کرو۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی میں اور تم سب اللہ کے بندے ہیں، ہم سب اسی کے محتاج ہیں ہم سب صرف تنہا اسی کی عبادت کرنے میں مشترک ہیں۔ (مختصر ابن کثیر)

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ : یہ توحید اور شرائع پر عمل پیرا ہونا سیدھا راستہ ہے جو جنت کی طرف لے جاتا ہے۔

نصاریٰ کی گروہ بندی، انتظارِ قیامت

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ {٦٥} هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ {٦٦} الزخرف

جواب ترجمہ: سو جماعتوں نے آپس میں اپنے درمیان اختلاف کر لیا۔ سو جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے لیے ہلاکت ہے اس دن کے عذاب سے جو دردناک ہوگا۔ یہ لوگ بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

خلاصہ تفسیر: حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزات، شرعی دلائل، واضح دلائل کے ساتھ مبعوث کیے گئے تھے، آپ نے اپنے لوگوں کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، حکمت کا مطلب یہ تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت اور اس کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت لے کر مبعوث ہوا ہوں، اور یہ بات لوگوں کو بتائی تھی کہ اس سے پہلے جن چیزوں میں تم اختلافات کا شکار ہوئے ہو ان کی وضاحت کرنے کے لیے آیا ہوں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تکلیفی احکامات میں اختلاف کیا تھا، اور چند چیزوں پر اتفاق کیا تھا، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، تاکہ

اختلافی مسائل کی وضاحت فرمائیں، الجھی ہوئی باتوں کو سلجھائیں۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام جس حکمت کے ساتھ مبعوث ہوئے اس سے مراد اصول دین ہیں، اور جن چیزوں میں وہ لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے ان سے مراد فروع دین ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ ان کی باتوں کو تسلیم کرتے اور مان لیتے الٹا لوگوں نے فرقے بنا لیے، جیسے قرآن کریم یہاں ہمیں بتاتا ہے کہ گروہوں نے اختلاف کیا، فرقوں نے اختلاف کیا، حضرات مفسرین کرام نے عیسائیوں کے کئی فرقوں کا اپنی تفسیروں میں ذکر کیا ہے، ان میں ملکانیہ، یعقوبیہ، نسطوریہ نامی فرقے مشہور ہیں، راقم الحروف نے اپنی کتاب ''تقابل ادیان'' اور ''مطالعہ مذاہب'' میں نصاریٰ کے بہت سے فرقوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

نصاریٰ جن فرقوں میں تقسیم ہوئے ان میں کچھ وہ تھے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہی فرقہ حق پر تھا۔

بعض ان فرقوں میں سے وہ تھے جو اس بات کے مدعی تھے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم اللہ کے بیٹے ہیں، بعض ان فرقوں میں سے وہ تھے جو کہتے تھے عیسیٰ بن مریم ہی اللہ ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان باطل فرقوں کے جھوٹ، فریب، فراڈ، دجل اور دھوکے اور شرکیہ کلمات سے بہت بلند و بالا ذات ہے۔

جو لوگ اللہ کی تعلیمات سے ہٹ کر من پسند باتوں کو نبیوں کی طرف منسوب کریں گے، فرقہ فرقہ ہو جائیں گے ان کے لیے ہلاکت ہے، ان کے لیے تباہی اور بربادی ہے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو ان صفات سے ہٹ کر کسی ربانی صفت کے ساتھ موصوف کریں گے وہ اللہ کی غیرت اور اللہ کے جلال پادشاہی کو دعوت دیں گے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: بس یہ لوگ اسی بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اچانک قیامت آجائے اور انہیں اس کی خبر بھی نہ ہو، هَلْ يَنْظُرُوْنَ ، کی ضمیر مستتر کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ احزاب کی طرف راجع ہے اور مطلب یہ

ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو لوگ اختلاف رکھتے ہیں راہ حق پر نہیں آتے حق کو قبول نہیں کرتے ان کا طریقہ کار ایسا ہے کہ انہیں قیامت کا انتظار ہے اچانک قیامت آجائے (جس کا انہیں پتہ بھی نہ ہو کیونکہ پہلے سے اس کی آمد کا وقت نہیں بتایا گیا) تو اس وقت توحید پر آئیں گے اور کفر و شرک چھوڑ دیں گے لیکن اس وقت ایمان لانا مفید نہ ہو گا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ فعل مضارع يَنظُرُونَ کی ضمیر قریش کی طرف راجع ہے ان کے سامنے توحید کے دلائل ہیں قرآن کا معجزہ سامنے ہے پھر بھی توحید پر نہیں آتے انھیں اس کا انتظار ہے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے اور انھیں پتہ بھی نہ ہو کہ وہ بھی اچانک آنے والی ہے چونکہ وہ لوگ وقوع قیامت کو مانتے ہی نہ تھے۔

صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ اس میں ان لوگوں کی کم فہمی بیان فرمائی، جیسے کوئی شخص اس چیز کے انتظار میں ہو جو ضرور واقع ہونے والی ہو اور جب وہ واقع ہو جائے تو مصیبت بن جائے حالانکہ وہ اس کے وقوع کو اپنے لیے خیر سمجھتا رہا ہو۔ (روح المعانی، انوار البیان)

دنیا اور دین کے لیے دوستی

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ {٦٧} الزخرف

جواب ترجمہ: اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے متقی لوگوں کے۔

خلاصہ تفسیر: اس آیت مبارکہ میں الاخلاء کا لفظ ہے، جو کہ خلیل کی جمع ہے، امام لغت علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ الاخلاء کا لفظ خلیل کی جمع ہے، خلیل کا معنیٰ ہے: وہ دوست جس کی محبت دل کی گہرائی میں جاگزین ہو، یہ خلۃ سے بنا ہے اور خلۃ خلال سے مشتق ہے، اس کا معنیٰ اندرون اور درمیان ہوتا ہے اور خلۃ اس محبت کو کہتے ہیں جو نفس کے اندر پیوست ہو یا یہ لفظ خلل سے مشتق ہے کیونکہ جب دو شخص ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے تو ہر ایک دوسرے کے خلل کو روکتا ہے، یا یہ لفظ "خل" سے مشتق ہے، اس کا معنیٰ ریگستانی راستہ ہے کیونکہ جو دو شخص ایک دوسرے کے گہرے

دوست ہوں وہ راستہ میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔

یا یہ لفظ خلۃ سے بنا ہے جس کا معنیٰ خصلت اور عادت ہے اور جو دو شخص ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوں ان کی خصلتیں اور عادتیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل اس لیے فرمایا کہ انہوں نے اپنی تمام حاجات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی تھیں اور تمام مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہو چکے تھے اور جب خلیل کے لفظ کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق ہو تو اس کا معنیٰ ہے: احسان کرنے والا یا اکرام اور افضال کرنے والا۔ (المفردات)

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرنے والے، ایک دوسرے کے ساتھ یارانہ رکھنے والے قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، کوئی ان میں سے ایک دوسرے کا حال نہیں دریافت کرے گا، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے دنیا میں تقویٰ کی زندگی اختیار کی اور تقویٰ کے اوپر ہی ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائیں، ان کی دوستی لازوال ہے، دنیا میں بھی متقی لوگ ایک دوسرے کے دلی دوست ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کی دوستی برقرار رہے گی۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں اس آیت نے یہ بات کھول کر بتادی کہ یہ دوستانہ تعلقات جن پر انسان دنیا میں ناز کرتا ہے اور جن کی خاطر حلال و حرام ایک کر ڈالتا ہے قیامت کے روز صرف یہ کہ کچھ کام نہ آئیں گی بلکہ عداوت میں تبدیل ہو جائیں گی۔ (معارف القرآن)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت علی کی بیان کردہ ایک حکایت ذکر فرمائی ہے کہ دو دوست مومن تھے اور دو کافر، مومن دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہوا اور اسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تو اسے اپنا دوست یاد آیا۔ اس نے دعا کی کہ یا اللہ، میرا فلاں دوست مجھے آپ کی اور آپ کے رسول کی اطاعت کی تاکید کرتا، بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا تھا اور یہ یاد دلاتا رہتا تھا کہ مجھے ایک دن آپ کے پاس حاضر ہونا ہے، لہٰذا یا اللہ، اس کو میرے بعد گمراہ نہ کیجئے گا تاکہ وہ بھی (جنت کے) وہ مناظر دیکھ سکے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے راضی ہوئے ہیں اسی طرح

اس سے بھی راضی ہو جائیں۔

اس دعا کے جواب میں اس سے کہا جائے گا کہ جاؤ، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے تمہارے اس دوست کے لئے کیا اجر و ثواب رکھا ہے تو تم رؤو کم اور ہنسو زیادہ۔ اس کے بعد جب دوسرے دوست کی وفات ہو چکے گی تو دونوں کی ارواح جمع ہوں گی، باری تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ تم میں سے ہر شخص دوسرے کی تعریف کرے، تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ بہترین بھائی، بہترین ساتھی اور بہترین دوست ہے۔

اس کے برخلاف جب دو کافر دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہو گا اور اسے بتایا جائے گا کہ اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو اسے بھی اپنا دوست یاد آئے گا اس وقت وہ یہ دعا کرے گا کہ یا اللہ، میرا فلاں دوست مجھے آپ کی اور آپ کے رسول کی نافرمانی کرنے کا حکم دیتا تھا، برائی کی تاکید کرتا اور بھلائی سے روکتا تھا، اور مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی آپ کے حضور حاضر نہ ہوں گا، لہٰذا یا اللہ، اس کو میرے بعد ہدایت نہ دیجئے گا، تاکہ وہ بھی (دوزخ کے) وہ مناظر دیکھے جو آپ نے مجھے دکھائے ہیں، اور آپ جس طرح مجھ سے ناراض ہوئے ہیں اسی طرح اس سے بھی ناراض ہوں۔

اس کے بعد دوسرے دوست کا بھی انتقال ہو جائے گا تو دونوں کی روحیں جمع کی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ساتھی کی تعریف کرے، تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہے گا کہ یہ بدترین بھائی، بدترین ساتھی اور بدترین دوست ہے۔ (ابن کثیر ۱۳۴ ج ۴ بحوالہ معارف القرآن)

اسی لئے دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہترین دوستی وہ ہے جو اللہ کے لئے ہو۔ جن دو مسلمانوں میں صرف اللہ کے لئے محبت ہو ان کے بڑے فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میدان حشر میں یہ لوگ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے۔ اور اللہ کے لئے محبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سے اس بنا پر تعلق ہو کہ وہ اللہ کے دین کا سچا پیرو ہے۔ چنانچہ علوم دین کے استاذ، شیخ و مرشد، علماء اور اہل اللہ سے نیز عالم اسلام کے تمام مسلمانوں سے بے لوث محبت

اس میں داخل ہے۔ (معارف)

دنیا کی دوستی ناپائیدار اور فانی ہے، دین کی دوستی پائیدار اور سدا بہار ہے، حدیث شریف میں اللہ کے لیے محبت اور دوستی کے بہت سے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے جس دن اللہ کے سائے کے سوا اور کسی کا سایہ نہ ہو گا ① امام عادل ② اور وہ شخص جو اپنے رب کی عبادت کرتے ہوئے پروان چڑھا ③ اور وہ شخص جس کا دل مسجد میں معلق رہتا ہو ④ اور وہ دو شخص جو اللہ کی محبت میں ملتے ہیں اور اللہ کی محبت میں الگ ہوتے ہوں ⑤ اور وہ شخص جس کو کسی مقتدر اور حسین عورت نے گناہ کی دعوت دی اور اس نے کہا: میں اللہ سے ڈرتا ہوں ⑥ اور وہ شخص جس نے اس طرح صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتا نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ⑦ اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، موطا امام مالک، ابن حبان، بیہقی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، وہ مسلمان کہاں ہیں جو محض میری ذات کی وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے؟ آج میں ان کو اپنے سائے میں رکھوں گا جس دن میرے سائے کے سوا اور کسی کا سایہ نہیں ہو گا۔ (صحیح مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل فرمائے گا: جو مسلمان میری ذات کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اس کے لیے نور کے منبر ہوں گے، ان کی انبیاء اور شہداء تحسین کریں گے۔ (ترمذی، مسند احمد، ابن حبان، معجم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لَوْ أَنَّ رَجُلَيْنِ تَحَابَّا فِي اللهِ، أَحَدُهُمَا بِالْمَشْرِقِ وَالْآخَرُ بِالْمَغْرِبِ، لَجَمَعَ اللهُ بَيْنَهُمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَقُولُ: هٰذَا الَّذِي أَحْبَبْتَهُ فِيَّ اگر دو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، ان دو میں

سے ایک اگر مشرق میں ہو گا اور دوسرا مغرب میں ہو گا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کو قیامت کے دن جمع فرمائیں گے اور ارشاد فرمائیں گے کہ یہ ہے وہ شخص جس کے ساتھ تو میری وجہ سے محبت رکھتا تھا۔ (تاریخ دمشق لابن منظور، بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ دوست چار ہیں دو مؤمن اور دو کافر، مومنین میں سے (جب) ایک مر جاتا ہے تو اس کے دوست کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے اے اللہ! میں نے کوئی دوست نہیں دیکھا کہ میں اس کو نیکی کا حکم دیتا ہوں اور نہ برائی سے روک سکتا ہوں، اے اللہ! اس کو ہدایت دے جیسے مجھے ہدایت دی اور اس کو موت دے اس (دین) پر جس پر مجھے موت دی۔

اور جب کافروں میں سے ایک مر جاتا ہے تو اس سے اس کے دوست کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ! میں نے کوئی ایسا دوست نہیں دیکھا جو برائی کا حکم کرنے والا ہو اور نیکی سے روکنے والا ہو، اے اللہ! اس کو گمراہ کر دے جیسے آپ نے مجھے گمراہ کیا اور اس کو اس (کفر) پر موت دے دے جس پر آپ نے مجھے موت دی، فرمایا پھر ان کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا، فرمایا وہ ایک دوسرے کے بارے میں رائے کا اظہار کریں گے بعض تو دونوں مومن ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی اچھی تعریف کرے گا لیکن دونوں کافر ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی بری تعریف کرے گا۔ (عبد بن حمید بحوالہ تفسیر در منثور)

حضرت کعب رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا کہ (لوگوں کو) خیر کی طرف (بلانے والے) سردار کو قیامت کے دن لایا جائے گا اس سے کہا جائے گا کہ اپنے رب کو جواب دو اور اسے اپنے رب کے پاس لے جایا جائے گا اس سے اللہ تعالیٰ پردہ نہیں فرمائیں گے اور اس کو جنت میں لے جانے کا حکم دیا جائے گا اور اپنے گھر کو دیکھے گا اور اپنے ساتھیوں کے گھروں کو بھی دیکھے گا جو بھلائی کے کاموں میں اس کی موافقت کرتے تھے اور اس کی مدد کرتے تھے اس سے کہا جائے گا یہ فلاں کا گھر ہے اور یہ فلاں کا گھر ہے۔ اور دیکھے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت میں عزتیں تیار کر رکھی ہیں اور اپنے گھر کو ان کے

گھروں سے بہتر پائے گا اور جنت کے کپڑوں میں سے پہنایا جائے گا اور اس کے سر پر تاج رکھا جائے گا اور اس کو جنت کی خوشبو لگائی جائے گی اس کا چہرہ چمکے گا یہاں تک کہ وہ چودھویں کے چاند کی طرح ہو جائے گا، وہ وہاں سے نکلے گا تو لوگوں میں سے جو بھی دیکھے گا تو کہے گا اے اللہ! اس کو ان میں سے بنادے یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کے پاس آئے گا جو بھلائی میں اس کے ساتھ اکٹھے ہوتے تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔

وہ کہے گا اے فلاں! تجھے خوشخبری ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے جنت میں یہ یہ چیز تیار کر رکھی ہے اور وہ بھی ان کو خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنت میں تیار کیا ہے اکرام میں یہاں تک کہ ان کے چہروں پر وہی روشنی آجائے گی جو چمک اس کے چہرے پر تھی، ان کو لوگ ان کے چہروں کی سفیدی سے پہچان لیں گے اور وہ کہیں گے یہ لوگ جنت والے ہیں۔

اور برے اعمال کرنے والوں کے سردار کو لایا جائے گا اس سے کہا جائے گا اپنے رب کو جواب دو اسے اپنے رب کی طرف لے جایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے پردہ فرمائے گا اور اس کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا وہ اپنے گھر اور اپنے ساتھیوں کے گھروں کو دیکھے گا اور اس سے کہا جائے گا یہ فلاں کا گھر ہے اور یہ فلاں کا گھر ہے اور وہ دیکھے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آگ تیار کر رکھی ہو گی اور وہ اپنے گھر کو ان کے گھروں سے زیادہ برا دیکھے گا اس کا چہرہ کالا ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نیلی ہو جائیں گی اور آگ کی ایک ٹوپی اس کے سر پر رکھی جائے گی۔

وہ وہاں سے نکلے گا تو اسے جو جماعت بھی دیکھے گی اس سے اللہ کی پناہ مانگے گی اور وہ کہے گا اللہ تعالیٰ مجھ سے تم کو کیسے پناہ دے گا اے فلاں! کیا تجھ کو فلاں فلاں برائی یاد نہیں ہے؟ وہ ان کو گناہ یاد دلائے گا جو وہ اس کے ساتھ مل کر کیا کرتے تھے اور اس پر اس کی مدد کرتے تھے وہ برابر ان کو بتاتا رہے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آگ میں تیار کیا ہو گا یہاں تک کہ ان کے چہروں پر ایسی سیاہی چھا جائے گی جیسے اس کے چہرہ پر تھی لوگ ان کو پہچان لیں گے ان کے چہروں کی سیاہی سے اور کہیں گے یہ دوزخ والے ہیں۔ (ابن ابی شیبہ، در منثور)

خوش نصیب بندگانِ خدا کو ندائے ربانی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ{٦٨}اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ{٦٩} اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ{٧٠} الزخرف

جواب ترجمہ: اے میرے بندو آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہوگے، جو لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور وہ فرمان بردار تھے، تم اور تمہاری بیویاں جنت میں خوشی خوشی داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ تفسیر: مہربان رب کی مہربانیاں اس فانی دنیا میں بھی بے انتہاء تھیں اور آخرت میں بھی اس کی مہربانیاں اپنے نیکوکاروں اور صالحین پر بے شمار ہوں گی، اس کے اس خطاب پر ہی جی جان قربان کر دینے کا جی چاہتا ہے، جس میں وہ پیار بھرے انداز میں پکارے گا کہ

يٰعِبَادِ: اے میرے مؤمن بندو! چونکہ مؤمنین ہی رب تعالیٰ کی بندگی کرتے رہے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ: تم پر خوف نہیں ہے۔ الْيَوْمَ: آج کے اس سخت دن میں۔ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ: جو دنیا تم سے فوت ہو چکی اس پر تم غمگین نہ ہوگے، یہ پکار اور ندا ان خوش نصیبوں کے لیے ہوگی جو ایک اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے تھے، جو دنیوی زندگانی میں اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے، یہ پیار بھری ندا ان کے اعزاز میں اللہ کی طرف سے دی جائے گی، مفسرین کہتے ہیں کہ یہ نداء قیامت کے روز دی جائے گی اور اس کی طمع وہ لوگ بھی کریں گے جو اس کے حقدار نہ ہوں گے یہاں تک کہ یہ قول سنائی دے گا،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ: اس خطاب الٰہی کے مخاطب وہ خوش بخت لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی تصدیق کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک گئے اور اس کی طاعت بجا لائی۔ مسلمین سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو اپنے ایمان اور اتباع میں مخلص ہوں گے۔

مفسر قرآن حضرت مقاتل رحمہ اللہ نے معتمر بن سلیمان رحمہ اللہ کی روایت نقل کی ہے، جس میں کہا گیا کہ منادی کرنے والا کھلی جگہ اعلان کرے گا اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں، کھلے

میدان والے اپنے سروں کو اوپر اٹھائیں گے تو منادی کرنے والا کہے گا: مسلمانوں کے علاوہ تمام ادیان والے اپنے سروں کو جھکالیں گے۔

علامہ محاسبی رحمہ اللہ نے ”رعایہ“ میں ذکر کیا ہے، اس حدیث میں بیان کیا گیا کہ قیامت کے دن منادی کرنے والا ندا کرے گا، مخلوق اپنے سروں کو اوپر اٹھائے گی وہ کہیں گے ہم اللہ کے بندے ہیں ، پھر دوبارہ وہ ندا آئے گی، کفار اپنے سروں کو جھکالیں اور مؤحد اپنے سروں کو اٹھائے رکھیں، پھر وہ تیسری دفعہ اعلان کرے گا تو گناہ کبیرہ کرنے والے اپنا سر جھکائیں گے اور تقوی اختیار کرنے والے اپنے سر اٹھائے رکھیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے خوف اور حزن کو زائل کر دیا ہو گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہو گا کیونکہ وہ معززین میں سب سے معزز اور وہ اپنے ولی کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑتا اور ہلاکت کے وقت اسے کسی کے سپرد نہیں کرتا۔ (قرطبی)

اہل ایمان کے سر اس ندا کے وقت بلند ہوں گے اور ادیانِ باطلہ والے جتنے لوگ ہوں گے اس ندا کے وقت ان کے سر نیچے ہو جائیں گے۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ: اسے کہا جائے گا: تم اپنی مؤمن بیویوں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، جنت میں تم عیش و عشرت میں رہو گے۔ تُحْبَرُوْنَ ایسی خوشی، مسرت اور شادمانی جس کے اثرات انسانی چہرے پر نمایاں دکھائی دیں۔

اہل جنت کیلیے بیش بہا جنتی نعمتیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ {۷۱} وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۷۲} لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ {۷۳} الزخرف

جواب ترجمہ: ان کے آگے سونے کے پیالے اور گلاس گردش میں لائے جائیں گے۔ اور اس جنت میں ہر وہ چیز ہو گی جس کی دلوں کو خواہش ہو گی اور جس سے آنکھوں کو لذت حاصل ہو گی۔ (ان سے

کہا جائے گا کہ) اس جنت میں تم ہمیشہ رہو گے۔ اور یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمہارے اعمال کے بدلہ میں ہے جو تم کرتے تھے، تمہارے لیے اس میں بہت میوے ہیں ان میں سے تم کھا رہے ہو۔

خلاصہ تفسیر: صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو جنتیں سونے کی ہیں، یہاں تک کہ ان کے برتن، ان کے لباس یہاں تک کہ جو کچھ ان میں ہو گا وہ سونے ہی کا ہو گا۔ (حادی الارواح الی بلد الافراح لابن الجوزی)

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جنت میں غلمان ستر سونے کے پیالوں کے ساتھ جنتیوں پر چکر لگائیں گے، ایک پیالے کا رنگ بھی دوسرے کے ساتھ نہیں ملتا ہو گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جنتی کے سامنے ایک سونے کا بڑا پیالہ لایا جائے گا، جس میں کھجوریں ہوں گی وہ اس میں سے کھائے گا۔ (حادی الارواح)

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حادی الارواح'' میں ایسی روایات ذکر فرمائی ہیں جن کے مطابق جنتی کے لیے جنت میں سونے کے کنگن ہوں گے، جو وہ پہنے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت میں بھی اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ کا فرمان موجود ہے، اسی طرح ایسے تخت ہوں گے جنتی کے لیے جو سونے سے تیار شدہ ہوں گے، جنتی جنت میں ایسے منبروں پر براجمان ہو گا جو سونے سے تیار شدہ ہوں گے، جنتی ایسی جنت میں رہیں گے جس کی ایک اینٹ سونے کی ہو گی اور ایک اینٹ چاندی کی ہو گی۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سونے کے استعمال پر صرف دنیا میں پابندی عائد کر رکھی ہے کہ مسلمان مرد سونا استعمال نہ کریں، دنیا میں عورتوں کو سونے کے زیورات استعمال کرنے کی اجازت ہے، مگر برتن استعمال کرنے کی ممانعت دونوں کے لیے یکساں ہے، مگر آخرت میں سونے کے برتنوں کا اس آیت میں ذکر ہے، احادیث میں بھی ذکر موجود ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے حادی الارواح میں بہت سی روایات ایسی ذکر فرمائی ہیں جن میں سونے کے برتنوں کا ذکر موجود ہے۔

سورۃ الزخرف کے اس مقام پر اہل جنت کے لیے فرمایا گیا کہ اہل جنت کے آگے سونے کے برتن لائے جائیں گے جن میں کھانا سجا ہوا ہو گا اور سونے کے پیالے لائے جائیں گے اور جام جن میں وہ

مشروب سے لطف اندوز ہوں گے، سب برتن اور جام سونے اور چاندی کے ہوں گے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: جنتیوں کے سامنے چاندی کے برتن پیش کیے جائیں اور شیشے کے جام پیش کیے جائیں گے۔ (الانسان ۱۵)

حدیث میں ہے: ریشم نہ پہنو اور دیباج بھی نہ پہنو، سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہیں کھاؤ پیو، سونے چاندی کے پلیٹوں میں کھانا نہ کھاؤ، چونکہ یہ سونے کی برتن دنیا میں کفار کے لیے ہیں اور آخرت میں تمہارے لیے ہوں گے۔ (رواہ الشیخان)

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ: جنت میں وہ تمام لذائذ اور خواہشات کی اشیا موجود ہو گی جنہیں نفس چاہتا ہو گا، خوبصورت مناظر ہوں گے جنہیں آنکھیں دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی۔

وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: اس حال میں کہ تم جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے، وہاں سے نکالے نہیں جاؤ گے۔ ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تمام نعمت اور سرور کی تکمیل ہے چنانچہ ہر زائل ہونے والی نعمت خوف زوال کی موجب ہوتی ہے۔ (تفسیر ابو سعود ۵:۴۹)

علامہ صابونی صفوۃ التفاسیر میں فرماتے ہیں ان آیات میں جنت کا ذکر ہوا یہ خوشی اور سرور کی جگہ ہے اور جنت کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، اولاً کھانے کی اشیا کا ذکر ہوا پھر مشروبات کا پھر اس تفصیل کے بعد بیان کلی ذکر کیا کہ جنت میں خواہش کی وہ تمام چیزیں ہوں گی جو دل چاہیں گے اور آنکھوں کو جن سے لذت ملے گی، پھر جنت میں ہمیشہ ہمیشہ داخلے کے ذکر سے تمام نعمت کا ذکر ہوا، یہ انواع و اقسام کی نعمتوں کا خلاصہ ہے چونکہ نعمتیں یا تو وہ ہوں گی جن کی دلوں کی خواہش ہو گی یا وہ ہوں گی جن سے آنکھیں لذت اٹھاتی ہوں۔ (حاشیہ زادہ ۳:۳۰۴)

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: یہ جنت جس کے اوپر بہت سارے اوصاف بیان کیے گئے ہیں یہ تمہیں تمہارے نیک اعمال کے بسبب عطا کی جائے گی جو تم نے دنیا میں آخرت کے لیے کیے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: تمہارے اعمال صالحہ اللہ کی رحمت کا سبب ہیں چنانچہ کوئی شخص بھی

محض اپنے عمل کی بدولت جنت میں داخل نہیں ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم سے جنت میں داخل ہو گا، درجات کا فرق بحسب اعمال صالحہ ہوتا ہے۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۲۹۶، صفوۃ التفاسیر)

حدیث میں ہے کوئی شخص بھی نہیں بجز اس کے کہ اس کے لیے ایک ٹھکانا جنت میں ہوتا ہے اور ایک ٹھکانا دوزخ میں، کافر دوزخ میں مؤمن کے ٹھکانے کا وارث بنتا ہے اور مؤمن جنت میں کافر کے ٹھکانے کا وارث بنتا ہے، یہی مضمون اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (اخرجہ ابن ابی حاتم)

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ: تمہارے لیے جنت میں انواع و اقسام کے پھل ہوں گے (جب کہ کھانا اور مشروبات ان کے علاوہ ہے) ان پھلوں کو تم لذت کے لیے کھاؤ گے۔ مفسرین کہتے ہیں: اہل جنت پھلوں میں سے کچھ کھائیں گے جب کہ باقی پھل دار ختوں پر دائمی لگے رہیں گے۔ اے مخاطب! تمہیں جنت میں کوئی درخت بھی پھلوں سے خالی نہیں دکھائی دے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ پھلوں سے آراستہ ہوں گے، چونکہ جو پھل بھی کھایا جائے گا اس کا متبادل پھل درختوں پر آجائے گا۔ حدیث میں ہے، جنت میں کوئی شخص بھی پھل کو درخت سے اتارے گا فوراً اس کی جگہ درخت پر دوسرا پھل اگ جائے گا۔ (تفسیر ابی السعود ۵:۴۹)

دوزخ میں کافروں کی مایوسی و چیخ و پکار

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ {۷۴} لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ {۷۵} وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ {۷۶} وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ {۷۷} لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ {۷۸} اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ {۷۹} اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ {۸۰} الزخرف

جواب ترجمہ: بلاشبہ مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سے عذاب ہلکا نہ کیا

جائے گا، اور وہ اسی میں ناامید ہو کر پڑے رہیں گے، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی ظالم تھے۔ اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک تیرا پروردگار ہمارا کام تمام کر دے، وہ جواب دیں گے کہ بیشک تم اسی میں رہو گے، بلاشبہ ہم تمہارے پاس حق لائے اور لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے ہیں، کیا انہوں نے کوئی مضبوط تدبیر کرلی ہے، سو ہم مضبوط تدبیر اختیار کرنے والے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں سنتے ان کی چپکی باتوں کو اور ان کے خفیہ مشوروں کو، وہاں ہم ضرور سنتے ہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے (فرستادے) ان کے پاس لکھتے ہیں۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ: جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں اپنے کفر کے سبب گناہ اختیار کیے ہوں گے ان کا انجام کار بتایا جارہا ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان مجرمین سے وہ مجرم مراد ہیں جو جرائم میں رسوخ، پختگی اور دوام رکھتے تھے، عادی مجرم تھے، جیسے کفار، مشرکین، یہ اہل ایمان کے مقابلے کے کفار لوگ ہوں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ: ان سے دوزخ کا عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا، یہ لوگ دوزخ کی آگ میں اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں گے، انہیں کسی درجے میں بھی آس وامید نہیں رہے گی کہ وہ کسی بھی صورت میں دوزخ سے نجات پائیں گے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ: ہم نے ان کو عذاب دے کر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی ظالم ہیں چونکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو عذاب پر پیش کیا۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ: جب اللہ تعالیٰ ان مجرموں کو دوزخ میں داخل کر دیں گے تو وہاں عذاب کی سختی اور شدت کے باعث ان کے لیے ناقابل برداشت حالات ہوں گے، نہ جیتے بنے گی اور نہ مرنے کو، ایسے حالات میں وہ داروغہ جہنم "مالک" کو پکاریں گے اور عرض کریں گے کہ اے مالک! تیرا رب ہمیں موت دے دے، تاکہ جس شدت عذاب میں ہم گرفتار ہیں اس سے آرام وراحت پائیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی ہماری روحیں نکال دے تاکہ ہم اس دردناک عذاب سے خلاصی

پائیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: فرشتہ انہیں ایک ہزار سال کے بعد جواب دے گا۔ (مختصر ابن کثیر ۲۹۶:۳) ان کی فریاد پر داروغہ جہنم مالک انہیں جواب دے گا کہ

قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ: تم لوگوں نے تو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، یہاں سے تمہیں کہیں اور نہیں جانا ہے، اور نہ ہی تمہیں اس سے چھٹکارا ملنے کا ہے۔ اس گفتگو کے بعد رب تعالیٰ انہیں جواب دیں گے کہ

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ: ہم نے دنیاں میں تمہارے پاس حق بھیجا تھا، ہم نے حق تم پر واضح کر دیا تھا، مگر تم میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو میرے بھیجے ہوئے رسولوں کو ناپسند کرتی تھی۔ علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تو بیخ کے لیے خطاب ہے یعنی اے کفار! ہم تمہارے پاس صاف واضح حق لے کر آئے لیکن تم اللہ تعالیٰ کے دین کو ناپسند کرتے تھے اور اس سے ناک بھوں چڑھاتے تھے، چونکہ یہ دین تمہاری خواہشات کے خلاف تھا۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ جملہ علت کی مانند ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ کفار مکہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن سے نفرت ہے اور دین حق کو قبول کرنے سے انہیں سخت چڑ ہے۔ (التفسیر الکبیر ۲۲۷:۲۷) کارھون کا معنیٰ ہے تم لوگ دین کو قبول نہیں کرتے تھے، بِدَکتے تھے، نفرت کرتے تھے اور اس سے دور بھاگتے تھے۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ: بلکہ ہم جو حق دے کر ان کے پاس اپنے رسولوں کو بھیجتے تھے یہ لوگ حق کے خلاف اپنی سازشیں کرتے تھے، چنانچہ ہم بھی اپنے عذاب اور اپنی سزا کے ساتھ ان کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس کا بہترین ترجمہ کیا ہے، فرماتے ہیں ہاں کیا ان لوگوں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی کچھ کرنے کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

لغات: یہاں اَبرَمُوا کا لفظ ہے، ابرام کا معنی ہے: کسی چیز کو پکا کرنا اور مستحکم کرنا، اَبرَمَ الحَبل کے معنی ہوں گے رسی کو اچھی طرح مضبوط بٹا، یہاں یہ کسی بات کا قطعی فیصلہ کر لینے کے مفہوم میں آیا ہے۔ جوہری لکھتے ہیں اَبرَمتُ الشَّیءَ : اُحکِمتُہُ (صحاح) میں نے کسی چیز کو پختہ کیا، مضبوط کیا، ابرام کا معنیٰ مضبوط کرنا، پختہ کرنا۔ اِبرَامُ الفَتَّال اس وقت بولتے ہیں جب رسی کو بٹنے والا اچھی طرح بٹے، بلکہ دوسری دفعہ بٹے، جس سے رسی بہت ہی مضبوط ہو جاتی ہے، جب کہ کچے دھاگے کو

سَحِیلٌ کہتے ہیں، جسے ایک بار بٹا جائے، جب دہرا بٹا جائے تو اسے اِبرَامٌ کہا جاتا ہے

شانِ نزول: مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ آیت قریش مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے چونکہ انہوں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر آپ ﷺ کو شہید کرنے کے متعلق مشاورت کی تھی۔ (تفسیر القرطبی) اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کی ان سازشوں کا ذکر سورۃ الانفال میں یوں فرمایا وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ {۳۰} الانفال اور جب کافر لوگ آپ ﷺ کے بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں، اور وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرما رہا تھا۔ اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب ان کا مشورہ اس بات پر اختتام کو پہنچا تو ابو جہل نے رائے پیش کی کہ ہر قبیلہ سے ایک آدمی سامنے آئے تاکہ وہ آپ ﷺ کے قتل میں شریک ہو تو اس طرح قصاص کا مطالبہ کمزور ہو جائے گا۔ (الجامع لاحکام القرآن) اللہ تعالیٰ نے ان سب سرداروں کو بدر کے واقعہ میں قتل کر دیا۔

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ: تو کیا یہ مشرکین دنیا میں یہ خیال کیا کرتے تھے کہ ہم ان کی باتیں نہیں سن رہے؟ جو یہ لوگ اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھتے تھے، وہ آپس اندر سرگوشیاں کیا کرتے تھے۔ اَمْ یہاں بَلْ کے معنیٰ میں ہے، سِرٌّ وہ ہے جو دل میں ہو اور نَجویٰ وہ کلام ہے جو سرگوشی کے زمرے میں آئے۔

بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ: ہاں ہاں ہم سنتے ہیں اور ہم جانتے بھی ہیں، اور ہمارے فرستادے عزت والے فرشتے ہیں، جو ان کے نگران و نگہبان ہیں، جو ان کے اعمال کو لکھتے رہے، چاہے وہ سرگوشیاں ہوں، چاہے علانیہ باتیں ہوں، چاہے چھپ چھپا کر کی جانے والی گفتگو ہو سب ہمارے فرشتے لکھتے ہیں۔

اللہ کی صفات کمال وجلال

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ {۸۱} سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ {۸۲} فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ {۸۳} وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ {۸۴} وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ {۸۵} الزخرف

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجیے کہ اگر رحمن کے لیے اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوں، آسمانوں اور زمین کا رب جو عرش کا بھی ہے وہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں، سو آپ ان کو چھوڑیئے باتوں میں لگیں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ اس دن سے ملاقات کرلیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، اور اللہ وہ ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے اور وہ حکمت والا ہے اور علم والا ہے، اور بابرکت ہے وہ ذات جس کے لیے ملک ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ یہاں اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے ان لوگوں کو کہلوانا چاہتے ہیں کہ اے میرے حبیب! اپنی قوم کے ان مشرکین سے کہیے جن کا عقیدہ، جن کا خیال اور کہنا یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، آپ انہیں کہیں کہ

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ: گر رحمان نے کوئی بیٹا بنا رکھا ہے تو میں سب سے پہلے اس کے بیٹے کی پوجا کرنے والوں میں سے ہوں گا، لیکن اس کا بیٹا ہے اور نہ ہی ہو گا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ بیوی سے پاک ہے، جب بیوی سے پاک ہے، مبرا ہے تو اس کا بیٹا بھی نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، وہ تنہا ہے، وہ احد ہے، وہ اولاد سے پاک ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ایسا ہی ہے جیسے تم اپنے مقابل مناظر سے کہو اگر دلیل سے تمہاری کہی

ہوئی بات ثابت ہو جائے تو سب سے پہلے میں اس کا عقیدہ اختیار کروں گا، یہ استبعاد میں مبالغہ ہے۔ (تفسیر القرطبی ۱۶:۱۱۹) طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ کلام میں ملاطفت و نرمی کا پہلو اختیار کیا گیا ہے۔

بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کلام سے اللہ کی اولاد کا ہونا صحیح لازم نہیں آتا بلکہ اس سے اولاد کی نفی کرنا مراد ہے، جو نہایت بلیغانہ طریقے کی گئی ہے، اولاد کا انکار عناد کی وجہ سے نہیں بلکہ اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اعتراف کرتے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ آپ کے لیے کیا صحیح ہے کیا چیز صحیح نہیں ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہونے کا کوئی امکان ہے، بلکہ یہ بات فرض محال کے طور پر کہی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے عقائد کا جو انکار کر رہا ہوں، وہ کسی ہٹ دھرمی یا عناد کی وجہ سے نہیں کر رہا، بلکہ دلائل کی بنا پر کر رہا ہوں اور اگر دلیل سے اللہ تعالیٰ کی کسی اولاد کا کوئی ثبوت ہوتا تو میں اس سے کبھی انکار نہ کرتا۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ: اللہ تعالیٰ پاک و منزہ ہے اور عظمت و جلال والا ہے، وہ آسمانوں اور زمین اور عرش عظیم کا رب ہے، وہ کفار کی بیان کردہ صفات سے پاک و منزہ ہے۔ یہاں سُبْحٰنَ کا لفظ بول کر وضاحت فرمادی کہ جو کچھ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بولتے ہیں، اس کے لیے بیوی، اس کے لیے بیٹے بیٹی کی بات کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے پاک و منزہ ہے، رب العرش میں اللہ تعالیٰ کی اضافت عرش اعظم کی طرف کی گئی ہے، اس سے مراد جسموں میں سب سے بڑا جسم ہے، یہ اس بات پر خبردار کرنے کے لیے بولا گیا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے جو ملکوتیت و ربوبیت ہے اس سب کا مالک وہ رب ہے جو عرش عظیم کا مالک ہے، اس لیے یہ وہم کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ یہ چیزیں اس کے اجزاء ہیں، رب تعالیٰ کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے عرش کی طرف اضافت کی گئی ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا: کفار مکہ کو اپنی جہالت اور گمراہی میں پڑے رہنے دو کہ وہ اپنے باطل میں گھسے رہیں اور اپنی دنیا میں کھیلتے رہیں، انہیں ان کی مستیوں میں مگن رہنے دیجیے، انہیں حق

وصداقت کا یقین ہی نہیں ہے، باوجود یکہ جلی برہان، واضح دلائل سن چکے ہیں، معجزات دیکھ چکے ہیں، کلام اللہ کی دلکش اور دلوں کو موہ لینے والی تلاوت سن چکے ہیں، انہیں ان کے اباطیل میں گھسے رہنے دیجیے، ان کو دنیا کی لذتوں اور کھیل تماشوں میں گم رہنے دیجیے، مشغول رہنے دیجیے، یہ لوگ جن کھیل تماشوں میں مصروف ہیں یہ سوائے جہالت و کھیل تماشے کے کچھ بھی نہیں۔

حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ: اس شدید و خوفناک دن تک جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ قیامت کا دن ہے وہ اس دن جان لیں گے کہ ان کا حال اور انجام کیسا ہو گا، انہیں پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں کس طرح اپنا وقت برباد کیا تھا، انہوں نے کس طرح دنیا میں اللہ کے دین کو مزاح بنایا تھا۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ: اللہ عزوجل آسمان میں معبود ہے اور وہی زمین میں بھی معبود ہے چونکہ وہی الٰہ حق ہے، آسمان و زمین میں وہی عبادت کا حقدار ہے۔ تسہیل میں ہے: اللہ ہی اہل آسمان اور اہل زمین کا معبود ہے۔ (التسہیل ۴:۳۳) ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ آسمان والوں کا بھی معبود ہے اور زمین والوں کا بھی، آسمان والے اور زمین والے اسی کی عبادت کرتے ہیں اور سب کے آگے سرنگوں ہیں۔ (المختصر ۳:۲۹۸)

وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ: اللہ تعالیٰ مخلوق کی تدبیر و انتظام میں حکمت سے کام لیتا ہے اور انسانوں کے مصالح سے باخبر ہے، یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلیل کی مانند ہے۔

وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا: عظمت اور بزرگی والا ہے وہ اللہ جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، آسمانوں اور زمین کے درمیان جو مخلوق ہے خواہ وہ انسان ہوں یا جنات یا فرشتے اللہ تعالیٰ ان سب کا مالک ہے، وہ بلا روک ٹوک کائنات میں تصرف کرنے والا ہے۔

وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ: صرف اللہ کی پاس قیامت کے قیام کے وقت کا علم ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: ساری مخلوقات نے صرف اسی کی طرف لوٹ کر آنا ہے اور پھر ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

معبودان باطلہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ {۸۶} وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ {۸۷} وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ {۸۸} فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ {۸۹} الزخرف

جواب اور یہ لوگ اسے چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں، انہیں کوئی سفارش کرنے کا اختیار نہیں ہو گا، ہاں البتہ جن لوگوں نے حق بات کی گواہی دی ہو، اور انہیں اس کا علم بھی ہو۔ اور اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ اس کے باوجود کوئی انہیں کہاں سے اوندھا چلا دیتا ہے؟ اور اللہ کو پیغمبر کی اس بات کا بھی علم ہے کہ: یارب! یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ لہٰذا (اے پیغمبر) تم ان کی پروانہ کرو، اور کہہ دو: سلام۔ کیونکہ عنقریب انہیں خود سب پتہ چل جائے گا۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ: مشرکین سے جب یہ کہا جاتا تھا کہ شرک بری چیز ہے تو شیطان کے پٹی پڑھا دینے سے یوں کہہ دیتے تھے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے لیے سفارش کر دیں گے، یہ ان کا ایک بہانہ تھا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جن کو شفاعت کرنے کی اجازت نہیں دی وہ کیا سفارش کر سکتے ہیں اور بے جان کیسے سفارش کریں گے جس کی بارگاہ میں سفارش کی ضرورت ہو گی اس نے کب فرمایا کہ یہ میرے ہاں سفارشی بنیں گے، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اس کے نبیوں نے توحید کی دعوت دی اور شرک سے روکا ان کی بات نہ مانی مشرک بنے اور جواز شرکت کا حیلہ بھی تراش لیا ان لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا کہ جنہیں اللہ کے سوا پکارتے ہو اور اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو یہ اللہ کی بارگاہ میں کوئی سفارش نہیں کر سکیں گے، ہاں اللہ تعالیٰ کے جو نیک بندے ہیں وہ شفاعت کر سکیں گے، انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی لیکن وہ بھی ہر شخص کی سفارش نہیں کریں گے، جس کے حق میں

سفارش کرنے کی اجازت ہو گی اس کی سفارش کریں گے۔(انوار البیان)

اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ :علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرات ملائکہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام اور ان جیسے حضرات مراد ہیں گو ان حضرات کی عبادت کی گئی لیکن اس میں ان کا کوئی دخل نہ تھا، یہ حضرات شفاعت کر سکیں گے لیکن کافروں کے لیے شفاعت نہ کریں گے اور نہ ہی انہیں اس کی اجازت ہو گی۔(روح المعانی، انوار البیان)

یہاں حق کی گواہی دینے سے مراد توحید کی گواہی دینا ہے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مؤمن موحد کی سفارش اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نفع دے گی، اسے اللہ کی بارگاہ سے سفارش کی اجازت دی جائے گی، کوئی پوپ، کوئی پادری، کوئی نجومی، کوئی کاہن نہ کسی کی سفارش کر سکتا ہے اور نہ انہیں اللہ کی بارگاہ سے کسی پیروکار کی سفارش کرنے کی اجازت دی جائے گی، جب اللہ کی طرف سے اجازت نہیں ملے گی تو یہ سفارش کیسے کر سکتے ہیں۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین و کفار مکہ سے پوچھ لیجیے کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو یہ لوگ یہی جواب دیں گے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس بات کے بھی اقراری ہیں کہ خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے پھر اپنی حماقت سے غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ: سو یہ لوگ کہاں الٹے جارہے ہیں، پیدا کیا اللہ نے اور عبادت کریں غیر اللہ کی یہ تو عقل اور فہم سے بہت دور ہے۔

وَقِيۡلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ: اس میں لفظ قیلہ قول سے لیا گیا ہے یعنی قاف کے کسرہ کی وجہ سے واؤ یا سے بدل گیا ہے، حضرت امام عاصم کی قرأت میں وقیلہ جر کے ساتھ ہے کہ ضمیر مجرور مضاف الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔(انوار البیان)

علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ میں لفظ السَّاعَةِ مضاف الیہ مجرور ہے اس پر عطف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت کے وقت کا بھی علم ہے اور وہ اپنے

رسول کی اس بات کو بھی جانتا ہے کہ جو انہوں نے اپنے مخاطبین کا حال بتاتے ہوئے عرض کیا کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (روح المعانی بحوالہ انوار البیان)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یعنی نبی ﷺ کا یہ کہنا بھی اللہ کو معلوم ہے اور اس کی اس مخلصانہ التجاء اور درد بھری آواز کی اللہ قسم کھاتا ہے کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا اور اپنی رحمت سے اس کو غالب و منصور کرے گا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے آپ کی درخواست کے جواب میں فرمایا آپ ﷺ ان سے اعراض کیجیے، یعنی ان کے ایمان لانے کی امید نہ رکھیے (روح المعانی)

وَقُلْ سَلٰمٌ: اور آپ ﷺ ان سے فرمایئے کہ میرا اسلام ہے یہ سلام وہ نہیں جو ملاقات کے وقت دعا دینے کے لیے کیا جاتا ہے بلکہ سلام متارکت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں اسی کو سورۃ القصص میں فرمایا **وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ**، اور جب کوئی لغوبات سنتے ہیں تو اس کو ٹال جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے اعمال ہیں تمہارے لیے تمہارے اعمال تم پر سلام ہو ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ (انوار البیان)

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: سو یہ لوگ عنقریب جان لیں گے یعنی کفر و شرک کا عذاب ان کے سامنے آجائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے وعید ہے، جب کہ اپنے پیارے نبی ﷺ کے لیے تسلی کا سامان ہے۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج سورۃ الزخرف کی تفسیر مکمل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کے طفیل اس متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرمائے، میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ ومشائخ کے لیے، میرے محبین و مخلصین کے لیے، میرے معاونین ومساعدین کے لیے ذریعہ نجات بنادے، اسے ہم سب کے لیے زاد سفر اور توشہ آخرت بنادیجیے، آپ بڑی ہستی ہیں، آپ بڑی ذات ہیں، آپ کے دروازے سے محروم ہی محروم جاتا ہے، نصیبے و بخت والے

کبھی تیرے در سے خالی جھولی واپس نہیں جاتے، تیرے سامنے دست سوال دراز کرنے والے مرادیں پالیتے ہیں، ہم بھی تیرے دروازے پر آہ وزاری اورالحاح سے عرض کرتے ہیں کہ تو ہم سے راضی ہو جا، ہمیں معافی کا پروانہ عطا فرمادے، ہمارے صغائر اور کبائر پر خط تنسیخ پھیر دیجیے۔ ہمیں بلا استحقاق قبول فرمالیجیے۔ اس متواضع کوشش کو قبول فرمادیجیے۔

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ غوث گارڈن فیز 2، مناواں جی ٹی روڈ لاہور

یکم اپریل ۲۰۱۸ء بروز اتوار، رات ۱۲ بج کر دس منٹ

اضافات وترمیمات جدیدہ: ۱۵ جون ۲۰۲۶ء بروز پیر، ساڑھے ۱۰ بجے دن

سورۃ الدخان (تعارف)

سوال سورۃ الدخان کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ دخان ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کریم کی ۶۳ ویں سورت ہے اور ترتیب تلاوت کے اعتبار سے ۴۴ ویں سورت ہے، یہ مکی سورت ہے اس میں ۳ رکوعات ۵۹ آیات ۳۴۶ کلمات اور ۱۴۳۱ حروف ہیں، سورۃ دخان میں بھی انہی موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جو مکی سورتوں کا اہم اہداف ہیں یعنی توحید، رسالت اور بعث بعد الموت، تاکہ عقیدہ اور ایمان کے ارکان پختہ ہو جائیں۔

وجہ تسمیہ: سورۃ مبارکہ کا نام "سورۃ الدخان" ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے دخان (دھویں) کو کفار کے ڈرانے دھمکانے کی نشانی اور علامت بنایا ہے چناچہ کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے قحط و بھوک کے عذاب میں مبتلا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر دھواں بھیج دیا یہاں تک کہ قریب المرگ ہوگئے، پھر نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی۔ (صفوۃ التفاسیر)

مضامین: سورت کی ابتدا میں قرآن عظیم کے بارے میں بات ہوئی ہے جو کہ عظیم معجزہ ہے، جو تا قیامت زندہ وجاوید رہے گا، سورۃ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے برکت والی رات میں یہ قرآن نازل کیا جو افضل رات ہے اور وہ لیلۃ القدر ہے، اس رات میں مخلوقات کے امور کی تفصیل و تدبیر ہوتی ہے۔

اس کے بعد قرآن عظیم کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں جب کہ اس کی آیات وبراھین بالکل واضح ہیں۔

سورۃ مبارکہ میں قوم فرعون اور ان کی سرکشی کے نتیجہ میں ان پر نازل ہونے والے عذاب، ان کی ہلاکت وتباہی کے بعد ان کے آثار یعنی ان کے چھوڑے ہوئے محلات، گھر بار، باغات، نہریں، چشمے وغیرہ کا ذکر ہوا ہے، یہ سب کچھ بنی اسرائیل کو وراثت میں ملا، پھر بنی اسرائیل کے تشتت، بغاوت اور نافرمانی کا ذکر ہوا ہے۔

مشرکین مکہ کا بھی ذکر ہوا ہے کہ وہ بعث بعد الموت کے منکر ہیں اور دوبارہ زندگی کو بعید سمجھتے

ہیں اسی لیے پیغمبر ﷺ کی تکذیب کے مرتکب ہوئے۔

سورۃ مبارکہ میں یہ امر بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مشرکین سابقہ قوموں سے زیادہ طاقتور اور مضبوط نہیں ہیں اور نہ ہی سابقہ امتوں سے عزیز ہیں، اللہ کا قانون سرکشوں کو ہلاک کرنے میں تبدیل نہیں ہوتا۔ (صفوۃ التفاسیر)

لیلۃ القدر میں نزول قرآن

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

حٰمٓ ۚ{۱}وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ{۲}اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ{۳}فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۖ{۴} اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ{۵}رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ{۶}الدخان

جواب ترجمہ: حٰمٓ، قسم ہے کتاب مبین کی، بلاشبہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا ہے، بلاشبہ ہم ڈرانے والے ہیں، اس رات میں ہر امر حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، جو ہماری طرف سے بطور حکم کے صادر ہوتا ہے، بلاشبہ ہم بھیجنے والے ہیں، آپ کے رب کی طرف سے رحمت کے طور پر بلاشبہ وہ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ، حروف مقطعات میں سے ہیں، جو اعجاز قرآن پر تنبیہ کے لیے لائے گئے ہیں، اس سے پہلے حروف مقطعات کی شرح بیان کی جاچکی ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: اس واضح قرآن کی میں قسم اٹھاتا ہوں جو ہدایت اور گمراہی میں فرق کرنے والا ہے، جس کا اعجاز بالکل واضح ہے، اس کے احکام واضح ہیں، یہ جواب قسم ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر میں قرآن کریم نازل فرمایا، یہ بڑی قدر و منزلت اور برکت والی رات ہے، جو کہ رمضان میں ہوتی ہے، قرآن کریم کے دوسرے مقام پر بھی لیلۃ القدر کی وضاحت آئی ہے، اس سورۃ کا نام ہی اللہ تعالیٰ نے سورۃ القدر رکھا ہے، اسی طرح قرآن کریم کے دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ قرآن کریم شہر رمضان میں نازل کیا گیا، اور لیلۃ

القدر رمضان میں ہی ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے اس رات سے مراد شب برأت لی ہے، جو شعبان کی پندرہویں رات ہوتی ہے، مگر اس بارے میں کوئی ایسی روایت صحیح نہیں ملتی جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ قرآن کریم شب برأت میں نازل کیا گیا۔

مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن تو ۲۳ سال میں نجمًا یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا پھر رمضان میں اور شب قدر میں نازل ہونے کا کیا معنی؟ اس کا ایک جواب تو بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ قرآن مجید نازل ہونے کی ابتداء شب قدر میں ہوئی اور اکثر حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ پورا قرآن مجید شب قدر میں لوح محفوظ سے سماء دنیا یعنی قریب والے آسمان میں نازل کیا گیا اس کے بعد ۲۳ سال میں وقتاً فوقتاً حسب احوال نازل ہوتا رہا کیونکہ شب قدر خیرات اور برکات والی رات ہوتی ہے اس لیے اسے لیلۃ مبارکۃ سے تعبیر فرمایا۔ (انوار البیان)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ لیلہ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے جو رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے، اس رات کو مبارک فرمانا اس لئے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بیشمار خیرات وبرکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شب قدر میں نازل ہونا قرآن کی سورۃ قدر میں تصریح کے ساتھ آیا ہے، اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ،

اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی لیلہ مبارکہ سے مراد شب قدر ہی ہے اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں ابتداء دنیا سے آخر تک اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں وہ سب کی سب ماہ رمضان المبارک ہی کی مختلف تاریخوں میں نازل ہوئی ہیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بروایت واثلہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان کی پہلی تاریخ میں اور تورات رمضان کی چھٹی تاریخ میں، زبور بارہویں میں، انجیل اٹھارویں میں اور قرآن چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد یعنی پچیسویں شب میں نازل ہوا۔ (قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کے شب قدر میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوح

محفوظ سے پورا قرآن سماء دنیا پر اسی رات میں نازل کر دیا گیا تھا، پھر تیئس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا رہا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل ہونا مقدر ہوتا تھا اتنا ہی شب قدر میں لوح محفوظ سے سماء دنیا پر نازل کر دیا جاتا تھا۔ (قرطبی)

اور بعض مفسرین عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد شب برأت یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے مگر اس رات میں نزول قرآن دوسری تمام نصوص قرآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے، شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ جیسی کھلی نصوص کے ہوتے ہوئے بغیر کسی قوی دلیل کے نہیں کہا جاسکتا کہ نزول قرآن شب برأت میں ہوا، البتہ شعبان کی پندرھویں شب کو بعض روایات حدیث میں شب برأت یا لیلۃ الصك کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور اس رات کا مبارک ہونا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذکر ہے، اس کے ساتھ بعض روایات میں یہ مضمون بھی آیا ہے جو اس جگہ لیلہ مبارکہ کی صفت میں بیان فرمایا ہے یعنی فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ، اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے۔

جس کے معنیٰ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ رات جس میں نزول قرآن ہوا، یعنی شب قدر، اسی میں مخلوقات کے متعلق تمام اہم امور جن کے فیصلے اس سال میں اگلی شب قدر تک واقع ہونے والے ہیں طے کئے جاتے ہیں کہ کون کون اس سال میں پیدا ہوں گے، کون کون آدمی اس میں مریں گے، کس کو کس قدر رزق اس سال میں دیا جائے گا، یہی تفسیر دوسرے ائمہ تفسیر حضرت قتادہ، مجاہد، حسن رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی منقول ہے۔

اور مہدوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ یہ تمام فیصلے جو تقدیر الٰہی میں پہلے ہی سے طے شدہ تھے اس رات میں متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، کیونکہ قرآن و سنت کی دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے ازل ہی میں لکھ

دیئے تھے، تو اس رات میں ان کے طے کرنے کا حاصل یہی ہو سکتا ہے کہ قضا و قدر کی تنفیذ جن فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہے اس رات میں یہ سالانہ احکام ان کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ (قرطبی)

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ بعض روایات حدیث میں شب برأت یعنی شعبان کی پندرہویں شب کے متعلق بھی آیا ہے کہ اس میں آجال و ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں، اس لئے بعض حضرات نے آیت مذکورہ میں لیلہ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأت سے کر دی ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہاں اس رات میں نزول قرآن کا ذکر سب سے پہلے ہے اور اس کا رمضان میں ہونا قرآن کی نصوص سے متعین ہے۔

اور شب برأت کے متعلق جو یہ مضمون بعض روایات میں آیا ہے کہ اس میں ارزاق وغیرہ کے فیصلے ہوتے ہیں اول تو ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا کہ یہ روایت مرسل ہے اور ایسی روایت نصوص صریحہ کے مقابلہ میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح قاضی ابو بکر بن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابل اعتماد روایت ایسی نہیں جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت وحیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ اس رات کی فضیلت میں بھی کوئی قابل اعتماد حدیث نہیں آئی لیکن روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں اور شب قدر میں فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس طرح دونوں قول میں تطبیق ہو سکتی ہے ورنہ اصل بات جو ظاہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہی ہے کہ سورۃ دخان کی آیت میں لیلہ مبارکہ اور فیہا یفرق وغیرہ کے سب الفاظ شب قدر ہی کے متعلق ہیں۔ (معارف القرآن)

حضرت مفتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رہا شب برأت کی فضیلت کا معاملہ، سو وہ ایک مستقل معاملہ ہے جو بعض روایات حدیث میں منقول ہے مگر وہ اکثر ضعیف ہیں اس لئے قاضی ابو بکر بن عربی رحمہ اللہ نے اس رات کی کسی فضیلت سے انکار کیا ہے لیکن شب برأت کی فضیلت کی روایات اگرچہ باعتبار سند کے ضعف سے کوئی خالی نہیں لیکن تعدد طرق اور تعدد روایات سے ان کو ایک طرح کی قوت حاصل

ہو جاتی ہے، اس لئے بہت سے مشائخ نے ان کو قبول کیا ہے کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ (تفسیر معارف القرآن)

اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِيۡنَ: علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یعنی سال بھر کے متعلق قضاء و قدر کے حکیمانہ اور اٹل فیصلے اسی عظیم الشان رات میں "لوح محفوظ" سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالہ کیے جاتے ہیں جو شعبہ ہائے تکوینیات میں کام کرنے والے ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبان کی پندرھویں رات ہے جسے شب برات کہتے ہیں۔ ممکن ہے وہاں سے اس کام کی ابتداء اور شب قدر پر انتہاء ہوئی ہو۔ واللہ اعلم (تفسیر عثمانی) ہم رسولوں کو انسانی رشد و ہدایت اور فلاح و بہبود کے لیے بھیجتے ہیں۔

رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ: اس قرآن کا نازل فرمانا آپ کے رب کی طرف سے رحمت فرمانے کی وجہ سے ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنی مخلوق پر رحم فرمایا ان کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب نازل فرمائی۔ (انوار البیان) حضرت زجاج رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ہم نے اسے برکت والی رات میں نازل فرمایا رحمت کے لیے۔ (معالم التنزیل) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم نازل کیا، کیونکہ ہماری عادت ہے کہ ہم رسولوں کو بندوں کی طرف بھیجتے ہیں تاکہ ہم ان پر اپنی رحمت عام فرمائیں، پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہونے والے احکامات اس کی طرف سے رحمت ہیں، ان سے مقصود بندوں کی تربیت ہے اور انہیں ان کے منافع سے آگاہ کرنا ہے۔ (المقتطف)

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ: بلاشبہ وہ سننے والا، جاننے والا ہے، وہ السمیع ہے جو اپنے بندوں کے اقوال کو سنتا ہے، وہ علیم ہے جو اپنے بندوں کے حالات کو جانتا ہے۔

رب ذوالجلال اور منکرین

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ {۷} لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ؕ رَبُّكُمۡ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ {۸} بَلۡ هُمۡ فِىۡ شَكٍّ يَّلۡعَبُوۡنَ {۹} فَارۡتَقِبۡ يَوۡمَ تَاۡتِى

السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ{۱۰}يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ{۱۱}رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ{۱۲}اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ{۱۳}ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ{۱۴}اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ{۱۵}يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ{۱۶}الدخان

جواب ترجمہ: وہ آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے وہ تمہارا اور تم سے پہلے جو تمہارے باپ دادے گزر گئے ان کا رب ہے۔ بلکہ وہ لوگ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ سو آپ اس دن کا انتظار کیجیے جس دن آسمان کی طرف دیکھنے والے کو واضح طور پر دھواں نظر آئے گا، وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ دردناک عذاب ہے، اے ہمارے رب ہم سے عذب کو دور کر دیجیے، بلاشبہ ہم ایمان لے آئیں گے، کہاں ہے ان کو نصیحت حالانکہ ان کے پاس رسول مبین آگیا، پھر اس سے انہوں نے اعراض کیا اور کہنے لگے کہ یہ شخص سکھایا ہوا دیوانہ ہے، بلاشبہ ہم عذاب کو تھوڑے وقت کے لیے ہٹا دیں گے بیشک تم لوٹنے والے ہو، جس روز ہم بڑی پکڑ کریں گے، بلاشبہ ہم انتقام لینے والے ہیں۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ: وہ ذات جس نے قرآن نازل کیا ہے وہ ساری کائنات کا رب ہے، وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ان دونوں کو پیدا کرنے والا اور ان کا مالک ہے، اگر تم اہل ایمان اور اہل یقین ہو۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے سوا کوئی رب نہیں چونکہ وہی صفات جلال اور صفات کمال کے ساتھ متصف ہے، وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی زندوں کو مارتا ہے۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ: وہ تمہارا بھی خالق ہے اور تم سے جو امتیں پہلے گزر چکی ہیں ان کا بھی خالق ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں وَالْمَقْصُوْدُ مِنَ الْآيَةِ أَنَّ الْمُنَزِّلَ إِذَا كَانَ مَوْصُوْفاً

بِهٰذِهِ الْجَلَالَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ، كَانَ الْمُنَزَّلُ الَّذِیْ هُوَ الْقُرْآنُ فِیْ غَايَةِ الشَّرَفِ وَالرِّفْعَةِ آیت سے مقصد یہ ہے کہ جب نازل کرنے والا اس عظیم الشان جلال و کمال کے ساتھ متصف ہے تو نازل کی گئی کتاب بھی انتہا درجے کی عظیم الشان اور عظیم المرتبت ہو گی۔ (التفسیر الکبیر ۲۴۱/۲۷ صفوۃ)

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ: ان سے اگر کوئی ایمان کی بات ظاہر ہو بھی جاتی ہے تو حقیقت میں اس کا اعتقاد اور یقین نہیں رکھتے ہوتے، مثلاً ان کا کہنا کہ اللہ ہمارا خالق ہے بلکہ وہ تو بعث بعد الموت میں شک کرتے ہیں، حقیقت میں وہ کھیل رہے ہیں اور مذاق کر رہے ہیں۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اِلْتَفَتَ مِنَ الْخِطَابِ لِلْغَيْبَةِ آیت میں خطاب سے غیبوبت کی طرف التفات ہے۔ (صفوۃ التفاسیر) مشرکین کی تحقیر و تذلیل کے لیے یہ اسلوب اپنایا گیا ہے چونکہ وہ خطاب کے اہل نہیں اس لیے کہ وہ اہل شک ہیں، ان کے افعال ہنسی مذاق اور کھیل کود کے قبیل سے ہیں اور وہ براہین قاطعہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے، حق و باطل کے درمیان امتیاز نہیں کرتے۔ (حاشیۃ شیخ زادہ علی البیضاوی ۳:۳۱۱) مذکورہ بالا آیت میں مشرکین کی حماقت اور ان کے عصیان کا ذکر ہوا اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے عذاب کے منتظر رہیں جب آسمان گہرا دھواں ظاہر کرے گا جسے ہر کس و ناکس دیکھے گا۔

دُخان مبین سے کیا مراد ہے؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب قریش نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں انتہا کر دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بد دعا دی اور فرمایا اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ وَاجْعَلْ عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِیْ يُوْسُفَ یا اللہ! مضر پر اور زیادہ سختی کر اور ان پر ایسا قحط مسلط کر دے جیسا تو نے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قحط مسلط کیا تھا۔ چنانچہ اہل مکہ سخت بھوک اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ مردار کھانے پر مجبور ہو گے، فضائی آلودگی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ایک شخص اپنے دوست سے بات کر رہا ہوتا وہ اس کی آواز ہی سن سکتا تھا اور فضا میں پھیلے دھویں کی وجہ سے اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ (صفوۃ التفاسیر)

پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا خمسٌ قد مضین: اَلدُّخَانُ، وَالرُّومُ، وَالقَمَرُ، وَالبَطشَةُ، وَاللِّزَامُ دھواں، روم، چاند، البطشہ (سخت پکڑ) اور لزام سب قریب قریب کے واقعات ہیں۔ (البحر المحیط ۸:۳۴، صفوۃ التفاسیر) رومیوں سے مراد اہل روم کی شکست کے بعد فتح، چاند کا دو ٹکڑے ہونا اور بطشہ سے مراد اہل مکہ پر عذاب اور لزام سے مراد عذاب کا لزوم ہے واللہ اعلم

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں لَمْ يَمْضِ الدُّخَانُ بَلْ هُوَ مِنْ أَمَارَاتِ السَّاعَةِ، وَهُوَ يَأْتِي قُبَيْلَ القِيَامَةِ، يُصِيبُ المُؤْمِنَ مِنهُ مِثْلَ الزُّكَامِ، وَيَنْضِجُ رُءُوسَ الكَافِرِينَ وَالمُنَافِقِينَ، حَتَّى يُصْبِحَ رَأْسُ الوَاحِدِ كَالرَّأْسِ المَشْوِيِّ، وَيَغْدُو كَالسُّكْرَانِ فَيَمْلَأُ الدُّخَانُ جَوْفَهُ وَيَخْرُجُ مِنْ مَنْخَرَيْهِ وَأُذُنَيْهِ وَدُبُرِهِ سورۃ مبارکہ میں جس دھویں کا ذکر ہے اس کا وقوع نہیں ہوا بلکہ یہ تو قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، جس کا ظہور قریب قیامت کے وقت ہوگا، مؤمن پر اس کا اثر ایسے ہوگا جیسے زکام کا اثر ہوتا ہے، جب کہ کفار و منافقین کے سر اس سے پگھل جائیں گے اور آدمی کا سر ایسے لگے گا جیسے بھونی ہوئی سری ہوتی ہے، آدمی صبح کے وقت نشہ میں دھت کی طرح اٹھے گا اس کا پیٹ دھویں سے بھر جائے گا پھر اس کی ناک کان اور دبر سے نکلے گا۔ چالیس دن تک یہی صورتحال رہے گی۔ (المقتطف) (ابن مسعود کا قول اظہر ہے جب کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔

يَغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ: کفار قریش کو یہ عذاب ہر طرف سے گھیر لے گا اور جب وہ دھویں کی مصیبت سے دوچار ہوں گے تو کہیں گے یہ تو دردناک عذاب ہے۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ: فریادی بن کر کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمارے اوپر سے یہ عذاب اٹھادے، ہم محمد اور قرآن پر ایمان لے آئیں گے اگر تو نے یہ عذاب اٹھالیا۔ بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں وَهٰذَا وَعدٌ بِالإِيمَانِ إِن كُشِفَ العَذَابُ عَنهُم قریش سے عذاب اٹھالینے پر یہ وعدہ ایمان ہو گیا تھا۔ (البیضاوی ۳:۳۱۲)

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى: مشرکین کے ایمان کو مستبعد قرار دیا جارہا ہے یعنی عذاب دور کر دینے پر یہ کہاں

سے عبرت اور نصیحت حاصل کریں گے۔

وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ: حالانکہ ان کے پاس پیغمبر واضح رسالت لے کر آیا ہے، اس کے پاس واضح نشانیاں اور کھلے معجزات تھے، بایں ہمہ وہ ایمان نہیں لائے اور نہ ہی پیغمبر کی اتباع کی۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ: پھر انہوں نے پیغمبر سے اعراض کیا اور اس پر بہتان باندھنے لگے اور پیغمبر کو جنون سے منسوب کرنے لگے۔ حاشا وکلا۔ بھلا جس قوم کی یہ حالت اور یہ صفت ہو کیا وہ عبرت اور نصیحت حاصل کرے گی۔ امام فخر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں وَذٰلِكَ لِأَنَّ كُفَّارَ مَكَّةَ كَانَ لَهُمْ فِي ظُهُورِ الْقُرْآنِ عَلَى مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا اس کے متعلق قریش مکہ کے دو اقوال سامنے آئے گئے۔ بعض کہتے ہیں : محمد یہ کلام کسی سے سیکھ کر آیا ہے اور بعض کہتے : محمد مجنون ہے اور کوئی جن اس پر یہ کلام ڈال دیتا ہے۔ (التفسیر الکبیر ۲۷: ۲۴۴)

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ: ہم تھوڑے وقت کے لیے تم سے عذاب دور کریں گے تم پھر شرک و عصیان کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں وَالْمَقْصُودُ التَّنْبِيهُ عَلَى أَنَّهُمْ لَا يُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ وَأَنَّهُمْ فِي حَالِ الْعَجْزِ يَتَضَرَّعُونَ إِلَى اللهِ تَعَالَى، فَإِذَا زَالَ الْخَوْفُ عَادُوا إِلَى الْكُفْرِ وَالتَّقْلِيدِ لِمَذَاهِبِ الْأَسْلَافِ مقصد اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ وہ وعدہ وفا نہیں ہیں، عجز و بیچارگی کے عالم میں اللہ تعالیٰ کے حضور آہ و بکا اور عاجزی شروع کر دیتے ہیں اور جب خوف اور مصیبت دور ہو جاتی ہے تو وہ کفر کی طرف پھر لوٹ جاتے ہیں، وہ ایسا اسلاف کی تقلید میں کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر، صفوۃ التفاسیر)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں لَمَّا كُشِفَ عَنهُمُ العَذَابُ بِاِستِسقَاءِ النَّبِی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادُوا إِلَى تَكذِيبِهِ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قحط کا عذاب دور ہو گیا تو قریش مکہ پھر کفر و عصیان کی طرف لوٹ گئے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ: اس دن کو یاد کرو جس دن کفار ہماری سب سے

بڑی پکڑ میں آئیں گے اور ہم ان سے انتقام لیں گے۔

بطشۃ الکبریٰ کیا ہے؟ البطش: قوت و مضبوطی کے ساتھ سخت پکڑ۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بطشہ کبریٰ سے مراد جنگ بدر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: بطشہ کبریٰ سے مراد روز قیامت ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: بظاہر اس سے مراد قیامت کا دن ہے اگرچہ بدر کا دن بھی بطشہ کبری ہے۔ (مختصر ابن کثیر ۳، ۲/۳) امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول واضح قول ہے چونکہ یوم بدر اس عظیم وصف و شدت کو نہیں پہنچتا، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انتقام تام قیامت کے دن ہو گا، جب اس کا وصف کبریٰ بیان کیا تو ضروری ہے کہ بطشہ کی تمام انواع میں سب سے بڑی نوع ہو علی الاطلاق اور یہ تو صرف قیامت کے دن کی صفت ہے۔ (التفسیر الکبیر ۲۴۴/۲۷)

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ {۱۷} اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ {۱۸} وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ {۱۹} وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ {۲۰} وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ {۲۱} فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ {۲۲} فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ {۲۳} وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ {۲۴} كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ {۲۵} وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ {۲۶} وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ {۲۷} كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ {۲۸} الدخان

جواب ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا اور ان کے پاس عزت والا رسول آیا۔ تم اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کر دو بلاشبہ میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، اور یہ کہ تم اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو بلاشبہ میں تمہارے پاس کھلی دلیل لے کر آیا ہوں، اور بلاشبہ میں اپنے رب سے اور تمہارے رب سے اس بات کی پناہ لیتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کر دو، اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے علیحدہ رہو، پھر موسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ

لوگ مجرم قوم ہیں، سو تم میرے بندوں کو رات کو لے کر روانہ ہو جاؤ، بیشک تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور سمندر کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا، بلاشبہ یہ لشکر غرق کر دیا جانے والا ہے، وہ بہت سے باغات اور چشمے چھوڑ گئے، کھیتیاں اور عمدہ مکانات۔ اور عیش کے سامان چھوڑ دیئے جن میں وہ خوشی کی حالت میں رہا کرتے تھے، اور ہم نے ان چیزوں کا دوسرے لوگوں کو وارث بنا دیا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ: ہم نے مشرکین سے پہلے قوم فرعون یعنی مصر کے قبطیوں کو آزمایا۔ **فَتَنَّا** کا معنیٰ ہے ہم نے امتحان لیا، **قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ**: ہم نے ان کی طرف موسیٰ کو بھیج کر ان کے ساتھ ایک ممتحن کا سا معاملہ کیا، ہم نے انہیں ڈھیل و مہلت دی، ہم نے انہیں رزق کی فراوانی عطا کی۔ علامہ طبری فرماتے ہیں کہ ہم نے جس طرح قوم قریش کو قحط سے آزمائش قوم فرعون کو بھی قحط سے آزمایا تھا۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ: ان کے پاس شریف الحسب و النسب پیغمبر آیا جو اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ عزت والا تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ رسول کریم، سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی صفت کریم ذکر فرمائی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ہاں عظمت والے اور بلند مرتبہ والے ہیں اور یہ بھی کہنا درست ہے کہ کریم ان کے لئے اللہ نے اس لئے ذکر فرمایا کہ وہ اپنی قوم میں معزز اور شان والے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی رسول اور پیغمبر کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لیے نہیں بھیجا مگر وہ اللہ کے ہاں بڑی شان و مقام والا تھا۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے سپرد کرو اور انہیں عذاب سے خلاصی دو جیسے سورۃ طٰہٰ میں فرمایا: **فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ** یعنی بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو اور انہیں عذاب نہ دو، حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق عباد اللہ سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے **اَدُّوْهُمْ اِلَيَّ وَاَرْسِلُوْهُمْ** کہ انہیں میرے حوالے کرو اور انہیں میرے ساتھ روانہ کرو۔ (مدارک التنزیل)

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ: میں پیغمبر ہوں اور میرے پاس وحی کی امانت ہے اور مجھ پر کوئی تہمت

نہیں ہے، میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میری نصیحت قبول کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ میں وحی پر امین ہوں پس میری نصیحتوں کو قبول کرو ایک قول یہ کیا گیا ہے جو میں تم سے لیتا ہوں اس میں امین ہوں میں اس میں کوئی خیانت نہیں کرتا۔ (الجامع لاحکام القرآن)

وَاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ: یعنی اللہ تعالیٰ پر تکبر نہ کرو اور اس کی طاعت سے اپنے آپ کو بالاتر نہ سمجھو۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا اللہ تعالیٰ پر بغاوت نہ کرو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں سستی نہ کرو، بغی اور افتراء میں فرق ہے بغی فعل کے ساتھ ہوتی ہے اور افتراء قول کے ساتھ ہوتا ہے۔

تعظیم اور استکبار میں فرق: تعظیم سے مراد مقتدر فرد کا بڑا جاننا اور استکبار کا معنی ہے ذلیل کم مرتبہ آدمی کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ (الجامع لاحکام القرآن) تم لوگ اللہ تعالیٰ کی وحی کی تحقیر اور اس کے رسول کی توہین کرکے تکبر نہ کرو۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

اِنِّیْٓ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ: میں تمہارے پاس واضح حجت لے کر آیا ہوں اور روشن برہان لے کر آیا ہوں، ہر عقل مند ان کا اعتراف کرتا رہے۔ سلطان مبین سے مراد وہ کھلے اور واضح معجزات لے کر آیا ہوں جن کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ان میں ایک معجزہ عصا تھا جو پھینکتے تھے سانپ بن جاتا تھا، جس کا ذکر کئی مقامات پر موجود ہے، دوسرا ید بیضا تھا۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم مجھے قتل کرو، جس وقت موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ تم لوگ تکبر نہ کرو تو اس کے بعد قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تھی اس لیے آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ: موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کو کہا اے لوگو! تم میری لائی ہوئی بات کو نہیں مانتے تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ، زبان اور ہاتھ کی ایذاء سے باز رہو، یہ اس شخص کا بدلہ و معاوضہ نہیں ہونا چاہیے جو تمہیں فلاح و نجات کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی مجھ سے تعرض نہ کرو اور معاملہ صلح جوئی پر چھوڑ دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان

فیصلہ کر دے۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۳۰۲)

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بد عا دی جب انہوں نے آپ علیہ السلام کی تکذیب کی اور یوں فرمایا: یا اللہ یہ لوگ مجرم ہیں ان سے انتقام لے۔ علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کے خلاف یہ بد دعا اس کے بعد کی جب وہ ایمان نہیں لائے، بنی اسرائیل کو غلامی کے شکنجے سے خلاصی بھی نہ دی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کا فیصلہ کیا۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن) یہ لوگ اپنے کفر اور جرائم پر اصرار کرتے تھے، یہ عادی مجرم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام لیا۔

سوال: کفر جرم سے بہت بڑا ہوتا ہے، تو یہاں مُجرِمُون فرمایا گیا، کَافِرُون کیوں نہیں فرمایا؟

جواب: کافر کبھی کبھار اپنے دین میں انصاف پر ہوتا ہے، کبھی کبھار کافر ہونے کے باوجود مجرم بھی ہوتا ہے، مختلف قسم کے کبیرہ گناہوں اور متنوع جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، قوم فرعون جو تھی یہ کفر اور جرائم دونوں کا مجموعہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کے خلاف بد دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بہت جلد یہ دعا قبول فرمالی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ: کلام میں حذف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے فَأَوحَيْنَا إِلَيْهِ وَقُلْنَا لَهُ: أَسْرِ بِعِبَادِي أَي أَخْرِجْ بِبَنِي إِسْرَائِيلَ لَيْلاً فَإِنَّ فِرْعَونَ وَقَوْمَهُ يَتَّبِعُوْنَكُم ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی اور اس سے کہا: بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر نکلو، فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھے کرے گی اور یہ ان کی ہلاکت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رات کے اس پہر اپنے علاقے سے نکلنے کا حکم دیا جب ان کے دشمن خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہوں، تاکہ فرعون اور اس کے پیروکاروں کی شر انگیزی سے نجات پائیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمادیا تھا کہ فرعون اور اس کی قبطی قوم کو آپ علیہ السلام کے نکلنے کا پتہ چلے گا تو وہ تمہارا پیچھا کریں گے۔ فَاَسْرِ کا مطلب صبح سے پہلے پہلے نکالنے کا حکم فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رات کے وقت نکلنے کا حکم دیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کا سفر عموماً خوف

کی وجہ سے ہوتا ہے خوف دو وجہ سے ہوتا ہے ① دشمن کا خوف ہوتا ہے تو رات کو پردہ بنایا جاتا ہے، یہ رات اللہ تعالیٰ کے پردوں میں سے ایک پردہ ہے ② جانوروں اور جسموں پر مشقت اور تکلیف سے خوف کی وجہ سے رات کو سفر کیا جاتا ہے، وجہ گرمی ہو یا خشک سالی ہو تو مصلحت کی غرض سے رات کو سفر کیا جاتا ہے نبی کریم ﷺ رات کو سفر کرتے، رات کے پہلے پہر سفر کرتے کبھی آہستہ چلتے اور کبھی جلدی کرتے، جس طرح ضرورت ہوتی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان گرامی ہے کہ جب تم سرسبز و شادابی کے دور میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین میں سے اس کا حصہ دو (اپنے چرنے کا موقع دو) جب تم خشک سالی کے دور میں سفر کرو تو جلدی چلو تاکہ مقصد کو پالو جبکہ اونٹ میں قوت باقی ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن)

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا: اور تم سمندر کو ٹھہرا ہوا اور پھٹنے والا چھوڑ دینا اپنے گزر جانے کے بعد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: **رَهْوًا** کا معنی راستہ ہے، یہ قول کعب رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا بھی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے راستہ، ضحاک رحمہ اللہ اور ربیع رحمہ اللہ نے کہا: اس کا معنی آسمان ہے: عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اس کا معنی خشک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ** (طٰہٰ ۷۷) اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چلے جاؤ پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا دینا نہ کسی کے تعاقب کا اندیشہ کرو گے اور نہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو گا۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنیٰ ہے جدا جدا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: کھلا، ان سے یہ قول بھی مروی ہے خشک ان سے یہ قول بھی مروی ہے ساکن لغت میں یہی معروف ہے یہ قتادہ رحمہ اللہ اور ہروی رحمہ اللہ کا قول ہے دوسروں نے کہا: کھلا، ابن عرفہ رحمہ اللہ نے کہا: ان دونوں کا ایک معنیٰ ہے، اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں کیونکہ جس کا چلنا ساکن ہو جاتا ہے تو وہ کھل جاتا ہے، اسی طرح سمندر کا چلنا ساکن ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کھل گیا، عربوں کے نزدیک **رَهْوٌ** سے مراد ساکن ہے یہ جملہ بولا

جاتا ہے جَائَتِ الخَیلُ رَھوًا گھوڑے پر سکون آئے۔

اِنَّھُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ: فرعون اور اس کی قوم سمندر میں غرق ہو جائیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر عبور کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر دوبارہ عصا مارنا چاہا تاکہ سمندر مل جائے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سمندر کو اسی حالت پر ساکن چھوڑ دو جیسے تمہارے داخل ہونے کے وقت تھا، تاکہ فرعون اور اس کی قوم بھی اس میں داخل ہو اور وہ سب اس میں غرق ہو جائیں۔ (صفوۃ التفاسیر)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خبر اس لیے دی تاکہ ان کا دل فرعونیوں کی اذیتوں سے فارغ ہو جائے اور انہیں اطمینان ہو جائے کہ فرعونی بنی اسرائیل کو نہیں پکڑ سکتے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی ہلاکت کی خبر دی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

کَمۡ تَرَکُوۡا مِنۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ: کم تکثیر کے لیے ہے، یعنی قوم فرعون نے بیشمار باغات، باغیچے، لہریں اور چشمے اپنے پیچھے چھوڑے، یہ سب کچھ بہت بڑی تعداد میں مصر میں تھا۔

وَّزُرُوۡعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیۡمٍ: بے شمار کھیتیاں جن میں طرح طرح کی فصلیں اگی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ مکانات اور محلات اپنے پیچھے چھوڑ گئے، قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: مقام کریم: سے ان کی خوبصورت بیٹھکیں اور رہائش گاہیں ہیں۔ (البحر المحیط ۸:۳۶، صفوۃ التفاسیر)

وَنَعۡمَۃٍ کَانُوۡا فِیۡھَا فٰکِھِیۡنَ: خوبصورت و بارونق عیش و عشرت کے سامان جن میں وہ پر تعیش اور آرام دہ زندگی گزارتے تھے گویا انہیں دنیا کا سکون حاصل تھا۔ امام فخر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں بَیَّنَ تَعَالَی أَنَّهُم بَعدَ غَرقِهِم تَرَکُوا هٰذِهِ الأَشیَاء الخَمسَة هِیَ: الجَنَّاتُ، وَالعُیُونُ، وَالزُّرُوعُ، وَالمَقَامُ الکَرِیمُ وَهُوَ المَجَالِسُ وَالمَنَازِلُ الحَسَنَةُ وَنَعمَةُ العَیش بِفَتح النُّون هِیَ حُسنُهُ وَنَضَارَتُهُ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ قوم فرعون نے سمندر میں غرق ہونے کے بعد پانچ چیزوں کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ باغات چشمے، کھیت، رہنے کی خوبصورت جگہیں اور زندگی کی رونقیں اور خوبصورتیاں۔ (التفسیر الکبیر ۲۷:۲۴۶، صفوۃ التفاسیر)

نَعۡمَۃٌ اور نِعۡمَۃٌ میں فرق: نَعۡمَۃٌ: نون کی فتحہ کے ساتھ بمعنی عیش و عشرت آسودگی اور نِعۡمَۃٌ نون

کے کسرہ کے ساتھ بمعنی احسان، عطیہ، انعام۔

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ: ہم نے قوم فرعون سے ایسا ہی کیا کہ انہیں ہلاک کر کے ان کا ملک اور ان کے گھر بار ایک اور قوم کو سونپ دیے اور وہ قوم قبطیوں کے ہاتھوں میں غلام تھی یعنی بنی اسرائیل، اس میں دو قول ہیں کہ ان کا وارث کسے بنایا؟ ایک قول یہ ہے کہ جن کو وارث بنایا گیا وہ بنو اسرائیل تھے، دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور لوگ تھے، کیونکہ بنی اسرائیل چلے جانے کے بعد پھر مصر میں نہیں آئے۔ ان میں پہلا قول درست ہے کہ ان کے وارث بنی اسرائیل کو بنایا گیا تھا، اس پر قرآنی نص بھی موجود ہے، قرآن کہتا ہے کہ وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہم نے ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا تھا، جہاں تک دوسرا قول ہے کہ بنی اسرائیل جانے کے بعد مصر واپس نہیں لوٹے، یہ قول درست نہیں ہے اور یہ اسرائیلی روایات سے لا کر یہاں ٹھونسا گیا ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں وَالْمُرَادُ بِهِمْ بَنُوْ إِسْرَائِيلَ فَقَدِ اسْتَوْلَوْا بَعْدَ غَرَقِ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ عَلَى الْمَمَالِكِ الْقِبْطِيَّةِ، وَالْبِلَادِ الْمِصْرِيَّةِ اس قوم سے مراد بنی اسرائیل ہے چنانچہ فرعون اور اس کی قوم کے غرق ہونے کے بعد ان کی املاک پر بنی اسرائیل نے قبضہ کر لیا اور مصر کے شہروں کے وہی مالک بن گئے۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا۔ (سورۃ الاعراف۔ ۱۳۷) اور ہم نے اس قوم کو وارث بنا دیا جو کمزور سمجھی جاتی تھی، ہم نے اسے زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا، اس سرزمین میں ہم نے برکت نازل کی تھی۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہم نے اس سرزمین کا بنی اسرائیل کو وارث بنا دیا۔ (سورۃ الشعراء۔ ۵۹) (مختصر ابن تفسیر ۳:۳۰۳ صفوۃ التفاسیر)

نیکوکاروں پر آسمان وزمین کا رونا

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ {۲۹} الدخان

جواب ترجمہ: سو ان پر آسمان رویا نہ زمین، اور ان کو مہلت نہیں دی گئی۔

خلاصہ تفسیر: آسمان وزمین اہل ایمان کے لیے روتے ہیں، زمین ان کی سجدہ گاہوں کی وجہ سے روتی ہے، آسمان ان کے نیک اعمال کے اوپر چڑھنے پر روتے ہیں، زمین روتی ہے کہ اب اس زمین کے ٹکڑے پر کون سجدہ کرے گا، آسمان روتا ہے کہ اب کس کے اعمال ادھر سے اوپر جائیں گے؟ آسمان وزمین کے رونے سے مراد غم وحزن ہے یا حقیقی معنٰی میں رونا ہے۔ کافر کے لیے آسمان روتا ہے اور نہ ہی زمین روتی ہے۔ قرآن کریم نے واضح فرمادیا ہے کہ

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ: پھر نہ ان پر آسمان رویا نہ زمین، اور نہ ان کو کچھ مہلت دی گئی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو بھی کوئی مومن بندہ ہے اس کے لیے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے اس کا عمل اوپر جاتا ہے اور ایک دروازے سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے۔ جب اس کی موت ہوجاتی ہے تو دونوں دروازے اس پر رونے لگتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اسی کو فرمایا گیا کہ پھر ان پر آسمان رویا اور نہ ہی زمین (ترمذی فی تفسیر سورۃ الدخان)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ یعنی وہ لوگ اللہ کے ہاں بہت ہلکے تھے کہا وَكُنَّا نُحَدِّثُ أَنَّ الْمُؤْمِنَ تَبْكِي عَلَيْهِ بِقَاعَةُ الَّتِي كَانَ يُصَلِّي فِيهَا مِنَ الأَرْضِ وَمُصْعِدُ عَمَلُهُ مِنَ السَّمَاءِ اور ہم یہ بیان کرتے تھے کہ مؤمن پر وہ جگہ روتی ہے جہاں مؤمن نماز پڑھتا تھا اور جہاں سے اس کا عمل آسمان کی طرف بلند ہوتا تھا (وہ جگہ اس پر روتی ہے)۔ (عبد بن حمید)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ سے مراد ہے کہ مؤمن نہیں مرتا مگر اس پر آسمان وزمین چیخیں مار کر روتے ہیں اس سے کہا گیا آپ اس پر روتے ہیں جس پر تعجب ہوتا ہے اور زمین کیوں نہ روئے کسی بندے پر جو اس کو رکوع اور سجود سے آباد کرتا تھا اور آسمان کیوں نہ روئے کسی بندے پر کہ اس کی تسبیح اور اس کی تکبیر سے یوں آواز آتی ہے جیسے

شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی ہوتی ہے۔(العظمت لابی الشیخ، عبد بن حمید، در منثور)

مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ إِنَّ الْعَالِمَ إِذَا مَاتَ بَكَتْ عَلَيْهِ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ أَرْبَعِينَ صَبَاحاً جب عالم مرتا ہے تو آسمان وزمین اس پر چالیس دن تک روتے ہیں۔(در منثور)

معاویہ بن قرۃ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس پر مؤمن نماز پڑھتا تھا اس پر روتا ہے جب وہ مؤمن مرجاتا ہے اس کے بالمقابل آسمان بھی روتا ہے پھر یہ آیت پڑھی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (عبد بن حمید، در منثور)

وھب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ إِنَّ الأَرْضَ لَتَحزَنُ عَلَى العَبْدِ الصَّالِحِ أَرْبَعِينَ صَبَاحاً زمین البتہ غمگین رہتی ہے نیک بندے پر چالیس دن تک۔(در منثور)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے برے لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان پر آسمان رویا اور نہ ہی زمین روئی اس لیے کہ لَم تَبكِ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ لأَنَّهُم لَم يَكُونُوا يَرفَعُ لَهُم فِيهَا عَمَلٌ صَالِحٌ وَلَم تَبكِ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ لأَنَّهم لَم يَكُونُوا يعْمَلُونَ فِيهَا بِعَمَل صَالِحٍ آسمان ان پر نہ رویا کیونکہ ان کا نیک عمل بلند نہ ہوتا تھا اور ان پر زمین نہ روئی وہ زمین میں نیک عمل کرنے والے نہیں تھے۔(در منثور)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ اَلأَرْض تَبْكِي عَلَى الْمُؤمِن أَرْبَعِينَ صَبَاحًا کہا جاتا تھا کہ زمین مؤمن پر چالیس دن روتی ہے۔(تفسیر در منثور)

حضرت ثور بن یزید رحمہ اللہ اور انہوں نے مولی ھذیل سے روایت کیا کہ مَا مِن عَبدٍ يَضَعُ جَبهَتَهُ فِي بقْعَة مِنَ الأَرْضِ سَاجِدًا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا شَهِدَت لَهُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَبَكَت عَلَيْهِ يَوْمَ يَمُوتُ، جو بندہ اپنی پیشانی کو زمین کے کسی ٹکڑے میں اللہ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے رکھتا ہے تو زمین اس کے لئے قیامت کے دن گواہی دے گی اور اس پر روتی ہے جس دن وہ مرتا ہے۔(العظمت لابی الشیخ، ابن مبارک، در منثور)

ابن ابی الدنیا وابن جریر نے شریح بن عبید حضرمی سے مرسلاً روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ إِنَّ الإِسلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا أَلَا لَا غُربَةَ عَلَى مُؤمِنٍ مَا مَاتَ مُؤمِنٌ فِي غُربَةٍ غَابَتْ عَنهُ فِيهَا بَوَاكِيهِ إِلَّا بَكَت عَلَيهِ السَّمَاءُ، اسلام اجنبیت میں شروع ہوا اور عنقریب اجنبی ہو جائے گا خبر دار اجنبیت مؤمن کے لئے نہیں ہے، جو آدمی مسافرت میں مر گیا جس جگہ اس پر رونے والے نہیں تو اس پر آسمان اور زمین روتے ہیں پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ زمین وآسمان کسی کافر کے مرنے پر نہیں روتے ہیں ۔(ابن ابی الدنیا)

ایک آدمی نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آسمان اور زمین کسی پر روتے ہیں؟ فرمایا کہ إِنَّهُ لَيْسَ مِن عَبدٍ إِلَّا لَهُ مُصَلًى فِي الأَرضِ وَمُصعِدُ عَمَلِهِ فِي السَّمَاءِ وَإِن آلَ فِرعَونَ لم يَكُن لَّهُم عَمَلٌ صَالِحٌ فِي الأَرضِ وَلَا مُصعِدٌ فِي السَّمَاءِ کوئی بندہ ایسا نہیں جس کیلئے زمین میں نماز پڑھنے کی جگہ نہ ہو اور اس کے عمل کے بلند ہونے کی جگہ نہ ہو آسمان میں اور فرعون والوں کے نیک عمل کی کوئی جگہ نہیں ہے، زمین میں اور نہ ہی کوئی بلند ہونے کی جگہ ہے آسمان میں۔(در منثور)

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مؤمن جب مرتا ہے تو زمین میں اس کی نماز پڑھنے کی جگہ روتی ہے اور آسمان میں اس کے عمل کے اوپر چڑھنے کی جگہ بھی روتی ہے پھر یہ (آیت) تلاوت فرمائی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (در منثور)

سوال مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مَا مِن مَيِّتٍ يَمُوتُ إِلَّا تَبْكِي عَلَيهِ الأَرضُ أَربَعِينَ صَبَاحاً جو آدمی بھی فوت ہوتا ہے تو اس پر زمین چالیس دنوں تک روتی ہے۔(در منثور) یہاں اس روایت میں میت مطلق مراد ہے، چاہے کافر ہو یا مسلمان، اس لیے زمین وآسمان کے رونے کی تخصیص مسلمان کے لیے نہیں ہونا چاہیے

جواب یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس میت سے مراد بھی مسلمان میت ہی ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کے واضح ارشادات میں مومن کا ذکر موجود ہے کہ اس پر زمین وآسمان روتے ہیں، کافر پر زمین وآسمان نہیں روتے، اسی طرح نیک عمل کرنے والی میت مراد ہے، نیک عمل نہ کرنے والی میت اس سے مراد نہیں ہے، اس پر زمین وآسمان نہیں روتے، عالم پر رونے کا ذکر ہے، مومن صالح پر

رونے کا ذکر ہے، سورۃ الدخان کی زیر تفسیر آیت بھی اس مؤقف کی تائید کرتی ہے۔

② اس مؤقف کی تائید میں عطا خراسانی کی ایک روایت بھی ہے، جس میں فرمایا گیا کہ مَا مِن عَبدٍ يَسجُدُ للهِ سَجدَةً فِي بُقعَةٍ مِّن بقَاعِ الأَرضِ إِلَّا شَهِدَت لَهُ يَومَ الْقِيَامَة وبَكَت عَلَيهِ يَومَ يَمُوتُ، کوئی بندہ اللہ کے لئے سجدہ نہیں کرتا زمین کے ٹکڑوں میں کسی ٹکڑے پر تو وہ ٹکڑا اس کے لئے قیامت کے دن گواہی دے گا اور وہ روتا ہے جس دن وہ فوت ہوتا ہے، روایت میں اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرنے والے کا ذکر ہے، کافر کب اور کہاں اللہ کو سجدہ کرتا ہے، اس لیے مومن مسلمان کے لیے ہی زمین و آسمان کا رونا ثابت ہو رہا ہے، کافر کے لیے نہیں۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبید المکتب سے اور انہوں نے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ آسمان نہیں رویا جب سے دنیا بنی مگر دو آدمیوں پر عبید سے پوچھا گیا کیا آسمان و زمین مؤمن پر روتے ہیں فرمایا وہ جگہ روتی ہے جہاں وہ رہتا تھا اور آسمان میں وہ جگہ جہاں سے اس کا عمل اوپر چڑھتا تھا پوچھا کیا تو جانتا ہے آسمان کا رونا کیا ہے؟ کہا نہیں فرمایا تَحَمَّرَ وَتَصَيَّرَ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ أَنَّ يَحيى بن زَكَرِيَّا لَمَّا قُتِلَ احْمَرَّتِ السَّمَاءُ وَقَطَرَت دَمًا وَإِنَّ حُسَيْنَ بنَ عَلِيّ يَوْمَ قُتِلَ احْمَرَّتِ السَّمَاءُ وہ سرخ ہو جاتا ہے اور اس کا رنگ رنگے ہوئے چمڑے کی طرح سرخ ہو جاتا ہے یحی بن زکریا علیہ السلام کو جب قتل کیا گیا تو آسمان سرخ ہو گیا اور اس نے خون برسایا اور جب حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو جب شہید کیا گیا تو آسمان سرخ ہو گیا۔ (ابن ابی حاتم، در منثور)

ابن ابی حاتم نے زید بن زیاد رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ لَمَّا قُتِلَ الْحُسَيْنُ احْمَرَّتْ آفَاقُ السَّمَاءِ أَرْبَعَةَ أَشْهُر (ابن ابی حاتم، در منثور) جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو آسمان کے کنارے چار ماہ تک سرخ رہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زمین و آسمان روتے ہیں اہل ایمان کے دنیا چھوڑ جانے کی وجہ سے، زمین کا وہ ٹکڑا روتا ہے جس پر مومن سجدہ ریزی کرتا ہے، قرآن کریم کہتا ہے کہ کافروں کے جانے پر آسمان رویا ہے اور نہ ہی زمین روئی ہے، ان بدبختوں کی وجہ سے تو زمین پناہ مانگتی ہے کہ کیسے کمینے اور گندے

لوگ میری پشت پر گھومتے پھرتے ہیں۔

فرعونی مظالم، فرعون کی سرکشی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ{۳۰}مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ {۳۱} الدخان

جواب ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی، جو فرعون کی طرف سے تھا، بیشک وہ بڑا سرکش اور حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ: اللہ کی قسم ہم نے بنی اسرائیل کو نہایت سخت عذاب سے نجات دی، یہ عذاب اہانت آمیز اور رسوا کن تھا، فرعونی بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے اور سخت محنت کے کاموں میں ان سے خدمت لیتے تھے، انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان تمام مظالم سے جو قبطی فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کے ساتھ روا رکھتے تھے جس طرح انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، عورتوں سے خدمت لینا، مردوں کو غلام بنالینا اور مشکل امور ان پر لازم کرنا۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ: فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دی، فرعون نہایت متکبر اور ظالم تھا اور ظلم و ستم میں حد سے بڑھ جانے والا تھا۔ صاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بنی اسرائیل پر کی گئی نعمتوں میں سے ایک یہ بھی نعمت ہے، اس سے مقصود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مؤمنین کو مشرکین کے ظلم سے نجات دے گا، چنانچہ مشرکین ظلم و ستم میں فرعون اور اس کی قوم کی حد ظلم تک نہیں پہنچے۔ (الصاوی ۴۸:۶۰، صفوۃ التفاسیر)

عَالِياً کا معنیٰ فرعون متکبر تھا، مُسرِفِین کا معنیٰ شر انگیزی اور فساد میں آگے بڑھنے والوں میں سے ایک فرعون تھا، فرعونی جرائم کی فہرست مرتب کی جائے تو بہت مظالم بیان ہو سکتے ہیں۔

کیا بنی اسرائیل کو سارے جہان پر فضیلت دی گئی؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ {۳۲} وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ {۳۳} الدخان

جواب ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رو سے جہاں والوں پر فوقیت دی، اور ہم نے ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں انعام تھا واضح طور پر۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: یہود کو اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانہ کے لوگوں پر چن لیا تھا، یہ اللہ کی پسندیدہ قوم تھی فقط اپنے زمانے میں، قیامت تک ان کی پسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے نبیوں کے آخر میں ایک عظیم الشان نبی مبعوث فرمائے جن کو رحمت للعالمین فرمایا گیا، ان کو کتاب ہدایت دی گئی جسے ہدیً للعالمین کہا گیا، ان کو امت دی گئی جسے اللہ نے معتدل امت قرار دیا، جسے امت وسط کے ساتھ ساتھ بہترین امت قرار دیا۔

اگر اس امت کے نبی کو محمد اور احمد کہا گیا تو اس نبی کی امت کو حمادون کہا گیا، اس لیے اسرائیل کی اولاد میں یہود کی پسندیدگی اور چنیدگی صرف اسی زمانہ تک تھی، جس زمانے میں انہیں من وسلویٰ ملا کرتا تھا، اسی زمانے تک یہ پسندیدہ تھے جس زمانے میں ان کی طرف بھیجے جانے والے لاڈلے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور کی بلندیوں پر اپنے پروردگار سے ہم کلامی کا اعزاز وشرف حاصل کرتے تھے۔

ان کی پسندیدگی اور چنیدگی تو اسی دن زوال پذیر ہوگئی تھی جس دن ان میں ایک طبقہ کو اللہ نے حکم دے دیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ، اچھے بھلے انسانوں کو رات کی تاریکی میں بندر اور وہ بھی ذلیل بندر بنادیا گیا، ان کی شکلیں مسخ کردی گئی تھیں، ان کی پسندیدگی تو اسی دن ختتام کی طرف بڑھنا شروع ہوگئی تھی جس دن سامری نے ان کے لیے بچھڑے میں زیورات ڈال کر بلوایا اور ان کا خدا بناڈالا تھا، یہ اس کی پوجا کی طرف متوجہ ہوگئے تھے، ان پجاریوں کو ایک دوسرے کی تلواروں سے تہہ تیغ کروایا گیا تھا، اس لیے بات واضح ہوگئی کہ یہ صرف اپنے زمانے تک پسندیدہ، لاڈلے اور چنیدہ تھے، جیسا کہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے اور ہم نے علم رکھنے کے باوجود اُن (بنی اسرائیل) کو اقوامِ عالم پر ترجیح دی تھی۔ (الدخان ۳۲)

صاحب تدبر قرآن فرماتے ہیں کہ عَلٰی عِلْمٍ کے الفاظ سے تاریخ کے اس فلسفہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کا عزل و نصب اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو منتخب کرتا ہے اور جس کو نااہل پاتا ہے اس کو رد کر دیتا ہے، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو معزول ہوئے ہیں وہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنی نالائقی پر سر پیٹیں اور جو اقتدار پر آئے وہ فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے خدا کے شکر گزار ہوں اور اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، اس دنیا کے عروج پر زوال کا سارا نقشہ اللہ تعالیٰ مرتب کرتا ہے اور اس کی بنیاد تمام تر قوموں کے اخلاق و کردار پر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا علم بے خطا اور اس کی حکمت بے لاگ ہے۔ (تدبر قرآن)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے بنی اسرائیل کا امت محمدیہ علی صاحبہا السلام پر فائق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس سے مراد اس زمانے کے دنیا جہان والے ہیں اور اس وقت بلاشبہ وہ تمام اقوام سے افضل تھے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مریم کے لئے نساء العالمین پر فضیلت کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص پہلو سے بنی اسرائیل کو تمام دنیا اور ہر زمانے کے لوگوں پر کوئی فضیلت حاصل ہو لیکن مجموعی حیثیت سے افضلیت امت محمدیہ ہی کو حاصل ہے۔ (معارف القرآن)

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس چننے سے مراد صرف وہی زمانہ لیا ہے جس میں یہ لوگ تھے، اس میں اللہ نے ان کو باقی لوگوں پر بہت سی چیزوں میں خصوصیات عطا کی تھیں جو باقیوں کے لیے نہیں تھیں، جیسے من وسلویٰ کا ان کے لیے اترنا، ان کے لیے سخت گرمی کے موسم میں بادلوں کا سایہ مہیا کرنا وغیرہ

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ: ہم نے ان کو دلائل، براہین اور خارق عادت معجزات

دیے، جن میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے امتحان ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیات سے مراد معجزات ہیں جیسے سمندر کا پھٹ جانا، بادلوں کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا نزول وغیرہا، یہ ایسی خارق عادت نشانیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیں۔ (الجامع لاحکام القرآن)

کفار مکہ کا غلط عقیدہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ{۳۴}اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ{۳۵}فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ{۳۶} الدخان

جواب ترجمہ: بلاشبہ یہ لوگ کہتے ہیں، کہ بس یہی ہماری پہلی موت ہے اور ہم دوبارہ زندہ کیے جانے والے نہیں ہیں، سو تم ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ: کفار قریش کہتے ہیں: ہمیں صرف ایک ہی بار موت آئے گی اور وہ دنیا کی موت ہے، هٰٓؤُلَآءِ: اشارہ برائے تحقیر ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ سورۃ مبارکہ کے شروع میں کفار مکہ کے متعلق بات ہوئی پھر فرعون اور اس کا قصہ بیان کیا گیا، اس سے استدلال کرنا مقصود ہے کہ مشرکین فرعون اور اس کی قوم کی طرح کفر وضلالت پر مصر ہیں۔ اب پھر کفار مکہ کی طرف بات لوٹ آئی ہے، اور

اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى: سے مشرکین کی غرض بعث بعد الموت کا انکار ہے، گویا یوں کہہ رہے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے پھر دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے اور نہ کوئی اور زندگی ہوگی اور نہ پھر سے اٹھنا ہوگا، اور پھر یوں صراحت کر دی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ذکر استطراداً آگیا تھا، یہاں سے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا تذکرہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہتے ہیں کہ ہماری آخری حالت بس یہ ہی ہے کہ موت آجائے، موت کے بعد سب قصہ ختم، موجودہ زندگی کے سوا دوسری زندگی کوئی نہیں، کہاں کا حشر، اور کیسا حساب کتاب۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ: اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

فَأْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: رسول کریم ﷺ سے اور مؤمنین سے علی سبیل عجز خطاب ہے، یعنی ہمارے سامنے ہمارے آباؤ اجداد کو زندہ کر لاؤ تا کہ وہ ہمیں تمہارے سچے ہونے کی خبر دیں، اگر تم سچے ہو تو ایسا کر دکھاؤ۔

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مشرکین نے حشر و نشر کی نفی پر یوں حجت پکڑی کہ اگر واقعی مردوں کو زندہ کیا جائے گا تو وہ لوگ جو مر چکے ہیں انہیں زندہ کر کے ہمارے سامنے پیش کرو تا کہ تمہارے دعویٰ کے سچ ہونے پر ہمارے پاس دلیل ہو جائے۔ (کبیر)

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بات کہنے والا ابو جہل تھا، اس نے کہا: اے محمد! اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو ہمارے آباؤ اجداد سے دو آدمیوں کو ہمارے سامنے زندہ کر لاؤ۔ ان میں سے ایک قصی بن کلاب ہو، وہ سچا آدمی تھا ہم اس سے پوچھیں گے کہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا؟ (الجامع لاحکام القرآن)

تبع حمیری اور قوم تبع

سوال اس آیت کی روشنی میں بتایئے تبع کون تھا؟ اور قوم تبع کون تھی؟

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ {۳۷} الدخان

جواب ترجمہ: کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، ہم نے ان کو ہلاک کیا بلاشبہ وہ مجرم تھے۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ: اس آیت میں اہل مکہ، قریش مکہ، کفار مکہ کی باتوں کا رد کیا جا رہا ہے اور انہیں دھمکایا جا رہا ہے، یہاں استفہام انکاری ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا اہل مکہ قوت و طاقت میں زیادہ ہیں؟ یا اہل سبا، شاہان یمن زیادہ طاقت و قوت کے مالک تھے جن کے پاس مال و دولت کی فراوانی کفار مکہ سے بہت زیادہ تھی۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ: ان سے پہلے جو سرکش امتیں گزری ہیں ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے شہروں کو تباہ کر دیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔ ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان سے مراد عاد، ثمود

اور ان جیسی دوسری سرکش اقوام ہیں جو کفار مکہ سے زیادہ طاقتور اور زیادہ جنگجو تھیں، اللہ نے ان کو بھی ہلاک کر دیا اور ان کی قوت ان کے کچھ کام نہ آسکی، لہٰذا ان مشرکین کا ہلاک کرنا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ: یہ کفار کی ہلاکت کی تعلیل ہے یعنی ہم نے انہیں ہلاک وتباہ کیا بسبب ان کے گنہگار ہونے کے آیت میں قریش کے لیے وعید وتہدید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کر سکتا ہے جو قوم تبع کے ساتھ کیا۔

قوم تبع سے مراد تبع حمیری کی قوم ہے، یہ وہ قوم تھی جو اپنے رب کا انکار کرتی تھی، تبع کی جمع تبابعہ آتی ہے، ان تبابعہ میں سے ایک شخص ابو کرب اسعد الحمیری کے بارے میں آتا ہے کہ یہ شخص نبی کریم ﷺ سے سات سو سال پہلے نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آیا تھا، تبع اور قوم تبع کی تفصیل اس آیت کی تفسیر میں بیان ہو رہی ہے، قرآن کریم نے قریش کی اکڑ اور زور آوری کو رد کرتے ہوئے قوم تبع کا خصوصیت سے یہاں ذکر کیا ہے، ارشاد ہے بھلا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ (کیونکہ) وہ یقینی طور پر مجرم لوگ تھے۔

تبع قبیلہ حمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جس طرح حبشہ کا ہر حکمران نجاشی کہلاتا تھا اور رومی سلطنت کا ہر تاجدار قیصر کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ایران کے حکمران کسریٰ کہلاتے تھے اور مصر کے حکمرانوں کو فرعون کہہ کر پکارا جاتا تھا، اسلامی حکمران کو خلیفہ کہا جاتا ہے، اسی طرح قبیلہ حمیر کے بادشاہوں کو تبع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ قوم سبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے، ۱۱۵ قبل مسیح میں ان کو سبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ حکمران رہے، عرب میں ان کی مادی شوکت وعظمت اور ذہنی صلاحیتوں کا بڑا چرچا رہا اور انصار چونکہ قحطانی قریش سے تعلق رکھتے تھے اور یمن سے آئے تھے اس لیے تبع بادشاہوں سے انہیں خاص لگاؤ تھا اور ہمیشہ ان کی عظمتوں کے گن گاتے رہتے تھے۔ (روح)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ تبع حمیری ہے اور یہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا، اس کا نام

تبع اس وجہ سے رکھا گیا کہ اس کے متبعین بہت زیادہ تھے اور ان میں سے ہر بادشاہ کا نام تبع رکھا جاتا تھا، اس لیے کہ وہ پہلے کا تابع ہوتا تھا۔

یہ بادشاہ آگ کی پوجا کرتا تھا، اسلام لے آیا اور اپنی قوم حمیر کو اسلام کی طرف بلایا، انہوں نے اس کو جھٹلایا اور اس کا واقعہ وہ ہے جو محمد بن اسحاق وغیرہ اور عکرمہ رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ تبع الآخر تھا، اس کا نام ابو کریب اسعد بن ملیک تھا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَاتَسُبُّوا تُبَّعًا فَاِنَّهٗ كَانَ قَدْ اَسْلَمَ (مسند احمد) تبع کو تم لوگ گالی مت دینا کیونکہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

جب یہ مشرق کی طرف متوجہ ہوا تو مدینہ کا راستہ اختیار کیا، وہ پہلے جب یہاں سے گزرا تھا تو ان کے درمیان اپنا بیٹا چھوڑ گیا تھا، وہ جنگ میں مارا گیا، پھر یہ واپس آیا تو اس نے پکا ارادہ کیا کہ مدینہ کو تباہ کر دوں گا اور اس کے اہل کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا، جب اس کے آنے کی خبر سنی تو مقابلہ کے لیے انصار کا قبیلہ جمع ہو گیا اور اس سے لڑائی کے لیے مدینہ سے نکل آئے، انصار سارا دن اس سے لڑائی کرتے اور رات کو اس کی مہمان نوازی کرتے، اس کو یہ بات بڑی عجیب لگی اور یہ کہنے لگا بیشک یہ لوگ بڑے معزز ہیں۔

اسی اثناء میں اس کے پاس دو عالم آئے، ان کا نام کعب اور اسد تھا، یہ دونوں بنو قریظہ کے علماء میں سے تھے اور دونوں چچازاد بھائی تھے، جب ان دونوں نے سنا کہ یہ مدینہ اور اس کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو دونوں نے اس کو کہا اے بادشاہ! ایسا نہ کر کیونکہ اگر تو نے اپنے ارادہ سے باز آنے سے انکار کیا تو تیرے اور مدینہ کے درمیان رکاوٹ ہو جائے گی اور تجھ پر جلد عذاب آنے سے ہم بے خوف نہیں ہیں کیونکہ اس مدینہ کی طرف ایک عظیم الشان ہجرت کرنے والے ہیں جو قریش کے خاندان سے ہوں گے، ان کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جن کی جائے پیدائش مکہ ہو گا اور مدینہ ان کا دارالہجرت ہے اور جس جگہ تو ہے یہاں ان کے ساتھیوں اور اپنے دشمنوں کے قتل اور زخم کا بڑا

معرکہ ہو گا۔

تبع نے پوچھا، ان سے کون قتال کرے گا حالانکہ وہ تو نبی ہوں گے ؟ تو وہ دونوں کہنے لگے ان کی قوم یہاں آئے گی اور یہاں لڑائی کرے گی تو ان دونوں کی بات سن کر تبع مدینہ کے بارے میں اپنے ارادہ سے باز آ گیا۔

پھر ان دونوں نے اس کو اپنے دین کی دعوت دی تو اس نے یہ دعوت قبول کر لی اور ان کے دین کا پیروکار ہو گیا اور ان کا اکرام کیا اور مدینہ سے چلا گیا اور ان دونوں عالموں اور یہود کے چند لوگوں کو ساتھ لے کر یمن کی طرف چل پڑا، پس راستہ میں ہذیل کے چند لوگ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے ہم تیری رہنمائی ایک گھر کی طرف کرتے ہیں جس میں موتی، زمرد اور چاندی کے خزانے ہیں۔

تبع نے پوچھا کون سا گھر ؟ وہ کہنے لگے مکہ میں ایک گھر ہے، ہذیل اس کو ہلاک کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی طرف جو شخص برا ارادہ کرے وہ ہلاک ہو جاتا ہے تو تبع نے یہ بات ان علماء کو ذکر کی تو انہوں نے کہا ہم زمین میں اس گھر کے علاوہ اللہ کا کوئی گھر نہیں جانتے، پس تو اس کو مسجد بنا اور وہاں سے چل اور قربانی کر اور سر منڈوا اور یہ قوم تیری ہلاکت چاہتی ہے، اس لیے جب بھی کسی نے اس کا ارادہ کیا ہے وہ ہلاک ہو گیا ہے، پس تو اس کا اعزاز کر اور اس کے پاس وہی کر جو اس کے اہل کرتے ہیں۔

جب انہوں نے یہ بات کہی تو تبع نے ہذیل کے ان لوگوں کو پکڑوایا اور ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے اور آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں، پھر ان کو سولی پر چڑھا دیا، پھر جب وہ مکہ آیا تو بطائح گھاٹی میں اترا اور بیت اللہ کو کپڑے چڑھائے، یہ پہلا شخص ہے جس نے بیت اللہ پر کپڑا چڑھایا اور گھاٹی میں چھ ہزار بدنہ (اونٹ) ذبح کیے اور چند دن وہاں قیام کیا، طواف کیا اور سر منڈوا کر چلا گیا۔

پھر جب یمن کے قریب ہوا تو اس کی قوم حمیر رکاوٹ بن گئی، وہ کہنے لگے تو ہمارے شہر میں داخل نہ ہو کیوں کہ تو نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے تو تبع نے ان کو اپنے دین کی دعوت دی اور کہا کہ إِنَّهُ دِينٌ خَيْرٌ مِنْ دِينِكُمْ، یہ تمہارے دین سے بہتر ہے۔

تو وہ کہنے لگے کہ ہمارا فیصلہ آگ کی طرف ہے اور یمن میں پہاڑ کے نیچے آگ تھی، لوگ اپنے اختلافی معاملات میں اس سے فیصلہ کراتے تھے، وہ ظالم کو کھاجاتی تھی اور مظلوم کو کچھ نقصان نہ دیتی تھی، تبع نے کہا تم نے انصاف کیا۔

پس تبع کی قوم اپنے بتوں اور ان چیزوں کو لے کر نکلی جن کے ذریعے وہ اپنے دین کا قرب حاصل کرتے تھے اور وہ دونوں عالم اپنے صحیفے اپنی گردن میں ڈال کر نکلے یہاں تک کہ وہ وہاں بیٹھ گئے جہاں سے آگ نکلتی ہے۔

پس آگ نکلی اور ان کو ڈھانپ لیا اور بتوں اور جن کے ساتھ وہ قرب حاصل کرتے تھے ان کو کھاگئی اور حمیر کے جن لوگوں نے ان کو اٹھایا ہوا تھا ان کو بھی اور وہ دونوں عالم اپنے مصاحف کے ساتھ تورات پڑھتے ہوئے نکلے، ان کی پیشانیوں سے پسینہ بہہ رہا تھا لیکن آگ نے ان کو نقصان نہ پہنچایا تھا اور آگ جہاں سے آئی تھی وہاں چلی گئی، اس وقت حمیر ان دونوں کے دین پر آگئے، پس اس وجہ سے یہودیت کی اصل یمن میں ہے۔

ابو حاتم نے رقاشی سے ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابو کرب اسعد الحمیری تبابعہ میں سے ہے، وہ نبی کریم محمد ﷺ کی بعث سے سات (۷۰۰) سو سال پہلے آپ علیہ السلام پر ایمان لایا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ تم تبع کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ نیک آدمی تھا، سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وہی شخص ہے جس نے بیت اللہ کو کپڑا پہنایا اور ذکر کیا گیا ہے کہ کعب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم تبع کی مذمت کی ہے لیکن اس کی مذمت نہیں کی۔ (تفسیر بغوی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ تبع نبی تھا یا غیر نبی۔ (بغوی)

قرآن نے قریش کے مذکورہ بالا مطالبہ کے جواب میں ان سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ بتائیں کہ مادی شان و شوکت اور ذہنی و عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ برتر ہیں یا تبابعہ برتر تھے؟ اگر وہ برتر تھے اور اس برتری کے باوجود خدا نے ان کو تباہ کر دیا، نہ ان کی مادی قوت و وصولت ہی خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکی نہ ان کی ذہانت ہی ان کے کچھ کام آئی تو آخر یہ کس بل بوتے پر اس غرے میں مبتلا ہیں کہ کوئی

ان کو ہلا نہیں سکتا؟

جب خدا نے ان سے زیادہ زور آوروں کی گردن توڑ دی تو ان کی گردن کیوں نہیں توڑ سکتا؟ یہی حال ان سے پہلے کی دوسری قوموں کا بھی ہوا، عاد و ثمود وغیرہ اور بعض دوسری قومیں ہر اعتبار سے ان سے برتر تھیں لیکن جب انہوں نے خدا سے سرکشی کی تو خدا نے ان کا نام و نشان مٹا دیا تو آخر ان کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ بہ خدا کے چہیتے بنے رہیں گے اگرچہ سرکشی میں ان سے بھی چار قدم آگے نکل جائیں؟

خدا کی میزان میں وزن قوموں کے اخلاق و کردار کا ہے، ان کی مادی دولت و ثروت اور ان کی شاندار عمارتوں کا نہیں ہے اور نہ ان کے میزائلوں پر ایٹم بموں کا ہے، جب قوموں کا کردار فاسد ہو جاتا ہے تو ان کے انہی بموں کو، جو وہ دوسروں کو تباہ کرنے کے لئے بناتی ہیں خود ان کے سروں پر دے مارتا ہے اور وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اسلحہ سے خودکشی پر مجبور ہوتی ہیں۔ (تدبر قرآن)

آسمان و زمین کی پیدائش، قیامت کا دن

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ {۳۸} مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ {۳۹} اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ {۴۰} يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ {۴۱} اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ {۴۲} الدخان

جواب ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طور پر پیدا نہیں کیا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں، ہم نے ان کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ، اور لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے، بلاشبہ فیصلہ کا دن ان سب کا وقت مقرر ہے۔ جس دن کوئی تعلق رکھنے والا کسی تعلق رکھنے والے کو کچھ بھی نفع نہ دے سکے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ مگر جس پر اللہ رحم فرمائے بیشک وہ عزیز ہے رحیم ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ: ہم نے اس کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کہ فضول وعبث نہیں پیدا کیا۔

مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ: ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان مخلوق ہے کو عدل اور واضح حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، تاکہ نیکوکار کو اس کی نیکی کا بدلہ ملے اور بدکار کو اس کی برائی کا بدلہ ملے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے اور بعث و جزا کا انکار کرتے ہیں، مفسرین رحمہم اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو پیدا کیا اور پھر ان کی معیشت کے اسباب پیدا کیے، یعنی بلند آسمان اور سطح زمین اور ان دونوں کے درمیان جو مخلوق پائی جاتی ہے، پھر انہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا مکلف بنایا چنانچہ بعض تو ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا، لہٰذا دار جزا کا ہونا ضروری ہوا، جس میں نیکوکار کو اس کی نیکی کا ثواب ملے اور بدکار کو اس کی برائی کی سزا اور اس لیے تاکہ ہر انسان کو اس کے کیے کا بدلہ ملے، اگر بعث بعد الموت اور جزا کا تصور ہی نہ ہوتا تو پھر اس مخلوق کو پیدا کرنا عبث و فضول کام ہوتا جب کہ اللہ تعالیٰ فضول سے پاک و منزہ ہے۔ اسی لیے بعد میں فرمایا:

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ: یعنی قیامت کی ساری مخلوقات کے حساب کا دن مقرر ہے، قیامت کو "یوم الفصل" کہا جاتا ہے چونکہ اس دن اللہ مخلوق کے درمیان فیصلہ کرے گا جیسا کہ سورۃ ممتحنہ میں فرمایا: يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ یعنی اس خوفناک دن میں کوئی قریبی رشتہ دار کسی اپنے کا دفاع نہیں کر سکے گا، کوئی دوست اپنے دوست کے کام نہیں آئے گا اور کوئی کسی کو نفع نہیں پہنچائے گا اور نہ کوئی کسی کی مدد کرے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا: (سورۃ لقمان۔ ۳۳) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی والد اپنی اولاد کو نفع نہیں پہنچائے گا اور نہ اولاد اپنے والد کو نفع پہنچائے گی۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ: وہ دن ایسا ہے کہ کوئی چچازاد اپنے چچازاد

سے کوئی دوست اپنے دوست سے اللہ کی طرف سے اترنے والی سزا میں سے ذرا بھر سزا کو بھی دور نہ کر سکے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے کہ جس کو وہ سزا مل رہی ہے اس کو وہ سزا سے بچا لیں جیسا کہ دنیا میں کیا کرتے تھے، حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کو تفسیر میں نقل کیا گیا کہ ابن آدم کے اسباب منقطع ہو جائیں گے اور لوگ اپنے اعمال کی طرف لوٹیں گے جس کسی نے اس دن بھلائی کو پالیا تو وہ اس کے ذریعہ سے آخر تک کیلئے سعادت مند ہو گیا اور جس نے برائی کو پایا وہ اس کے ذریعہ آخر تک کے لئے بد بخت ہو گیا۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ: استثنا متصل ہے یعنی کوئی قریبی رشتہ دار اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا، ہاں البتہ مؤمنین کو ایک دوسرے کی سفارش کی اجازت دی جائے گی۔ (البحر المحیط ۳۹:۸)

ایک دوسری تفسیر کے مطابق یہ استثنا منقطع ہے یعنی لیکن جس پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کرے وہ سفارش کر سکتا ہے اور دوسرے کو نفع پہنچا سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مراد مؤمن ہے چنانچہ انبیا علیہم السلام اور فرشتے اس کی سفارش کریں گے۔ (التفسیر الکبیر ۲۵۱:۲۷)

اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ: یعنی اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے والا ہے اور اپنے دوستوں پر رحم کرنے والا ہے۔

شجرہ زقوم

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر بیان کیجیے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ﴿۴۴﴾ كَالۡمُهۡلِ ۚ يَغۡلِىۡ فِى الۡبُطُوۡنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلۡىِ الۡحَمِيۡمِ ﴿۴۶﴾ الدخان.

جواب ترجمہ: یقین جانو کہ زقوم کا درخت، گنہگار کا کھانا ہو گا۔ تیل کی تلچھٹ جیسا۔ وہ لوگوں کے پیٹ میں اس طرح جوش مارے گا۔ جیسے کھولتا ہوا پانی۔

خلاصہ تفسیر: قیامت پر دلائل ذکر کرنے کے بعد اس خوفناک دن کے کچھ اوصاف ذکر کیے جارہے ہیں، چنانچہ پہلے کفار کے لیے وعید ذکر فرمائی پھر نیکوکاروں کا وعدہ ذکر کیا تاکہ ترغیب و ترہیب

جمع ہو جائے، کھانا انسانی جسم کے لیے بطور خوراک بہت ضروری ہے، دنیا میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، آخرت میں بھی دیے اور کھلائے جانے والے کھانوں کا ذکر ہے، جہنم میں کفار کا کھانا زقوم ہو گا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ: حقیقت میں یہ خبیث درخت یعنی زقوم کا درخت جو دوزخ کی تہہ میں پیدا ہوتا ہے ہر ہر فاسق و فاجر کا کھانا ہو گا، اس کے لیے کوئی اور کھانا نہیں ہو گا۔ ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: الاثیم صفت مبالغہ ہے، گناہگار کو اثیم کہا جاتا ہے اور اس کی تفسیر مشرک سے کی گئی ہے۔

شجرہ زقوم دوزخ میں اہل جہنم کو کھلایا جائے گا، یہ خبیث ترین درخت ہے، بہت ہی کڑوا ہوتا ہے، اس کا پھل بہت زیادہ گناہگاروں، بہت بڑے گناہ کرنے والوں اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں کو کھلایا جائے گا، زقوم درخت کا پھل مشرکین کے پیٹوں میں اس طرح کھولے گا جس طرح پگھلتی چیزیں پگھلتی ہیں، جس طرح آگ پر رکھا ہوا پانی جب بہت زیادہ گرم ہو جاتا تو ابلنے لگتا ہے اس طرح یہ ابلے گا۔

کسی ادنیٰ مشابہت کی وجہ سے اس کو زقوم (سیہنڈ) کہا گیا ہے ورنہ دوزخ کے سیہنڈ کی کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہے جیسے بعض نعمائے جنت اور نعمائے دنیاوی میں اشتراک اسمی ہے، اسی طرح جہنم کے متعلق سمجھ لو۔ (تفسیر عثمانی)

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "یہاں اتنی بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفار کو زقوم دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھلایا جائے گا کیونکہ یہاں زقوم کھلانے کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ "اسے کھینچ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لے جاؤ۔" اس کے علاوہ سورۃ واقعہ کی آیت **هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ** سے بھی بعض حضرات نے یہی سمجھا ہے کیونکہ "نزل" ان کے نزدیک اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے، بعد کے کھانے کو "ضیافۃ" یا "مأدبۃ" کہتے ہیں۔

یوں قرآنی الفاظ میں احتمال اس کا بھی ہے کہ زقوم کا کھلانا دخول جہنم کے بعد ہو، اس صورت میں

" نزل "کا استعمال دعوت کے اصل کھانے کے معنیٰ میں توسعًا ہو گا اور آیت زیر تفسیر میں جو اس کے بعد جہنم کی طرف گھسیٹ لے جانے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ تھا تو پہلے بھی جہنم ہی میں، لیکن زقوم کھلانے کے بعد اسے مزید تذلیل اور ایذا رسانی کے لئے دوزخ کے وسط میں لیجایا جائے گا۔ واللہ اعلم (ملخص)

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: زقوم کا درخت اللہ تعالیٰ نے جہنم میں پیدا کر رکھا ہے اور اسے شجرہ معلونہ کا نام دیا ہے، جب دوزخی بھوکے ہوں گے بے چین ہو کر اسی درخت کو نوچیں گے، یہ ان کے پیٹوں میں ایسے کھولے گا جیسے گرم پانی کھولتا ہے، پیٹ میں اس درخت کے بننے والے مواد کو اللہ تعالیٰ نے تانبے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پگھلا ہوا ہو۔

طَعَامُ الْاَثِيْمِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شجرۂ زقوم کو طَعَامُ الْأَثِيمِ قرار دیا ہے۔ الأَثِيمُ کا لفظ إِثْمٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی گناہ کے ہیں، اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہوں میں ڈوبا ہوا، نافرمان، فاجر اور حق کا منکر ہو، چنانچہ جمہور مفسرین نے اس کی تفسیر كَثِيرُ الإِثمِ یعنی بہت زیادہ گناہ کرنے والے شخص سے کی ہے، مطلب یہ ہے کہ شجرۂ زقوم جہنم میں ایسے مجرموں اور سرکش لوگوں کی غذا ہو گی جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، کفر اور ظلم کا راستہ اختیار کیا۔

بعض مفسرین نے آیت کے نزولی پس منظر کے اعتبار سے ابو جہل یا ولید بن مغیرہ جیسے کفارِ مکہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سب سے بڑے مخالف اور تکبر و سرکشی میں پیش پیش تھے، لیکن آیت کا حکم کسی ایک شخص کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس کافر اور بدکار انسان کو شامل ہے جو حق کو جھٹلاتا اور گناہوں پر اصرار کرتا ہے۔

یہ "طعام" دراصل جہنم کے خوفناک درخت شجرۂ زقوم کا پھل ہے، دنیا میں کھانا انسان کے لیے راحت، قوت اور زندگی کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن جہنم میں یہی کھانا عذاب اور تکلیف کا سبب ہو گا، قرآنِ کریم نے آگے اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ: كَالْمُهْلِ: پگھلا ہوا تانبا۔ یہ درخت اپنی شناعت و قباحت میں ایسا ہے

کہ جب انسان اسے کھائے گا تو وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو گا جس کی حرارت انتہا کو پہنچی ہو گی اور وہ انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ المھل تیل کی کالی تلچھٹ کو بھی کہا جاتا ہے۔

كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ: جیسے سخت گرم اُبلا ہوا پانی۔ عربی زبان میں جو پانی بہت زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے جوش مار رہا ہو اسے حمیم کہا جاتا ہے۔

کافروں اور گناہ گاروں کی رسوائی کا منظر

سوال ان آیات کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں سَوَآءِ الْجَحِيْمِ سے کیا مراد ہے؟

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ {۴۷} ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ {۴۸} ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ {۴۹} اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ {۵۰} الدخان

جواب ترجمہ: (فرشتوں سے کہا جائے گا) اس کو پکڑو، اور گھسیٹ کر دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ۔ پھر اس کے سر پر گرم پانی کے عذاب سے ڈال دو، تو چکھ لے بیشک تو تو معزز مکرم ہے۔ بیشک یہ ہی عذاب ہے جس کے بارے میں تم شک کیا کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر: علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوزخ کے زبانیہ فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس گناہ گار کو پکڑو، اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچو اور اسے ہانکو، عتل سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا گریبان پکڑے اور اسے اپنی طرف کھینچے تاکہ تو اسے قید خانہ یا کسی اور امتحان کی طرف لے جائے۔ جب تو اسے سختی کے ساتھ کھینچے تو رجل معتل ہے۔ شاعر نے گھوڑے کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

عَتَلْتُ الرَّجُلَ أَعْتِلُهُ وَأَعْتُلُهُ عَتْلًا إِذَا جَذَبْتُهُ جَذْبًا عَنِيفًا ہم اس گھوڑے کی لگام کھینچ کر روک لیتے ہیں ہم اسے گھسیٹتے ہیں۔

اس میں دو لغتیں ہیں، عَتَلَهُ وَعَتَنَهُ، یہ ابن سکیت رحمہ اللہ نے کہا: کوفیوں اور ابو عمرو نے کہا: یعنی تاء کے نیچے کسرہ پڑھا اور باقی قراء نے اسے ضمہ دیا ہے۔ یعنی جحیم کے وسط میں مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: مالک فرشتہ جو جہنم کا خازن ہے وہ ابو جہل کے سر پر لوہے کا ہنٹر مارے گا تو ابو جہل کا سر دماغ والی جگہ سے پھٹ جائے گا تو اس کا دماغ اس کے جسم پر بہہ جائے گا، پھر مالک فرشتہ اس میں کھولتا ہوا پانی

انڈیلے گا جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہو گی تو وہ پانی اس کے پیٹ میں جا پہنچے گا تو فرشتہ کہے گا: عذاب کا مزا چکھو۔ (قرطبی) سَوَآءِ الْجَحِيْمِ کا مطلب ہے جہنم کے بیچ میں، درمیان میں، جلالین میں سَوَآءِ الْجَحِيْمِ کا معنیٰ آگ کے درمیان میں کیا گیا ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے سَوَآءِ الْجَحِيْمِ کا معنیٰ دوزخ کے بیچ میں کیا ہے۔

ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ: پھر اس فاجر و فاسق کے سر کے اوپر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب انڈیل دو۔

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ: استہزا اور اہانت کے طور پر اس سے کہا جائے گا: یہ عذاب چکھ تو بڑا معزز اور مکرم بنا کرتا تھا، عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابو جہل سے ملاقات ہوئی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھے کہوں: اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى: یعنی تیرے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ (سورۃ القیامۃ۔ ۳۴) ابو جہل نے کہا: تم مجھے کس چیز سے دھمکاتے ہو! اللہ کی قسم! تو اور تیرا رب مجھے کچھ بھی نہیں کر سکتے، میں تو وہ شخص ہوں جس نے وادی بطحا کو عزت دی اور اپنی قوم کا سر عزت سے بلند کیا، اللہ تعالیٰ نے اس ملعون کو جنگ بدر میں ذلیل و رسوا کر کے قتل کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (البحر المحیط ۸:۳۹، صفوۃ التفاسیر)

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ: یہ وہی عذاب ہے جس کے بارے میں تم دنیا میں شک کرتے تھے، آج اس کا مزہ چکھو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (سورۃ الطور۔ ۱۵) کیا یہ جادو ہے یا تم اسے دیکھ نہیں پا رہے۔

اہل تقویٰ کے لیے جائے امن، باغات و چشمہ ہائے جاریہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ {۵۱} فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ {۵۲} الدخان

جواب ترجمہ: بلاشبہ متقی لوگ امن والی جگہ میں ہوں گے، باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر: قرآنی اسلوب کو دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے محبین قرآن کریم جانتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی مخلوق میں سے دوزخ میں جانے والوں، وہاں کے عذاب میں رسوا کیے جانے والوں، دوزخ میں عذاب الیم میں ڈالے جانے والوں، عذاب مھین، عذاب مقیم میں لوٹ پوٹ ہونے والوں کا ذکر فرماتے ہیں تو ساتھ ہی اپنے ایمان والے نیکوکار بندوں کے بارے میں بھی بہت ہی احسن پیرائے میں ایسا ذکر کرتے ہیں کہ اہل ایمان عش عش کر اٹھتے ہیں، جیسے یہاں فرمایا کہ

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ: جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ اس کے اوامر کا امتثال کرتے ہیں اور نواہی سے اجتناب کرتے ہیں وہ آج ایسی جگہ ہوں گے جہاں آفات، مشقات اور ناگواریوں سے بے خوف مقیم ہوں گے اس سے مراد جنت ہے، متقین سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں کفر اور معاصی سے بچتے رہے ہوں گے۔ مقام کا معنیٰ ٹھہرنے کی جگہ، یہ جنتی محلات ہوں گے، امین اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کے رہنے والے کو ہر لحاظ سے امن حاصل ہو، آفات وبلاؤں سے محفوظ ہو اور اسے یہ کھٹکا اور ڈر نہ لگا رہے کہ مجھے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا، یا مجھے یہاں سے جانا پڑے گا، کوئی بھی جائے سکونت دو شرطوں سے خوشگوار اور بہترین ہوتی ہے، ایک شرط یہ کہ ہر طرح کے خوف سے یہاں امن وشانتی حاصل ہو، دوسری شرط یہ کہ یہاں ہمہ قسم لطف اندوزی کا سازوسامان موجود ہو۔ ان لوگوں کی سعادت اور خوش نصیبی یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ

فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ: بارونق بہشتوں میں ہوں گے اور ان کے آس پاس چشمے بہہ رہے ہوں گے، جن باغات میں ان مہمانان خدا کو ٹھہرایا جائے گا یہ سرسبز وشاداب ہوں گے، اس کے ساتھ ساتھ میٹھے اور شیریں پانی کے چشمہ ہائے صافیہ ان میں رواں دواں ہوں گے، باغات اور پانی کی فراوانی دو ایسی چیزیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہاں ماکولات اور مشروبات مختلف الاقسام میسر ہوں گے، جو ان جنتی مہمانوں کو کھلائے اور پلائے جائیں گے۔

سندس اور استبرق کیا ہے؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ سندس اور استبرق کا کیا معنیٰ ہے؟

يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ {۵۳} الدخان.

جواب ترجمہ: وہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے سندس اور استبرق کا لباس پہنے ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر: یہ دونوں ریشمی کپڑوں کی دو قسمیں ہیں، سندس دیباج سے باریک ہوتا ہے جب کہ استبرق موٹے ریشم کو کہا جاتا ہے، یہ تو دنیا میں سندس، استبرق اور دیباج کی تعریف ہو گئی لیکن جنت میں سندس، دیباج اور استبرق کس طرح کا ہو گا وہ کسی آنکھ نے دیکھا تک نہیں ہے، کسی کان نے اس کا تذکرہ تک نہیں سنا اور کسی دل پر اس کی خوبصورتی اور ملائمت کا خیال تک نہیں گزرا ہے۔

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں کہ سندس، اور استبرق ریشمی کپڑوں کے نام ہیں، بعض لوگوں نے ان کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے، لیکن یہ ذکر جنت کے سندس اور استبرق کا ہے اس وجہ سے یہ بحث غیر ضروری ہے۔ ان کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، تقابل کے معنیٰ یہاں آمنے سامنے بیٹھنے کے ہیں، تالیف کلام کے پہلو سے یہاں فعل یَجْلِسُونَ یا یَتَّکِئُونَ محذوف ماننا پڑے گا، یعنی وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی دلیل ہے چونکہ انہوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو نیک مشورے دیئے اور اس کا نہایت مبارک انجام ان کے سامنے ہو گا اس وجہ سے وہ پوری خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کے بیٹھیں گے۔ اس کے برعکس کفار اور ان کے لیڈر اس دن ایک دوسرے پر لعنت کے ڈونگرے برسائیں گے۔ (تدبر قرآن) ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کعب رحمہ اللہ کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا آج دنیا میں کوئی پہنے تو اس کو دیکھنے والے بیہوش ہو جائیں، ان کی آنکھوں کو برداشت نہ ہو سکے۔ عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جنتی آدمی جنت کے اندر جو لباس پہنے گا، وہ لباس فوراً ستر رنگ بدلے گا۔ (تفسیر مظہری)

حور العین کے حسن و جمال کا منظر

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز حور عین کی تعریف کیجیے۔

كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ {۵۴} الدخان

جواب ترجمہ: ان کے ساتھ یہی معاملہ ہو گا اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کا ان سے بیاہ

کر دیں گے۔

خلاصہ تفسیر: حُوْرٌ، حَوْرَاءُ کی جمع ہے، یعنی صاف گوری عورتیں جن کے رنگ کی صفائی اور گورے پن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ عِیْنٌ، عَیْنَاءُ کی جمع ہے، فراخ چشم عورتیں۔ طبرانی نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حور عین کو زعفران سے بنایا گیا ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موقوف حدیث بھی اسی طرح نقل کی ہے اور مجاہد سے بھی یہ روایت آئی ہے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے حوروں کو مٹی سے نہیں بنایا، بلکہ اللہ کا تخلیقی قوام مشک، کافور اور زعفران کا ہے۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَو أَنَّ حُورَاءَ بَزَقَت فِي بَحرٍ لُجِّي لَعَذُبَ ذَلِكَ الْبَحْرُ مِن عُذُوبَةِ رِيقِهَا اگر حور سمندر میں تھوک دے تو اس کے تھوک کی شیرینی سے سمندر میٹھا ہو جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لَو أَنَّ حُورَاءَ أَخرَجَت كَفَّهَا بَينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَافتَتَنَ الْخَلَائِقُ بِحُسنِهَا وَلَو أَخرَجَت نَصِيفَهَا لَكَانَتِ الشَّمْسُ عِندَ حُسنِهِ مِثلَ الفَتِيلَةِ فِي الشَّمْسِ لَا ضَوءَ لَهَا وَلَو أَخرَجَت وَجهَهَا لَأَضَاءَ حُسنُهَا مَا بَينَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (ابن ابی الدنیا، در منثور)

اگر حور اپنی ہتھیلی زمین و آسمان کے درمیان بر آمد کر دے تو اس کے حسن کی وجہ سے دنیا دیوانی ہو جائے اور اگر حور اپنی اوڑھنی نکال دے تو سورج اس کے سامنے ایسا معلوم ہو جیسے سورج کے سامنے ایک بے نور بتی اور اگر حور اپنا چہرہ نمودار کر دے تو اس کے حسن سے زمین و آسمان کے درمیان کی ساری فضا چمک جائے۔

ہناد رحمہ اللہ نے حبان بن احیلہ رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ دنیا والی عورتیں جب جنت میں جائیں گی تو (حسن میں) حور عین سے بڑھ کر ہوں گی۔ جہاں حور کی پیدائش مشک وزعفران سے ارشاد فرمائی

گئی ہے وہاں اس کے حسن وجمال کو مزید چار چاند لگانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حورالعین کو فرشتوں کی تسبیح سے پیدا فرمایا ہے۔ حُورُ الْعِين خَلَقَهُنَّ مِن تَسْبِيحِ الْمَلَائِكَةِ حورالعین جنت کے دروازے پر اپنے جنتی خاوند کا استقبال کرے گی اور اس سے کہے گی کہ آپ نے ہمیں بہت انتظار کروایا، پھر وہ بہت ہی خوبصورت آواز میں اس سے مخاطب ہو کر کہے گی کہ طَالَ مَا انتَظَرنَاكُم فَنَحنُ الرَّاضِيَاتِ فَلَا نَسخَطُ وَالمُقِيمَاتُ فَلَا نَظعَنَ وَالخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوتُ ہم نے آپ کی لمبی انتظار کی، پس ہم خوش ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی، ہم ہمیشہ رہیں گی کبھی کوچ نہیں کریں گی، ہم ہمیشہ رہیں گی کبھی مریں گی نہیں۔ (حادی الارواح للجوزی)

ہمہ قسم میوہ جات

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِينَ {۵۵} الدخان

جواب ترجمہ: وہ لوگ اس میں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگائیں گے۔

خلاصہ تفسیر: جنتی جنت میں خدام سے پھلوں کی تمام انواع سامنے پیش کرنے کا مطالبہ کریں گے، جنت میں بد ہضمی اور بیماریوں کا خوف نہیں ہو گا، نہ تھکاوٹ ہو گی اور نہ ہی کسی قسم کی دقت۔ علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ متقی لوگ جنت میں اپنے من پسند پھیل منگوائیں گے اور وہ پھل بھی منقطع نہ ہوں گے، وہ نہ ختم ہوں گے اور نہ فنا اور اس کے ایذاء اور دکھ سے محفوظ ہوں گے، یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے، دنیا کے پھلوں کی طرح نہ ہوں گے کہ آخرت میں جن کے استعمال سے ایذاء کا خدشہ یا ختم ہونے یا اوقات سے مخصوص ہونے کا سلسلہ ہو، قتادہ آمنین کی تفسیر موت اور شیطانی اثرات سے مامون ہونا، کرتے ہیں۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

جنتیوں کی طبیعت جو پسند کرے گی، جو من کرے گا وہ جنتی میوہ جات منگوائیں گے، اس میں زمان ومکان کی کوئی تخصیص اور قید نہیں ہو گی، بے موسمے پھل بھی چاہت کے مطابق منگوا سکتے ہیں۔

موت کا ذائقہ ایک بار چکھنا ہے

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ {٥٦} الْجَحِيْمِ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {٥٧} الدخان

جواب ترجمہ: جو موت ان کو پہلی آچکی تھی، اس کے علاوہ وہاں وہ کسی اور موت کا مزہ نہیں چکھیں گے، اور اللہ انہیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ یہ سب تمہارے پروردگار کی طرف سے فضل ہو گا۔ (انسان کے لیے) زبردست کامیابی یہی ہے۔

خلاصہ تفسیر: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ متقی لوگ جنت میں پہلی موت کے بعد دوبارہ موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے، جو موت ایک بار آئی سو آئی، جس کا ذائقہ انہوں نے دنیا میں چکھ لیا تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان متقی لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے بچائے گا۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استثنا منقطع ہے یعنی اہل جنت جنت میں موت کا مزہ نہیں چکھیں گے لیکن انہوں نے دنیا میں پہلی موت کا مزہ چکھ لیا، اب جنت میں موت کی دہرائی نہیں ہو گی بلکہ ہمیشہ ہمیشہ عیش و آرام سے مقیم رہنا ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے شدید عذاب سے نجات اور خلاصی دے دی ہے۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ: اللہ تعالیٰ نے ایسا محض اپنے فضل و کرم سے کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اہل تقویٰ کو ملے گا، دوزخ سے خلاصی اور جنت کے ذریعے کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی، یہ سب کچھ انہیں فضل خداوندی سے ملے گا، یہ اس کا فضل ہے جب وہ اپنا فضل کرنے پہ آتا ہے تو ایسا کر دکھاتا ہے جو انسانی فکر و سوچ سے بہت ہی دور ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ نعمتیں جو انہیں دی گئی ہیں یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اس کے بعد کوئی اور کامیابی رہتی ہی نہیں، جنت مل گئی، جنات کی بیش بہا نعمتوں سے لطف اندوزی نصیب ہو گئی، اس سے بڑھ کر اور انسان کو کیا چاہیے۔ یہ سب فضل خداوندی اور بڑی کامرانی ہے۔

قرآن کریم آسان یا مشکل؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ{۵۸} الدخان

جواب ترجمہ: سو بات یہی ہے کہ ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

خلاصہ تفسیر: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے میرے حبیب ﷺ جس قرآن کو آپ ﷺ پر اتارا ہے اس کی قرأت آپ ﷺ کی زبان پر آسان کر دی تاکہ اس کی عبرتوں اور دلائل سے ان مشرکین کو یاد دلایا جائے اور اس کے مواعظ سے وہ نصیحت حاصل کریں اور جب آپ ﷺ ان پر اس کی تلاوت کریں تو وہ اس میں سوچ بچار کریں اور اپنے رب کی اطاعت کی طرف رجوع اختیار کریں اور حق کے بارے میں خبردار ہونے پر یقین کریں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے یسرناہ کی ضمیر سے قرآن مراد لیا ہے تاکہ لوگوں کو نصیحت حاصل ہو، ابن زید سے مروی ہے کہ یسرناہ کی ضمیر قرآن کریم کی طرف راجع ہے اور یسرناہ کا معنیٰ آپ کی زبان پر اس کو جاری کر دیا۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی ہم نے قرآن کریم آپ ﷺ پر نازل کر کے اسے آپ کی زبان پر، آپ ﷺ پر اور جو بھی اسے پڑھے اس پر آسان کر دیا ہے ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کریں اور اپنے برے اعمال سے رک جائیں۔ (الجامع لاحکام القرآن)

سوال: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ قرآن ہم نے آسان کیا ہے، حالانکہ بہت مشکل ہے، کئی کئی سال میں لوگ اسے زبانی یاد کرتے ہیں، کئی کئی سال اس کی تفسیر سمجھنے میں لگ جاتے ہیں؟

جواب: قرآن کریم ان لوگوں کے لیے آسان ہے جو اسے بار بار پڑھتے ہیں، جو اسے قانون، ضابطے اور اصول کے مطابق سیکھتے ہیں، جیسے قرآن کریم کے حفاظ ہیں، چند سال ان کے اسے یاد کرنے پر لگ جاتے ہیں مگر جب وہ پڑھتے ہیں تو پھر بلا اٹکن وہ اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں، سیکھنے والوں کے لیے آسان بلکہ آسان ترین ہے، جب کہ نہ سیکھنے والوں کے مشکل ہے۔

فتح اور نصرت کا انتظار

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ {۵۹} الدخان

جواب ترجمہ: سو آپ انتظار کیجیے، بلاشبہ وہ لوگ بھی انتظار کر رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ ان مشرکین کے خلاف جو وعدہ نصرت کا ہم نے آپ ﷺ سے کیا ہے آپ اس کا انتظار کیجیے، ان پر جو عذاب کا کوڑا برسنے والا ہے اس کا بھی انتظار کیجیے، یہ تو آپ ﷺ کی موت کے انتظار میں ہیں، انہیں پتا چل جائے گا کہ نصرت اور ظفر مندی اور دنیا و عقبیٰ میں کس کا علم و جھنڈا بلند رہے گا، کامیابی اور کامرانی کس کے قدم چومے گی، اے میرے حبیب! فتح آپ کے قدم چومے گی، آپ کے پیروکاروں کے قدم چومے گی، اہل ایمان کے قدم چومے گی۔

شیخ الاسلام تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ یہ لوگ تو جھٹلانے کے انداز میں قیامت کا انتظار کر رہے ہیں، اور آنحضرت ﷺ کو تصدیق کے ساتھ اس کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے کہ اس وقت ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی، اور ان کافروں کو سخت سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (توضیح القرآن)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے، حم، الدخان، رات کو پڑھی تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (تفسیر بغوی)

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج بفضل اللہ، بنصرۃ اللہ، وبعون اللہ سورۃ الدخان کی تفسیر مکمل ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بلا استحقاق اس کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، اور اسے میرے لیے، میرے والدین ماجدین، میرے اساتذہ، میرے محبین مخلصین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

۲، اپریل ۲۰۱۸ء بروز پیر، ڈھائی بجے رات (جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۱۹ جون ۲۰۲۶ء بروز جمعۃ المبارک، اضافات و ترمیمات جدیدہ: حال وارد سوہان اسلام آباد)

سورۃ الجاثیہ (تعارف)

سوال سورۃ الجاثیہ کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الجاثیہ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے سورۃ الدخان کے بعد اور سورۃ الاحقاف سے پہلے واقع ہے، یہ سورت ترتیب نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی ۶۵ ویں سورت ہے اور ترتیب تلاوت کے اعتبار سے ۴۵ ویں سورت ہے، اس صورت میں چار رکوعات، ۳۷ آیات، ۴۸۸ کلمات اور ۲۱۹۱ حروف ہیں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، عکرمہ رحمہ اللہ، مجاہد رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سمیت اکثر اہلِ تفسیر نے اسے مکی قرار دیا ہے، البتہ بعض علماء نے آیت قُلْ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا يَغْفِرُوا (آیت: ۱۴) کو مدنی قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے نزول کا تعلق بعض روایات کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے بیان کیا گیا ہے، تاہم مجموعی طور پر سورت کا اسلوب، مضامین اور دعوتی انداز اس کے مکی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا مشہور نام سورۃ الجاثیہ ہے، یہ نام آیت ۲۸ سے ماخوذ ہے، جہاں قیامت کے ایک نہایت ہولناک منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: وَتَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً اور آپ ہر امت کو گھٹنوں کے بل گری ہوئی دیکھیں گے۔ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو گی، حساب و کتاب کا آغاز ہو گا اور ہر شخص اپنے انجام کے انتظار میں ہو گا، تو خوف، دہشت اور ہیبت کی وجہ سے تمام امتیں عاجزی اور بے بسی کے عالم میں گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوں گی، اسی مناسبت سے اس سورت کا نام "الجاثیہ" رکھا گیا۔

اس سورت کا دوسرا نام سورۃ الشریعۃ بھی بیان کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کردہ شریعتِ کاملہ کا ذکر فرمایا ہے: ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا "پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک واضح راستے (شریعت) پر قائم کیا، لہٰذا آپ اسی کی

پیروی کیجیے۔ اس آیت میں شریعتِ محمدیہ کی عظمت، جامعیت اور سابقہ شریعتوں پر اس کی برتری کو نمایاں کیا گیا ہے، اسی لیے بعض مفسرین نے اسے ''سورۃ الشریعۃ'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔

اہم مضامین: ① توحید اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں: سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے کائنات میں پھیلی ہوئی اپنی قدرت کی بے شمار نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے، آسمانوں اور زمین کی تخلیق، انسان اور حیوانات کا وجود، دن اور رات کا بدلنا، بارش کا نزول، مردہ زمین کا زندہ ہونا اور ہواؤں کی گردش، یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور حکمت کے روشن دلائل ہیں، اہلِ ایمان اور صاحبانِ عقل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان نشانیوں میں غور و فکر کر کے اپنے خالق کو پہچانیں۔

② قرآن کریم کی حقانیت: سورت کے آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے، اس لیے اس کی تعلیمات حق ہیں اور اس کی رہنمائی انسانیت کے لیے باعثِ ہدایت ہے۔

③ منکرینِ حق کی سرکشی: سورت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ کی آیات سنتے ہیں لیکن تکبر، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں قبول نہیں کرتے، وہ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

④ عفو و درگزر کی تعلیم: مکی دور میں مسلمانوں کو ظلم و ستم کا سامنا تھا، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو صبر، برداشت اور عفو و درگزر کی تعلیم دی تاکہ وہ انتقام کے بجائے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کریں اور دعوتِ دین کے مشن کو حکمت کے ساتھ آگے بڑھائیں۔

⑤ بنی اسرائیل کا عبرت آموز تذکرہ: اس سورت میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہیں کتاب، حکمت، نبوت اور دنیاوی عزت و شرف عطا کیا گیا، لیکن بعد میں انہوں نے اختلاف، سرکشی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی اختیار کی، اس واقعہ کے ذریعے قریش اور دیگر منکرینِ حق کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ سابقہ امتوں کے انجام سے سبق حاصل کریں۔

⑥ شریعت محمدیہ کی عظمت: سورت کا ایک اہم موضوع شریعتِ اسلامیہ کی حقانیت اور برتری ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ایک کامل اور روشن شریعت عطا فرمائی اور حکم دیا کہ آپ اسی پر ثابت قدم رہیں اور اہلِ خواہشات کی پیروی نہ کریں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی اللہ کی نازل کردہ شریعت کی اتباع میں مضمر ہے۔

⑦ قیامت اور عدالت الٰہی: سورۃ الجاثیہ کا مرکزی مضمون قیامت اور آخرت کا اثبات ہے، اس میں قیامت کے مختلف مناظر نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، خصوصاً وہ منظر کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوگی، نامۂ اعمال پیش کیا جائے گا، ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی اور اللہ تعالیٰ کا کامل عدل سب کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

⑧ نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام: سورت کے اختتام پر اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے مختلف انجام کو بیان کیا گیا ہے، متقی اور فرمانبردار لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت، مغفرت اور جنت کی دائمی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے، جبکہ کفار اور مجرمین حسرت، ندامت اور دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

مرکزی پیغام: سورۃ الجاثیہ دراصل توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی عقائد کو نہایت مؤثر دلائل کے ساتھ بیان کرتی ہے، یہ سورت انسان کو کائنات کی نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے، شریعتِ الٰہی کی عظمت واضح کرتی ہے، سابقہ امتوں کے انجام سے عبرت دلاتی ہے اور قیامت کی جواب دہی کا احساس پیدا کرکے بندے کو ایمان، تقویٰ اور اطاعتِ الٰہی کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرتی ہے۔

عظمت قرآن اور قدرت والے کی کبریائی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ{۵}تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ{۶}وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ{۷}يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ{۸}الجاثیہ

جواب ترجمہ: یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری جارہی ہے جو بڑا صاحب اقتدار، بڑا صاحب حکمت ہے۔ بلاشبہ آسمانوں میں اور زمین میں نشانیاں ہیں مومنین کے لیے، اور تمہارے پیدا کرنے میں اور جو چوپائے اللہ تعالیٰ پھیلاتا ہے ان کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں، اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں اور جو رزق اللہ نے آسمان سے اتارا ہے پھر اس کے ذریعے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ فرما دیا اور ہواؤں کے پھیرنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں، یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ پر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں، سو یہ لوگ اللہ کے اور اس کی آیات کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔ بڑی خرابی ہے ہر جھوٹے کے لیے جو نافرمان ہے۔ اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جو اس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں۔ پھر وہ تکبر کرتے ہوئے اصرار کرتا ہے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں سو ایسے شخص کو آپ دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں، قرآنِ کریم کی بعض سورتوں کے آغاز میں ایسے حروف آئے ہیں جن کے حقیقی معنی اور مراد کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، البتہ ان حروف میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم انہی حروف سے مرکب ہے، جو عربوں کی زبان میں مستعمل تھے، اس کے باوجود وہ اس جیسا کلام پیش کرنے سے قاصر رہے، زبانی کلامی قرآن کریم کے خلاف پروپیگنڈے کرتے تھے، مگر قرآنی چیلنج کے جواب میں ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں۔ گویا کہ اعجاز قرآنی کی طرف ان حروف کے ذریعے اشارہ دیا گیا ہے، جو لوگ قرآن کریم کے اولین مخاطبین تھے انہیں خبردار کیا گیا کہ ان حروف کا مفہوم، ان کے اندر چھپے اسرار و رموز تم نہیں جان سکتے، باوجود یکہ تم لوگ بھی عربی زبان جانتے ہو، تم میرے نبی ﷺ پر لب کشائی کرتے ہو مگر ان کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہو۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ: یہ قرآنِ کریم اس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ

کتاب ہے جو کامل غلبے اور اقتدار کا مالک ہے، جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور جو اپنی تمام مخلوقات، فیصلوں اور تدابیر میں کامل حکمت والا ہے، لہٰذا جس کتاب کا نازل کرنے والا ایسا عظیم الشان رب ہو، اس کے حق اور سچ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ ذات اپنی بادشاہی میں غالب ہے اور وہ اپنی کاریگری اور صنعت کاری میں حکمت والی ذات ہے، یہ قرآن کریم اس کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس لیے مشرکین مکہ کا یہ زعم اور یہ خیال بالکل باطل ہے کہ قرآن کریم محمد ﷺ کو کوئی پڑھاتا ہے اور وہ کسی سے پڑھ کر ہمیں لاکر سنادیتے ہیں۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ: بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، ان کی وسعتوں اور ان میں پھیلی ہوئی بے شمار نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، وحدانیت اور حکمت کی واضح نشانیاں موجود ہیں، جس طرح آسمان وزمین میں اہل ایمان وایقان کے لیے نشانیاں ہیں اسی طرح کفار کے لیے بھی نشانیاں ہیں، البتہ ان نشانیوں سے حقیقی فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ ایمان انسان کے دل کو حق قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے، اس کی نظیر دوسرے مقام پر موجود ہے جہاں فرمایا گیا کہ یہ قرآن تقویٰ والوں کے لیے ہدایت ہے، حالانکہ اس کا پیغام ہدایت تو سبھی کے لیے ہے، چاہے تقویٰ والے ہیں یا تقویٰ والے نہیں ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ھدی للناس ہے، اس میں الناس سے تمام انسانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان تمام جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی تکوینی، انفسی اور آفاقی آیات سے خبردار کیا ہے، جب کہ آسمان وزمین کی صورت میں بیان کی گئی نشانیاں بدیعات (بغیر ماڈل ونمونہ کسی چیز کا وجود میں لانا) میں سے ہیں، اسی طرح جگمگاتے ستارے، آفتاب وماہتاب کی ضیاپاشیاں، زمین میں موجود دشت وجبل، بروبحر اور عجیب وغریب انواع واقسام کی مخلوقات ہیں۔ انفسی نشانیوں کا ذکر آگے بیان ہورہا ہے

وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ: اور تمہاری اپنی پیدائش میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی روشن نشانیاں موجود ہیں، انسان ایک حقیر قطرۂ آب سے وجود میں آتا ہے، پھر

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے کامل انسان بنتا ہے، اسی طرح زمین میں پھیلے ہوئے بے شمار جانور، پرندے اور دوسری مخلوقات بھی خالقِ کائنات کی قدرت اور وحدانیت پر گواہی دیتی ہیں، یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے زیادہ مؤثر ہیں جو یقین کی دولت سے مالا مال ہوں۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: رات اور دن کے مسلسل آنے جانے، ان کی مدت کے لمبا اور چھوٹا ہونے اور اثرات کے اختلاف میں۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: نیز آسمان سے بارش کے نزول میں، جس کے ذریعے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اور اس سے طرح طرح کی نباتات اگتی ہیں، آسمان سے رزق اترنے سے مراد بارش کا نزول ہے، جس سے کھیت لہلہا اٹھتے ہیں، انواع واقسام کے غلے، پھل اور میوہ جات پیدا ہوتے ہیں، اس میں اللہ نے اپنی قدرت اور رحمت دونوں ہی نشانیوں سے آگاہ فرمایا ہے، ایک ایک چیز میں اللہ کی قدرت کا رنگ چھلکتا اور جھلکتا ہے۔

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: اسی طرح ہواؤں کا مختلف سمتوں سے چلنا، بادلوں کو لانا اور بارش کے اسباب مہیا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کا مظہر ہے، یہی ہوائیں سمندروں میں پانی کی سطح پر چلتی کشتیوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتی ہیں، یہ تمام دلائل ان لوگوں کے لیے ہیں جو اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں اور ان نشانیوں سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور قیامت پر استدلال کرتے ہیں۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی وہ آیات ہیں جو ہم حق اور سچائی کے ساتھ آپ پر تلاوت کر رہے ہیں، جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی روشن نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے تو پھر اس کے بعد کون سی بات، کون سا کلام اور کون سی دلیل انہیں ایمان لانے پر آمادہ کر سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے بڑھ کر کوئی دلیل اور کوئی ہدایت نہیں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ: ہر اس شخص کے لیے ہلاکت، تباہی اور دردناک عذاب ہے جو بہت بڑا

جھوٹا اور سخت گناہگار ہے، وہ حقائق کو جھٹلاتا، اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا اور گناہوں میں ڈوبا رہتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں رسوائی مقدر ہے۔ اَفَّاكٍ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا، ایسا جھوٹا کہ جھوٹ بولنا اس کی عادت ثانیہ بن گئی ہو، اَثِيْمٍ گناہگار، بڑا مجرم، جرائم پیشہ شخص۔

يَسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا: یہ بدبخت شخص اللہ تعالیٰ کی آیات سنتا ہے جو اس کے سامنے پوری وضاحت اور تفصیل سے پڑھی جاتی ہیں، یہ افاک (جھوٹے) اور اثیم (گناہگار) کی دوسری صفت بیان کی گئی ہے، لیکن ان سے نصیحت حاصل کرنے کے بجائے اپنے کفر، گناہوں اور سرکشی پر ڈھٹائی اور اصرار کے ساتھ جمار ہتا ہے، تکبر اور غرور کی وجہ سے وہ حق کو قبول نہیں کرتا، گویا اس نے ان آیات کو سنا ہی نہیں، یہ شخص اہل عجم کی اباطیل اور جھوٹے قصے کہانیوں پر مشتمل مواد لا کر لوگوں کو پڑھ کر سناتا ہے، تاکہ لوگ ان میں مشغول رہیں اور قرآن کریم کی طرف توجہ نہ دے سکیں، بتایا گیا کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں اتری ہے۔

آج ہمارے زمانے میں بھی بہت سی ایسی چیزیں مشینی شکل وصورت میں تیار کی جاچکی ہیں، جن میں صرف کافر لوگ ہی مشغول نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی سر تاپا اس میں ڈوبے ہوئے ہیں، جیسے اس دور میں موبائل ہے، جو قریباہر شخص کی جیب اور ہاتھ میں موجود ہے، چوبیس گھنٹے کی زندگی میں مسلمانوں کا زیادہ وقت اس موبائل کی سکرین پر گزرتا ہے، مدرسوں کے بچے قرآن اور دینی تعلیم کو یکسوئی سے حاصل نہیں کرپارہے، ان کی نگاہیں اسی مشین پر مرکوز ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء بھی اسی مشین کے فریب میں مبتلا ہیں، نتیجہ وقت کی بربادی ہے، نمازیں ضائع ہورہی ہیں، قرآنی تلاوت کی طرف کسی کو توجہ نہیں رہی۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: ایسے شخص کو، اے میرے حبیب ﷺ! ایک دردناک اور المناک عذاب کی خبر سنادیجیے جو آخرت میں اس کا منتظر ہے، یعنی اس کو ایسی خبر دے دو جس کا اثر اس کی ظاہری پیشانی پر نظر آئے، فَبَشِّرْهُ فَ سببیت کیلئے ہے یعنی فَ سے پہلے کا کلام بعد والے کلام کی علت ہے بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جس کو سن کر چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہو جائیں (یعنی چہرہ کھل جائے)

یہاں چہرے پر آثار غم پیدا کرنے والی خبر کو بطور استہزاء بشارت کہا ہے۔

ان آیات میں سب سے پہلے قرآنِ کریم کے الہامی ہونے کو بیان کیا گیا ہے، پھر کائنات، انسان کی تخلیق، حیوانات، بارش، ہواؤں اور نظامِ شب و روز کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت کی روشن دلیلوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد منکرینِ حق کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب وہ اتنی واضح نشانیوں اور قرآنِ کریم جیسی عظیم کتاب پر ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے لیے ہدایت کا کوئی اور راستہ باقی نہیں رہتا، آخر میں ان متکبر اور گناہگار لوگوں کے دردناک انجام کا ذکر کیا گیا ہے جو حق سننے کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

قرآن کا مزاح اڑانے والوں کے لیے ذلت آمیز عذاب

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۬ؕ {۹} الجاثیہ

جواب ترجمہ: اور جب ہماری آیتوں میں سے کوئی آیت ایسے شخص کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق بناتا ہے، ایسے لوگوں کو وہ عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔

خلاصہ تفسیر: کفار مکہ قرآن کریم کی آیات کا انکار کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ قرآنی آیات بناتے ہیں اور پھر ہمیں سناتے ہیں، کبھی کہتے کہ یہ کسی سے سیکھ کر آتے ہیں اور ہمارے سامنے پڑھتے ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر چیلنج دیا کہ اگر تم اس جیسا کلام بنا سکتے ہو تو بنا کر لاؤ، اگر پورا نہ سہی کچھ سورتیں لاؤ وہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر اس جیسی آیات لاؤ، مگر بڑے بڑے زبان دان، قادر الکلام شعرا بھی قرآنی بلاغت و فصاحت کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔

ایک طبقہ کفار میں غیر جانبدار تھا، جو بڑی توجہ اور انہماک سے قرآن کریم سنتا تھا اور پھر گواہی دیتا تھا کہ اس جیسا کلام کوئی انسان پیش نہیں کر سکتا، ان میں سے کئی لوگ ایسے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔

کفار میں ایک طبقہ ایسا تھا جو قرآنی آیات سن لیتا، انہیں محفوظ کرتا، پھر ان کا استہزا کرتا اور ان کا

مزاح اڑاتا تھا، تاکہ جو لوگ کسی نہ کسی شکل میں قرآن کریم سے متاثر ہو رہے ہیں ان کے سامنے یہ کلام ہلکا پڑ جائے اور وہ اس سے دور بھاگیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں کہ اس کے کلام کا کوئی ٹھٹھا کرے، نہیں مانتا نہ مانے مگر مزاح اور ٹھٹھا اڑانا اللہ کو پسند نہیں ہے، وہ اپنے نبیوں کا استہزا برداشت نہیں کرتا، وہ اپنے کلام کا استہزا برداشت نہیں کرتا، اسی لیے جنھوں نے اللہ کے کلام کا مزاح اڑایا ان کے لیے واضح فرمادیا بلکہ وعدہ فرمالیا کہ ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہو گا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان استہزا کرنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی قرآنی آیات کو یاد کرلیتا تو پھر اس کا مزاح اڑاتا پھرتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ذلت آمیز عذاب کا وعدہ فرمایا ہے کہ انہوں نے قرآنی آیات کو ہلکا سمجھا ہے، حالانکہ یہ ایسا عظیم الشان کلام ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی سرزمین کی طرف اس اندیشے کے پیش نظر لے جانے کی اجازت نہیں دی کہ دشمن کہیں اس کلام کی توہین نہ کر ڈالے، جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ مَخَافَةَ أَنْ يَنَالَهُ الْعَدُوُّ (مسلم) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی سرزمین کی طرف سفر کے دوران قرآن کریم لے جانے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں دشمن کی طرف سے اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اسم اشارہ ذکر فرمایا، جس کا مشارالیہ ہر وہ شخص ہے جو افترا پردازی کرتا ہے، قرآنی آیات کا استہزا کرتا ہے، ان لوگوں کو ذلت آمیز عذاب دیا جائے گا، ذلت آمیز عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جس نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہوتا ہے، آگے سے، پیچھے سے، اوپر سے اور نیچے سے، کسی صورت اور کسی جہت سے چھٹکارے کی گنجائش نہیں ہوتی، اسی ذلت کا نقشہ اگلی آیت میں کھینچا گیا ہے، جہاں وراکا لفظ استعمال فرما کر عذاب مہین کی ہمہ جہتی شکل بیان کی گئی ہے۔

ان استہزا کرنے والوں کی ایک رسوائی تو عذاب مہین کی شکل میں ہو گی، ایک رسوائی اس شکل میں ہو گی کہ دنیا میں ان کا سازوسامان ان کے کام نہیں آئے گا، دنیوی جاہ وجلال ان کے کسی کام کا نہیں ہو گا، انہوں نے جو کچھ کمایا وہ انہیں کام نہیں آئے گا، یہ بتوں کے پجاری جن خود تراشیدہ بتوں کی

پوجا پاٹ کرتے رہے وہ بھی ان کے کام نہیں آسکیں گے، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر جن لوگوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا وہ بھی ان کے کام نہیں آسکیں گے۔

عذاب مہین یعنی ذلت آمیز عذاب کے بعد پھر اللہ نے یہاں عذاب عظیم ذکر فرمایا ہے، حالانکہ ذلت آمیز عذاب سے آگے کچھ باقی رہ نہیں جاتا، مگر علیم وقدیر ذات کا اپنا علم اور اپنی حکمت بالغہ ہے، اسے معلوم ہے کہ عذاب مہین کے بعد عذاب عظیم ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے، تو عذاب مہین یہاں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں عذاب کے ساتھ اہانت کا بھی سامنا کرنا پڑھے گا، جب کہ عذاب عظیم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عذاب اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہو گا، جس میں انہیں تکلیف محسوس بھی ہو گی۔ ابو اسحاق ثعلبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ثعلبی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ آیت ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ثعلبی)

منکرین قرآن کے لیے عذاب عظیم

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ اس آیت میں مِن وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ کا کیا مطلب ہے؟

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ {۱۰} الجاثیۃ.

جواب ترجمہ: ان کے آگے جہنم ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے نہ وہ ان کے کچھ کام آئے گا اور نہ وہ کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ کے بجائے اپنا رکھوالا بنا رکھا ہے۔ اور ان کے حصے میں ایک زبردست عذاب آئے گا۔

خلاصہ تفسیر: وَارَی یُوَارِی کا معنیٰ ہوتا ہے کسی چیز کو اس طرح چھپا لینا کہ وہ پوری طرح اس کے شکنجے میں آجائے، اسی طرح قرآنی آیات کا انکار کرنے والے، قرآنی آیات کا استہزا کرنے والے دوزخ کی آگ اور عذاب کے شکنجے میں ہوں گے، آگے سے پیچھے سے عذاب ان کو ہر طرح گھیرے ہوئے ہو گا۔

یہ لوگ آگے کی سمت بڑھیں گے تو دوزخ ہو گی، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، پیچھے بھاگنا چاہیں

گے جہاں دنیا تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا ادھر بھی آگ ہی آگ، عذاب ہی عذاب دکھائی دے گا۔ منکرین قرآن، مستہزئین قرآن، مکذبین آیات، کسی طرح بچ نہیں پائیں گے، ان کو طرح طرح کے عذاب دیے جائیں گے۔

منکرین قرآن کے لیے عذاب رجز الیم

سوال اس آیت کی تفسیر اور ترجمہ کیجیے۔

هٰذَا هُدًى وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ {۱۱} الجاثية

جواب یہ (قرآن) سراپا ہدایت ہے اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا ہے، ان کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے۔

خلاصہ تفسیر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ چیز ہے جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا، رِجزٌ سے مراد عذاب ہے، یعنی ان کے لئے دردناک عذاب ہے ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (بقرہ ۵۹)

رِجزٌ سے مراد عذاب ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: رجز سے مراد ناپاک شے ہے جس طرح رجس ہوا کرتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے (ابراہیم) یعنی گندہ مشروب پینے کی صورت میں ان کے لئے عذاب ہے۔ (قرطبی)

یہ قرآن اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی ان آیات کا انکار کریں گے یا مذاق اڑائیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہو گا۔ من رجز کے الفاظ اس عذاب کی نوعیت واضح کر رہے ہیں، رجز اس سزا یا عذاب کو کہتے ہیں جو کپکپی پیدا کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی عذاب نہیں ہو گا بلکہ نہایت دردناک ہو گا، جو دلوں کو لرزا دے گا۔ (تدبر قرآن) یہاں عذاب کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں، سب پر تنوین ہے، جو شدت عذاب پر دلالت کرتی ہے۔

اس قرآن کی حقیقت بس یہ ہے کہ یہ ایک رہنمائی ہے، خالص ہدایت، صاف صاف ہدایت،

ایسی ہدایت جس میں ضلالت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اس لیے اس قسم کی آیات کا جو لوگ انکار کرتے ہیں، وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار کر دیا جائے، اَلِیمٌ کے معنٰی میں شدت الم اور ایذا رسانی کے معنٰی ظاہر ہیں، رِجزٌ کے معنٰی ہیں عذاب شدید اور جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جارہی ہے، وہ اَلِیمٌ بھی ہے اور شدید بھی، یعنی اس کی شدت اور اس کا الم دونوں مکرر و مشدد ہیں۔ تاکید بعد تاکید ہے اور جو لوگ واضح خالص اور صریح ہدایت کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے ایسا عذاب ہی ہونا چاہئے۔ (ظلال القرآن)

ایک عقل و خرد رکھنے والا انسان یہاں یہ بات ذہن نشین کر سکتا ہے کہ قرآنی آیات کا استہزا کرنے والوں کے لیے ذلت آمیز عذاب کو عذاب مہین سے تعبیر کیا گیا، جس کی ہولناکی واضح ہے۔

پھر منکرین قرآن کریم کے لیے عذاب عظیم کا اعلان کیا گیا، دنیا میں انسان غور کرے کہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ کے مقابلے میں ستر واں حصہ ہے، جو جلا کر جنگلوں کے جنگل خاکستر کر دیتی ہے، لوہے کی بھٹیوں کو گرماتی ہے، لوہے کو تپاتی ہے، موم بنا کر چھوڑتی ہے، بڑے بڑے گاڈر اور ٹی آر منٹوں سیکنڈوں میں موم کر دیتی ہے، تو گوشت پوست کے بنے یہ انسان جو تکبر کی انتہاؤں پر چلے جاتے ہیں، اپنے کو ان داتا سمجھتے ہیں، اپنے جتھوں اور گروہوں کے باعث اتراتے ہیں کہ انہیں فرش پر عرش والے کی کاریگری دکھائی نہیں دیتی، انسانی دلوں کو ہلا دینے والی آیات ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، ان کے انکار اور تکبر کے باعث انہیں عذاب عظیم سے دوچار کیا جائے گا۔

پھر ان منکرین کو عَذَابٌ مِّن رِّجزٍ اَلِیم کی اطلاع دی گئی، الیم ایسا عذاب جسے خود بھی درد و کرب محسوس ہو گا، وہ ان لوگوں کو اپنے شکنجے میں کسے گا، اس لیے ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، قرآن سے ٹکرانے اور قرآن کریم کے حاملین سے ٹکرانے والے اپنے انجام سے باخبر رہیں۔

تسخیر کائنات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ

تَشْكُرُوْنَ{۱۲}وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ{۱۳} الجاثیہ

جواب ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل سے تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو، اور جو چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر بنادیا، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ: اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے فائدے کے لیے سمندر کو مسخر کر دیا، اس کے حکم سے کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز سمندر کی موجوں کو چیرتے ہوئے سفر کرتے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک تک انسانوں اور سامانِ تجارت کو پہنچاتے ہیں، غوطہ خور غوطے لگاتے ہیں، سمندر میں موجود اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتیں تلاش کرکے نکالتے ہیں اور ان سے فائدے اٹھاتے ہیں۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اسی کے ذریعے لوگ تجارت، سفر اور دیگر جائز ذرائع سے رزق حاصل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمت اس لیے عطا فرمائی تاکہ بندے اس کی قدرت و رحمت کو پہچانیں اور اس کا شکر ادا کریں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ: اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر دیا ہے، سورج روشنی اور حرارت فراہم کرتا ہے، چاند اور ستارے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں، بارش زمین کو سیراب کرتی ہے، دریا، پہاڑ، درخت اور بے شمار مخلوقات انسانی زندگی کے لیے نفع بخش ہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مظہر ہے، نہ کہ کسی اور کی قدرت کا نتیجہ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: یقیناً ان نعمتوں اور کائنات کے اس منظم نظام میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور وحدانیت کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں، جو شخص

تدبر کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس عظیم کائنات کا خالق، مالک اور مدبر صرف ایک اللہ ہے۔

ایام اللہ سے ناامیدی والوں کو درگزر کا حکم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ {۱۴} الجاثیہ

جواب ترجمہ: آپ ایمان والوں سے فرما دیجیے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو اللہ کے ایام کی امید نہیں رکھتے تاکہ اللہ ہر قوم کو اس کی جزا دے جو کماتے ہیں۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس آیت سے مراد بطور خاص حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جب کہ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللهِ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ایام سے محروم اور مایوس ہیں مثلاً عبد اللہ بن ابی اس کا شان نزول یہ ہے کہ یہ لوگ غزوہ بنی مصطلق میں المریسیع نامی کنویں پر جا اترے عبد اللہ بن ابی نے اپنا غلام پانی لانے کے لیے بھیجا تو پانی لانے میں دیر ہو گئی، جب وہ پانی لے کر آیا تو عبد اللہ بن ابی نے اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے روک رکھا تھا؟ جو اتنی دیر لگ گئی اس نے جواب دیا کہ عمر کا غلام کنویں کے دہانے پر بیٹھ گیا اس نے تب تک کسی کو پانی نہ لینے دیا، جب تک کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشک ابو بکر کی مشک اور اس کے غلام کی مشک نہ بھر لی اس پر عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ ہماری اور ان کی مثال تو ایسی ہے جیسے کہا گیا کہ اپنے کتے کو کھلاؤ پلاؤ تاکہ وہ تمہی کاٹ کھائے یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی وہ تلوار سونت کر عبد اللہ کی طرف چل پڑے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

② عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت، {مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا} نازل ہوئی تو مدینے کے فنحاص نامی ایک یہود نے کہا کہ نعوذ باللہ محمد کا رب محتاج ہو گیا، راوی نے کہا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو انہوں نے تلوار لے لی اور اس یہودی کی تلاش میں نکلے تو جبریل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتا ہے کہ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا

لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ یعنی ایماندار لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو ایام اللہ سے مایوس اور ناامید ہیں اور آپ جان لیں کہ عمر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر یہودی کی تلاش میں چل پڑے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں آدمی بھیجا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ اے عمر! اپنی تلوار رکھ دو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا آپ نے سچ فرمایا یارسول اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر بھیجا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب فرماتا ہے قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیشک اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اللہ میرے چہرے پر غصہ نہیں دیکھے گا۔ (اسباب النزول)

③ بنی غفار کے ایک شخص نے مکہ مکرمہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو گالی دی، یہ شخص مشرک تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے پکڑنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا۔ (المقتطف فی عیون التفاسیر)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرما دیجیے کہ وہ ان لوگوں کی زیادتیوں کو معاف کر دیا کریں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے بے خوف ہیں اور اس کی قدرت کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، یہ حکم ابتدائی دورِ اسلام میں دیا گیا تھا جب مسلمانوں کو صبر، برداشت اور عفو و درگزر کی تعلیم دی جا رہی تھی۔

لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: اللہ تعالیٰ خود ہر گروہ کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا، صبر کرنے والے مومن اپنے اجر سے نوازے جائیں گے اور ظلم و سرکشی کرنے والے اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔ مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا ملے گی، گناہگاروں کو ان کے گناہ کی سزا ملے۔

عمل اپنا اپنا جزا و سزا اپنی اپنی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ {۱۵} الجاثیہ

جواب ترجمہ: جو شخص نیک کام کرے سو وہ اسی کی جان کے لیے ہے اور جو شخص کوئی برا کام کرے اس کا وبال اسی کے نفس پر ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا : اس دنیا کی زندگی میں جو شخص نیک عمل کرے گا، اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور جو شخص برے اعمال اختیار کرے گا، اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا، کسی کے برے عمل کا حساب دوسرے کو نہیں دینا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نیک اعمال بجالانے کی ترغیب دے رہے ہیں اور برے اعمال سے بچنے کا فرمارہے ہیں، اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال سے بے نیاز ہے، نہ کسی کی اطاعت سے اسے کوئی نفع پہنچتا ہے اور نہ کسی کی نافرمانی سے کوئی نقصان۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ: آخر کار سب لوگوں کو اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے، جہاں اعمال کا مکمل حساب ہوگا اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

بنی اسرائیل، کتاب، حکم، نبوت، رزق، فضیلت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ {١٦} وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ {١٧} الجاثیه

جواب ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب دی اور حکم عطا کیا اور نبوت دی، اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، اور جہانوں پر فضیلت دی، اور ہم نے دین کے بارے میں انہیں کھلی کھلی دلیلیں عطا کیں، سو انہوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آگیا آپس کی ضد اضدی کی وجہ سے، بلاشبہ آپ کا رب قیامت کے دن ان امور میں ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ آپس میں اختلاف کرتے تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ : اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عظیم نعمتوں سے نوازا، انہیں تورات جیسی آسمانی کتاب عطا کی، یہاں کتاب سے مراد تورات ہے، حکم سے مراد حکمت اور لوگوں کے نزاعی معاملات میں ان کے درمیان فیصلے کرنے کا طریقہ کار ہے، شریعت اور فیصلے کی حکمت دی اور نبوت سے مراد ان میں بکثرت انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں نبوت کا سلسلہ جاری رکھا گیا، جو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل کا مظہر تھا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دینی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا گیا، اس سے مراد من وسلویٰ کا عطا کیا جانا اور انواع واقسام کے لذیذ پھلوں سے مالامال کرنا مراد ہے اور ان کے زمانے کی دوسری قوموں پر فضیلت بخشی گئی، یہ فضیلت علمِ دین، نبوت، شریعت اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں کی وجہ سے تھی، یہاں بنی اسرائیل کے لیے فرمایا گیا کہ ہم نے انہیں جہان والوں پر فضیلت دی ہے، اس سے مراد اس زمانے پر فضیلت دینا مراد ہے جس زمانے میں وہ موجود تھے، ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی فضیلت سارے جہانوں پر تسلیم شدہ ہے اور قرآنی نص سے ثابت ہے، جس میں فرمایا گیا کہ تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے نفع کے لیے نکالے گئے ہو۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ : اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے واضح دلائل اور روشن احکام عطا کیے جن سے حق اور باطل کے درمیان فرق بالکل نمایاں ہو گیا تھا۔

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ: لیکن انہوں نے حق واضح ہو جانے کے بعد اختلاف کیا، ان کا یہ اختلاف جہالت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ باہمی حسد، عناد، اقتدار کی خواہش اور دنیاوی مفادات کے حصول کی خاطر تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور حق مزید روشن ہو گیا تو بہت سے لوگوں نے اسے جان لینے کے باوجود محض تعصب اور ضد کی وجہ سے قبول نہ کیا۔

نَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان تمام اختلافات کا فیصلہ فرمادے گا، اس دن واضح ہو جائے گا کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون، اور ہر

شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ہونے والے اپنے انعامات اور ان کے باہمی اختلافات کا ذکر کر کے بتایا کہ علم و ہدایت مل جانے کے بعد حسد، تکبر اور دنیا طلبی انسان کو گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے، آخر میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی کامل عدالت اور فیصلہ کن حکم کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

شریعت اور مذہب

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا کا کیا مطلب ہے؟

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ {۱۸} الجاثية

جواب ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ اس کا اتباع کیجیے اور ان لوگوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجیے جو نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر: لغت کے اعتبار سے شریعت کے معنیٰ مذہب کے ہیں اور شرائع فی الدین سے مراد وہ مذاہب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے مشروع کیا ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے مراد واضح راستہ اور منہاج ہے یعنی ہم نے آپ ﷺ کو ایک واضح اور متعین منہاج پر رکھا ہے سو اسی کی اتباع کیجئے اور بے علم لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے۔

من الامر سے مراد دینی معاملات ہیں، فاتبعھا کا مطلب یہ ہے کہ دینی معاملات اپنے اندر بھی جاری کیجیے اور دوسروں میں جاری کیجیے، ان کے درمیان کسی چیز کو گھسانے اور داخل کرنے سے اجتناب کیجیے۔ روسائے قریش کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے، جو یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنے آباؤ اجداد کے دین کی طرف واپس پلٹ آیئے، یہ خواہشات ان جہلاء کی ہیں، آپ ﷺ نے ان کی کسی خواہش پر عمل نہیں کرنا۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا حکم: علامہ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: بعض علمی گفتگو کرنے

والے یہ گمان کرتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ شرائع سابقہ ہمارے (مسلمانوں کے) لئے مشروع نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت کے لئے اس آیت میں مستقل شریعت کا دینا متعین فرمادیا ہے۔ ہمیں اس بات کا انکار نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کی شریعت بالکل علیحدہ اور مستقل و متعین شریعت ہے، لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ شرائع سابقہ کے جو اعمال و احکام وغیرہ رسول اللہ ﷺ نے بتلائے اور ان کی تعریف و ثناء فرمائی کیا ہم پر ان کی اتباع لازم ہے یا نہیں؟

تو ابن العربی رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ شرائع سابقہ کے وہ احکام جو رسول اللہ ﷺ نے بر سبیل تحسین و ثناء بیان فرمائے ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا حصہ بن کر ہمارے لئے قابل اتباع ہیں اور یہ شرائع سابقہ کی اتباع نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت ہی کی اتباع ہے۔ واللہ اعلم۔

(احکام القران لابن العربی، بحوالہ معارف الفرقان للقاسمی)

خواہشات پرست، ظالم، متقی، قرآن کریم، نیکوکار و سیاہ کار

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ {۱۹} هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ {۲۰} اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ {۲۱} وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ {۲۲} الجاثیہ

جواب ترجمہ: بلاشبہ وہ لوگ اللہ کے مقابلہ میں آپ کو کچھ نفع نہیں دے سکتے اور بیشک ظلم کرنے والے ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور اللہ متقیوں کا دوست ہے۔ یہ قرآن لوگوں کے لیے دانشمندیوں کا اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے برے کام کیے کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے

اور اعمال صالحہ کیے کہ ان کا مرنا اور جینا برابر ہو جائے، یہ برا فیصلہ کرتے ہیں، اللہ نے سارے آسمانوں اور زمین کو برحق مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، اور اس لیے کیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ دیا جائے، اور بدلہ دیتے وقت ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ : اے میرے حبیب ﷺ! اگر آپ ان جاہل اور خواہشاتِ نفس کے پیرو لوگوں کی بات مانیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے آپ کو ذرا بھی نہیں بچا سکتے۔

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ: حقیقت یہ ہے کہ حق سے ناواقف لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے عقائد، قومیتیں اور گروہ مختلف ہوں، لیکن اہلِ حق کی مخالفت میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ: اس کے برعکس اللہ تعالیٰ خود اہلِ تقویٰ کا کارساز، مددگار اور محافظ ہے، جو لوگ اس کے احکام کی پیروی اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی نصرت فرماتا اور انہیں اپنی خصوصی ولایت سے نوازتا ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: یہ قرآنِ کریم لوگوں کے لیے بصیرت اور روشنی کا خزانہ ہے، اس کے ذریعے حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی، خیر اور شر کے درمیان واضح امتیاز پیدا ہوتا ہے، یہ کتاب سراسر ہدایت ہے جو انسان کو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور سراسر رحمت ہے جو دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے، البتہ اس کی ہدایت اور رحمت سے حقیقی فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جن کے دل یقین کی دولت سے مالا مال ہوں، کیونکہ وہی اس کے احکام کو قبول کر کے اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: ظالموں اور متقین کے تذکرہ کے بعد گناہگاروں اور نیکوکاروں کے احوال کا از سرِ نو ذکر کیا جا رہا ہے، یہاں اَمْ منقطعہ بَلْ کے معنیٰ میں ہے، جو بیان اول سے بیان ثانی کی طرف انتقال کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، بتایا جا رہا ہے کہ کیا وہ لوگ جو کفر، شرک اور گناہوں میں مبتلا ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم

انہیں ایمان والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کے برابر کر دیں گے؟ کیا ان کا انجام بھی وہی ہو گا جو اطاعت گزار بندوں کا ہے؟ اِجۡتَرَاحٌ: جوارح سے ہے، اس کا معنیٰ کمائی کرنا۔

سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ : کیا ان کی دنیاوی زندگی اور موت، دونوں حالتوں میں مومنوں اور کافروں کو یکساں قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں، مومن ایمان، سکونِ قلب، اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی رضا کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور اسی حال میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے، جبکہ کافر محرومی، گمراہی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی طرح آخرت میں بھی دونوں کے انجام یکساں نہیں ہو سکتے۔

سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ: یہ لوگ جو فیصلہ کرتے ہیں، وہ نہایت غلط، باطل اور عقل و انصاف کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل کا تقاضا یہی ہے کہ نیک اور بد، فرمانبردار اور نافرمان، مومن اور کافر کے انجام میں واضح فرق ہو۔

شانِ نزول: کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت عتبہ، شیبہ اور ولید کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انہوں نے ایمان والوں سے کہا تھا کہ جو کچھ تم لوگ کہتے ہو اگر یہ سچ ہے تو پھر ہماری حالت آخرت میں تمہاری حالت سے بہتر ہو گی، کیونکہ ہماری حالت دنیا میں تمہاری حالت سے افضل و بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس بات کا رد کر دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ مجرم اور نیکوکار برابر نہیں ہیں، جیسے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا ہے کہ مومن اور فاسق برابر نہیں ہو سکتے، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر کر دیں، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو؟

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو کسی کھیل تماشے یا بے مقصد نہیں پیدا کیا، بلکہ ایک عظیم حکمت اور حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک حکیم اور قادر مطلق خالق ہے اور اس نے اس نظام کو ایک خاص مقصد کے تحت قائم کیا ہے۔

وَلِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ: تخلیقِ کائنات کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ انسانوں کی

آزمائش ہو اور پھر قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے، جس نے نیکی کی ہو گی اسے اس کی جزا ملے گی اور جس نے برائی اختیار کی ہو گی وہ اس کے نتائج بھگتے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں فرمائے گا، کسی کی نیکی کم نہیں کی جائے گی اور کسی کے گناہ میں اضافہ نہیں کیا جائے گا، اس کی عدالت کامل اور اس کا فیصلہ سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہو گا۔ ثواب میں کمی اور سزا میں زیادتی کو ظلم کے ساتھ تعبیر کیا گیا، ایسا انداز اختیار کرنے سے مقصد اللہ تعالیٰ کی کمال و غایب صفائی بیان کرنا ہے کہ وہ ذات عالی ظلم نہیں کرے گا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ اہلِ باطل کی دوستی اور حمایت کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، جبکہ حقیقی مدد اور حفاظت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ تقویٰ کو حاصل ہوتی ہے، پھر قرآنِ کریم کی عظمت بیان کی گئی کہ وہ انسانیت کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت کا سرچشمہ ہے، اس کے بعد منکرین کے اس باطل تصور کی تردید کی گئی کہ نیک اور بد لوگوں کا انجام ایک جیسا ہو سکتا ہے، آخر میں تخلیقِ کائنات کی حکمت بیان کرتے ہوئے واضح کیا گیا کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں میں کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں فرمائے گا۔

خواہشات کا بندہ

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ {۲۳} الجاثية

جواب کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، سو کون ہے جو اللہ کے بعد اس شخص کو ہدایت دے گا، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

خلاصہ تفسیر: اتباعِ ہدایت کی بجائے اطاعتِ خواہشات پر اظہار تعجب کیا جا رہا ہے، گویا کہ

خواہشات کی پوجا شروع کر دی گئی ہے، خواہشات کے گھوڑے کو بے لگام نہیں چھوڑنا چاہیے، خواہشات کے تقاضے پر زندگی نہیں گزارنا چاہیے، کیونکہ خواہشات کے تقاضے بڑھتے رہتے ہیں، جیسے پتھروں کے پجاری جب ایک خوبصورت پتھر کو دیکھتے ہیں تو اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں، جب اس سے خوبصورت پتھر دکھائی دیتا ہے تو پہلے والے کو توڑ ڈالتے ہیں، پھینک دیتے ہیں اور دوسرے پتھر کی پرستش و پوجا شروع کر دیتے ہیں، اسی طرح خواہشات کے بندے نئی نئی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ ان آیات میں مشرکین کی گمراہی بتلائی کہ وہ غیر اللہ کی بھی عبادت کرتے ہیں اور وقوع قیامت کا بھی انکار کرتے ہیں ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کی خواہش ہی کو معبود بنا رکھا ہے جس کی عبادت کرنے کو جی چاہتا ہے اسی کی عبادت کرنے لگ جاتے ہیں کبھی پتھر کے سامنے جھکے عاجزی کر رہے ہیں کبھی اس پتھر کو سجدہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ سے نقل کیا ہے کہ عرب کے مشرکین کا یہ طریقہ تھا کہ کسی پتھر کو پوجنے لگتے تھے پھر جب اس سے اچھا پتھر نظر آجاتا تھا تو پہلے پتھر کو پھینک دیتے تھے اور دوسرے پتھر کو پوجنے لگتے تھے یعنی ان کا معبود ان کی نفس کی خواہش کے مطابق ہوتا تھا۔ (تفسیر انوار البیان)

آیت کا دوسرا معنیٰ مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ آپ نے انہیں دیکھا جو اپنے نفس کے پابند ہیں؟ انہیں ہدایت سے کوئی محبت نہیں اور گمراہی سے کوئی نفرت نہیں جو نفس چاہتا ہے وہی کہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں یہ تفسیر پہلے مفہوم کو بھی شامل ہے عربی میں ھَوٰی خواہش نفس کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جتنی جگہ بھی ھَوٰیہُ کا ذکر ہے مذمت کے ساتھ ہی ہے سورۃ القصص میں فرمایا وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰیہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کا اتباع کیا۔

خواہشات کی پیروی پر ضروری تنبیہ: جیسا کہ نفس کی خواہش کفر پر جما کر رکھتی ہے اور اسلام قبول

کرنے سے باز رکھتی ہے اسی طرح بہت سے مدعیان اسلام بھی نفس کے پابند ہونے کی وجہ سے بڑھ چڑھ کر گناہ کرتے ہیں جو نفس کی خواہش ہوتی ہے وہی کرتے ہیں نمازیں بھی چھوڑتے ہیں، زکوٰتیں بھی حساب کرکے نہیں دیتے حرام مال بھی کماتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں دشمنوں کی طرح شکل و صورت بناتے ہیں اور ان جیسا لباس پہنتے ہیں اور طرح طرح کے گناہوں کے مرتکب رہتے ہیں اتباع ھَوٰی یعنی نفس کی خواہش پر چلنا برباد کردینے والی چیز ہے اور نفس کی مخالفت کرنا کامیابی کا راستہ ہے سورۃ النازعات میں فرمایا وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى اور لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بیشک جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

مومن بندہ پر لازم ہے کہ نفس کی خواہشوں سے خبردار رہے جائز اور حلال خواہش پوری کرنے کی اجازت ہے لیکن اگر نفس کی ہر خواہش پورا کرنے کے پیچھے پڑا تو نفس تباہ کرکے چھوڑے گا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اس کی خواہشوں کے پیچھے لگا دیا اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھتا رہا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: ① پوشیدہ اور ظاہر طریقے پر اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ ② رضامندی اور ناراضگی میں حق بولنا۔ ③ مالداری اور تنگدستی میں میانہ روی اختیار کرنا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: ① نفس کی خواہش جس کا اتباع کیا جائے۔ ② کنجوسی جس کی اطاعت کی جائے۔ ③ انسان کا اپنے نفس پر اترانا اور یہ ان میں سب سے زیادہ ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۴)

مومن پر لازم ہے کہ نفس کی خواہشوں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کے تابع کردے

جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ (مشکوٰۃ) البتہ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے نفس کو دبانا پڑتا ہے اور اسے خیر کے لیے آمادہ کرنا پڑتا ہے۔

وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ : اور اسے اللہ نے علم والا ہوتے ہوئے گمراہ کر دیا، اللہ کو علم ہے کہ اس نے گمراہی کو اختیار کیا ہے، اس نے اس فطرت کو تبدیل کیا ہے، جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے۔

وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً: یہ تینوں جملے پہلے جملہ پر معطوف ہیں چاروں جملوں کا ترجمہ یوں ہوا، کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنالیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ فرمادیا اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، اس لیے وعظ و نصیحت کی باتیں ان پر اثر نہیں کرتی ہیں اور نہ ہی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ غشاوۃٌ: وہ پردہ جو بصیرت کے راستوں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰہِ: سو اللہ کے گمراہ کرنے کے بعد اسے کون ہدایت دے گا۔

اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ: کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، درحقیقت نفس کی خواہشوں کے پیچھے چلنا انسان کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہے اتباع ھویٰ کرتے کرتے اور جی چاہی زندگی پر چلتے چلتے قبول حق کی استعداد ختم ہو جاتی ہے پھر علم بھی کام نہیں دیتا جانتے اور سمجھتے ہوئے حق کو قبول نہیں کرتا کان بھی حق سننے کو تیار نہیں اور دل بھی قبول نہیں کرتا اور آنکھوں پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے اتنی دور کی گمراہی میں پڑ جانے کے بعد ہدایت پر آنے کی کوئی بھی امید نہیں رہتی۔ (تفسیر انوار البیان)

منکرین بعث بعد الموت کا رد

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَقَالُوْا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ {۲۴} وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا کَانَ حُجَّتَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ {۲۵} قُلِ اللّٰہُ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یَجْمَعُکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ {۲۶} الجاثیہ

جواب ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ نہیں ہے یہ مگر ہماری دنیا والی زندگی ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرے گا مگر زمانہ، اور انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں، یہ لوگ صرف گمان کرتے ہیں۔ اور جب ان کے اوپر ہماری کھلی کھلی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کی حجت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ہمارے باپ دادوں کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ آپ فرما دیجیے اللہ تمہیں زندگی بخشتا ہے پھر موت دیتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں اور لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ: منکرینِ آخرت اور کفار کہتے تھے کہ ہماری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد نہ کوئی دوسری حیات ہے اور نہ دوبارہ اٹھایا جانا ہے، کچھ لوگ مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں اور ہماری ہلاکت و موت کا سبب صرف زمانے کا گزرنا ہے، ان کے نزدیک زندگی اور موت محض طبعی قوانین اور زمانے کے گردش کرنے کا نتیجہ تھی، اس کے پیچھے کسی قادرِ مطلق کی قدرت اور تدبیر کار فرما نہیں تھی، یہ دراصل دہریہ اور منکرینِ آخرت کا نظریہ تھا، جو حیاتِ بعد الموت اور روزِ جزا کے عقیدے کا انکار کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انسان مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

لوگ زمانے کو گالیاں دیا کرتے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ زمانے کو گالیاں نہ دو بے شک اللہ ہی زمانہ ہے، یعنی اللہ ہی حوادث لاتا ہے نہ کہ زمانہ۔

وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ: اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی حقیقت بیان فرمائی کہ ان کے پاس اپنے اس عقیدے کے حق میں کوئی علمی دلیل نہیں، نہ عقلِ صحیح اس کی تائید کرتی ہے اور نہ وحیِ الٰہی، وہ صرف گمان، قیاس اور بے بنیاد خیالات کے پیچھے چل رہے ہیں، حالانکہ محض گمان کبھی حق اور یقین کا قائم مقام نہیں بن سکتا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ: جب ان منکرین کے سامنے اللہ تعالیٰ کی واضح آیات تلاوت کی جاتیں اور انہیں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ قیامت اور

دوبارہ زندہ ہونے کا یقین دلایا جاتا تو ان کے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوتا، وہ دلیل کے مقابلے میں محض یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمارے مرے ہوئے باپ داداؤں کو زندہ کرکے دکھاؤ، یہ درحقیقت دلیل نہیں بلکہ ضد، ہٹ دھرمی اور انکار کا ایک بہانہ تھا، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصد ہر مطالبے کے مطابق معجزات دکھانا نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی روشن نشانیوں کے ذریعے حق واضح کرنا ہوتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہہ دیجیے کہ تمہیں پہلی مرتبہ زندگی دینے والا بھی اللہ ہی ہے، وہی تمہیں موت دیتا ہے اور وہی قیامت کے دن تم سب کو دوبارہ زندہ کرکے اپنے حضور جمع کرے گا، جس ذات نے پہلی بار عدم سے وجود عطا فرمایا، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہو سکتا ہے؟ قیامت کا دن ایک یقینی حقیقت ہے، جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں، اس دن تمام اولین و آخرین جمع کیے جائیں گے، اعمال کا حساب ہوگا اور ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے گا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے، یا جاننے کے باوجود اس پر غور نہیں کرتے، اسی جہالت، غفلت اور دنیا کی محبت کی وجہ سے وہ آخرت کی تیاری سے غافل رہتے ہیں اور نیک اعمال اختیار نہیں کرتے۔

ان آیات میں منکرینِ آخرت کے باطل عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور موت وحیات کو محض زمانے کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ان کے پاس اس دعوے کی کوئی علمی دلیل نہیں، بلکہ وہ صرف گمان اور قیاس کے پیچھے چلتے ہیں، جب ان کے سامنے قیامت کے دلائل پیش کیے جاتے تو وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے مرے ہوئے آباء واجداد کو زندہ کرنے کا مطالبہ کرتے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ زندگی دینا، موت دینا اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرکے جمع کرنا صرف اسی کے اختیار میں ہے، قیامت ایک اٹل حقیقت ہے، لیکن اکثر لوگ اپنی غفلت اور جہالت کی وجہ سے اس کی تیاری نہیں کرتے۔

زمین وآسمان کا بادشاہ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ اَلْمُبْطِلُوْنَ کا کیا معنیٰ ہے؟

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ {۲۷} وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۲۸} الجاثية.

جواب ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے، اور جس دن قیامت آ کھڑی ہو گی، اس دن جو لوگ باطل پر ہیں، وہ سخت نقصان اٹھائیں گے، اور تم ہر گروہ کو دیکھو گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہے۔ ہر گروہ اس کے اعمال نامے کی طرف بلایا جائے گا، (اور کہا جائے گا کہ) آج تمہیں ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندہ کرنے، اسے مارنے اور اسے قیامت کے دن جمع کرنے کا ذکر کیا ہے، یہاں مزید وضاحت کی جارہی ہے کہ اللہ کے لیے کوئی مشکل اور دشوار نہیں ہے کہ وہ قیامت کے دن کیسے جمع کرے گا؟ اس لیے کہ وہ مختار کل ذات ہے، ارض وسماء کا وہی مالک ہے، ان میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب اسی کے اختیار میں ہے، وہ چاہے تو زندگی عطا کرے، وہ چاہے تو زندگی کے بعد موت کی آغوش میں پہنچا دے اور وہ چاہے تو بروز محشر تمہیں جمع کرے اور قیامت کا دن ایسا ہو گا جس میں باطل والے لوگ نقصان میں چلے جائیں گے۔

یہ ایسا دہشت اور خوف والا دن ہو گا کہ ہر گروہ، ہر فرقہ، ہر جماعت خوف کے مارے گھٹنوں کے بل گری پڑی ہو گی، ہر گروہ اپنے نامہ اعمال میں لکھے ہوئے اعمال کے حساب کی طرف پکارا جائے گا، کیونکہ نامہ اعمال ان کے ہاتھوں میں ہو گا، انہیں کہا جائے گا کہ آج تمہیں تمہارے اعمال کا صلہ ملے گا۔

اس روز انہیں نامہ اعمال کے بارے میں بتایا جائے گا کہ یہ نامہ اعمال ہم نے لکھوایا ہے، یہ ایسی دستاویز ہے جس میں سب درست طور پر لکھا ہوا ہے، تمہارے مقابلے میں یہ درست بول رہا ہے، ہم تمہارے اعمال کو دنیا میں فرشتوں سے لکھواتے تھے، یہ اعمال کا لکھا ہوا مجموعہ وہی ہے، جو ہمارے

فرستادہ فرشتوں نے دنیا میں لکھا تھا۔

قیامت کے روز حساب کے بعد فیصلہ ہو جائے گا، اہل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والے کامیاب قرار دیے جائیں گے، انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہ واضح کامیابی کی علامت ہو گی، اور جو کافر اور بد اعمال ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا دنیا میں تمہیں میری آیات پڑھ کر نہیں سنائی گئی تھیں؟ تم نے میری آیات سن کر تکبر کیا تھا؟ انکار آیات اور تکبر کے باعث ہی تم بڑے مجرم گردانے جاتے ہو، جب تمہیں دنیا میں کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس زندگی کے بعد موت دے گا، موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا، پھر اچھے اور برے عمل کی جزا و سزا دے گا، قیامت برپا ہو گی تو تم لوگ بڑی بے پروائی سے کہہ دیتے تھے کہ ہم کسی قیامت کو نہیں جانتے، حالانکہ اس دن کے برپا ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔

دنیا میں اس طرح تکبر کا اظہار کرنے والوں پر اپنی تمام بد اعمالیاں ظاہر ہو جائیں گی، جس عذاب کا وہ مزاح اڑاتے تھے وہ انہیں اپنے شکنجے میں لے لے گا، پھر ان سے کہا جائے گا کہ ہم آج کے دن تمہیں بھلا دیتے ہیں جس طرح تم نے یہ دن بھلا رکھا تھا، آج تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے، تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔

انہیں اس سزا کی وجہ بتائی جائے گی کہ چونکہ تم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے تھے، ہنسی مزاح کرتے تھے، آیات کو حقیر سمجھتے تھے، تمہیں تمہاری حیات دنیا نے فریب میں مبتلا کیا ہوا تھا، تم دنیوی زندگی کی چمک دمک سے اتنے مرعوب ہو گئے تھے کہ آخرت کو بھلا ہی دیا تھا کہ آخرت بھی کوئی چیز ہے، چنانچہ ان لوگوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اور انہیں یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ تم اللہ سے معافی مانگ لو اور اللہ کو راضی کر لو، کیونکہ وہاں اس بات کا تصور اور خیال بھی نہیں کیا جا سکتا، معافی تلافی، ازالہ مافات کی جگہ دنیا ہے، جس نے اس عالی ذات کو راضی کرنا ہے اس کے لیے دنیا ہی بہترین مقام ہے۔ آخرت تو دار الجزا ہے۔

اللہ کی حاکمیت اور قدرت کا اظہار ہر جگہ پر ہو رہا ہے، سلطان وہی ہے، سلطانی بھی اسی کی ہے،

بادشاہی کا سکہ اسی کا رائج ہے، وہی مختار کل اور مختار حقیقی ہے۔

آیت مبارکہ میں مُبْطِلُون کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد کافر لوگ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والے تھے، جو اللہ نے اپنے رسول کریم ﷺ پر نازل فرمایا اس کا انکار کرنے والے تھے، وہ لوگ آیات بینات، دلائل واضحہ، براہین قاطعہ کے منکر تھے، یہی لوگ قیامت کے دن سخت خسارے میں ہوں گے، انہی جیسے لوگوں سے دوزخ پر ہو گی، انہی جیسے لوگوں کو کھولتا ہوا پیپ والا لہو پلایا جائے گا، انہی جیسے لوگوں کے لیے شجرہ زقوم کھانے کی چیز ہو گی، انہی لوگوں کی چمڑیاں ادھیڑ ادھیڑ کر پھر پہنائی جائیں گی، یہی لوگ ہیں جن کو سدا دوزخ میں جلنا ہے، نہ زندگی ہو گی وہاں اور نہ ہی موت ہو گی، چیخ وپکار ہو گی، جس پر ترس کھانے کی بجائے مزید غصہ کیا جائے گا، عذاب تو ہو گا ہی ان کے لیے، رسوائی بھی ان کا مقدر ہو گی۔

کتاب حق، اہل ایمان، اہل کفر، قیامت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ{۲۹}فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ {۳۰}وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ{۳۱}وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ{۳۲}وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ{۳۳}وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ {۳۴}ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ {۳۵}فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ {۳۶}الجاثیه

جواب ترجمہ: یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے، بیشک ہم لکھوا

لیتے تھے جو تم کرتے تھے، سو جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کا رب انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا یہ کھلی ہوئی کامیابی ہے، اور جن لوگوں نے کفر کیا! کیا تمہارے پاس میری آیات نہیں آئیں جو تم پر پڑھی جاتی تھیں؟ سو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم قوم تھے، اور جب کہا گیا کہ بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے ہم تو بس یوں ہی خیال کرتے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں، اور جو عمل انہوں نے کیے تھے ان کے برے نتیجے ظاہر ہو گئے اور وہ جس چیز کا مذاق بنایا کرتے تھے وہ ان پر نازل ہو گئی۔ اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمہیں بھولتے ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی ملاقات کو بھول گئے، اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق کی چیز بنالیا اور دنیا والی زندگی نے تمہیں دھوکہ دیا، سو آج وہ اس میں سے نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان سے یوں کہا جائے گا کہ راضی کرلو، سو اللہ ہی کے لیے ہے سب تعریف جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمینوں کا اور رب ہے سارے جہانوں کا۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ : قیامت کے دن ہر انسان کے سامنے اس کا نامۂ اعمال پیش کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ ہمارا وہ ریکارڈ ہے جو تمہارے تمام اعمال کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کر رہا ہے، اس میں نہ کسی نیکی کی کمی کی گئی ہے اور نہ کسی برائی کا اضافہ، دنیا میں تم جو کچھ کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرشتے اسے محفوظ کرتے رہے اور آج وہی اعمال تمہارے سامنے گواہی بن کر کھڑے ہیں۔

اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : بے شک ہم فرشتوں کو حکم دیتے تھے کہ وہ تمہارے اعمال کو لکھتے رہیں، تمہارا ہر قول، ہر فعل اور ہر حرکت اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اور اس کا مکمل ریکارڈ محفوظ کیا جاتا رہا، تاکہ قیامت کے دن عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جاسکے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ : جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال اختیار کیے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خاص رحمت میں داخل فرمائے گا، اس رحمت

سے مراد جنت اور اس کی دائمی نعمتیں ہیں، جہاں ہر قسم کی راحت، خوشی اور اطمینان میسر ہو گا۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ: یہی درحقیقت کھلی اور حقیقی کامیابی ہے، دنیا کی تمام کامیابیاں عارضی اور محدود ہیں، جبکہ جنت کی کامیابی دائمی، کامل اور بے مثال ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ: رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان سے بطورِ ملامت کہا جائے گا: کیا تمہارے سامنے میری آیات نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ کیا تمہیں بار بار ایمان، توحید اور آخرت کی دعوت نہیں دی جاتی تھی؟

فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ: مگر تم نے تکبر اور غرور کا راستہ اختیار کیا، حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور جرم، نافرمانی اور گناہ کی زندگی اختیار کیے رکھی، تمہارا اصل جرم یہی تھا کہ واضح دلائل کے باوجود تم نے سرکشی کا رویہ اپنایا۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا: جب تمہیں کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کا آنا یقینی ہے، جس میں کوئی شک نہیں، تو تم اس نصیحت کو سنجیدگی سے قبول کرنے کے بجائے انکار کا رویہ اختیار کرتے تھے۔

قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ: تم کہتے تھے کہ ہمیں معلوم نہیں قیامت کیا چیز ہے، ہم تو محض ایک گمان رکھتے ہیں اور ہمیں اس کے وقوع کا کوئی یقین نہیں، اس طرح تم نے واضح دلائل کے باوجود آخرت کے عقیدے کو شک وشبہ کا نشانہ بنایا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا: قیامت کے دن ان کے تمام برے اعمال ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے، دنیا میں جن گناہوں کو وہ معمولی سمجھتے تھے، آج وہی ان کے لیے باعثِ ندامت اور ہلاکت بن جائیں گے۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا، وہی انہیں ہر طرف سے گھیر لے گا، اس وقت ان کی ہنسی اور استہزاء حسرت اور ندامت میں بدل جائے گا۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا: ان سے کہا جائے گا، آج ہم تمہیں اسی طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے تم دنیا میں اس دن کی ملاقات کو بھلا بیٹھے تھے، تم نے نہ اس کی تیاری کی اور نہ اس پر ایمان لانے کی فکر کی۔

وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ: اب تمہارا مستقل ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی ایسا مددگار نہیں جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: یہ عذاب اس لیے ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتے رہے اور دنیا کی عارضی لذتوں اور خواہشات نے تمہیں دھوکے میں مبتلا رکھا، تم نے دنیا کو سب کچھ سمجھ لیا اور آخرت کو فراموش کر دیا۔

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ: آج انہیں جہنم سے نکالا نہیں جائے گا اور نہ ہی انہیں دوبارہ دنیا میں واپس جانے یا اپنی غلطیوں کی تلافی کا کوئی موقع دیا جائے گا، فیصلہ ہو چکا اور اب واپسی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: پس ہر قسم کی حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جو آسمانوں، زمین اور تمام جہانوں کا رب، مالک اور پروردگار ہے، تمام نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں اور تمام تعریفوں کا حقیقی مستحق بھی وہی ہے۔

ان آیات میں قیامت کے دن نامۂ اعمال پیش کیے جانے، اہلِ ایمان کے جنت میں داخلے اور کفار کی حسرت و ندامت کا منظر بیان کیا گیا ہے، مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور دائمی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے، جبکہ کفار کو ان کے تکبر، انکارِ آخرت اور آیاتِ الٰہی کے استہزاء پر ملامت کی گئی ہے، پھر جہنم میں ان کے دائمی قیام اور دنیا کے دھوکے میں مبتلا رہنے کے انجام کو واضح کیا گیا ہے۔

تکبر اور بڑائی

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ کا کیا مطلب ہے؟

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ {۳۷} الجاثية

جواب ترجمہ: اور تمام تر بڑائی اسی کو حاصل ہے، آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، اور وہی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔

خلاصہ تفسیر: مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصر عظمت کو اپنے واسطے ثابت کیا ہے ولہ الکبریاء یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت، بلاغت کے قاعدہ سے لہ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی، نیز یہ نہیں فرمایا ولہ الکبریاء العظمی کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریاء کو دوسرے سے نفی کر دیا اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اَلعَظمَۃُ اِزَاری وَالکِبریَاءُ رِدَائی فَمَن نَازَعَنی فِیھِمَا قَصَمتُہُ، یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریائی میری چادر جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔

چادر اور تہبند فرمانا کنایہ ہے خصوصیت سے معنیٰ یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہو گا تو میں اس کو سزا دوں گا جب کبریاء حق ہوا باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساوات ہوئی، باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی، مثلاً کھانا کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے۔

مگر کبر وہ معصیت ہے کہ اس کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ لَا یَدخُلُ الجَنَّۃَ مَن کَانَ فی قَلبِہٖ مِثقَالَ ذَرَّۃٍ مِّن کِبر یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو گا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔ یعنی قیامت کے دن حکم ہو گا کہ اَخرِجُوا مِنَ النَّار مَن کَانَ فی قَلبِہٖ مِثقَالَ ذَرَّۃٍ مِّن اِیمَان، جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔

اس کو پہلی حدیث سے ملایئے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے وہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل

میں ہے جنت میں نہ جائے گا، یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر کبر بھی کسی دل میں ہے اس میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہو سکتا اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا دونوں میں بالکل نقیضیں ہیں۔

گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہو گا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مفاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہوا سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اس کی بھی اصل ہے اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہئے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔

تکبر کا علاج: حق تعالیٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتایا کہ جب اس کو مستحضر رکھا جائے تو نہ چھوٹا گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی ایک صفت **وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْارض** اور اسی کو آسمانوں اور زمین میں بڑائی حاصل ہے، کو یاد رکھو گے تو گناہ خود بخود تم سے چھوٹ جائیں گے۔

یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفات کبریا مختص ہوئی ذات باری کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا تذلل جو اصل ہے تمام عبادات کی جس شخص نے صفت کبریا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محقق نہیں ہو سکتا عقل مند لوگ یہی ہیں۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: یعنی وہ غالب اور صاحب حکمت ہے، سے موکد کیا ان کو چونکانے کے لئے جو اس مفسدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں اور اپنے طبیب پر ان کی نظر ہی نہیں جب ان کو سمجھانے اور بھلائی سجھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے کہیں جا نہیں سکتے۔

اور اگر کسی برے عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا میں کسی مصلحت اور حکمت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو دار الجزاء ہے ہی۔ وہاں کی سزا اور زیادہ سخت ہے۔ (اشرف التفاسیر)

سورت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی حمد، ربوبیت، کبریائی، عزت اور حکمت کے بیان پر ہوتا ہے، جو اس پوری سورت کے مضامین کا نہایت جامع اور بلیغ خلاصہ ہے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج سورۃ الجاثیہ کی تفسیر مکمل ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ اور شیوخ کے لیے اور میرے مساعدین ومعاونین سب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور کینٹ

۱۲اپریل ۲۰۱۸ء بروز پیر، گیارہ بج کر اٹھاون منٹ شب

اضافات وترمیمات: ۲۰جون ۲۰۲۶ء بروز ہفتہ، بعد نماز مغرب

حال وارد حدوٹ۔ مری

سورۃ الاحقاف (تعارف)

سوال سورۃ الاحقاف کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الاحقاف قرآنِ کریم کی چھیالیسویں سورت ہے، جو ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے سورۃ الجاثیہ کے بعد نازل ہوئی ہے، جمہور مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورت ہے، البتہ چند آیات کے بارے میں بعض اہلِ علم نے مدنی ہونے کا احتمال ذکر کیا ہے، اس سورت کی بنیادی دعوت بھی دیگر مکی سورتوں کی طرح عقیدۂ توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات پر مشتمل ہے، پوری سورت میں بالخصوص رسالتِ محمدی ﷺ کی صداقت، قرآنِ کریم کی حقانیت اور منکرینِ حق کے انجام کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام سورۃ الاحقاف ہے، احقاف، حقف کی جمع ہے، جس کے معنی ریت کے بلند ٹیلوں اور ریتلی پہاڑیوں کے ہیں، قرآنِ کریم میں حضرت ہود علیہ السلام کی قومِ عاد کے مسکن کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا، وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ اور عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو یاد کیجیے جب انہوں نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا تھا۔

قومِ عاد یمن اور حضر موت کے درمیان واقع ایک وسیع ریتلے علاقے میں آباد تھی جہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے موجود تھے، چونکہ اس سورت میں قومِ عاد اور ان کے علاقے "احقاف" کا تفصیلی ذکر آیا ہے، اس لیے اس سورت کو "سورۃ الاحقاف" کہا جاتا ہے۔

اہم مضامین: سورۃ الاحقاف کے نمایاں مضامین درج ذیل ہیں ①: قرآنِ کریم کی حقانیت: سورت کے آغاز میں قرآنِ کریم کے منزل من اللہ ہونے اور اس کے الٰہی کلام ہونے کا بیان ہے۔

② توحید کا اثبات اور شرک کی تردید مشرکین کے معبودانِ باطل کی بے بسی اور ان کی عبادت کے بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔

③ رسالتِ محمدی ﷺ کا اثبات: نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کے حق ہونے اور کفار کے اعتراضات کے جوابات بیان کیے گئے ہیں۔

④ والدین کے حقوق: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، شکر گزاری اور اطاعت کی اہمیت کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ⑤ نیک اور بد اولاد کا تقابل: فرمانبردار مومن اور نافرمان منکرِ آخرت کے کردار اور ان کے انجام کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ⑥ قومِ عاد کا واقعہ: حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت، قومِ عاد کی سرکشی اور ان کے عبرتناک انجام کا ذکر ہے۔ ⑦ آخرت اور جزا و سزا: قیامت، حساب، جنت اور جہنم کے مختلف پہلوؤں کو بیان کر کے آخرت پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ ⑧ جنات کا ایمان لانا: قرآنِ کریم کے اثرات اور اس کی عالمگیر دعوت کو جنات کے ایمان لانے کے واقعہ سے واضح کیا گیا ہے۔

مرکزی پیغام: سورۃ الاحقاف کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نجات کا راستہ صرف توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان میں ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو قبول کر کے انبیاء علیہم السلام کی پیروی اختیار کرتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتے ہیں، جبکہ تکبر، شرک، نافرمانی اور حق کی تکذیب انسان کو تباہی اور دائمی خسارے سے دوچار کر دیتی ہے، اس سورت میں سابقہ اقوام کے واقعات، والدین کے حقوق، ایمان والوں کے اوصاف اور جنات کے قبولِ حق کے تذکرے کے ذریعے انسانیت کو ہدایت، عبرت اور نصیحت کا جامع پیغام دیا گیا ہے۔

عظمت قرآن کریم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ الاحقاف

جواب ترجمہ: حٰمٓ، یہ کتاب ہے اتاری ہوئی اللہ کی طرف سے جو عزیز ہے حکیم ہے۔

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ: حروف مقطعات میں سے ہیں جو اعجاز قرآن پر تنبیہ کرنے کے لیے لائے گئے ہیں کہ یہ قرآن بھی ایسے ہی حروف ہجا سے منظوم ہے، یہ اعجاز قرآنی کی طرف اشارہ ہے، اہل مکہ قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لب کشائی اور زبان درازی کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے کسی سے سیکھتے ہیں اور پھر آکر ہمیں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اتارا گیا ہے،

ان کی لب کشائیوں اور زبان درازیوں کا ان مختصر مختصر الفاظ میں جواب دیا گیا ہے۔

سورۃ الاحقاف ان سورتوں میں سے ہے جن کا آغاز ان ہجائی حروف کے ساتھ کیا گیا ہے، جیسے حم ہے، اس کے معنیٰ میں درستگی کے سب سے زیادہ قریب وہ قول ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حروف مقطعات ہیں جو بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، ان حروف کو لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مشرکین کو چیلنج کر رہے ہیں یہ اسی کلام کی جنس سے ہے جو ان حروف سے مرکب ہے، جسے یہ لوگ جانتے ہیں، یہ لوگ بھی اس طرح حروف جوڑ کر کلام بنا سکتے ہیں، لیکن یہ لوگ اس قرآن کریم جیسی ایک سورت لانے سے عاجز و قاصر ہیں، کیونکہ قرآن کریم فصاحت و حکمت کی انتہاؤں کو پہنچا ہوا ہے، ان کے فصحاء اور بلغاء ابھی اس مرحلے و مرتبے کو نہیں پہنچے کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔

اس سب کچھ کے باوجود جب بعض سورتوں کے آغاز میں اس طرح کے الفاظ وارد ہوتے ہیں تو اعراض کرنے والوں کے کان پوری طرح تلاوت کے دوران ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں، تلاوت کے دوران وہ لوگ اپنے لبوں پر مہر خامشی لگانے اور کانوں کو اس کی طرف جھکانے اور دماغوں کو اس پر غور و فکر کرنے پر متوجہ کرتے ہیں۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ: یہاں قرآن کریم کا مصدر بتایا جا رہا ہے، عربوں کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جس قرآن کریم پر تم لوگ لب کشائی اور زبان درازی کرتے ہو یہ کسی عام ہستی کی طرف سے نہیں آتا بلکہ اسے بھیجنے والا اللہ ہے، جو زبردست ہے اپنی بادشاہت میں اور حکیم ہے اپنی صناعی اور کاریگری میں، اس کی طاقت اور حکمت کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔

مقصد تخلیق کائنات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝ {۳} قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ

الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ {۴} الاحقاف

جواب ترجمہ: ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو مگر حق کے ساتھ اور ایک میعاد معین کے لیے، اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ اس چیز سے اعراض کیے ہوئے ہیں جس سے ڈرائے گئے، آپ فرما دیجیے کہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو ان کے بارے میں بتاؤ مجھے دکھا دو انہوں نے زمین کے اجزاء میں سے کیا پیدا کیا؟ کیا ان کے لیے آسمانوں میں کوئی ساجھا ہے؟ لے آؤ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے ہو یا کوئی ایسا علم لے آؤ جو منقول ہو کر آیا ہو اگر تم سچے ہو۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ: ہم نے آسمانوں کو زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان مخلوق ہے کو فضول نہیں پیدا کیا، بلکہ حکمت کے تحت ہم نے انہیں پیدا کیا ہے تاکہ یہ چیزیں ہماری وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کریں۔

وَاَجَلٍ مُّسَمًّى: تا زمانہ متعین اور وہ ان کے فنا کا وقت یعنی روز قیامت ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ جس دن زمین اس کے علاوہ اور زمین میں بدل جائے گی اور آسمان بھی اور سارے لوگ ایک اللہ کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے جو یکتا اور غالب ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ: یعنی یہ کفار جس سے ڈرائے جاتے ہیں اور آخرت کی ہولناکیاں جن کا انہیں ڈر سنایا جاتا ہے سے روگردانی کرتے ہیں اور غور و فکر نہیں کرتے اور نہ ہی اس دن کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ الٰہ برحق کے وجود کو بیان کرنے کے بعد بتوں کے پرستاروں پر رد ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اے محمد! ان مشرکین سے کہہ دیجیے: مجھے ان بتوں کے بارے میں خبر دیجیے جنہیں تم پوجتے ہو، تمہارا گمان ہے کہ وہ تمہارے خدا ہیں۔

اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ: مجھے بتاؤ اور خبر دو تمہارے خداؤں نے زمین کا کون سا حصہ پیدا

کیا ہے حالانکہ تم انہیں خدا مانتے ہو یا کوئی انسان یا کوئی جانور تخلیق کیا ہے مجھے دکھاؤ؟

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ: یا آسمانوں کی تخلیق میں اللہ کے ساتھ ان کا کوئی حصہ اور نصیب ہے؟

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ: کوئی آسمانی کتاب میرے پاس لے آؤ جو اللہ کی طرف سے منزل ہو اور قرآن سے پہلے کی ہو، وہ کتاب تمہیں بتوں کی عبادت کا حکم دیتی ہو؟ امر برائے تعجیز ہے چونکہ مشرکین کے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں جو اشراک باللہ پر دلالت کرتی ہو بلکہ سب آسمانی کتابیں توحید کا پیغام سناتی ہیں، (اگر کہا جائے کہ ہندوؤں کے مقدس ویدوں میں بتوں کی پوجا کا حکم ہے اور وہ قرآن سے پہلے کی کتابیں ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ تو منزل من اللہ ہے ہی نہیں یہ قدیم ہندوؤں کی اپنی لکھی ہوئی منتروں پر مشتمل ہیں)

اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ: یا کوئی علمی روایت لے آؤ جس کا تعلق اولین کے علوم سے ہو اور وہ اس شرک کی گواہ ہو۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں، مشرکین سے مطالبہ کیا گیا کہ کوئی ایسی کتاب پیش کرو جو غیر اللہ کی عبادت کی صحت پر گواہ بن جائے یا پہلے لوگوں کی کوئی علمی روایت پیش کر دو جو تمہارے دعویٰ پر گواہی ہو؟ اس سے غرض مشرکین کو ڈانٹ پلانا ہے چونکہ تمام آسمانی کتابوں میں توحید اور ابطال شرک کا پیغام ہے، مشرکین کے پاس نہ کوئی عقلی سند ہے اور نہ ہی نقلی۔ (البحر المحیط ۸:۵۵، صفوۃ التفاسیر)

معبودان باطلہ قیامت کے دن برأت کریں گے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ {۵} وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ {۶} الأحقاف

جواب ترجمہ: اس شخص سے بڑا گمراہ کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان (من گھڑت دیوتاؤں) کو

پکارے جو قیامت کے دن تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے، اور جن کو ان کی پکار کی خبر تک نہیں ہے۔ اور جب لوگوں کو محشر میں جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی عبادت ہی سے منکر ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر: مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ یعنی جن جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے، آخرت میں وہ سب ان مشرکین سے برأت ظاہر کرکے یہ کہہ دیں گے کہ یہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، یہ بات سورۃ قصص (۲۸: ۶۳) میں بھی گزری ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مشرکین کئی قسم کے ہوتے ہیں، بعض مشرکین نے کچھ دنیا سے گزرے ہوئے انسانوں کو معبود بنا رکھا ہے، ان انسانوں کو بسا اوقات یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ان کی عبادت کی جارہی ہے، اس لئے وہ انکار کردیں گے، اور جن کو پتہ ہے وہ یہ کہیں گے کہ درحقیقت یہ ہماری نہیں، بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی عبادت کرتے تھے۔

دوسرے بعض مشرکین وہ ہیں جو فرشتوں کو معبود بنائے ہوئے تھے، ان کے بارے میں سورۃ سبا (۳۴: ۴۰، ۴۱) میں گزرا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو جنات اور شیاطین کی عبادت کیا کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے ہی انہیں بہکایا تھا۔

مشرکین کی تیسری قسم وہ ہے جو پتھر کے بتوں کو پوجتی ہے، بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو دکھانے کے لئے ان بتوں کو بھی زبان دے دیں گے اور چونکہ وہ دنیا میں بے جان پتھر تھے اس لئے انہیں واقعی یہ پتہ نہیں ہوگا کہ مشرکین ان کی عبادت کرتے تھے، اس لئے وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، اور اگر یہ روایت ثابت نہ ہو تو پھر یہ بت زبان حال سے یہ کہیں گے کہ ہم تو بے جان پتھر ہیں ہمیں کیا پتہ کہ ہماری عبادت کی جاتی تھی۔ (توضیح القرآن)

تلاوت قرآن کریم اور معاندین قرآن

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ {۷} اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ {۸} الاحقاف

جواب ترجمہ: اور جب ان پر واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ حق کے بارے میں کہتے ہیں جب ان کے پاس آگیا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا، آپ فرمادیجیے کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا تم مجھے اللہ سے ذرا بھی نہیں بچاسکتے، وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم رہتے ہو، میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ کافی ہے وہ بڑی مغفرت والا ہے اور بڑی رحمت والا ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ: جب کفار پر قرآن کی واضح اور دوٹوک آیات پڑھی جاتی ہیں اور جو اس امر کا علاج کرتی ہیں کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ: قرآن برحق جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کفار کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ : یہ تو جادو ہے اور اس کے جادو ہونے میں کوئی شبہ نہیں، الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اسم ظاہر ہے جو اسم ضمیر کی جگہ لایا گیا ہے دراصل کفار پر کفر و ضلالت کی مہر ثبت کرنا مقصود ہے، بحر میں لکھا ہے: لَمَّا جَآءَهُمْ: میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ کفار کو جو آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ ان میں غور و فکر نہیں کرتے، بلکہ سنتے ہی فوراً جادو کے ساتھ اسے جوڑ دیتے ہیں۔ کفار نے جادو کی۔ مبین: صفت لائی ہے یعنی یہ قرآن کھلم کھلا جادو ہے اس میں کوئی شعبے نہیں۔ (البحر المحیط ۸:۵۶، صفوۃ التفاسیر)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: یا کہتے ہیں کہ محمد نے یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، یہ انکار تو بیخی ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا: بالفرض اگر میں نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو مجھے اللہ ہی کافی ہے وہی مجھے اس افترا پردازی پر سزا دے گا، تم مجھ سے اللہ کے عذاب کو دور

کرنے پر قدرت نہیں رکھتے ہو، بھلا میں تمہاری وجہ سے اسے کیسے گھڑ سکتا ہوں اور اللہ کے عذاب سے کیسے تعرض کر سکتا ہوں؟

هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ: اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم قرآن مجید کے بارے میں باتیں کرتے ہو اور جو ردو قدح کرتے ہو کہ قرآن شعر ہے، جادو ہے، افترا ہے وغیرہ۔

كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ کافی ہے، وہ میری سچائی اور تبلیغ کی گواہی دے گا اور تمہارے خلاف انکار و تکذیب کی گواہی دے گا۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو بخش دیتا ہے اور اپنے مؤمن بندوں کے لیے مہربان ہے۔ ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں کفار سے مغفرت اور رحمت کا وعدہ ہے، اگر وہ کفر و ضلالت سے لوٹ آئیں اور توبہ کر لیں، نیز اللہ تعالیٰ کے حلم کا اظہار بھی ہے چونکہ وہ عذاب دینے میں جلد بازی نہیں کر رہا ہے۔ (البحر المحیط ۸:۵۶، صفوۃ التفاسیر)

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مآل کار کا علم

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ **مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ** کا کیا مطلب ہے؟

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ {۹} الأحقاف

جواب ترجمہ: کہو کہ: میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا پیغمبر نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو گا؟ میں کسی اور چیز کی نہیں، صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے۔ اور میں تو صرف ایک واضح انداز سے خبردار کرنے والا ہوں۔

خلاصہ تفسیر: اس آیت کے شان نزول کے بارے میں علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ اسباب النزول میں لکھتے ہیں کہ جب نبی کریم کے صحابہ پر مصیبتوں کی شدت ہو گئی تو رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ کھجور اور دوسرے درختوں اور پانی والی زمین کی طرف ہجرت کر رہے ہیں آپ نے یہ خواب صحابہ کو

سنایا اس سے وہ خوش ہوگئے انہوں نے مشرکوں کے ہاتھوں سے ملنے والی اذیتوں سے نجات اور خلاصی کی ایک راہ دیکھ لی انہوں نے کچھ دیر انتظار کیا انہیں اس خواب کی تعبیر نظر نہ آئی تو انہوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ اس سرزمین کی طرف کب ہجرت کریں گے جسے آپ نے خواب میں دیکھا ہے؟ رسول اللہ خاموش رہے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ یعنی میں نہیں جانتا کہ میں نے خواب میں جو زمین دیکھی ہے اس کی طرف نکالا جاتا ہوں یا نہیں یہ تو ایک چیز تھی جو میں نے خواب میں دیکھی تھی میں تو صرف اسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بذریعہ وحی نازل کی جاتی ہے۔ (اسباب النزول)

تفسیر مظہری کے مصنف علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، بدع اور بدیع دونوں ہم معنی ہیں، جیسے نصف اور نصیف، یعنی میں پہلا پیغمبر نہیں ہوں کہ جو دعویٰ مجھ سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں کیا، وہ میں کر رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر ہو چکے ہیں، پھر تم لوگ میری نبوت کا انکار کیوں کرتے ہو؟ جبکہ معجزات بھی میری نبوت کی تصدیق کر رہے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ میں انوکھا پیغمبر نہیں ہوں کہ تمہارے مطالبات اور مطلوبہ فرمائشیں پوری کر دوں، جو پہلے پیغمبر نہیں کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔

وَمَآ اَدْرِیْ الخ بعض اہل تفسیر نے اس آیت کے یہ معنیٰ بیان کئے کہ مجھے نہیں معلوم تمہارے ساتھ قیامت کے دن کیا کیا جائے گا اور میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کافر بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے: قسم ہے لات وعزّٰی کی! اللہ کے نزدیک ہمارا اور محمد ﷺ کا درجہ ایک ہی ہے، ان کو ہم پر کوئی برتری اور مرتبہ حاصل نہیں۔ اگر یہ کلام اس کا خود ساختہ نہ ہوتا (اور اللہ کی طرف سے اس کو پیغمبر بنایا گیا ہوتا) تو اللہ اس کو اس کی برتری اور مرتبہ سے واقف کر دیتا۔

اس کے بعد آیت لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ نازل ہوئی تو صحابہ نے

عرض کیا: یا نبی اللہ ﷺ! آپ کو مبارک ہو، اللہ جو معاملہ اور سلوک آپ سے کرے گا، وہ تو ہم کو معلوم ہو گیا لیکن ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا، یہ ہم کو معلوم نہیں ہوا، اس پر آیت لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ الخ اور آیت وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا نازل ہوئی اور اللہ نے بتادیا کہ اللہ کے نبی کے ساتھ کیا کیا جائے گا اور اہل ایمان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

مفسر قرآن امام بغوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: یہ قول حضرت انس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ اور حسن رحمہ اللہ اور عکرمہ رحمہ اللہ کا ہے، ان حضرات کا بیان ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کی صلح سے پہلے نازل ہوئی تھی، لیکن جب حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کو آپ کی ساری اگلی پچھلی فروگذاشتوں کے معاف ہونے کی اطلاع دے دی گئی تو آیت مذکورہ منسوخ ہو گئی۔ میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن کی ہر سورت میں مدنی سورت ہو یا مکی، مؤمنوں کیلئے وعدۂ مغفرت اور کافروں کیلئے وعید عذاب مذکور ہے۔

سب سے پہلے (حکم تبلیغ کی) آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اقرباء ایمان نہ لائیں تو ان کو عذاب کی وعید سنا دو، اس سورۃ میں بھی کافروں کو عذاب کی وعید اور مؤمنوں کو بشارت دی گئی ہے اور صراحت کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب مان لیا اور اس پر قائم رہے اور سیدھی چال چلتے رہے تو ان کو نہ عذاب کا خوف ہو گا، نہ غم۔ اور سب کے سب جنتی ہوں گے۔ فرمایا ہے: وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کا (اچھا) اور کافروں کا (برا) انجام رسول اللہ ﷺ کو معلوم نہ ہو اور اللہ کی کتاب میں بھی اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اس سے تو کافروں کو اعتراض کرنے اور یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ہمارا اور محمد ﷺ کا معاملہ اللہ کے نزدیک ایک ہی ہے، ان کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، پھر باپ دادا کے مذہب کو ترک اور پیغمبر کی اتباع کرنے سے کیا فائدہ۔

اس کے علاوہ ایک خرابی یہ ہو جائے گی کہ اگر آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ

وَمَا تَأَخَّرَ اور آیت لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ کا نزول بعثت سے کچھ اوپر دس سال کے بعد مانا جائے گا تو وقت ضرورت سے بیان کی تاخیر لازم آئے گی اور یہ محال ہے۔ (مظہری)

ایک شبہ: بغوی رحمہ اللہ نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ام علاء انصاریہ نے کہا: جب مہاجر مدینہ میں آئے تو ان کی سکونت (اور میزبانی) کے سلسلہ میں انصار نے قرعہ اندازی کی۔ ہمارے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے اور ہمارے پاس ان کی سکونت ہوگئی، پھر وہ بیمار ہوگئے، ہم نے ان کی تیمار داری کی، کچھ مدت کے بعد ان کی وفات ہوگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، میں بھی اندر چلی گئی اور میں نے کہا: ابو السائب! آپ پر اللہ کی رحمت ہو، میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ نے آپ کی عزت افزائی فرمادی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے کیا معلوم کہ اللہ نے اس کی عزت افزائی فرمادی ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں، اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو اس کے رب کی طرف سے موت آگئی، اور میں اس کیلئے بھلائی کی امید رکھتا ہوں۔ اور باوجودیکہ میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ جانتا ہوں کہ) تم لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ حضرت ام علاء نے فرمایا: اس واقعہ کے بعد میں کسی کے گناہوں سے پاک ہونے کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ عثمان بن مظعون کا ایک چشمہ جاری ہے۔ میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس کے اعمال (خیر) ہیں۔

یہ حدیث اس تفسیر کی تائید کر رہی ہے جس میں آیت کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ میں نہیں جانتا کہ قیامت کے دن میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ اگر یہ مراد نہیں ہے تو پھر حدیث کا مطلب ہی کیا ہوگا۔

اس شبہ کے اظہار کے بعد قاضی ثناء اللہ اس کا جواب تحریر فرماتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں: حدیث کا تقاضا ہے کہ کسی معین شخص کی نجات یا ہلاکت کا قطعی فیصلہ کرنا ناجائز ہے، کیونکہ یہ علم غیب کا دعویٰ ہو جائے گا اور اللہ کے سوا کوئی بھی باطن اور غیب کا علم نہیں رکھتا، لیکن اگر کسی شخص کے ظاہری

احوال (اعمال) اچھے ہوں تو اس کیلئے خیر کی امید کی جاسکتی ہے۔

حدیث مبارک کا مطلب یہ ہے کہ میں باوجود یکہ اللہ کا رسول ہوں، اللہ نے مجھے اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم عطا فرما دیئے ہیں، پھر بھی میں تفصیلی طور پر نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے خاص خاص اعمال کی جزا کیا ہو گی۔ تجھے معین شخص یعنی ابوالسائب کے متعلق کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ نے اس کی عزت افزائی فرمادی۔ (مظہری)

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ کی اسی طرح کی تاویل بعض اہل تفسیر نے یہ بھی کی ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ دنیا اور آخرت میں میرے ساتھ (تفصیلی طور پر) کیا کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، کیونکہ مجھے غیب کا علم نہیں۔

یہ تفسیر رفتار کلام کے اقتضاء کے خلاف ہے، آیت کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ کفار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مذہب پر لانے کے خواستگار تھے، مال کا لالچ بھی دیتے تھے اور بغیر مہر کے حسب پسند عورتوں سے نکاح کرا دینے کا بھی اور بصورت انکار آپ کو تکلیفیں بھی دیتے تھے اور ڈراتے دھمکاتے بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کسی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرمادیا کہ مجھے نہ تم سے کوئی دنیوی لالچ ہے، نہ کسی قسم کا خوف۔ کوئی بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ خیر و شر، سب اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جیسا چاہے گا کرے گا۔ رفتار کلام کے اس اقتضاء کو پیش نظر رکھ کر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، کون کامیاب ہو گا اور کس کو ناکام چھوڑ دیا جائے گا۔ بہر صورت میں تمہارا اتباع نہیں کر سکتا۔ (تفسیر مظہری)

آیت کے آخری حصہ پر قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ ان اتبع الا ما یوحی الی میں تو بس اسی وحی پر چلوں گا جو میرے پاس بھیجی جارہی ہے، یعنی قرآن پر چلوں گا، اس کو کبھی ترک نہیں کروں گا۔ (مظہری)

بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کافروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ غیبی باتیں جن کے متعلق کوئی وحی نہیں آئی تھی، دریافت کی تھیں، یہ آیت ان کی درخواست کا جواب ہے، یا یوں کہا جائے کہ

مسلمانوں نے درخواست کی تھی کہ کافروں کی طرف سے جو اذیتیں ان کو پہنچ رہی ہیں، ان سے جلد از جلد رہائی مل جائے، اس خواہش کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی کا یہی قول ہے۔ (بیضاوی)

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر کفار طرح طرح کے اعتراضات کرتے۔ کبھی کہتے یہ بشر ہے۔ بھلا بشر بھی منصب نبوت پر فائز ہو سکتا ہے؟ کبھی کہتے یہ تو بالکل ہماری طرح کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ بھلا رسول سے بھی ایسے معمولی کام سرزد ہوتے ہیں؟ کبھی کہتے اگر خدا کو رسول بنا کر بھیجنا ہی تھا تو وہ کیا ایسے شخص کو رسول بناتا جس کے پاس نہ مال، نہ دولت، نہ خدم، نہ حشم، نہ بھائی، نہ اعوان وانصار، بھلا یہ بھی کوئی تک ہے؟ ہمارے ہاں بڑے بڑے رؤسا ہیں جو زیرک بھی ہیں اور تجربہ کار بھی۔

ان کے اثر ورسوخ کا دائرہ بڑا وسیع ہے، عرب کے تمام قبائل کے دلوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے، ان کی دولت وثروت کے افسانے دور دور تک مشہور ہیں۔ منصب رسالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کیوں کسی کو منتخب نہ کیا، پھر وہ فرمائش کرتے ہیں کہ ہم تب مانیں گے اگر یہ خشک کالے پہاڑ یہاں سے دور ہٹا دیئے جائیں، حد نگاہ تک ہموار میدان ہو، اس میں چشمے ابلنے لگیں، نہریں بہنے لگیں وغیرہ وغیرہ۔

ان سب ہرزہ سرائیوں کے جواب میں صرف ایک ہی پر مغزبات فرمانے کا حکم دیا کہ اے رونق بزم ہستی! اے شمع محفل امکان! آپ انہیں کہیں کہ کیا میں نرالا رسول ہوں، مجھ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں آیا؟ اگر میں پہلا رسول ہوتا تو تمہاری ان اکھڑی اکھڑی باتوں میں کچھ وزن ہوتا اور ان کے جواب کی طرف توجہ کی جاتی، جب مجھ سے پہلے کثیر تعداد میں پیغمبر آچکے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم بھی مانتے ہو اور ان کا احترام کرتے ہو، کیا وہ انسان نہ تھے؟ کیا وہ کھاتے پیتے نہ تھے؟ کیا وہ زروسیم کے انباروں کے مالک تھے؟ کیا وہ اپنی امت کی ایسی بے ہودہ فرمائشوں کو پورا کیا کرتے تھے؟ جب ایسا نہیں تھا تو تم میرے متعلق یاوہ گوئی کیوں کرتے ہو۔

میرا کام ظاہری چشمے جاری کرنا نہیں، میں تو معرفت الٰہی کے چشموں سے تمہارے اجڑے ہوئے

چمن حیات کو از سر نو بہار آشنا کرنے آیا ہوں، ان پہاڑوں کو تو تم ڈائنامیٹ سے بھی اڑا سکتے ہو، میں ایسے حجابات اٹھانے کے لئے آیا ہوں جنہوں نے تمہارے دلوں کی آنکھوں کو اندھا بنا رکھا تھا۔ مجھ سے جو اور چنے کے بھاؤ نہ پوچھو۔ مجھ سے اپنے رب کریم کے قرب و رضا کے طریقے سیکھو۔

میں تمہیں اس بت کدہ تصورات سے نکال کر حریم ذات تک لے جاؤں گا، مجھ سے اس چور کے بارے میں سوال نہ کرو جو تمہارا گھوڑا اور اونٹ چرا کر لے گیا ہے۔ مجھ سے اس راہزن اور ڈاکو کا پتہ پوچھو جو دن دہاڑے تمہارے ایمان و ایقان کے خزانوں پر ڈاکہ ڈال رہا ہے، اس کا پورا پتہ اور نشان بتاؤں گا، تم اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لو گے۔

کیا ہوا اگر میرے پاس خزانے نہیں، کیا دنیا کے شہنشاہوں کے خزانوں کے قیمتی موتی، علوم و معارف، اسرار و لطائف کے ان درہائے آبدار کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن سے میرے رب نے مجھے سرفراز فرمایا ہے، پیغمبر تمہارا نوکر نہیں ہوتا کہ تمہاری فرمائشوں کی تعمیل میں لگا رہے، وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور تمہارا آقا ہے۔ وہ تو صرف اور صرف اپنے رب کی فرمانبرداری کرے گا۔ ہاں! تمہاری عزت و شرف اس میں ہے کہ بے چون و چرا اس کی اطاعت کرو۔ (ضیاء القرآن)

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ: دریٰ: حیلہ سے جاننا۔ (المنجد اردو ص ۳۲۱) دریٰ: وہ معرفت جو کسی قسم کے حیلہ سے حاصل کی گئی ہو۔ (المفردات ج ۱ ص ۲۲۴) دریٰ: کسی قسم کے حیلہ سے جاننا۔ (القاموس ص ۱۲۸۲) کسی چیز کو قیاس سے اور حیلہ سے جاننا درایت ہے اور کسی چیز کو مطلقاً جاننا علم ہے۔ علم کے بجائے درایت کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ درایت میں کسی چیز کو حیلہ سے جاننے کا معنی ہے۔ (روح المعانی علامہ محمود آلوسی فی سورۃ لقمان ۳۴) علامہ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اَلدِّرَایَۃُ: اَلْمَعْرِفَۃُ الْمُدْرِکَۃُ بِضَرْبٍ مِنَ الْحِیَلِ، یُقَالُ: دَرَیْتُہٗ، وَدَرَیْتُ بِہٖ، دِرْیَۃً، نَحْوَ: فِطْنَۃً، وَشِعْرَۃً، وَادَّرَیْتُ قَالَ الشَّاعِرُ:

وَمَاذَا یَدَّرِی الشُّعَرَاءُ مِنِّیْ ... وَقَدْ جَاوَزْتُ رَأْسَ الْأَرْبَعِیْنَ

درایت اس معرفت کو کہتے ہیں جو ظن و تخمین سے حاصل ہوتی ہے۔ فہم و ذہانت سے کسی چیز کو سمجھنا۔ علامہ راغب ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ درایت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ شاعر کا یہ مصرع جس میں اللہ تعالیٰ کو ”الداری “کہا گیا ہے، یہ شاعر کی جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے، علامہ زبیدی شارح قاموس اپنی مایہ ناز تصنیف تاج العروس میں اس کی تحقیق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

قالَ شيْخُنا: صَرِيْحُه اتِّحادُ العِلْمِ والدِّرَايَةِ.وصَرَّحَ غيرُهُ: بأَنَّ {الدِّرايَةَ أَخَصُّ مِن الْعِلْم، كَمَا فِي التَّوْشِيح وغيرِهِ.وقيلَ: إنَّ} دَرَى يكونُ فِيمَا سَبَقه شَكٌّ، قالَهُ أَبو علىَ (أَو) عَلِمْتُه (بضَرْبٍ من الحِيلَةِ) وَلِذَا لَا يُطْلَقُ على اللهِ تَعَالَى وأَمَّا قَوْلُ الراجزِ: لَا هُمَّ لَا {أَدْرِي وأَنْتَ} الدَّارِي فَمن عجرفة الأَعْراب (تاج العروس)

مطلب یہ کہ درایت بذات خود بھی متعدی ہوتا ہے اور باء کے ساتھ بھی اس کا تعدیہ کیا جاتا ہے، درایت کا معنیٰ ہے میں نے جان لیا ہے، میرے شیخ کہتے ہیں کہ علم و درایت ہم معنیٰ ہیں، لیکن دوسرے علماء لغت نے تصریح کی ہے کہ درایت علم سے خاص ہے یا حیلہ و قیاس سے کسی کو جاننا درایت کہلاتا ہے، اسی لئے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا اور ایک رجز گو نے درایت کی نسبت اس مصرعہ میں ذات باری کی طرف کی ہے، یہ اس کا گنوارپن ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے درایت کی تشریح ان الفاظ سے کی ہے، الدِّرَايَة: أَيْ إِدْرَاكُ الْعَقْلِ بِالْقِيَاسِ عَلَى غَيْرِهِ، یعنی عقل کا بذریعہ قیاس کسی دوسری چیز کو جاننا۔ (الدرالمختار وحاشیہ شامی ۱: ۱۳۷) پتا چلا کہ درایت کا مطلب یہ ہے کہ غور و فکر، ظن اور تخمینہ اور قیاس سے کسی چیز کو جاننا، اس مفہوم کو جانتے ہوئے قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ میں فکر و تدبر کیا جائے تو کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، تخصیص کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی نسخ کا قول تسلیم کرنا پڑے گا، یوں قرآنی نصوص اور نبوی فرامین میں کسی قسم کے تضاد اور تعارض کی نوبت بھی نہیں آئے گی اور نہ کسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مبارک تولنے اور ناپنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ

آپ ان کفار کو بتادیجئے کہ میں اپنی عقل و فہم، ذہانت و فطانت اور قیاس سے نہ یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا، مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اس دعوت کا انجام کیا ہو گا یا تمہاری سرکشی کی تمہیں کب اور کیا سزا ملے گی۔ ان امور کو میں اپنی فہم و فراست سے نہ تفصیلاً جان سکتا ہوں اور نہ اجمالاً، میرا علمی سرمایہ میری عقل و شعور کا اثر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

اگر میں نے غور و فکر سے ان حقائق کو جانا ہوتا تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی اور تمہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ اس کو جانچو اور اپنی کسوٹی پر پرکھو، لیکن میرا علم تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اس میں شک و شبہ کا ذرا شائبہ نہیں، "مادری" سے درایت کی نفی ہے، مایوحی الی سے علم خداداد کا ثبوت ہے، سکھلانے والا اللہ تعالیٰ ہو اور سیکھنے والا مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہو، استاذ عالم الغیب والشہادہ ہو اور تلمیذ غار حرا کا گوشہ نشین ہو، بھیجنے والا رب العالمین ہو اور آنے والا رحمۃ للعالمین ہو، وہاں کمی رہے گی تو کیسے؟ کوئی نقص ہو گا تو کس جانب سے؟ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس مقام پر چند اقوال نقل فرمائے ہیں، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں

أَمَا فِي الآخِرَةِ فَمَعَاذَ اللهِ، قَدْ عَلِمَ أَنَّهُ فِي الجَنَّةِ حِينَ أُخِذَ مِيثَاقُهُ فِي الرُّسُلِ، وَلٰكِن قَالَ: وَمَا أَدرِي مَا يُفعَلُ بِي وَلَا بِكُم فِي الدُّنيَا، أُخرَجُ كَمَا أُخرِجَتِ الأَنبِيَاءُ قَبلِي أَو أُقتَلُ كَمَا قُتِلَتِ الأَنبِيَاءُ مِن قَبلِي، وَلَا أَدرِي مَا يُفعَلُ بِي وَلَا بِكُم، أُمَّتِي المُكَذِّبَةُ، أَم أُمَّتِي المُصَدِّقَةُ، أَم أُمَّتِي المَرمِيَةُ بِالحِجَارَةِ مِنَ السَّمَاءِ قَذفًا، أَم مَخسُوف بِهَا خَسفًا، (جامع البیان فی تاویل القرآن)

یعنی یہ کہنا کہ حضور ﷺ کو یہ علم نہ تھا کہ آخرت میں حضور ﷺ کے ساتھ کیا کیا جائے گا تو ایسی نازیبا بات سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ حضور ﷺ کو اس وقت سے اپنے جنتی ہونے کا علم تھا جب روز اول ارواح انبیاء سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا تھا۔ بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں

جانتا کہ دنیا میں مجھے سابقہ انبیاء کی طرح جلاوطن کر دیا جائے گا یا نہیں، یا مجھے قتل کر دیا جائے گا جس طرح مجھ سے پہلے انبیاء کو قتل کیا گیا تھا، اور میں یہ نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، میری امت مجھے جھٹلائے گی یا میری تصدیق کرے گی، یا میری امت پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں گے یا اسے دھنسایا جائے گا دھنسایا جانا۔

مفسر قرآن علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے فرمان کو درست قرار دیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں جو معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جانے والا تھا اور جو سلوک آپ کی قوم اور دوسرے مکذبین کے ساتھ ہونے والا تھا اس کو بیان کر دیا۔ علامہ نیشا پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یعنی خود بخود جان لینے کی نفی کی گئی ہے اور جو بذریعہ وحی عطا ہوا اس کی نفی نہیں۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ نے تو بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔

وَالَّذِی أختَارَہ أَنَّ المَعنیٰ عَلَی نَفی الدِّرَایَةِ مِن غَیرِ جِھَةِ الوَحیِ سَوَاء کَانَ الدِّرَایَةُ تَفصِیلِیَة أَو إجمَالِیَة وَسَوَاء کَانَ ذَلكَ فی الأُمُور الدُّنیَوِیَةِ أَو الأُخرَوِیَةِ وَأَعتَقِدُ أَنَّهُ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ لَم یَنتَقِل مِنَ الدُّنیَا حَتَّی أُوتِیَ مِنَ العِلمِ باللهِ تَعَالَی وَصِفَاتِهِ وَشُؤُونِهِ وَالعِلم بأَشیَاءِ یُعَدُّ العِلمُ بِهَا کَمَالًا مَّا لَم یُؤتِهِ أَحَد غَیرُهُ مِنَ العَالَمِینَ، وَلَا أَعتَقِدُ فَوَاتَ کَمَال بعَدمِ العِلمِ بحَوَادِثٍ دُنیَوِیَةٍ جُزئِیَةٍ کَعَدمِ العِلمِ بمَا یَصنَعُ زَید مَثَلاً فی بَیتِهِ وَمَا یَجری عَلَیهِ فی یَومِهِ أَو غَدِهِ، وَلَا أَرَی حَسَنًا قَولَ القَائِل: إنَّه عَلَیهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ یَعلَمُ الغَیبَ وَأستَحسِنُ أَن یُّقَالَ بَدلَه: إنَّهُ صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ أَطلَعَهُ اللهُ تَعَالَی عَلَی الغَیبِ أَو عَلَّمَهُ سُبحَانَه إیَّاهُ أَو نَحوُ ذَلِكَ، (روح المعانی)

جس چیز کو میں اختیار کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس آیت سے اس درایت کی نفی کرنا مراد ہے جو بغیر وحی کے ہو (یعنی میں از خود نہیں جانتا)، عام ازیں کہ وہ درایت تفصیلی ہو یا اجمالی ہو اور خواہ اس کا تعلق دنیاوی امور سے ہو یا اخروی امور سے ہو اور میرا اعتقاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک دنیا سے منتقل نہیں ہوئے حتیٰ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور تمام شانوں کا علم دے دیا گیا اور جن چیزوں

کے علم کو کمال قرار دیا جاتا ہے ان تمام چیزوں کا علم آپ کو دے دیا گیا۔

اور آپ کو اتنا علم دیا گیا ہے کہ تمام جہانوں میں کسی کو اتنا علم نہیں دیا گیا اور میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ دنیا کے بعض جزوی حوادث کا علم نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے علم کا کمال نہیں رہے گا، مثلاً یہ کہ زید آج اپنے گھر میں کیا کر رہا ہے اور کل کیا کرے گا اور میں کسی قائل کے اس قول کو اچھا نہیں جانتا کہ نبی ﷺ غیب کو جانتے ہیں اس کو اس کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرما دیا ہے یا اللہ سبحانہٗ نے آپ کو غیب کا علم عطا فرما دیا ہے یا اس طرح کی کوئی اور بات کہنی چاہیے۔

شیخ غلام رسول سعیدی نے اس آیت کے ذیل میں بہت تفصیلی حاشیہ لکھا ہے، اس کے بعد وہ خلاصہ بحث کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جن علماء نے الاحقاف: ۹ میں درایت کی نفی کو دنیا کے احوال پر محمول کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ آپ آخرت میں جنت میں ہوں گے اور کفار دوزخ میں ہوں گے اس لئے آیت کا یہی معنیٰ ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ دنیا میں میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور آخرت میں کیا کیا جائے گا اور یہ معنیٰ نہیں ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا کیونکہ آپ کو اپنے اخروی انجام کے اچھے ہونے اور کفار کے اخروی انجام کے برے ہونے کا قطعی طور پر علم تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ جو یہ قطعی علم تھا وہ وحی سے تھا اور اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کے خبر دینے کے بغیر از خود آپ کو اس کا علم نہیں تھا اور یہی معنیٰ اس آیت میں مراد ہے۔ (تبیان)

بنی اسرائیل کا گواہ کون تھا؟ اور گواہی کیا تھی؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ {۱۰} الأحقاف

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجیے کہ تم بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو اور تم اس کے منکر ہو گئے اور بنی اسرائیل میں سے کوئی گواہ اس جیسی کتاب پر گواہی دے کر ایمان لے آئے اور تم تکبر

کرو، بیشک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ عوف بن مالک اشجعی سے نقل کیا ہے کہ

انْطَلَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا مَعَهُ حَتَّى دَخَلنَا عَلى كَنِيسَةِ الْيَهُود يَوْمَ عِيدِهِم فَكَرِهُوا دُخُولَنَا عَلَيْهِم فَقَالَ لَهُم رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَرُونِي اِثْنَى عَشَرَ رَجُلًا مِّنْكُم يَشْهَدُونَ أَن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ يَحبِطُ اللهُ عَن كُل يَهُودِيّ تَحتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ الْغَضَبَ الَّذِي عَلَيْهِ فَسَكَتُوا فَمَا أَجَابَهُ مِنْهُم أَحَد ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ فَلَم يُجِبهُ أَحَد فثلث فَلم يجبهُ أحد فَقَالَ: أَبَيْتُم فَوَ اللهِ لأَنَا الحَاشِرُ وَأَنَا العَاقِبُ وَأَنَا المُقَفِّي آمنتم أَو كَذبْتُمْ ثمَّ انْصَرَفَ وَأَنَا مَعَه حَتَّى كِدنَا أَن نَخرُجَ فَإِذَا رَجُل مِن خَلفِهِ فَقَالَ: كَمَا أَنْتَ يَا مُحَمَّدُ فَأَقبَلَ فَقَالَ ذٰلِك الرَّجُلُ أَي رجل تعلمونى فِيكُم يَا مَعشَرَ الْيَهُودِ فَقَالُوا: وَاللهِ مَا نَعلَمُ فِينَا رَجُلًا أَعلَمُ بِكِتَاب اللهِ وَلَا أَفقَهُ مِنْكَ وَلَا مِن أَبِيكَ وَلَا مِن جَدِّكَ قَالَ: فَإِنِّي أَشهَدُ بِاللهِ أَنَّهُ النَّبِي الَّذِي تَجِدُونَهُ فِي التَّوْرَاةِ والإِنجيل قَالُوا: كَذَبتَ ثمَّ رَدُّوا عَلَيْهِ وَقَالُوا شَرًّا فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَذَبْتُمْ لَن يُّقبَلَ مِنْكُم قَوْلُكُم فَخَرَجنَا وَنَحنُ ثَلَاث: رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم وَأَنَا وَابْنُ سَلَام (تفسیر در منثور، اسباب النزول)

نبی کریم اور میں اکٹھے چلے یہاں تک کہ ہم یہود کی عید کے دن ان کے کنیسہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے ہمارا آنا ناپسند کیا رسول اللہ نے ان سے فرمایا اے یہود کی جماعت! تم مجھے اپنے میں سے بارہ آدمی دے دو جو یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ آسمان تلے ہر یہودی سے غضب کو ہٹا دیں گے، وہ سب خاموش رہے ان میں سے ایک نے بھی کوئی جواب نہ دیا، آپ واپس ہوئے تو آپ کے پیچھے سے ایک شخص نے آواز دی اے محمد! اپنی جگہ پر کھڑے رہو، وہ آپ کے قریب آیا اور کہا اے یہود کی جماعت! تم مجھے اپنی جماعت میں سے کیسا جانتے ہو؟ انہوں نے کہا اللہ کی قسم ہم اپنی جماعت میں تجھ سے بڑھ کر کتاب اللہ کو جاننے والا اور

سمجھنے والا کوئی شخص نہیں پاتے اور نہ تجھ سے پہلے تیرے باپ سے اور اس سے پہلے تیرے دادا سے بڑھ کر کوئی شخص پاتے ہیں، اس نے کہا، پھر میں گواہی دیتا ہوں یہ وہی نبی ہیں جن کا تذکرہ تم تورات اور انجیل میں پاتے ہو انہوں نے کہا تو نے جھوٹ بولا پھر انہوں نے اس کا رد کیا اور اس کی نسبت بری باتیں کہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی، قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (معجم طبرانی الکبیر ۱۸ : ۴۶، طبری ۱۶ : ۱۱، مسند احمد ۶ : ۲۵ در منثور) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن سلام سے منقول ہے کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ (زادالمسیر ۷ : ۳۷۳، ابن کثیر ۴ : ۱۵۶)

اکثر مفسرین کرام نے یہاں شاہد سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہی کو لیا ہے، کچھ کو صرف اس وجہ سے مغالطہ لگا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور یہ آیت مدنی ہے، کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے جب کہ عبد اللہ بن سلام تو مدینہ میں اسلام لائے تھے۔

ایک اردو زبان کی تفسیر میں راقم الحروف نے دیکھا کہ اس میں یہاں شاہد سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کو بتایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے اور ان پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی، حالانکہ روایات اس بارے میں واضح طور پر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہی کے بارے میں بتا رہی ہیں، بات بھی یہی درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دی تھی نہ کہ شہادت، آپ بشیر ہوئے نہ کہ شاہد۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں مفسرین کہتے ہیں: بنی اسرائیل کے گواہ سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں، چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا، جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ آپ نبی منتظر ہیں، عرض کی: میں آپ سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا، ان کو اللہ کے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا، قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ اہل جنت کا پہلا کھانا کیا ہو گا؟ اولاد باپ یا ماں کے

مشابہ کیوں ہوتی ہے ؟ آپ ﷺ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو جواب دیا، کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں (قصہ اسلام عبد اللہ بن سلام، بخاری)

کفار، اہل ایمان، کتاب موسیٰ، ایمان پر ثابت قدمی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ {۱۱} وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ {۱۲} اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ {۱۳} اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۱۴} الاحقاف

جواب ترجمہ: اور کافروں نے ایمان والوں کے بارے میں یوں کہا کہ اگر یہ ایمان لانا کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ لوگ ہم سے آگے کیوں بڑھ جاتے، اور جب قرآن کے ذریعہ انہوں نے ہدایت نہ پائی تو یوں کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے، اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ہے جو پیشوا تھی اور رحمت تھی اور یہ کتاب ہے جو تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں ہے، تاکہ ظالموں کو ڈرائے، اور خوشخبری ہے اچھے کام کرنے والوں کے لیے، بلاشبہ جن لوگوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے تو ان پر کوئی خوف نہیں ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے، یہ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ: کفار مکہ نے مؤمنین کے بارے میں کہا: اگر یہ قرآن اور دین حق و سچ اور خیر ہوتا تو یہ فقرا، ضعفا ہمارے اوپر سبقت نہ لے جاتے، ان کی مراد حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت صہیب اور حضرت حباب رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ تھے جو کمزور اور غلام تھے اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۳۱۸)

وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ: جب ان بدبختوں نے قرآن سے ہدایت نہ لی

جب کہ اعجاز قرآن صاف واضح ہے کہنے لگے یہ تو پرانا جھوٹ ہے جو پہلے لوگوں سے منقول چلا آرہا ہے، اب کی بار اسے محمد لے کر آگیا ہے اور اسے اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً: قرآن سے پہلے تورات کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا جو رہنما ہے، اللہ کے دین اور شرائع میں اس کی اقتدا کی جاتی ہے جیسے امام کی اقتدا کی جاتی ہے اور یہ کتاب رحمت ہے اس شخص کے لیے جو اس پر ایمان لائے اور اس پر عمل کرے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس آیت کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ مشرکین صحت قرآن پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے، اگر یہ خیر ہوتا تو ضعفا و تنگدست و محتاجین ہمارے اوپر سبقت نہ لے جاتے، اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کر دیا کہ تم نے اس بات پر نزاع کھڑا نہیں کیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کو رہنما بنایا، یہی تورات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دے رہی ہے، جب تم نے تسلیم کر لیا کہ تورات اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے تو اس کا حکم بھی تسلیم کر لو کہ محمد اللہ کے برحق پیغمبر نہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ (التفسیر الکبیر للرازی ۱۲:۲۸)

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا: یہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے اور اس سے پہلے جتنی کتابیں آئیں ان کی تصدیق کرتی ہے اور یہ فصیح عربی زبان میں ہے، بھلا قرآن کا کیسے انکار کرتے ہیں جب کہ یہ افصح کتاب ہے ازروئے بیان ظہر کتاب ہے ازروئے برہان، تورات سے ابلغ کتاب ہے ازروئے اعجاز؟

لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ: تاکہ ظالم کفار مکہ کو دوزخ کے عذاب سے ڈرائے اور نیک مؤمنین کو جنت کی خوشخبری دے، اوپر مشرکین مکذبین کے احوال بیان ہوئے اب مؤمنین کے احوال بیان کیے جا رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: بیشک جن لوگوں نے ایمان، توحید اور استقامت کو جمع کیا، فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: آخرت میں انہیں کوئی پریشانی اور ناگواری نہیں پیش آئے گی۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: انہوں نے جو کچھ دنیا میں چھوڑا اس پر حزین و غمگین نہیں ہوں گے۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: یہی وہ لوگ ہیں جو دین میں استقامت دکھانے والے ہیں اور

وہ اہل جنت ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یہ نعمتیں انہیں نیک اعمال کے بدلے میں ملیں گی۔

مدت حمل، مدت فطام اور کمال عمر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ {۱۵} الأحقاف

جواب ترجمہ: اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اسے (پیٹ میں) اٹھائے رکھا، اور بڑی مشقت سے اس کو جنا، اور اس کو اٹھائے رکھنے اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہوتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری توانائی کو پہنچ گیا، اور چالیس سال کی عمر تک پہنچا تو وہ کہتا ہے کہ یارب! مجھے توفیق دیجیے کہ میں آپ کی اس نعمت کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی، اور ایسے نیک عمل کروں جن سے آپ راضی ہو جائیں، اور میرے لیے میری اولاد کو بھی صلاحیت دے دیجیے، میں آپ کے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں شامل ہوں۔

خلاصہ تفسیر: اس آیت مبارکہ کے ذیل میں ایک شرعی مسئلہ ایسا نکلتا ہے جس میں حضرات فقہاء کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے بندہ اس آیت کی تفسیر میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن سے اس آیت کے ذیلی معارف و مسائل یہاں من وعن نقل کرتا ہے، حضرت مفتی رحمہ اللہ نے انتہائی احسن انداز میں اس آیت کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان چار آیتوں میں اصل مضمون انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرنا ہے اور ضمناً دوسری تعلیمات آئی ہیں، اگرچہ بعض روایات

حدیث سے ان آیات کا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور اسی بنا پر تفسیر مظہری نے وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ میں الانسان کے الف لام کو عہد کا قرار دے کر اس سے مراد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قرار دیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی آیت قرآن کا سبب نزول کوئی خاص فرد یا خاص واقعہ ہو تو پھر بھی حکم سب کے لئے عام ہی ہوتا ہے۔

شان نزول خاص صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہوں اور تخصیصات مندرجہ آیات انہیں کی صفات ہوں جبھی مقصود آیات کا تعلیم عام ہی ہے اور اگر اصل آیات کو عام تعلیم قرار دیا جائے، اس میں بھی صدیق اکبر اس تعلیم کے پہلے مصداق قرار پائیں گے، جوان ہونے اور چالیس سال عمر ہونے کے بعد کی جو تخصیصات ان آیات میں مذکور ہیں وہ تخصیصات بطور تمثیل کے ہوں گی اب آیات مذکورہ کے خاص خاص الفاظ کی تشریح دیکھئے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا: لفظ وصیت تاکیدی حکم کے معنٰی میں آتا ہے اور احسان بمعنے حسن سلوک ہے جس میں ان کی خدمت واطاعت بھی داخل ہے اور تعظیم و تکریم بھی۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا: لفظ کرھا بضم الکاف اس مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی وجہ سے برداشت کرنا پڑے اور کرھا بفتح کاف اس محنت و مشقت کا نام ہے جس پر ان کو کوئی دوسرا آدمی مجبور کرے۔ اسی سے اکراہ مشتق ہے۔

پہلے جملے میں جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے یہ دوسرا جملہ اس کی تاکید کے لئے ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت ضروری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمہاری پیدائش سے لے کر جوانی تک تمہارے لئے بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، خصوصاً ماں کی محنت و مشقت بہت ہی نمایاں ہے اس لئے یہاں بیان صرف ماں کی مشقت کا کیا گیا ہے کہ اس نے ایک طویل مدت نو ماہ اپنے پیٹ میں تم کو اٹھائے رکھا جس میں اس کو طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر ولادت کے وقت سخت درد اور تکلیف کے ساتھ تمہارا وجود اس دنیا میں آیا۔ (معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے: شروع آیت میں حسن سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لئے ہے مگر اس جگہ صرف ماں کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ماں کی محنت و مشقت لازمی اور ضروری ہے۔ حمل کے زمانے کی تکلیفیں، پھر وضع حمل اور دردزہ کی تکلیف ہر حال ہر بچہ کے لئے لازمی ہے جو صرف ماں ہی کی محنت ہے۔

باپ کے لئے پرورش پر محنت اٹھانا اتنا لازمی و ضروری نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی باپ کو اولاد کی تربیت میں کوئی بھی محنت مشقت اٹھانی پڑے جبکہ وہ مالدار صاحب حشم و خدم ہو، دوسروں سے اولاد کی خدمت لے یا وہ کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور خرچ بھیجتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد پر ماں کے حق کو سب سے زیادہ رکھا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے صِل اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدنَاكَ فَادنَاكَ (مظہری) یعنی صلہ رحمی اور خدمت کرو اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی، اس کے بعد اپنے باپ کی اور اس کے بعد جو قریب تر رشتہ دار ہو اس کی پھر جو اس کے بعد ہو۔ (معارف القرآن)

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا: اس جملہ میں بھی ماں کی محنت و مشقت ہی کا بیان ہے کہ بچے کے حمل اور وضع حمل کی مشقت کے بعد بھی ماں کو محنت سے فراغت نہیں ملتی کیونکہ اس کے بعد بچے کی غذا بھی قدرت نے ماں کی چھاتیوں میں اتاری ہے وہ اس کو دودھ پلاتی ہے۔

آیت میں ارشاد یہ فرمایا کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال فرمایا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ کی ہے کیونکہ قرآن کریم نے اکثر مدت رضاع تو دو سال کامل متعین فرما دیئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے

وَالوَالِدَاتِ يُرضِعنَ اَولَادَهنَّ حَولَين كَامِلَين: اور یہاں حمل اور رضاع دونوں کی مدت تیس ماہ قرار دی گئی تو مدت رضاع کے دو سال یعنی چوبیس مہینے نکلنے کے بعد چھ ماہ ہی باقی رہ جاتے ہیں جس کو کم سے کم مدت حمل قرار دیا گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک عورت کے بطن سے چھ ماہ

ہو جانے پر بچہ پیدا ہو گیا جبکہ عام عادت نو مہینے میں اور کم سے کم مدت سات مہینے میں بچہ پیدا ہونے کی ہے۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس حمل کو ناجائز قرار دے کر سزا کا حکم دیدیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس سزا سے منع کیا اور فرمایا کہ قرآن میں حمل اور رضاع کی مجموعی مدت تیس ماہ ہے پھر رضاع کی مدت کا چوبیس ماہ ہونا دوسری جگہ متعین کر دیا ہے اس لئے باقی ماندہ مدت چھ ماہ ہی حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ عثمان غنی نے ان کے استدلال کو قبول کر کے اپنا حکم واپس لے لیا۔ (تفسیر قرطبی)

اسی لئے کم سے کم مدت حمل کے بارے میں تمام امت کے ائمہ متفق ہیں کہ وہ چھ ماہ ہو سکتی ہے اکثر مدت کتنی ہے اس میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں قرآن نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

فائدہ: اس آیت میں حمل کی تو اقل مدت کا بیان کیا گیا اور رضاع کی اکثر مدت کا اس میں اشارہ ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ متعین ہے اس سے کم میں صحیح سالم بچہ پیدا نہیں ہو سکتا مگر زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ بچہ حمل میں رہ سکتا ہے اس میں عادتیں مختلف ہیں یہ متعین نہیں اسی طرح رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین ہے کہ دو سال تک دودھ پلایا جا سکتا ہے کم سے کم مدت کچھ متعین نہیں۔ بعض عورتوں کے دودھ ہوتا ہی نہیں، بعض کا دودھ چند مہینوں میں خشک ہو جاتا ہے، بعض بچے ماں کا دودھ زیادہ نہیں پیتے یا ان کو مضر ہوتا ہے تو دوسرا دودھ پلانا پڑتا ہے۔

مدت حمل و مدت رضاعت: اکثر مدت حمل اور اکثر مدت رضاع میں فقہائے امت کا اختلاف، اکثر مدت حمل امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دو سال ہیں، امام مالک رحمہ اللہ سے مختلف روایات منقول ہیں۔ چار سال، پانچ سال، سات سال، امام شافعی کے نزدیک چار سال، امام احمد رحمہ اللہ کی بھی مشہور روایت چار ہی سال کی ہے (مظہری)

اور اکثر مدت رضاعت جس کے ساتھ حرمت رضاعت کے احکام متعلق ہوتے ہیں جمہور فقہاء کے نزدیک دو سال ہیں، امام مالک رحمہ اللہ شافعی رحمہ اللہ، احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور ائمہ حنفیہ رحمہم اللہ میں سے ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ سب اس پر متفق ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر و رضی اللہ عنہ ،

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہ قول ہے (رواہ الدار قطنی) علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی یہی ارشاد ہے (اخرجہ ابن ابی شیبہ)

صرف امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ ڈھائی سال تک بچہ کو دودھ پلایا جاسکتا ہے جس کا حاصل جمہور حنفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچہ کمزور ہو، ماں کے دودھ کے سوا کوئی غذا دو سال تک بھی نہ لیتا ہو تو مزید چھ ماہ دودھ پلانے کی اجازت ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مدت رضاعت پوری ہونے کے بعد ماں کا دودھ بچے کو پلانا حرام ہے مگر فتویٰ فقہائے حنفیہ کا بھی جمہور ائمہ کے مسلک پر ہے کہ دو سال کی مدت کے بعد اگر دودھ پلایا گیا تو اس سے حرمت رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہوں گے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدی حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ اگر فتویٰ جمہور کے قول پر ہے مگر عمل میں احتیاط کرنا بہتر ہے کہ ڈھائی سال کی مدت کے اندر جس بچہ کو دودھ پلایا گیا ہے اس سے مناکحت میں احتیاط برتی جائے، بعض حضرات نے آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا سے امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اکثر مدت رضاعت ڈھائی سال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ یہ درست نہیں کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت علی مرتضیٰ عثمان غنی نے آیت کی تفسیر یہ متعین کردی ہے کہ اس میں چھ ماہ اقل مدت حمل کے اور چوبیس ماہ مدت رضاعت کے مراد ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن کریم نے حمل اور رضاعت کی مشترک مدت تیس ماہ بتلائی ہے ہر ایک کی الگ الگ حد نہیں بتلائی اس کا سبب یہ ہے کہ عادت عامہ یوں ہے کہ بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پورے نو ماہ میں پیدا ہو تو ماں کا دودھ پلانے کی ضرورت صرف اکیس ماہ رہ جاتی ہے اور اگر بچہ سات مہینے میں پیدا ہو جائے تو تئیس ماہ دودھ پلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو بچہ چھ ماہ میں پیدا ہو جائے تو چوبیس ماہ یعنی پورے دو سال دودھ پلانے کی ضرورت ہو گی۔ (مظہری)

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً: لفظ اشد کے لغوی معنیٰ قوت کے ہیں۔ سورۃ انعام میں حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ کے تحت میں اس کی تفسیر بلوغ سے کی گئی ہے یعنی جب بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلوغ اشد سے مراد اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنا ہے، مذکور الصدر آیت میں بھی بعض حضرات نے بلغ اشدہ کے معنی یہی کئے ہیں کہ بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اس کے بعد بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کو ایک مستقل منزل عمر قرار دیا، یہ قول شعبی اور ابن زید کا ہے اور حسن بصری رحمہ اللہ نے بلوغ اشد اور بلغ اربعین دونوں کو ہم معنی اور بلغ اربعین کو بلغ اشدہ کی تفسیر و تاکید قرار دیا ہے۔ (قرطبی)

اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ اول بچہ کے حمل کا پھر وضع حمل کا پھر دودھ پینے کے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ فَعَاشَ وَاسْتَمَرَّتْ حَيَاتُهٗ حَتّٰٓى اِذَا كَتَهَلَ وَاسْتَحْكَمَ قُوَّتُهٗ وَعَقْلُهٗ (روح) یعنی دودھ چھوٹنے کے بعد بچہ زندہ رہا اور عمر پائی یہاں تک کہ وہ بالغ اور قوی ہو گیا اور اس کی قوت اور عقل مکمل ہو گئی تو اب اس کو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ یوں دعائیں مانگنے لگا کہ

اے میرے پالنے والے! مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر مبذول فرمائی اور جو میرے والدین پر مبذول فرمائی اور مجھے یہ توفیق دے کہ میں وہ عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور میرے لئے میری اولاد کی بھی اصلاح فرما دے، میں تیری طرف رجوع ہوتا ہوں اور میں تیرے تابع فرمان مسلمان میں سے ہوں۔

قرآن نے اس جگہ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ سے لے کر من المسلمین تک سب صیغے ماضی کے استعمال فرمائے جس سے ظاہر یہ ہے کہ یہ بیان کسی خاص واقعہ اور خاص شخص کا ہے جو نزول آیت کے وقت ہو چکا ہے۔

اسی لئے تفسیر مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ یہ سب حالات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہیں انہیں کا بیان بالفاظ عام اس حکمت سے کیا گیا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی ترغیب ہو کہ

وہ بھی ایسا ہی کیا کریں اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو قرطبی نے بروایت عطا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے تجارت کا قصد فرمایا اور ملک شام کا سفر کیا تو اس سفر میں ابو بکر صدیق آپ کے ساتھ تھے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جو مصداق ہے بَلَغَ اَشُدَّهٗ کا۔

پھر اس سفر میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے حالات دیکھے کہ وہ اتنے گرویدہ ہوگئے کہ سفر سے واپسی کے بعد ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہوگئی اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا شرف عطا فرمایا اس وقت ابو بکر کی عمر اڑتیس سال تھی۔

مردوں میں سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا پھر جب ان کی عمر چالیس سال کی ہوگئی اس وقت یہ دعا مانگی جو اوپر آیت میں مذکور ہے رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اور یہی مصداق ہے بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کا اور جب یہ دعا مانگی اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ تو اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی ان کو نو ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی توفیق بخشی جو مسلمان ہوگئے تھے اور ان کے مالک ان کو اسلام لانے پر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔

اسی طرح ان کی دعا اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ بھی قبول ہوئی، ان کی اولاد میں کوئی ایسا نہ رہا جو ایمان نہ لایا ہو۔ اسی طرح صحابہ کرام میں یہ خصوصیت حق تعالیٰ نے صدیق اکبر ہی کو عطا فرمائی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے، والدین بھی، اولاد بھی اور سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اور تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام صحابہ کرام مہاجرین و انصار میں اس وقت یہ خصوصیت صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں اور یہ سورت پوری مکی ہے اس لئے یہ آیات بھی مکہ میں نازل ہوئیں اس وقت والدین پر نعمت الٰہی مبذول ہونے کا ذکر کیسے مناسب ہوگا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حضرات نے ان آیات کو مدنی کہا ہے اس پر تو کوئی اشکال نہیں رہتا اور اگر مکی بھی ہوں تو مراد نعمت اسلام سے

مشرف ہونے کی دعا ہو گی (روح المعانی علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ)

اس تفسیر کی رو سے اگرچہ یہ سب حالات صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بیان ہوئے مگر حکم عام ہے سب مسلمانوں کو اس کی ہدایت کرنا مقصود ہے کہ آدمی کی عمر جب چالیس سال کے قریب ہو جائے تو اس کو آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہئے۔ پچھلے گناہوں سے توبہ کی تجدید کرے اور آئندہ کے لئے ان سے بچنے کا پورا اہتمام کرے کیونکہ عادت اور تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں جو اخلاق و عادات کسی شخص کی ہو جاتی ہیں پھر ان کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ مومن جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب آسان فرما دیتے ہیں اور جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو اس کو اپنی طرف رجوع وانابت نصیب فرما دیتے ہیں اور جب ستر سال کی عمر کو پہنچ جائے تو تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات (نیکیوں) کو قائم فرما دیتے ہیں اور اس کے سیئات (برائیوں) کو مٹا دیتے ہیں اور جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہل بیت کے متعلق شفاعت کرنے کا حق دیدیتے ہیں اور آسمان میں اس کے نام کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ اسیر اللہ فی الارض ہے یعنی زمین میں اللہ کی طرف سے قیدی ہے (ذکرہ ابن کثیر عن ابی یعلی و مسند احمد) اور یہ ظاہر ہے کہ مراد اس سے وہی بندہ مومن ہے جس نے اپنی زندگی احکام شرع کے تابع ہو کر تقویٰ کے ساتھ گزاری ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے چونکہ پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ مراد عام انسان ہے۔ تو جو الفاظ خصوصیت کے اس میں آئے ہیں جیسے حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً الخ وہ سب بطور تمثیل کے ہیں جس میں یہ ہدایت دینا مقصود ہے کہ انسان جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کو اپنی اصلاح اور اپنے اہل و عیال کی اصلاح اور آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہئے۔ (معارف القرآن)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور ان کے گھرانے کی شان

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ {١٦} الاحقاف

جواب ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کے اچھے کاموں کو ہم قبول کریں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کر دیں گے جنت والوں میں شامل کرتے ہوئے سچے وعدہ کی وجہ سے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا: اُولئک اسم اشارہ ہے، جس کا مشارالیہ وہ لوگ ہیں جو مذکورہ بالا صفات کے حاملین ہوں ہم ان کی طاعات کو قبول کرتے ہیں اور ان کے اعمال پر انہیں پورا پورا بدلہ دیں گے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جن لوگوں کی یہ صفات ہیں وہ یہ لوگ ہیں جن کے دنیا میں کیے ہوئے نیک اعمال قبول کیے جائیں گے اور ان کا بدلہ دیا جائے گا اور ان کو ثواب ملے گا اور ان کے برے اعمال سے جو دنیا میں ان سے ہو گئے ان سے درگزر کی جائے گی، اس پر ان کو سزا نہ ملے گی یہ معاملہ درگزر اہل جنت سے کیا جائے گا جو جنت کے حقدار ہیں۔ (جامع البیان)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جناب نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا اور آپ نے جبریل علیہ السلام سے کہ بندے کی نیکیاں اور برائیاں لائی جائیں گی اور انہیں ایک دوسرے سے بدلہ چکایا جائے گا اگر نیکی بچ گئی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی وسعت عنایت کر دیں گے۔

مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے کہا میں تم کو ایسی وصیت کر رہا ہوں جس کو یاد رکھنا، اللہ تعالیٰ کے بعض حقوق کا تعلق رات سے ہے جن کو وہ دن میں قبول نہیں کرتا اور کچھ حقوق دن سے متعلق ہیں جن کو رات کو قبول نہیں کرتا، کسی کے نوافل کی کوئی حیثیت نہیں جب تک وہ فرائض ادا نہ کرے، جن کے میزان عمل بھاری ہوں گے وہ دنیا میں حق کی پیروی کی وجہ سے بھاری بنیں گے اور وہ چیز ان پر گراں ہے۔

اور میزان کا حق یہ ہے کہ اس میں حق رکھا جاتا ہے اور حق ہی بوجھ والا ہے اور میزان ان کے ہلکے ہوں گے جن کے میزان قیامت کے روز ہلکے ہوں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں باطل کی اتباع کی اور اس باطل کی خفت ان پر ہو گی اور میزان میں باطل خفیف صورت میں رکھنے کے لائق ہے۔

وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ: اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو درگزر کریں گے اور انہیں اہل جنت میں شامل کریں گے، معافی اور بخشش سے ہم ان کا اکرام کریں گے۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت بہترین اعمال کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ کہنے والا کہے گا کہ میرا عمل ان لوگوں کے عمل کو کیا پہنچے گا اور یہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال سے تجاوز فرمائیں گے اور ان کو ظاہر بھی نہ کریں گے کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ اہل نار کا تذکرہ ان کے بدترین اعمال سے کیا ہے، یہاں تک کہ کہنے والا کہے گا میں ان سے بہت بہتر عمل والا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے بہترین عمل ان پر لوٹا دیئے کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے نرمی آیت کے ساتھ سختی والی آیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔، تاکہ تو **مَنْ رَاغَبَ وَرَاهَبَ** رہے تاکہ وہ اپنے کو اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں نہ ڈال لے اور نہ اللہ تعالیٰ سے ناحق تمنائیں کرے۔ (جامع البیان)

وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ: یہ سچا وعدہ جو ہم نے پیغمبروں کی زبانی ان سے کر رکھا ہے کہ ہم نیکوکاروں کے نیک اعمال قبول کریں گے اور گنہگاروں کے گناہوں کو درگزر کریں گے۔

علامہ محمود نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے والد ابو قحافہ اور ان کی والدہ ام الخیر اور اولاد کے متعلق اتری اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعا کی قبولیت ان میں ظاہر ہوئی وہ جب ایمان لائے تو ۳۸ اڑتیس سال کی عمر تھی اور ان کے لیے چالیس سال کی عمر میں دعا کی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو خود اسلام لایا اور اس کے والدین اور بیٹے اور بیٹیاں تمام مسلمان صحابی بنے یہ اعزاز ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل رہا، جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا، دنیا کی زندگی میں۔

والدین کا نافرمان اور گستاخ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ {۱۷} اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ {۱۸} وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ {۱۹} وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ {۲۰} الاحقاف

سوال ترجمہ: اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا ”اف“ ہے تمہارے لیے کیا تم مجھے یہ وعدہ دیتے ہو کہ میں نکالا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے امتیں گزر چکی ہیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کر رہے ہیں کہ ارے تیرا ناس ہو ایمان لے آ، بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اس پر وہ کہتا ہے کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی باتیں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے حق میں اللہ کا قول پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جنات میں سے اور انسانوں میں سے گزر چکے ہیں، بلاشبہ یہ لوگ خسارہ والے ہیں، اور ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کی وجہ سے درجات ہیں، اور تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کی پوری جزا دے، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور جس دن کافروں کو آگ پر پیش کیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنی لذتوں کو اپنی دنیا والی زندگی میں ختم کر لیا اور ان سے نفع حاصل کر لیا سو آج تمہیں سزا کے طور پر ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس سبب سے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس سبب سے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک صالح اور متقی انسان کی مثال بیان فرمائی، جو اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کا صالح بندہ ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہو گا، اس کا ذکر فرمایا، اب یہاں اس شخص کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ بد سلوکی کرتا ہے، انہیں ایذا دیتا ہے، اس کا انجام بھی بتایا گیا کہ بد بختی اور ذلت اس کا مقدر ہے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ: رہی بات اس بیٹے کی جو فاسق و فاجر ہے اور جب اس کے والدین

اسے ایمان کی دعوت دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے: اف ہے تمہارے لیے یعنی اس دعوت پر تمہارے لیے قباحت ہے۔ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ: کیا تم مجھے ڈرا دھمکا رہے ہو کہ مرنے کے بعد مجھے دوبارہ اٹھایا جائے گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بے شمار امتیں گزر چکیں ان میں سے کوئی بھی دوبارہ زندہ نہیں کیا گیا۔

وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ: اس کے والدین اللہ کے حضور سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دولت اسلام سے سرفراز کرے اور اس سے کہتے ہیں: تیری ہلاکت ہو، اللہ تعالیٰ پر ایمان لا اور بعث و نشور کی تصدیق کر، ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اس میں کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: یہ بدبخت کہتا ہے: یہ جو تم مجھ سے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کرتے ہو یہ تو خرافات اور باطل باتیں ہیں جو پہلے لوگوں کے قصے ہیں اور کتابوں میں لکھ دیے گئے، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ: یہ وہی مجرمین ہیں جن پر اللہ کا فیصلہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ اہل دوزخ ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: أَيْ وَجَبَ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ وَهِيَ كَلِمَةُ اللّٰهِ كَمَا فِي الْحَدِيْثِ «هٰؤُلَآءِ فِي النَّارِ وَلَا أُبَالِي ان پر عذاب واجب ہو چکا، یہی اللہ کا کلمہ ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور مجھے ان کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ (تفسیر القرطبی ۱۹۸:۱۶)

فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: یہ دوزخ کے جملہ گروہوں میں شامل ہو گا جو اس سے پہلے گزر چکے اور وہ کفار و فجار تھے ان کا تعلق انسانوں میں سے بھی ہے اور جنات میں سے بھی۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ: یہ لوگ کافر تھے، ان کی جملہ کاوشیں اور کوششیں برباد و تباہ ہو گئیں اور ان کی آخرت ضائع ہوئی اور وہ خسارے میں رہے، یہ ان کفار کے دخول جنت کی علت بیان کی گئی ہے۔

آیت کا مصداق کون ہے؟ امام فخر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت عبدالرحمن بن ابی بکر کے بارے میں ان کے قبول اسلام سے پہلے نازل ہوئی، وَالصَّحِيْحُ أَنَّهُ لَا

يُرَادُ بِالْآيَةِ شَخْصٌ مُّعَيَّنٌ لیکن صحیح یہ ہے کہ مضمون آیت سے شخص متعین مراد نہیں ہو گا بلکہ وہ شخص مراد ہو گا جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں اور یہ ہر وہ شخص ہے جسے اس کے والدین دین اسلام کی دعوت دیں اور وہ انکار کر دے، اس پر یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وصف میں کہا ہے کہ وہ اپنے والدین سے اُفٍّ لَّكُمَا کہتا ہے اور وہ منجملہ ان لوگوں میں شامل ہے جن پر کلمہ عذاب ثابت ہو چکا ہے، وَلَا شَكَّ أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ آمَنَ وَحَسُنَ إِسْلَامُهُ وَكَانَ مِنْ سَادَاتِ الْمُسْلِمِينَ فَبَطَلَ حَمْلُ الْآيَةِ عَلَيْهِ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور اس کا بہت اچھا اسلام رہا اور آپ رضی اللہ عنہ سادات مسلمین میں سے تھے، لہٰذا آیت کو اسی پس منظر پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا: مؤمنین اور کفار میں سے ہر ایک کے مراتب اور منازل ہیں، یہ مراتب ان کے اعمال کے اعتبار سے ہیں، چنانچہ مؤمنین کے مراتب جنت عالیہ میں ہیں اور کفار کے مراتب دوزخ میں ہوں گے۔

وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اعمال کا پورا پورا بدلہ دے، مؤمنین کو درجات کے اعتبار سے بدلہ ملے گا اور کفار کو درکات کے اعتبار سے۔

درجات اور درکات: درجات جنت کے ہوتے ہیں جو نیچے سے اوپر جاتے ہیں جب کہ درکات دوزخ کے ہیں جو اوپر سے نیچے جاتے ہیں، جنت کا اعلیٰ درجہ سب سے اوپر کا ہے، دوزخ کا سب سے برا دَرَکہ سب سے نیچے کا ہے۔ ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی اور عذاب میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ: اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! مشرکین کو یاد کرائیں جب دوزخ کی آگ سے پردہ اٹھالیا جائے گا اور دوزخ کفار کے لیے ظاہر ہو جائے گی، انہیں دوزخ کے قریب کر دیا جائے گا اور وہ دوزخ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا: کلام میں حذف ہے، یعنی کفار سے بطور توبیخ اور بطور ڈانٹ کہا جائے گا: تم اپنی اچھی چیزیں ختم کر چکے یعنی تم نے دنیا کے لذائذ اور خواہشات کو پالیا ہے،

اب آخرت میں تمہارا کوئی حصہ باقی نہیں رہا ہے۔ طیبات سے مراد اَلْمُسْتَلَذَّاتُ مِنَ الْمَأْكَلِ وَالْمَشَارِبِ، وَالْمَلَابِسِ وَالْمَفَارِشِ وَالْمَرَاكِبِ وَالْمَوَاطِئِ، وَغَيْرِ ذٰلِكَ کھانے پینے، اوڑھنے، بچھونے، پہننے، سوار ہونے کی عمدہ چیزیں، لذات اور عیش و عشرت کی چیزیں ہیں۔ (بحر المحیط)

وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا: تم دنیا کی لذات وطیبات سے لطف اٹھا چکے ہو، ارباب تفسیر فرماتے ہیں اَلْمُرَادُ بِالْآيَةِ إِنَّكُمْ لَمْ تُؤْمِنُوا حَتّٰى تَنَالُوا نَعِيْمَ الْآخِرَةِ، بَلِ اشْتَغَلْتُمْ بِشَهَوَاتِ الدُّنْيَا وَلَذَائِذِهَا عَنِ الْإِيْمَانِ وَالطَّاعَةِ، وَأَفْنَيْتُمْ شَبَابَكُمْ فِي الْكُفْرِ وَالْمَعَاصِيْ، وَآثَرْتُمُ الْفَانِيَ عَلَى الْبَاقِيْ، فَلَمْ يَبْقَ لَكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ شَيْءٌ مِّنَ النَّعِيْمِ، آیت سے مراد یہ ہے کہ تم ایمان نہیں لائے تاکہ آخرت کی نعمتیں حاصل کرتے، بلکہ تم لوگ دنیا کی شہوات، خواہشات اور لذات میں مشغول رہے، ایمان وطاعت کی طرف تم نے کوئی توجہ نہ دی، کفر و معاصی میں تم نے اپنی جوانی ضائع کر دی، فانی دنیا کو باقی رہنے والی آخرت پر ترجیح دی اس کے بعد تمہارے لیے کوئی نعمت باقی نہیں رہی، اسی لیے اس کے بعد فرمایا:

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ: آج جزا کے دن تم نے ذلت ورسوائی والا عذاب پالیا۔

بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ: اس وجہ سے کہ تم نے دنیا میں ایمان وطاعت سے تکبر کیا۔

وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ: تمہارے فسق اور اللہ کی طاعت سے نکل جانے کی وجہ سے۔ امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ آیت خوش حال و آسودہ حال زندگی بسر کرنے کے لیے مانع نہیں ہے، چونکہ آیت کفار کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے کافر کی توبیخ کی ہے، چونکہ وہ دنیا سے فائدہ اٹھاتا ہے اور انعام کرنے والی ذات یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کرتا، جب کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے، آیت میں مؤمن کی توبیخ نہیں ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (سورۃ الاعراف۔ ۳۲)

آپ کہہ دیجیے کہ کس نے اللہ کی دی ہوئی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور اس کی

عطا کی ہوئی پاکیزہ چیزیں یعنی رزق کو حرام قرار دیا ہے۔

ہاں البتہ عیش و عشرت اور عیاشی سے احتراز کرنا افضل ہے، اسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول محمول کیا جائے گا آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: لَوْ شِئْتُ لَكُنْتُ أَطْيَبُكُمْ طَعَاماً، وَأَحْسَنُكُمْ لِبَاساً، وَّلٰكِنِّي أَسْتَبْقِي طَيِّبَاتِي لِحَيَاتِي الآخِرَةِ اگر میں چاہتا تم سب سے عمدہ اور لذیذ میرا کھانا ہوتا اور تم سب سے زیادہ خوبصورت لباس میرا ہوتا لیکن میں اپنی اچھی عمدہ چیزوں کو اپنی آخرت کی زندگی کے لیے بچا کر رکھتا ہوں۔ (التفسیر الکبیر ۲۸:۲۵)

علامہ صابونی رحمہ اللہ تسہیل کے حوالہ سے لکھتے ہیں، یہ آیت کفار کے لیے ہے چونکہ اس سے پہلے ذکر ہوا: وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اس کے باوجود یہ آیت مؤمنین اہل تقویٰ کے لیے وعظ و نصیحت بھی ہے، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: (جابر رضی اللہ عنہ گوشت خرید رہے تھے) أَوَ كُلَّمَا اشْتَهٰى أَحَدُكُم شَيئاً جَعَلَهُ فِي بَطْنِهِ کیا تم میں سے کسی آدمی کے دل میں جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے وہ اسے اپنے پیٹ میں ٹھونس لیتا ہے، کیا تم نہیں ڈرتے ہو کہ اس آیت کے مصداق بن جاؤ: أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنيَا (التسہیل، صفوۃ التفاسیر)

قوم عاد کے احوال

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ احقاف سے کیا مراد ہے؟

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ {۲۱} الأحقاف.

جواب ترجمہ: اور قوم عاد کے بھائی (حضرت ہود علیہ السلام) کا تذکرہ کرو، جب انہوں نے اپنی قوم کو خم دار ٹیلوں کی سرزمین میں خبردار کیا تھا۔ اور ایسے خبردار کرنے والے ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اور ان کے بعد بھی، کہ: اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، مجھے تم پر ایک زبردست دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

خلاصہ تفسیر: اور آپ قوم عاد کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام) کا (ان سے) ذکر کیجئے جبکہ انہوں نے اپنی

قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ریگ کے مستطیل خمدار تودے تھے (یہ مقام کی نشان دہی اس لئے کی گئی کہ دیکھنے والوں کے ذہن میں استحضار ہو جائے) اس (بات) پر (عذاب الٰہی سے) ڈرایا کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو (ورنہ تم پر عذاب نازل ہو گا) اور (یہ ایسی ضروری اور صحیح بات ہے کہ) ان (ہود علیہ السلام) سے پہلے اور ان کے پیچھے (اسی مضمون کے متعلق) بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر اب تک) گزر چکے ہیں۔

(اور عجب نہیں کہ ہود علیہ السلام نے ان سب کا متفق ہونا دعوت الی التوحید میں ان کے سامنے بیان بھی کیا ہو، پس جملہ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ کا بیچ میں بڑھا دینا ان فوائد کے لئے ہے کہ مضمون دعوت کی تاکید ہو جائے اور ہود علیہ السلام نے انذار میں یہ فرمایا کہ) مجھ کو تم پر ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (اگر اس سے بچنا ہے تو توحید قبول کر لو)

وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس ارادے سے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو سو (ہم تو پھرنے والے ہیں نہیں باقی) اگر تم سچے ہو تو جس (عذاب) کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اس کو ہم پر واقع کر دو۔

انہوں نے فرمایا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے (کہ عذاب کب تک آوے گا) اور مجھ کو تو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے میں تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں (چنانچہ اس میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ تم پر عذاب آوے گا میں نے تم کو اطلاع کر دی، اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم ہے اور نہ قدرت) لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نری جہالت کی باتیں کرتے ہو (کہ ایک تو توحید کو قبول نہیں کرتے پھر اپنے منہ سے بلا مانگتے ہو، پھر مجھ سے اس کی فرمائش کرتے ہو۔

البتہ اپنے صدق کا میں مدعی ہوں جس پر دلیل قائم کر چکے ہیں اور جس واقعہ میں تم کو شبہ ہے اس کا وقت وقوع مجھ کو نہیں بتلایا گیا ہاں نفس وقوع کو جب اللہ چاہے دیکھ لیتا ہے غرض جب کسی طرح انہوں نے حق کو قبول نہ کیا تو اب عذاب کا اس طرح سامان شروع ہوا کہ اول ایک بادل اٹھا) سو ان لوگوں نے جب اس بادل کو اپنی وادیوں کے مقابل آتا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔

(ارشاد ہوا کہ) نہیں (برسنے والا بادل نہیں) بلکہ یہ وہی (عذاب) ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے (کہ وہ عذاب جلدی لاؤ اور اس بادل میں) ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے وہ (آندھی) ہر چیز کو (جس کے ہلاک کرنے کا حکم ہو گا) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دے گی۔

چنانچہ (وہ آندھی) ہر چیز کو جس کے ہلاک کرنے کا حکم ہو گا) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دیگی چنانچہ (وہ آندھی چھٹتی اور آدمیوں کو اور مواشی کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیتی تھی جس سے) وہ ایسے (تباہ) ہو گئے کہ بجز ان کے مکانات کے اور کچھ (آدمی اور حیوان) نہ دکھلائی دیتا تھا، ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو (یعنی قوم عاد کے) لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قدرت نہیں دی (مراد ان باتوں سے وہ تصرفات ہیں جو قوت جسمانی ومالی پر موقوف ہیں)

اور ہم نے ان کو کان اور آنکھ اور دل (سب ہی کچھ) دیئے تھے، سو چونکہ وہ لوگ آیات الٰہیہ کا انکار کرتے تھے اس لئے (جب ان پر عذاب آیا ہے تو) نہ ان کے کان ان کے ذرا کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل اور جس (عذاب) کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اسی نے ان کو آگھیرا (یعنی نہ ان کے حواس ان کو عذاب سے بچا سکے اور نہ ان کی تدبیر جس کا ادراک قلب سے ہوتا ہے، نہ ان کی قوت پس تمہاری تو کیا حقیقت ہے) (تفسیر بیان القرآن للتھانوی رحمہ اللہ)

اَلْاَحْقَاف: احقاف یہ حقف کی جمع ہے جو لمبے مگر خم دار ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں جس جگہ قوم عاد آباد تھی، وہاں اسی قسم کے ٹیلے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سرزمین کا نام ہی احقاف تھا اور یہ یمن کے علاقے میں واقع تھی، آج یہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔

ائمہ مفسرین فرماتے ہیں کہ عاد کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام تھے جن کو حق تعالیٰ نے عاد اولی کی طرف مبعوث فرمایا تھا ان کی بستیاں مقام احقاف میں واقع تھیں لفظ احقاف حقف کی جمع ہے جو ریت کے پہاڑ کو کہتے ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے طبقات الارض کے ایک ماہر امام ابن زید کا یہ قول نقل کیا عکرمہ سے منقول ہے کہ احقاف پہاڑوں اور غاروں کو کہتے ہیں عاد اولی کی آبادیاں ایسی ہی سرزمین میں واقع تھیں۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضر موت میں ایک وادی کا نام احقاف ہے قتادہ کہا کرتے تھے کہ یہ بات مشہور ہے کہ عاد یمن میں رہنے والی ایک قوم تھی جو ریگستانی علاقہ میں ساحل سمندر پر آباد ہوئی اور اسی کے قرب وجوار میں ان کی بستیاں بھی آباد ہو گئیں۔

مؤلف ارض القرآن بلاد احقاف کے تحت یہ لکھتے ہیں کہ یمامہ عمان بحرین حضر موت اور مغربی یمن کے درمیان جو صحرائے اعظم الدھناء یا ربع خالی کے نام سے واقع ہے اگرچہ وہ آبادی کے قابل نہیں لیکن اس کے اطراف وجوانب میں کہیں کہیں آبادی کے لائق کچھ صاف زمین ہے خصوصاً اس حصہ میں جو حضر موت سے بحرین تک پھیلا ہوا ہے گو اس وقت وہ بھی آباد نہیں تاہم عہد قدیم میں اسی حضر موت اور بحرین کے درمیانی حصہ میں عاد ارم کا مشہور قبیلہ آباد تھا جس کو خداوند عالم نے اس کی نافرمانی کی پاداش میں نیست ونابود کر دیا تھا۔ (معارف القرآن للکاندھلوی رحمہ اللہ)

عذاب لانے کا مطالبہ

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ لِتَاْفِكَنَا کا کیا مطلب ہے؟

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ {۲۲} الأحقاف

جواب ترجمہ: انہوں نے کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمارے خداؤں سے ہمیں برگشتہ کرو؟ اچھا اگر تم سچے ہو تو لے آؤ ہم پر وہ (عذاب) جس کی دھمکی دے رہے ہو۔

خلاصہ تفسیر: حضرت ھود علیہ السلام جب اپنی قوم کو ڈرا رہے تھے تو ان کی قوم کے لوگوں نے جواباً کہا کہ اے ہود! آپ اللہ کی بندگی پر اس قدر زور دے رہے ہیں اور لگاتار اور پیہم شرک وبت پرستی کی مذمت کر رہے ہیں اور آپ اس کے ساتھ ہمیں اس بات سے خوف زدہ کر رہے ہیں کہ اگر ہم آپ کی بات کو نہیں مانیں گے تو ہم پر اس وجہ سے اللہ کا عذاب آجائے گا، ہمیں آپ کی بات سے یوں لگ رہا ہے کہ آپ ہمیں اللہ کے عذاب سے ڈرا دھمکا کر اور ایک اللہ کی عبادت کرنے کا جھوٹ بول کر ہمیں ہمارے معبودوں سے پھیرنا چاہتے ہیں، اگر آپ کے خیال میں ہم غلط ہیں، ہم گمراہ ہیں، آپ کو

ہم پر عذاب کا اندیشہ ہے تو پھر آپ کسی ایسے آدمی کو زندہ کر کے کیوں نہیں دکھا دیتے جو مر چکے ہیں، اگر ان مرے ہوئے لوگوں میں سے آپ کسی ایک کو بھی زندہ کر کے لے آئیں تو ہم مان لیں گے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی آئے گی، اور مرنے والے ایک دن دوبارہ اٹھائے جائیں گے، اگر آپ ایسا کر دیتے ہیں تو ہم آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔

آپ ایسا کرنے اور ہمیں مطمئن کرنے کی بجائے لگاتار دھمکی دیے جا رہے ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زبردستی ہمیں قائل کرنا چاہتے ہو اور ہمارے عقیدے تبدیل کرنا چاہتے ہو، اگر آپ واقعی ہمیں عذاب کے مستحق سمجھتے ہیں تو پھر ہمارے سروں پر عذاب لے کیوں نہیں آتے؟ تاکہ ہمیں اسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر تمہاری سچائی کو مان لیں، اور آپ پر ایمان لے آئیں، لیکن آپ کی طرف سے ملنے والی دھمکی کی وجہ سے ہم ایمان قبول نہیں کر سکتے۔

لِتَأْفِكَنَا: اِفْكٌ سے ہے، افکٌ عربی زبان میں جھوٹ بولنے کو کہتے ہیں۔ تَافِكُ فعل مضارع کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے تو جھوٹ بولے یا تو جھوٹ بولتا ہے، لیکن جب اس کے ساتھ عَنْ کا صلہ آجائے تو اس کا معنی ہوتا ہے کسی سے جھوٹ بول کر اسے اس کے خیالات سے برگشتہ کرنا۔ آیت میں یہی معنی کیا گیا ہے۔

تند و تیز المناک آندھی کا عذاب

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز قوم ہود کو دیے جانے والے عذاب کی صورت کیا تھی؟

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ {۲۳} فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۲۴} تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ {۲۵} الاحقاف

جواب ترجمہ: انہوں نے جواب میں فرمایا کہ علم اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمہیں وہ بات پہنچاتا ہوں جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور لیکن میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت کی باتیں کر رہے ہو، پھر ہوا یہ کہ جب انہوں نے اس (عذاب) کو ایک بادل کی شکل میں آتا دیکھا جو ان کی وادیوں کا رخ کر

رہا تھا تو انہوں نے کہا کہ: یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔ نہیں! بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کی تم نے جلدی مچائی تھی۔ ایک آندھی جس میں دردناک عذاب ہے۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالے گی، غرض ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے مجرم لوگوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ (سورۃ الاحقاف)

خلاصہ تفسیر: ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: قوم عاد نے جلد از جلد عذاب آنے کا مطالبہ کر دیا چونکہ ان کے خیال میں یہ تھا کہ عذاب وغیرہ کچھ نہیں آنے والا۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ: حضرت ہود علیہ السلام نے قوم سے کہا: عذاب کے وقت کا علم میرے پاس نہیں ہے، یہ علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔

وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ: میں تو اللہ تعالیٰ کی رسالت کو تم تک پہنچانے والا ہوں۔

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ: لیکن میں تمہیں جاہل قوم پاتا ہوں چونکہ تم عذاب کے جلد آجانے کا مطالبہ کرتے ہو۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ: جب مقررہ وقت آ پہنچا تو افق پر انہیں کالی گھٹا نظر آئی جو ان کی وادی کی طرف مستانہ وار بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا: اسے دیکھ کر وہ باغ باغ ہو گئے اور بول اٹھے کہ لو بادل آیا، ابھی برسے گا، کوہ و دمن سیراب ہو جائیں گے، ندیاں، نالے اور وادیاں پانی سے لبریز ہو جائیں گی۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ: انہیں بتایا گیا کہ نادانو! یہ بارش نہیں، المناک عذاب ہے جو تند و تیز آندھی کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے، چنانچہ سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل جھکڑ چلتا رہا، وہ لاکھوں ٹن ریت کے نیچے دفن ہو گئے، ان کے باغات کا نام و نشان باقی نہ رہا اور مستحکم محلات کی بنیادیں لرز گئیں۔

مفسرین کہتے ہیں: قوم عاد ایک عرصہ سے بارش سے محروم تھی اور قحط کا سامنا کر رہی تھی، جب بادل ظاہر ہوئے تو وہ سمجھے ابھی بارش ہونے والی ہے خوش ہو گئے اور کودنے لگے اور کہنے لگے: یہ بادل

چھائے ہیں جو ہمارے اوپر بارش برسائیں گے۔ (صفوۃ التفاسیر)

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِأَمْرِ رَبِّهَا: جس چیز پر بھی اس عذاب کا گزر ہو گا اسے تباہ اور ہلاک کر کے چھوڑے گا، انسان، حیوان مال جو کچھ بھی یہ سب اس کی لپیٹ میں آئے گا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: پہلے آندھی قوم عاد پر آئی ان کے مردوں اور مویشیوں کو لپیٹ میں لیا اور زمین سے اوپر انہیں اٹھا لیا اور آسمان کی طرف پر کی مانند لٹتے پلٹتے اڑتے تھے، پھر انہیں زمین پر دے مارا، پھر آندھی ان کے گھروں میں داخل ہوئی، جب کہ انہوں نے گھروں کے دروازے مقفل کر رکھے تھے، آندھی نے دروازے اکھاڑ ڈالے، اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ آندھی نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا جس پر سے بھی آندھی کا گزر ہوا انسان، مویشی مال وغیرہ سب تباہ کر دیا۔ التدمیر کا معنی ہلاکت ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی بادل چھائے ہوئے دیکھتے یا تیز ہوا چلتی دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر افسردگی کے آثار دکھائی دیتے تھے، میں عرض کرتی، اے اللہ کے رسول! بادل کو دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں، امید کرتے ہیں کہ ان بادلوں میں بارش ہو گی، لیکن میں ایسے موقع پر آپ کے چہرے پر ناگواری کی اثرات دیکھتی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! میں بے خوف نہیں ہو سکتا، ممکن ہے کہ ان بادلوں میں عذاب ہو، ایک قوم ہوا کے عذاب میں مبتلا ہوئی، جب کہ ایک قوم نے عذاب کو دیکھا اور کہا: هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا: یہ بادل چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مینہ برسائیں گے۔ (الحدیث اخرجہ البخاری)

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰٓ إِلَّا مَسَٰكِنُهُمْ: قوم عاد ہلاک شدگان ہو گئی اور صرف ان کی رہائشی جگہیں دکھائی دیتی تھیں چونکہ آندھی نے ان کے آثار میں صرف درودیار ہی باقی چھوڑے تھے۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ: جیسی سزا ہم نے قوم عاد کو دی ایسی سزا ہم مجرم نافرمان کو دیتے ہیں۔ اس سے مقصود اہل مکہ کو ڈرانا اور انہیں خوف دلانا ہے کیونکہ اہل مکہ بھی پیغام ربانی سن کر سرکشی اور تمرد کا اظہار کرتے تھے، وہ بھی دین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

طاقتوروں پر قدرت کا کوڑا برسا، بے طاقتوں کی کیا حیثیت؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ {٢٦} الاحقاف

جواب ترجمہ: اور (اے باشندگان عرب) ہم نے ان لوگوں کو ان باتوں کی طاقت دی تھی جن کی طاقت تمہیں نہیں دی، اور ہم نے ان کو کان، آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے، لیکن نہ ان کے کان اور ان کی آنکھیں ان کے کچھ کام آئیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اسی نے انہیں آگھیرا۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ: ان نافیہ ہے اور ما کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے قوم عاد کو ایسی چیز دی تھی جو اہل مکہ ہم نے تمہیں نہیں دی، یعنی قوت، وسعت طویل طویل عمریں، آیت میں اہل مکہ سے خطاب ہے اور دھمکی دی جارہی ہے۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً: ہم نے ان کو کان، آنکھیں اور دل دیے تاکہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانیں اور پھر ان سے خالق منعم پر استدلال کریں۔

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ: یہ حواس انہیں کوئی نفع نہ پہنچا سکے اور نہ ہی اللہ کے عذاب کو روک سکے۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وَالْمَعْنَى أَنَّا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ النِّعَمِ وَأَعْطَيْنَاهُمْ سَمْعًا فَمَا اسْتَعْمَلُوهُ فِي سِمَاعِ الدَّلَائِلِ، وَأَعْطَيْنَاهُمْ أَبْصَارًا فَمَا اسْتَعْمَلُوهَا فِي تَأَمُّلِ الْعِبَرِ، وَأَعْطَيْنَاهُمْ أَفْئِدَةً فَمَا اسْتَعْمَلُوهَا فِي طَلَبِ مَعْرِفَةِ اللّٰهِ تَعَالَى، بَلْ صَرَفُوا كُلَّ هَذِهِ الْقُوَى إِلَى طَلَبِ الدُّنْيَا وَلَذَّاتِهَا، فَلَا جَرَمَ مَا أَغْنَى سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ شَيْئًا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیے، ہم نے ان کو کان دیے لیکن انہوں نے

کان دلائل کے سننے میں استعمال نہیں کیے، ہم نے ان کو آنکھیں دیں لیکن عبرت کے لیے انہوں نے آنکھیں استعمال نہیں کیں، ہم نے انہیں دل دیے لیکن معرفت خداوندی کی طلب میں انہوں نے دل استعمال نہیں کیے، بلکہ انہوں نے یہ حواس و قویٰ دنیا طلبی اور لذات طلبی میں لگائے رکھے، اب کچھ شک نہیں کہ یہ حواس اور قویٰ انہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکے۔

اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ ماسبق کی علت ہے چونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کی تکذیب کرتے تھے۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: جس عذاب کی یہ جلدی مچاتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے اس نے ان سب کو گھیرے میں لے لیا۔

بستیوں کی ہلاکت

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ اس آیت میں اللہ کا خطاب کن لوگوں کے لیے ہے؟ اور وہ کون سی بستیاں تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا؟

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ {۲۷} الاحقاف

جواب اور ہم نے اور بستیوں کو بھی ہلاک کیا ہے جو تمہارے ارد گرد واقع تھیں، جبکہ ہم طرح طرح کی نشانیاں (ان کے) سامنے لا چکے تھے، تاکہ وہ باز آجائیں۔

خلاصہ تفسیر: ارشاد فرمایا اور بیشک ہم ہلاک کر چکے ہیں تمہارے آس پاس کی بہت سی بستیاں مثلاً قوم ثمود اور قوم لوط کی بستیاں بھی اسی طرح تباہ کر دیں جیسے کہ عاد کی بستی تباہ کر دی گئی جو مکہ والوں کے قرب و جوار میں واقع تھیں اور ان علاقوں پر سے اہل مکہ کا تجارتی سفروں میں گزر ہوتا تھا اور ان کی ہلاکت کے واقعات عام طور پر لوگوں میں معروف تھے ہر ایک جانتا تھا اور تاریخی واقعات کے ذیل میں ان کو بیان بھی کیا جاتا تھا ان کا حسرت ناک حال یہ تھا کہ اور پھیر پھیر کر ہم نے سنائیں ان کو باتیں اور دلائل و نشانیاں بار بار دکھائیں شاید یہ کہ وہ لوٹ جائیں حق و ہدایت کی طرف لیکن نہ ان کو

نصیحتوں سے کچھ فائدہ پہنچا اور نہ دلائل وبینات سے حق کی طرف رجوع کیا۔

جس کا انجام یہی ہوا کہ تباہ وبرباد کر دیئے گئے تو کیوں نہ مدد کی انہوں نے جن کو انہوں نے اپنا معبود بنالیا تھا تقرب حاصل کرنے کے لیے خدا کو چھوڑ کر یہیں، مدد تو کیا کرتے بلکہ وہ تو ان سے گم ہو گئے اور قطعاً بے گانگی اختیار کر لی اور یہ ان کا صریح جھوٹ تھا اور جو کچھ وہ اپنی طرف سے گھڑتے تھے۔

اور یہ بات یقینی ہے کہ من گھڑت باتیں اور جھوٹ نہ چلا کرتا ہے اور نہ کام آتا ہے تو اسی طرح جو مشرکین زندگی بھر شرک کرتے رہے اور اپنے بتوں کو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عبادت خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہے جب میدان حشر ہو گا تو وہ سب معبود غائب ہوں گے اور ان کے سارے جھوٹ اور من گھڑت افسانے ان کے سامنے وبال اور عذاب بن کر ظاہر ہو رہے ہوں گے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی) اس آیت مبارکہ میں خطاب مکہ والوں سے ہے، اور بستیوں سے مراد قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیاں ہیں۔

معبودان باطلہ نے پیروکاروں کی مدد کیوں نہیں کی؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ {۲۸} الاحقاف

جواب ترجمہ: پھر انہوں نے اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جن چیزوں کو اللہ کے سوا معبود بنا رکھا تھا، انہوں نے ان کی کیوں مدد نہ کر لی؟ اس کے بجائے وہ سب ان کے لیے بے نشان ہو گئے۔ یہ تو ان کا سراسر جھوٹ تھا، اور بہتان تھا جو انہوں نے تراش رکھا تھا۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً: ان کے خداؤں نے ان کی مدد کیوں نہ کی، حالانکہ وہ ان کے خیال میں انہیں اللہ کے قریب کرتے تھے اور انہیں سفارشی بنا رکھا تھا تاکہ ان سے اللہ کے عذاب کو دور کریں۔ لَوْلَا تحضیضیہ ہے اور هَلَّا کے معنی میں ہے اور اس کا معنی نفی ہے یعنی ان کے خداؤں نے ان کی مدد نہیں کی اور نہ ہی انہیں اللہ کے عذاب سے بچایا۔

بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ: بلکہ وہ ان کی مدد سے غائب ہو گئے، بلکہ وہ تو خود مدد کے زیادہ محتاج ہیں، دوست تو مصیبت کے وقت کام آتا ہے، ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں تہکم ہے، گویا ان کا مدد نہ کرنا ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے۔ (تفسیر ابی السعود ۵:۶۹)

وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: جس مصیبت میں یہ پھنسے ہیں وہ ان کا جھوٹ اور افتراء ہے جو انہوں نے اللہ پر باندھا ہے، چونکہ ان کا خیال ہے کہ بت اللہ کے شرکاء ہیں اور اللہ کے ہاں ان کے سفارشی ہیں۔

جب جنات نے قرآن کی تلاوت سنی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، جنات کا قصہ بیان کیجیے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ {۲۹} قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ {۳۰} يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ {۳۱} وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ {۳۲} الأحقاف

جواب ترجمہ: اور (اے پیغمبر) یاد کرو جب ہم نے جنات میں سے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں۔ چنانچہ جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ: خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس انہیں خبردار کرتے ہوئے واپس پہنچے۔ انہوں نے کہا: اے ہماری قوم کے لوگو! یقین جانو ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق بات اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی بات مان لو، اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور تمہیں ایک دردناک عذاب سے پناہ دے دے گا۔ اور جو کوئی اللہ

کے داعی کی بات نہ مانے تو وہ ساری زمین میں کہیں بھی جا کر اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا، اور اللہ کے سوا اس کو کسی قسم کے رکھوالے بھی نہیں ملیں گے۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اے رسول! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے آپ کی طرف جنوں کا ایک گروہ بھیجا تھا، کہ وہ آپ ﷺ سے قرآن سنے، جب وہ حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ قرآن کریم پڑھ رہے تھے، تو وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے، خاموش ہو جاؤ، تا کہ ہم قرآن کریم سن سکیں، جب رسول کریم ﷺ قرآنی تلاوت سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ اسے یاد کر چکے تھے اور اس کی تاثیر ان میں پیدا ہو چکی تھی۔

اس کے بعد یہ اپنی قوم کی طرف واپس پلٹے اس حال میں کہ یہ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور پکڑ سے ڈرا رہے تھے، کہ اگر وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے تو اللہ کے عذاب کا شکار ہوں گے، انہوں نے کہا، اے ہماری قوم! ہم نے ایسی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل کی ہیں۔

وہ حق اور درست راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، وہ راہ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اے ہماری قوم! اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی بات کو قبول کر لو، جس کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں اسے مان لو، ان کو سچا جانو، وہ جو کچھ تمہارے پاس لے کر آئے ہیں اس پر عمل کرو، یوں اللہ تعالیٰ تمہاری بخشش کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اپنے دردناک اور تکلیف دہ عذاب سے تمہیں بچائے گا۔

جس چیز کی طرف رسول اللہ ﷺ دعوت دے رہے ہیں اسے جو قبول نہیں کرے گا تو اللہ جب زمین پر اپنے عذاب کا کوڑا برسانے کا ارادہ فرمائیں گے تو اسے عاجز کرنے والا کوئی نہیں ہو گا اور اللہ کے علاوہ اس کا کوئی مددگار اور انصار بھی نہیں ہو گا، جو اسے اللہ کے عذاب سے بچائے۔

جنوں کی ایک جماعت کا ذکر جو ان آیات میں فرمایا گیا اس کی غرض تو یہ ہے کہ کفار مکہ باوجودیکہ از قسم بنی آدم اشرف المخلوق ہیں اور خدا نے نوع بشر میں حلم و بردباری اور تاثر انفعال کی صلاحیت

بہت زائد رکھی ہے، اسکے بالمقابل نوع جن ہیں، اس وجہ سے کہ وہ مخلوق ناری ہیں شدت و تمرد اور سرکشی اور خارجی تاثرات سے متاثر نہ ہونے کا وصف ان میں زائد ہے لیکن اس جماعت نے جب قرآن کریم کی طرف توجہ کی اور غور و فکر کے ساتھ سنا تو فوراً ہی حق کی طرف قلوب مائل ہو گئے اور قرآن کریم کی عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اطاعت و فرمانبرداری کا سر جھکا دیا اور نہ صرف یہ کہ خود ہدایت قبول کی بلکہ اپنی قوم کی طرف ہادی و راہنما اور داعی بن کر لوٹے تو اس قصہ سے اہل مکہ کے عناد اور تمرد و سرکشی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کریم اور رسول خدا ﷺ سے کس قدر متنفر و برگشتہ تھے، جنوں کا یہ گروہ کون تھا اور کس وقت اور کہاں یہ واقعہ پیش آیا؟ تو اس سلسلہ میں۔

ایک روایت تو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے کہ یہ واقعہ مقام نخلہ میں پیش آیا جبکہ رسول اللہ ﷺ نماز عشاء ادا فرما رہے تھے اور یہ افراد نصیبین کے جنوں میں سے تھے جن کی تعداد سات تھی اس روایت کو ائمہ محدثین نے امام احمد رحمہ اللہ کے تفردات میں شمار کیا ہے۔

بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "دلائل النبوۃ" میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی سند سے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنات کے سامنے خود کچھ نہیں پڑھا اور نہ ان کو دیکھا اصل قصہ یہ پیش آیا کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ اپنے اصحاب کے ساتھ بازار عکاظ کی طرف جا رہے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جنات و شیاطین اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان رکاوٹ قائم کر دی گئی تھی اور جب بھی کوئی جن آسمانوں پر چڑھ کر غیبی خبروں کی طرف کان لگاتا تو شہاب ثاقب اس پر ٹوٹ پڑتا اور جلا کر راکھ کر دیتا۔

تو جنوں میں اس صورت حال کے پیش آنے پر تشویش ہوئی اور باہم یہ کہنے لگے کہ ضرور کوئی نئی بات ایسی پیش آئی ہے جس کے باعث اب آسمانوں کی خبروں کا سننا ممکن نہیں رہا تو تلاش کے لئے جنوں کی جماعتیں روئے زمین کے اطراف مشرق و مغرب کی طرف نکل کھڑی ہوئیں ان میں سے ایک جماعت جس نے تہامہ (مکہ) کا رخ کیا تھا رسول اللہ ﷺ کی طرف جب کہ آپ ﷺ مقام نخلہ میں تھے (بازار عکاظ جاتے ہوئے) اور اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے تو ناگہاں

قرآن کریم کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی فوراً ہی متوجہ ہوئے اور غور سے سننے لگے جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو کہنے لگے بس یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔

قرآن کریم کی آواز انہیں نہایت ہی عجیب مؤثر اور دل کش معلوم ہوئی اس کی ہیبت و عظمت دلوں پر چھاگئی اور اپنے ایمان و ایقان کا ایسا جوہر لے کر لوٹے کہ اپنی قوم کو بھی رشد و فلاح کی دعوت دینے لگے جس کا ان کلمات میں ذکر ہے، يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ یہی وہ قصہ ہے جس کو سورۃ جن میں قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ میں فرمایا گیا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ آنحضرت ﷺ کو ان کی آمد کا اور قرآن کریم کے سننے کا علم نہیں ہوا تھا ایک درخت نے باذن اللہ کچھ اجمالی اطلاع آپ ﷺ کو دی اور پھر اس کی تفصیل بذریعہ وحی آپ ﷺ کو بتائی گئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی اس جماعت نے داعی بننے کے بعد جنوں میں اسلام پھیلایا اور بہت بڑی تعداد میں جن مسلمان ہوئے اور حضور ﷺ سے ملاقات کرنے اور دین سیکھنے کیلئے ان کے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

علامہ خفاجی رحمہ اللہ نے چھ مرتبہ جنوں کی آمد کو بیان کیا ہے عبداللہ بن مسعود ﷺ کی سند سے لیلۃ الجن کا قصہ کتب حدیث میں معروف ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دفعہ قصداً آپ ﷺ جنوں کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو وعظ و نصیحت کے ساتھ دین کی تعلیم دی۔ (معارف الکاندھلوی)

دلائل وحدانیت و قدرت باری تعالیٰ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ {۳۳} وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ {۳۴} الاحقاف

جواب ترجمہ: کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کو پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے، ہاں اسے ضرور قدرت ہے، بیشک وہ ہر چیز

پر قادر ہے، اور جس روز کافر لوگ آگ پر پیش کیے جائیں گے کیا یہ حق نہیں ہے؟ کہیں گے کہ قسم ہے ہمارے رب کی یہ ضرور امر واقعی ہے! ارشاد ہو گا تو چکھ لو عذاب اس سبب سے کہ تم کفر کرتے تھے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: کیا یہ کفار جو بعث و نشور کے منکر ہیں جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جو عظمت و قدرت والا ہے اسی نے ابتداء بغیر کسی نمونہ سابقہ کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔

وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ: اور ان کی تخلیق کا مرحلہ انجام دینے میں اسے ذرہ بھی تھکن نہیں ہوئی۔

بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی: کیا وہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پا قادر نہیں ہے اور کیا اعضا بکھر جانے کے بعد انہیں زندہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: کیوں نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اسے کوئی چیز بھی عاجز نہیں کر سکتی جیسے اس نے اول وھلہ میں مخلوق کو پیدا کیا ہے دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَی النَّارِ: اے محمد! ان مشرکین کو روز آخرت کی ہولناکیاں اور شدائد یاد کراؤ جنہیں وہ دیکھیں گے اور اس دن کی انہیں یاد دلاؤ جب انہیں دوزخ پر پیش کیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا:

اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ: کیا یہ عذاب جسے تم آج چکھ رہے ہو کیا حق نہیں ہے؟ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے ،اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ، یعنی کیا یہ جادو ہے یا تم اسے دیکھ نہیں پا رہے۔ (الطور، ۱۵)

قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا: کہیں گے بلاشبہ اے ہمارے رب! تیری عزت کی قسم، مشرکین قسم کے ساتھ کلام میں تاکید پیدا کریں گے چونکہ عذاب سے خلاصی پانے کی انہیں طمع ہو گی۔

امام فخر الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت سے مقصود مشرکین سے تہکم کرنا ہے اور انہیں وعید سنانا ہے چونکہ وہ اللہ کے وعدہ اور وعید کا مذاق اڑاتے تھے، حالانکہ وہ اعلان کرتے پھرتے تھے: وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ یعنی ہمیں عذاب نہیں ہو گا۔ (التفسیر الکبیر ۲۸:۳۴)

قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: مشرکین سے کہا جائے گا: اپنے کفر کے بسبب

دردناک والمناک عذاب کا مزہ چکھو۔

اُولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ {۳۵} الأحقاف

جواب ترجمہ: غرض (اے پیغمبر) آپ اسی طرح صبر کیے جاؤ جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ وہ چیز دیکھ لیں گے جس سے انہیں ڈرایا جارہاہے اس دن (انہیں) یوں محسوس ہو گا جیسے وہ (دنیامیں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ یہ ہے وہ پیغام جو پہنچادیا گیاہے۔ اب برباد تو وہی لوگ ہوں گے جو نافرمان ہیں۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ اے میرے حبیب ﷺ! آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی جھٹلانے والی قوم کی طرف سے جو اذیت اور جو تکلیف پہنچ رہی ہے اس پر آپ اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کیجیے۔

یہ اولوالعزم رسول آپ سے پہلے گزرے ہیں، ان لوگوں کو مصائب، آلام اور سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، جن کے واقعات سے قرآنی صفحات بھرے پڑے ہیں، ان میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام نمایاں ہے۔

اور آپ ﷺ بھی انہیں اولوالعزم پیغمبروں میں شامل ہیں، آپ ﷺ حوصلہ سے کام لیجیے، صبر کا مظاہرہ کیجیے، اپنی قوم کے ان لوگوں کے لیے جلدی عذاب نہ مانگیے، جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھیں گے تو پھر اس کا سامنا کرنا ان کے لیے مشکل ہو جائے گا، جب اس عذاب کی ایک جھلک دیکھیں گے تو یوں لگے گا کہ یہ لوگ دنیامیں دن کی ایک گھڑی جتنے وقت بھی نہیں رہے، یہ پیغام انہیں بھی دیناہے اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی پہنچاناہے، اور یہ بات بھی یادرکھنے کی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہی لوگوں کو ہلاک کیا جائے گا جو اس کے حکم کو نہیں مانتے، جو اس کی فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بہت سے مفسرین کرام کے حوالے سے اس کی تفصیل بیان کی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اولوالعزم سے مراد یہاں عزم وصبر والے ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا وہ پانچ ہیں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوۃ والسلام، یہ سب شریعتوں والے ہیں۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: اولو العزم رسول یہ ہیں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو حکم دیا کہ وہ چوتھے ہو جائیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ نے کہا وہ چھ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد علیہ الصلوۃ والسلام۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ کیا گیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، یہ سب سورۃ اعراف اور سورۃ شعرء میں مذکور ہیں۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یہ چھ ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک اپنی قوم کی اذیتوں پر صبر کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگ پر صبر کیا، حضرت اسحاق علیہ السلام نے ذبح پر صبر کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچے کے گم ہونے پر اور نظر کے چلے جانے پر صبر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں میں گرنے اور قید خانے میں گرنے پر صبر کیا، حضرت ایوب علیہ السلام نے بیماری پر صبر کیا۔

حضرت ابن جریج علیہ السلام نے کہا: ان میں حضرت اسماعیل، حضرت یعقوب اور حضرت ایوب ہیں ان میں حضرت یونس، حضرت سلیمان اور حضرت آدم علیہم السلام نہیں۔

حضرت شعبی، کلبی اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا: اس سے مراد وہ رسل ہیں جن کو جہاد کا حکم دیا گیا انہوں نے مکاشفہ کو ظاہر کیا اور کافروں سے جہاد کیا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد وہ عظیم رسول ہیں جو سورۃ انعام میں مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت الیسع علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام، حسن بن فضل نے اس قول کو پسند کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تمام رسول اولوالعزم تھے، اسے علی بن مہدی طبری نے پسند کیا ہے: کہا: اس میں من جنس کو ظاہر کرنے کے لئے ہے بعضیت کو بیان کرنے کے لئے نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے: تمام انبیاء اولوالعزم ہیں مگر حضرت یونس بن متی، کیا تو نہیں دیکھتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر سے منع کیا گیا کہ آپ ان کی مثل ہو جائیں اس کی وجہ ان کی عجلت پسندی اور جلد بازی ہے جو ان سے اس وقت ظاہر ہوئی جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تین امور کے ساتھ انہیں آزمایا۔ اللہ تعالیٰ نے عمالقہ کو ان پر مسلط کر دیا یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے اہل اور مال پر غارت گری مچائی اللہ تعالیٰ نے بھیڑیئے کو ان کے بیٹے پر مسلط کر دیا تو وہ اسے کھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو ان پر مسلط کر دیا تو اس نے آپ کو نگل لیا یہ بات ابوالقاسم حکیم نے کہی ہے۔

بعض علماء نے کہا: أُولُو الْعَزْمِ اثْنَا عَشَرَ نَبِيًّا أُرْسِلُوا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ بِالشَّامِ فَعَصَوْهُمْ، فَأَوْحَى اللهُ إِلَى الْأَنْبِيَاءِ أَنِّي مُرْسِلٌ عَذَابِي إِلَى عُصَاةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى الْمُرْسَلِينَ فَأَوْحَى اللهُ إِلَيْهِمُ اخْتَارُوا لِأَنْفُسِكُمْ، إِنْ شِئْتُمْ أَنْزَلْتُ بِكُمُ الْعَذَابَ وَأَنْجَيْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ، وَإِنْ شِئْتُمْ نَجَّيْتُكُمْ وَأَنْزَلْتُ الْعَذَابَ بِبَنِي إِسْرَائِيلَ، فَتَشَاوَرُوا بَيْنَهُمْ فَاجْتَمَعَ رَأْيُهُمْ عَلَى أَنْ يُنْزِلَ بِهِمُ الْعَذَابَ وَيُنَجِّيَ اللهُ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَأَنْجَى اللهُ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَنْزَلَ بِأُولٰئِكَ الْعَذَابَ. وَذٰلِكَ أَنَّهُ سَلَّطَ عَلَيْهِمْ مُلُوكَ الْأَرْضِ، فَمِنْهُمْ مَنْ نُشِرَ بِالْمَنَاشِيرِ، وَمِنْهُمْ مَنْ سُلِخَ جِلْدَةُ رَأْسِهِ وَوَجْهِهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ صُلِبَ عَلَى الْخَشَبِ حَتَّى مَاتَ، وَمِنْهُمْ مَنْ حُرِّقَ بِالنَّارِ

اولوالعزم نبی بارہ ہیں جنہیں بنی اسرائیل کی طرف شام کے علاقہ میں بھیجا گیا، تو بنی اسرائیل نے ان کی نافرمانی کی: اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی کہ میں اپنا عذاب بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف بھیجنے والا ہوں یہ امر رسولوں پر شاق گزرا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی، اپنے لئے پسند کرلو اگر چاہو تو میں تم پر عذاب کو نازل کر دوں اور بنی اسرائیل کو نجات دے دوں اور اگر چاہو تو تمہیں نجات دے دوں اور عذاب بنی اسرائیل پر نازل کر دوں؟

انہوں نے آپس میں مشورہ کیا تو ان کی رائے اس بات پر متفق ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان پر عذاب کو نازل کر دے اور بنی اسرائیل کو نجات عطا فرما دے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دی اور ان پر عذاب کو نازل کر دیا اس کی صورت یہ بنی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زمین کے بادشاہوں کو مسلط کر دیا ان میں سے کسی کو آری سے چیر دیا گیا، کسی کے چہرے اور سر کی جلد اتار لی گئی، کسی کو سولی پر لٹکایا گیا یہاں تک کہ وہ مر گیا کسی کو آگ میں جلا دیا گیا۔

میں نے یہ تفسیر علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر سے لی ہے، بعض علماء والی اس بات کو پڑھ کر میں خود بھی حیران ہو گیا کہ یہ کن علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر عذاب مسلط کیا ہے، وہ بھی ان کی چاہت پر، وہ اپنی قوم کو بچانا چاہتے تھے، وہ اپنی قوم کی بجائے خود مبتلائے عذاب ہوئے، مگر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کا حوالہ نہیں دیا کہ یہ بات انہوں نے کہاں سے لی ہے اور بعض علماء سے کون سے علماء مراد ہیں؟

پھر اس کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی طرف سے بھی لاعلمی کا اظہار کیا گیا اور انہوں نے اس بات کو اللہ کے علم کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یعنی میرے خیال میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بعض علماء کی کہی گئی یہ بات درست ہے یا کہ نادرست ہے، ہم بھی اس بات کو کسی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا ہوا ہو گا، انبیاء کرام علیہم السلام تو اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوتے ہیں۔

صاحب روح البیان علامہ اسماعیل حقی حنفی استنبولی رحمہ اللہ نے بھی بارہ انبیاء کرام علیہم السلام جو شام میں

بھیجے گئے تھے ان کا ذکر انہی الفاظ کے ساتھ کیا ہے، انہوں نے قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ کی بجائے قَالَ بَعْضُهُم فرمایا ہے، آخر میں انہوں نے بھی کوئی حوالہ یا روایت پیش نہیں کی کہ ان بارہ انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کس معتبر راوی نے کیا ہے یا کس محدث و مفسر نے کیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: الولوالعزم چار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہیں کہا گیا، أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (البقرہ ۱۳۱) آپ تابعدار ہو جایئے، انہوں نے کہا کہ میں جہانوں کے پروردگار کے لیے تابعدار ہو گیا۔

پھر ان سے ان کے مال، ان کی اولاد، وطن اور ذات کے بارے میں امتحان لیا گیا تو جن جن امور میں ان کا امتحان لیا گیا ان میں آپ کو پورا اور سچا پایا گیا۔

جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہوں نے عزم کا اظہار کیا جب ان کی قوم نے ان کو کہا، إِنَّا لَمُدْرَكُونَ. قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الشعراء) اے موسیٰ! ہم تو پکڑے گئے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کوئی بات نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے جو مجھے عنقریب راستہ بتائے گا۔

جہاں تک حضرت داؤد علیہ السلام کا تعلق ہے تو ان سے خطاء ہوئی تو اس خطا پر انہیں متنبہ کیا گیا، آپ چالیس سال تک روتے رہے یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے درخت اگ آیا، تو آپ اس کے سائے میں بیٹھے۔

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو انہوں نے یہ عزم کیا کہ وہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ نہ رکھیں گے۔ انہوں نے فرمایا، إِنَّهَا مَعْبَرَةٌ فَاعْبُرُوهَا وَلَا تُعَمِّرُوهَا یہ ایک راستہ ہے اسے عبور کرو اسے آباد نہ کرو۔

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے ارشاد فرمایا ہے: صبر کیجئے، جن امور میں آپ کو آزمایا گیا ہے ان میں سچے ہو جائیں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سچ کا اظہار کیا اپنے مولی کی مدد پر اس طرح اعتماد کرتے ہوئے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اعتماد تھا، اپنی لغزشوں پر ایسے غم کا اظہار کیجئے جس طرح

حضرت داؤد علیہ السلام نے غم کا اظہار کیا تھا اور دنیا میں ایسا زہد اختیار کیجئے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زہد اختیار کیا تھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر یہ بھی کہا گیا کہ یہ آیت آیت سیف سے منسوخ ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے: یہ آیت محکم ہے، زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے کیونکہ سورت مکی ہے۔ مقاتل نے یہ ذکر کیا ہے یہ آیت غزوہ اُحد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جو مصیبت آپ کو پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے۔ جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، مقصود اس امر کو آپ پر آسان کرنا اور اس پر ثابت قدم رکھنا تھا۔ (تفسیر قرطبی)

ابن مردویہ رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اولوالعزم رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ ہے، یہ روایت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے تفسیر الدر المنثور میں نقل فرمائی ہے۔

علامہ عز بن عبد السلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولوالعزم رسول وہ تھے جنہیں جہاد کا حکم دیا گیا تھا، یا وہ تھے جو عربوں میں سے انبیاء تھے، یا وہ انبیاء اولوالعزم تھے جنہیں کوئی آزمائش نہیں پہنچی تھی، یا وہ انبیاء کرام اولوالعزم تھے جنہیں بلا کسی قصور اور گناہ کے آزمائشوں سے دوچار کیا گیا، یا وہ انبیاء کرام اولوالعزم تھے جن کو لوگوں کی طرف سے ستایا گیا، تکلیف پہنچائی گئی مگر انہوں نے اس پر جزع فزع نہیں کی، یا تمام کے تمام انبیاء کرام اولوالعزم تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ ان انبیاء کرام کی طرح آپ بھی صبر کریں۔ (تفسیر عز بن عبد السلام)

شیخ ابو محمد سہل بن عبد اللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِصبر صَبرَ أَهل المَعرفَةِ، كَمَا صَبَرَ أُولُو العَزمِ مِنَ الرُّسُل الَّذينَ كَانُوا قَبلَكَ رضىً وَّتَسلِيماً مِّن غَيرِ شَكوَى وَلَا جَزَع (تفسیر تستری) اہل معرفت کی طرح صبر کیجیے، جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، جو اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے اور انہیں تسلیم کیا، کوئی شکوہ شکایت اور جزع فزع نہیں کی۔

اولوالعزم من الرسل سے کیا مراد ہے؟ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر زاد المسیر میں دس

اقوال نقل فرمائے ہیں، جو ہم نے مختلف مفسرین، محدثین رحمہم اللہ اور علماء کرام رحمہم اللہ کے حوالے سے اوپر الگ الگ بیان کر دیے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اس میں من الرسل کا حرف من محققین کے نزدیک بیانیہ ہے تبعیض کے لئے نہیں۔ معنیٰ یہ ہیں کہ تمام رسول جو صاحب عزم وہمت ہی ہوتے ہیں معلوم ہوا کہ صاحب عزم وہمت ہونا سبھی انبیاء کی صفت ہے۔

البتہ رسولوں کے درمیان صفات کے درجات میں تفاضل اور کمی بیشی خود قرآن کے ارشاد سے ثابت ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ اس لئے جو انبیاء علیہم السلام صفت عزم وہمت میں دوسروں سے زیادہ امتیاز رکھتے ہیں خاص ان رسولوں کے لئے یہ لقب کے طور پر مشہور ہو گیا اور ان کی تعیین میں بھی اختلاف ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ لقب اولوا العزم جن کو دیا گیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کا ذکر سورۃ احزاب کی اس آیت میں ہے وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا الخ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی عیش و عشرت اور تنعم محمد اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اولو العزم سے بجز صبر کے اور کسی چیز پر راضی نہیں اور مجھے یہی حکم دیا ہے کہ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (معارف القرآن للمفتی)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ اور کتابوں میں موجود سوانح عمریاں دیکھ اور پڑھ کر انسانی کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ رب العالمین کے ان فرستادوں نے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالیں، سخت دل، سنگدل لوگوں کے سامنے حق وصداقت کا پھریرا لہرایا، مگر وہ بجائے ماننے اور تسلیم کرنے کے جانی دشمن بن گئے تھے، انہیں دھمکی آمیز لہجے میں بستی اور دیس چھوڑ جانے کا کہتے تھے، ہر طرح کی تکلیفیں انہیں دینے کی کوشش کرتے اور کئی کر بھی گزرتے تھے۔

مگر رب تعالیٰ نے کسی مرحلہ پر ان کو اپنا مشن اور منشور چھوڑنے کا حکم نہیں دیا، سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول اور معاشرے میں سراج منیر بن کر جلوہ افروز ہوئے وہ بھی

کوئی قابل رشک وستائش نہیں تھا، یہاں بھی انسانیت کا جنازہ نکلا ہوا تھا، انسان اپنے ڈگر سے ہٹ کر جانوروں اور بہائم کی زندگی گزار رہا تھا، اس جاہلی معاشرے کو درست لائن پر لا کھڑا کرنا میرے آقا ومولا نبی کریم ﷺ کا کام تھا، آزمائشوں کی جاں گسل وادیوں میں اترے ہوئے عظیم الشان نبی ﷺ کو مزید کہا گیا کہ آپ حوصلہ ہارنے کے بجائے اولوالعزم رسولوں کی طرح صبر کیجیے۔

رحمت کائنات ﷺ صبر وثبات کی عملی تصویر بنے رہے، اپنی تیئس سالہ مکی اور مدنی دور میں صبر واستقلال کی عجیب عجیب داستانیں رقم کر دیں، دیکھنے اور سننے والے محو حیرت تھے کہ اس قدر حوصلہ اور صبر! پھر کبھی سخت سے سخت ترین معاملات میں حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے، یہ اولوالعزم نبیوں کے صبر سے بھی بڑھ کر صبر تھا۔

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ: کفار کے لیے عذاب کے جلدی آجانے کی بد دعا نہ کرو چونکہ لا محالہ عذاب ان پر نازل ہو کر رہے گا۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ: وہ جب آخرت میں عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے انہیں یوں لگے گا گویا وہ دنیا میں ایک دن کی گھڑی بھر ٹھہرے، انہیں ایسا اس لیے لگے گا چونکہ وہ شدت عذاب کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے۔

بَلٰغٌ: یہ پیغام ہے جو پہنچا دیا گیا اور آخرت کے عذاب سے ڈرا دیا گیا۔

فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ: ہلاکت اور تباہی نہیں ہے مگر ان کافروں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکلے ہوئے ہیں۔ (صفوۃ التفاسیر)

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَالتَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ

اللہ تعالیٰ رب العالمین کے فضل وکرم اور احسان عظیم سے آج سورۃ الاحقاف کے چنیدہ مقامات کی تفسیر مکمل کر لی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے اور میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے، میرے مشائخ عظام کے

لیے، میرے دوست احباب کے لیے، میرتے تعلق داروں اور شاگردوں کے لیے، میرے مساعدین ومعاونین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اس کتاب کے فیوض وبرکات سے ہم سب کو مالامال اور سرشار فرمائے، آمین بحرمۃ النبی الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واھل بیتہ وذریاتہ اجمعین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۱۲ مئی ۲۰۱۸ء بمطابق ۲۵ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ،

یوم السبت ایک بجے شب

نظر ثانی۔ ۲۷ مئی ۲۰۱۸ء ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ بوقت ۲ بجے شب

اضافات جدیدہ وترمیمات: ۲۲ جون ۲۰۲۶ء بروز پیر، بوقت ۹ بجے شب

حال وارد حدوٹ۔ مری

☼☼

سورۃ محمد ﷺ (تعارف)

سوال سورۃ محمد کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ محمد قرآنِ کریم کی سینتالیسویں سورت اور مدنی سورتوں میں سے ہے، اس کا مرکزی موضوع جہاد فی سبیل اللہ، نصرتِ دین، اہلِ ایمان کے اوصاف اور منافقین کے کردار کا بیان ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد مسلمانوں کو جن اجتماعی اور دفاعی ذمہ داریوں کا سامنا تھا، اس سورت میں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

سورت کا آغاز کفار کے انجام اور اہلِ ایمان کی کامیابی کے ذکر سے ہوتا ہے، کفار چونکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی راہ میں رکاوٹ بنتے اور حق کی مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ان کے اعمال ضائع قرار دیے گئے، جبکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ اختیار کرنے والوں کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے۔

اس سورت میں مسلمانوں کو کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے اور ضرورت کے وقت قتال کا حکم دیا گیا ہے، جنگ کے آداب، قیدیوں کے احکام اور دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں، ساتھ ہی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جہاد کا مقصد ذاتی مفادات نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہے۔

سورۃ محمد کا ایک اہم مضمون یہ بھی ہے کہ کامیابی اور غلبہ صرف مادی وسائل سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ وابستہ ہیں، چنانچہ اہلِ ایمان کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ اگر وہ اللہ کے دین کی مدد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے قدم جمادے گا۔

سورت میں سابقہ ہلاک شدہ اقوام کا ذکر کرکے کفارِ مکہ کو عبرت دلائی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب، سرکشی اور کفر ہمیشہ تباہی کا سبب بنتے رہے ہیں، اسی طرح منافقین کے کردار، ان کے باطنی مرض، اسلام دشمن سازشوں اور دوغلے پن کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے، تاکہ مسلمان ان کے فریب سے محفوظ رہ سکیں۔

اختتامی آیات میں مسلمانوں کو جہاد، انفاق فی سبیل اللہ، صبر و استقامت اور اللہ تعالیٰ پر کامل

بھروسا اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے، انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود اجر و ثواب دائمی اور بہتر ہے، سورت کا اختتام بھی دین کی نصرت، قربانی اور استقامت کی دعوت پر ہوتا ہے، جس سے آغاز اور اختتام میں ایک حسین مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام سورۃ محمد ہے، کیونکہ اس کی دوسری آیت میں رسول اکرم ﷺ کا اسمِ مبارک صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ اور جو لوگ ایمان لائے، نیک اعمال کیے اور اس چیز پر ایمان لائے جو محمد (ﷺ) پر نازل کی گئی ہے۔

قرآنِ کریم میں یہ ان چند سورتوں میں سے ہے جن کا نام براہِ راست نبی کریم ﷺ کے اسمِ گرامی پر رکھا گیا ہے۔ اس سورت کا ایک دوسرا نام سورۃ القتال بھی ہے، کیونکہ اس میں جہاد اور قتال کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

اہم مضامین: ① کفار کے اعمال کی بربادی اور اہلِ ایمان کی کامیابی۔ ② جہاد فی سبیل اللہ اور قتال کے احکام۔ ③ جنگی قیدیوں کے بارے میں اسلامی ہدایات۔

④ نصرتِ الٰہی کے اسباب اور شرائط۔ ⑤ کفار و مشرکین کے انجام سے عبرت دلانا۔

⑥ منافقین کے اوصاف اور ان کی سازشوں کا بیان۔

⑦ قرآنِ کریم میں غور و فکر کی دعوت۔

⑧ صبر، استقامت اور اللہ پر توکل کی تلقین۔

⑨ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب۔ ⑩ دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی دائمی کامیابی کا بیان۔

مرکزی پیغام: سورۃ محمد اہلِ ایمان کو یہ درس دیتی ہے کہ دینِ اسلام کی سربلندی، اللہ تعالیٰ کی نصرت، دشمنوں پر غلبہ اور آخرت کی کامیابی کا راستہ ایمان، اطاعت، جہاد، انفاق اور استقامت سے ہو کر گزرتا ہے۔ جبکہ کفر، نفاق، بزدلی اور دنیا پرستی انسان کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے محروم اور انجامِ بد کا مستحق بنا دیتی ہے۔

بدون ایمان اعمال صالحہ مردود

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۱﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ﴿۳﴾ محمد

جواب ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا اللہ نے ان کے اعمال کو ضائع فرما دیا، اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور جو کچھ محمد پر نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور وہ ان کے رب کی طرف سے امر واقعی ہے اللہ ان کے گناہوں کا کفارہ فرمادے گا اور ان کے حال کو درست فرمادے گا، یہ اس وجہ سے کہ کافروں نے باطل کا اتباع کیا، اور بیشک جو لوگ ایمان لائے انہوں نے حق کا اتباع کیا جو ان کے رب کی طرف سے ہے اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے احوال بیان فرماتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے دین کے دشمنوں کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا ہے آیت کا معنی ہے: جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر دیا، اسلام سے روگردانی کر دی اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روک دیا۔

اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ: ان کے اعمال ضائع کر دیئے، اس پر انہیں کوئی ثواب نہیں چونکہ یہ اعمال اللہ کے لیے نہیں اس لیے باطل ہیں، اعمال سے مراد، مشرکین کے اعمال صالحہ مثلاً مستحقین کو کھانا کھلانا، صلہ رحمی کرنا اور مہمانوں کو کھانا کھلانا وغیرہ۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں: اضلال اعمال حقیقت میں اعمال ضائع کرنا ہے، انہیں قبول کرنے والا کوئی نہیں اور ان پر کوئی ثواب نہیں جیسے گمشدہ اونٹنی کو ضَالَّةٌ مِّنَ الْاِبِلِ کہا جاتا ہے، اس کا کوئی مالک نہیں ہوتا جو اس کی حفاظت کرے اور اس کا خیال رکھے، اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کفر میں کیے اور انہیں مکارم الاخلاق کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً

صلہ رحمی، قیدی چھڑانا، مہمان نوازی، پڑوس کا خیال رکھنا اور غلام وغیرہ آزاد کرنا۔ (الکشاف)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: جن لوگوں نے ایمان صادق اور اعمال صالحہ کو جمع کیا۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ: اور انہوں نے اللہ کے رسول محمد ﷺ پر نازل کیے گئے، قرآن کی تصدیق کی کہ اس تصدیق میں شک وارتیاب نہیں گزرا۔ یہ جملہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔

نکتہ: اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس سے اہتمام مزید اعتنائے کمال مقصود ہے، اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ (الصاوی ۴:۸۱ صفوۃ التفاسیر) اسی لیے تاکید لائی گئی۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ: اور یہ ثابت، موکد اور قطعی بات ہے کہ قرآن، کلام اللہ اور منزل من اللہ ہے، یہ جملہ معترضہ ہے اور اس سے سابقہ جملہ کی تاکید مقصود ہے۔

كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ: ان کے پہلے گناہ اور بوجھ مٹادیے۔ کفر: مٹادینا، محو کردینا، ریمو کردینا۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ: اور ان کی حالت سنوار دی اور دین دنیا کی حالت بہتر ہو گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار کے ضلالت پر ہونے اور مؤمنین کے ہدایت پر ہونے کی وجہ بتادی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ: کفار کے اعمال کے ضائع ہونے کا سبب ان کی گمراہی اور بے راہ روی ہے اور انہوں نے حق کی بجائے باطل کو اختیار کر لیا ہے۔

وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ: جب کہ مؤمنین ہدایت کے راستے پر چلے ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے حق کو مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ: یعنی اس واضح بیان کی مثال، اللہ تعالیٰ نے فریقین مؤمنین و کفار میں سے ہر ایک کی بات واضح کر دی ہے اور وہ کھلی دلیل ہے تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور نصیحت پکڑیں۔

جنگ اور جنگی حکمت عملی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا

مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ {۴} سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۚ {۵} وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ {۶} محمد

جواب ترجمہ: اور جب ان لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہو جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے، تو گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم ان کی طاقت کچل چکے ہو، تو مضبوطی سے گرفتار کرلو، پھر چاہے احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار پھینک کر ختم ہو جائے۔ تمہیں تو یہی حکم ہے اور اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لے لیتا، لیکن (تمہیں یہ حکم اس لیے دیا ہے) تاکہ تمہارا ایک دوسرے کے ذریعے امتحان لے۔ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز اکارت نہیں کرے گا، وہ انہیں منزل تک پہنچا دے گا، اور ان کی حالت سنوار دے گا۔ اور انہیں جنت میں داخل کرے گا جس کی انہیں خوب پہچان کرا دی ہو گی۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ یہاں اہل ایمان سے فرما رہے ہیں کہ اے اہل ایمان! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے ساتھ میدان حرب وضرب میں ہو تو اچھی طرح ان سے لڑائی کرو، ان کی گردنیں صرف ناپو ہی نہیں بلکہ مارو بھی، جب بہت زیادہ قتل وخونریزی سے تم انہیں کمزور کر ڈالو، ان کی شان وشوکت تم توڑ ڈالو، تو اگلے مرحلے کے طور پر تم انہیں گرفتار کرلو، اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر کے ان کی بیڑیاں کھول دو کسی عوض ومعاوضے کے بغیر یا کسی مال کے بدلے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دو، یا انہیں غلام بنالو، اگر ان سے آنے والے وقت میں مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ محسوس کیا جائے تو انہیں قتل کر ڈالو، یہ معاملہ یہاں تک چلے کہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ ” جنگ بدر میں ستر آدمی گرفتار ہوئے تھے، ان کو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی اکثریت کے مشورے سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا تھا، ان پر سورۃ انفال (۸۔ ۲۲، ۲۳) میں اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جب تک کافروں کی طاقت اچھی طرح کچلی نہیں جاتی، اس وقت تک قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا صحیح فیصلہ نہیں تھا، کیونکہ ان

حالات میں دشمنوں کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی طاقت کو اور مضبوط کیا جائے۔

سورۃ انفال کی ان آیتوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ شاید آئندہ بھی جنگی قیدیوں کو چھوڑنا جائز نہ ہو، اس آیت نے یہ وضاحت فرمادی کہ اس وقت قیدیوں کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا جو اظہار فرمایا تھا وہ اس لئے کہ دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچلے بغیر انہیں رہا کر دیا گیا، لیکن جب ان کی طاقت کچلی جاچکی ہو تو اس وقت انہیں چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور مسلمان حاکم کے لئے دونوں صورتیں جائز ہیں چاہے کوئی فدیہ یعنی معاوضہ لئے بغیر احسان کے طور پر انہیں چھوڑ دیا جائے یا کوئی فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔

چنانچہ اس آیت کی روشنی میں اسلامی حکومت کو چار قسم کے اختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ قیدیوں کو بلا معاوضہ احسان کے طور پر چھوڑ دے، دوسرے یہ کہ ان سے کوئی فدیہ یا معاوضہ لے کر چھوڑے جس میں جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی داخل ہے، تیسرے یہ کہ اگر ان کو زندہ چھوڑنے میں یہ اندیشہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے لئے خطرہ بنیں گے تو انہیں قتل کرنے کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ سورۃ انفال (۸۔ ۲۲، ۲۳) میں بیان فرمایا گیا ہے، اور چوتھے یہ کہ اگر ان میں یہ صلاحیت محسوس ہو کہ وہ زندہ رہ کر مسلمانوں کے لئے خطرہ بننے کے بجائے اچھی خدمات انجام دے سکیں گے تو انہیں غلام بنا کر رکھا جائے، اور ان اسلامی احکام کے مطابق رکھا جائے جو غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے ہیں، اور انہیں بھائیوں کا سا درجہ دیتے ہیں، ان چار صورتوں میں سے کوئی صورت لازمی نہیں ہے، بلکہ اسلامی حکومت حالات کے مطابق کسی بھی صورت کو اختیار کر سکتی ہے۔

لیکن یہ اس وقت ہے جب دشمنوں سے جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی معاہدہ نہ ہو، اگر کوئی ایسا معاہدہ ہو تو مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم ہے، آج کل بین الاقوامی طور پر اکثر ملکوں نے جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ معاہدہ کیا ہوا ہے کہ وہ قیدیوں کو نہ قتل کریں گے اور نہ غلام بنائیں گے، جو ممالک اس معاہدے میں شریک ہیں اور جب تک شریک ہیں ان کے لئے اس کی پابندی شرعاً لازم ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں کو قتل کرنا یا گرفتار کرنا صرف حالت جنگ میں جائز ہے،

جب حالت جنگ ختم ہو گئی ہو، اور امن کا کوئی معاہدہ ہو گیا ہو تو قتل یا گرفتار کرنا جائز نہیں ہے۔

لَانْتَصَرَ: یعنی اللہ تعالیٰ خود براہ راست ان پر کوئی عذاب نازل کر کے ان سے انتقام لے سکتا تھا، لیکن اس نے تم پر جہاد کا فریضہ اس لئے عائد فرمایا ہے کہ تمہارا امتحان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر تم میں سے کون ثابت قدمی سے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے، اور ان کافروں کا بھی امتحان مقصود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت دیکھ کر ایمان کی طرف مائل ہوتے ہیں یا نہیں۔

جو لوگ جہاد میں شہید ہو جائیں ان کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ فتح کی منزل تک پہنچے بغیر دنیا سے چلے گئے، اس لئے شاید ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی ہو، آیت نے واضح فرمایا کہ انہوں نے جو قربانی دی اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرے گا، اور ان کو اصلی منزل یعنی جنت تک پہنچا دے گا۔ (توضیح القرآن)

سَيَهْدِيهِمْ: اللہ تعالیٰ انہیں ایسے راستے کی طرف راہنمائی کرے گا جو انہیں دنیا اور آخرت میں نفع پہنچائے گا، اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق دے گا اور انہیں جنت کی راہ دکھائیے گا، اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں ان کی راہنمائی سب سے زیادہ ہدایت والے کاموں کی طرف کی جائے گی اور آخرت میں ثواب اور جنت کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔

وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ: اور ان کی حالت کو سنوار دے گا، اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے خوش ہو جائے گا اور انہیں قبول فرمالے گا۔

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ: اور انہیں نعمتوں والی جنت میں داخل کرے گا، انہیں اپنی اپنی منزل اور ٹھکانے کی ایسی پہچان کروادی جائے گی کہ ہر شخص اپنی منزل تک آسانی اور سہولت کے ساتھ پہنچ جائے گا، جس جنت میں اس نیک بخت و خوش نصیب نے بسیرا کرنا اور ٹھکانہ پکڑنا ہے اس کے اوصاف بیان کر دیے جائیں گے، بایں طور کہ ہر ایک اپنے ٹھکانے اور مکان کو پہچان لے گا، گویا کہ مدتوں سے یہاں اپنا مسکن و ٹھکانہ بنائے ہوئے ہے۔

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: يَهْتَدِي أَهْلُهَا إِلَى بُيُوتِهِمْ وَمَسَاكِنِهِمْ لَا يُخْطِئُونَ كَأَنَّهُمْ

سَكَنُوهَا مُنذ خُلِقُوا اہل جنت اپنے محلات اور منازل کی طرف ایسی راہ پائیں گے کہ ان سے ذرہ برابر بھی خطانہ ہوگی گویاوہ جب سے پیدا کیے گئے یہاں ہی سکونت پذیر ہیں۔(البحر المحیط ۸:۵۷ صفوۃ التفاسیر)

حدیث میں ہے: وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ إِنَّ أَحَدَھُم بِمَنْزِلِہٖ فِی الْجَنَّۃِ أَھْدیٰ مِنْہُ بِمَنْزِلِہِ الَّذِی کَانَ فِی الدُّنیَا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جنتی جنت میں اپنی منزل کی طرف اتنا جلدی راہ پائے گا کہ دنیا میں اپنے گھر کی طرف اتنا جلدی راہ نہیں پاتا۔(جزء من الحدیث رواہ البخاری، صفوۃ التفاسیر)

دین کی خدمت پر اللہ کی مدد آتی ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، جس میں دین کی خدمت کرنے والوں کے لیے اللہ کی مدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ {۷} محمد.

اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا، اللہ کی مدد سے مراد یہ ہے کہ اس کے راستے میں کافروں کے خلاف جہاد کیا جائے، اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کیے جائیں، اس کے احکامات کی پیروی کی جائے، اس نے جن چیزوں سے روکا اور منع کیا ہے ان سے رکا جائے، جب مسلمان کی طرف سے اس طرح کا معاملہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس کے دشمن کے خلاف مدد اور نصرت فرمائیں گے، اس کے بعد میدان حرب وضرب میں اللہ تعالیٰ اس کے قدم جمادے گا۔

اگر مسلمان من حیث القوم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور عزت کی زندگی مطلوب ہے تو ان کو چاہئے کہ اعلاء کلمۃ اللہ میں مصروف رہیں اور اپنی کوششیں اسی مقصد کے واسطے وقف کردیں اسی کی برکت سے وہ دشمنوں کے مقابلے میں مضبوط وثابت قدم رہیں گے اور یہی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اصل کامیابی آخرت کی ہے وہ صرف ایمان وتقویٰ پر موقوف ہے۔(تفسیر معارف القرآن للکاندھلوی)

یہ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی نصرت کے لئے اٹھ کھڑے ہو، اگر تم عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو آگے کا کام تمہارا رب سنبھال لے گا، وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدم اس طرح جمائے گا کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہ سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی راہ میں پہلا قدم وہ اٹھائیں، اگر انہوں نے یہ قدم اٹھا دیا تو اس کے بعد اس کی شانیں ظاہر ہوں گی، ان لوگوں کے لئے اس کی مدد نہیں نازل ہوتی جو گھروں میں بیٹھے بیٹھے اس کا انتظار کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے نازل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو میدان میں ڈال دیتے ہیں پھر اس کی نصرت کا انتظار کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے لئے حکم ہے کہ وہ اقامت دین، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اور اس کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے ذریعے سے اس کی مدد کریں اور ان تمام امور میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو۔ جب وہ یہ تمام کام کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا اور ان کو ثابت قدمی عطا کرے گا، یعنی اللہ تعالیٰ طمانینت اور ثبات کے ذریعے سے ان کے دلوں کو مضبوط کرے گا، ان کے اجساد کو ان امور کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے گا اور ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد فرمائے گا، یہ ایک کریم اور وعدے کی سچی ہستی کا وعدہ ہے کہ جو کوئی اپنے قول و فعل سے اس کی مدد کرے گا تو وہ بھی اپنے دوست کی مدد کرے گا اور اسے فتح و نصرت کے اسباب یعنی ثابت قدمی وغیرہ عطا کرے گا۔ (تفسیر السعدی)

دین اور رسول کریم ﷺ کی امداد کو اللہ تعالیٰ کی امداد فرمایا گیا ہے، جان کی بازی لگانے والوں کے لیے اس سے بڑھ کر مژدہ کیا ہو سکتا ہے، وہ مجاہد نصرت الٰہی جن کی پشت پناہی کر رہی ہو، ہر نازل مرحلہ پر تائید ایزدی جن کے دلوں کی ڈھارس ہو، دشمن کا کوئی طوفانی حملہ ان کے قدموں میں لغزش نہ پیدا کر سکے، تو ایسے جانباز مجاہدوں کو دنیا کی کوئی طاغوتی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ شرط یہ ہے کہ یہ جنگ وہ دنیاوی مفادات کے لیے نہ کر رہے ہوں، یہ خون ریزی کسی حقیر مقصد کے لیے نہ ہو، محض اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کے لئے ہو اور دین حق کو غالب کرنے کے لیے ہو۔ (ضیاء القرآن)

مولانا اسلم صدیقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انسانی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے، زندگی کا ایک حصہ ضروریات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا مقاصدِ زندگی پر، مسلمان اپنی ذات میں بھی اور ایک مملکت کے شہری اور سربراہ ہونے کی حیثیت سے بھی بہر حال انسان ہیں اور انسانی زندگی کی ضروریات اپنے اندر بے حد تنوع رکھتی ہیں، اسلام نے نہ صرف کسی جائز ضرورت کے مہیا کرنے سے نہیں روکا بلکہ اس کی ترغیب دی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس کے حصول کا ذریعہ جائز اور پاکیزہ ہونا چاہیے۔

انسانوں کی جان، مال و دولت اور عزت کی حفاظت کا مملکت کو ذمہ دار بنایا گیا ہے اور ہر شہری کی تعلیم اور اس کی صحت بھی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے وسائل فراہم کرے اور اس کے اداروں کو وجود دے، اسی طرح حالات کے مطابق دیہاتی اور شہری زندگی کی جو معاشرتی اور تمدنی ضروریات ہیں ان کا فراہم کرنا بھی مملکت کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے۔

یہ وہ ضروریات ہیں جن میں شہری اور حکمران برابر کے ذمہ دار ہیں اور ان کی فراہمی ان سب کی ذمہ داری ہے۔ لیکن جہاں تک ملک کی سلامتی، اسلام کی ترویج اور نفاذ اور اس کی بالادستی اور اگر اسلام کو خطرہ لاحق ہو تو اس کی حفاظت یہ نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت ہے بلکہ ان کے مقاصدِ زندگی میں شامل ہے۔

یہ وہ چیز ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمان اہل مکہ کے استبدادی رویہ کے حوالے سے اپنی بقا اور اسلام کے فروغ کی جنگ لڑ رہے ہیں، اہل مکہ نے اکثر قبائل کو مسلمانوں کا دشمن بنا دیا ہے، مدینہ کی چھوٹی سی بستی کا معاشی بائیکاٹ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے اہل مدینہ کی زندگی ضروریاتِ زندگی کی کمی کا شکار ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کے منافقین سے خفیہ مراسلت کے ذریعے مدینہ کے اندر کے حالات کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ اب مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا ہو گا کہ ہم اسلام سے ترک تعلق کر دیں اور جاہلیتِ قدیمہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور یا پھر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے کفر کے سامنے استقامت کے پیکر

بن جائیں، چنانچہ یہ دوسری بات مسلمانوں کا مقصد زندگی ہونے کی وجہ سے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے پاس افرادی قوت کی کمی ہے، معاشی حالات دگرگوں ہیں، اسلحۂ جنگ کی فراہمی کے لیے وسائل نہیں ہیں، لیکن مرحلہ ایسا درپیش ہے کہ اس میں ذراسی کمزوری اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ کرکے رکھ دے گی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت جوش میں ہے اور مسلمانوں سے وعدہ فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین کے احیاء، بقاء، نفاذ اور تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہو اور سب کچھ اس راستے میں قربان کرنے کا عہد کرلو تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارا کام استقامت دکھانا ہے باقی کام وہ خود سنبھال لے گا اور اس طرح تمہاری مدد فرمائے گا اور اس طرح تمہارے قدم جمائے گا کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہ سکے گا۔

اس کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا کہ جب اس کا کوئی بندہ یا اس کی نام لیوا کوئی قوم اس کے نام پر اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو پھر اس کی طرف سے فرشتے مدد کے لیے اترتے ہیں، جنگ بدر اس کی زندہ مثال ہے، آنحضرت ﷺ ہجرت کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر غار ثور میں جاکر بیٹھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی کے جالے سے وہ کام لیا جو بعض دفعہ قلعے بھی نہیں دیتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے بند دروازوں تک دوڑنا ضروری سمجھا تو دروازوں کا کھولنا قدرت نے اپنے ذمہ لے لیا۔

جب بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے صحیح فیصلے کے بعد اس کے بھروسے پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی شانیں ظاہر ہوتی ہیں اور غیر معمولی طریقے سے اس کی مدد آتی ہے۔ لیکن یہ مدد ان لوگوں کے لیے کبھی نہیں آتی جو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

جہاں تک مخالفین کا تعلق ہے ان کے بارے میں واضح طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ان پر پھٹکار ہے، ان کی ہلاکت کو کوئی نہیں روک سکتا، وہ جو کچھ اس سلسلے میں کریں گے ان کی ہر تدبیر اکارت جائے گی۔ جیسے جنگ بدر میں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی پہلی صف تہِ تیغ ہوگئی اور دوسری صف ذلت کے ساتھ قید کی زنجیروں میں جکڑی گئی۔ (روح القرآن)

فی زمانہ بھی اللہ کی مدد اور نصرت کی داستانیں دنیا بھر میں رقم ہورہی ہیں، افغانستان کے کہساروں پر چند مٹھی بھر مجاہدین اللہ کے نام کی خاطر میدان میں اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی، انہوں نے ایک اسلامی ریاست کو وجود دیا،وہ دنیا کی سپر پاور امریکہ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے،امریکہ جیسی سپر طاقت ان کی غیرت ایمانی اور ایقانی سے خوف زدہ اور لرزہ براندام ہونے لگی۔

دنیا بھر میں دینی مدارس قائم ہوئے، جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں سنائی دینے لگیں، ان مدارس میں قیام پذیر طلباء کی تعداد درجنوں اور سینکڑوں میں نہیں ہے بلکہ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ان کے اکل وشرب، ان کے قیام وطعام کا ذمہ دنیا کی کسی حکومت وسلطنت نے نہیں لے رکھا، بلکہ ان کا نظام اللہ کے غیبی نظام کے تابع ہے، اللہ ہی انہیں کھلاتا اور پلاتا ہے، ان کی ضروریات پوری کرتا ہے۔

دنیا بھر میں شاید چند ممالک ایسے ہوں جو مدارس اور مساجد شاہی خزانے سے بناتی ہوں، ورنہ دنیا بھر میں مساجد اور مدارس کا قیام جو یقیناً نصرت الٰہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے نصرت خداوندی کا عظیم شاہکار ہے، بڑی بڑی مساجد، بڑے بڑے مدارس، بڑی بڑی خانقاہیں، ادارے، انسٹی ٹیوٹس اللہ کی مدد اور نصرت سے ہی قائم ہوئے۔

اللہ نے ان لوگوں کی مالی مدد اور نصرت کی جو اللہ کے دین کی اشاعت وترویج، اس کی بقاء اور دوام کے لیے کچھ اپنا حصہ شامل کرنا چاہتے تھے، ان کے دل سے ہوک اٹھی قدرت والے نے ان کا ہاتھ تھام لیا، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایک صدقہ جاریہ کا کام کرنے میں کامیاب وبامراد ہوگئے۔

دور نبوی کے بہت عرصہ بعد، دور صحابہ وتابعین کے بہت عرصہ بعد بھارتی شہر دہلی کے نظام الدین سے ایک بوریہ نشینوں کی جماعت اٹھی، جس کی صدا دنیا بھر میں گونجی کہ سب کچھ اللہ سے ہوتا ہے اللہ کی مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا، جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے، کائنات ہستی میں موجود درختوں کا ایک پتا بھی اس کی منشاء اور مرضی کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا، یہ لوگ اٹھے تھے تو مٹھی بھر تھے، انسانی انگشت پر انہیں گنا جاسکتا تھا، مگر یہ ضرب الا اللہ کی گونج میں آگے کی سمت بڑھتے چلے گئے،

رب العالمین نے ان کی یاوری اور دست گیری کی تو دنیا کے آخری کونے تک یہ لوگ اپنا پیغام لے کر پہنچ گئے۔

ان کی دھیمی چال، دھیمے لہجے اور آہنگ کی بدولت دنیا کے حکمران ان میں شامل ہوئے، یہ اٹھے تو مختصر تھے مگر آج دنیا کی حکومتیں اور سلطنتیں ان کے گرد گھومتی ہیں، پھر بھارت کے بعد پاکستان میں رائے ونڈ کے مقام پر ان درویشوں، خدامستوں نے دعوتی بیس کیمپ قائم کیا تو یہاں علماء، طلباء، عامۃ الناس بلکہ سول اور فوج کے اداروں میں بھی ان کی نقل و حرکت شروع ہو گئی، اللہ کا دین پھیلتا چلا گیا، دنیا کے نغمے گونجتے چلے گئے، ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق ان لوگوں کی مدد کی جو اللہ کے دین کی مدد اور نصرت کرتے رہے۔

اسی طرح آپ اپنے گرد و پیش میں ان لوگوں پر نگاہیں مرکوز کیجیے، جو صبح و شام، علانیہ اور سراً اللہ کے نام پر مال خرچ کرتے ہیں، اپنی تجوریاں اللہ کے دین کی اشاعت و ترویج کے لیے انڈیل دیتے ہیں، جہاں اور جس جگہ پر اللہ کے دین کو ضرورت پیش آتی ہے وہ لوگ پیش پیش بلکہ راہ خدا میں خرچ کرنے والوں میں وہ لوگ سباق الاقدام نظر آتے ہیں، ان کی دولت کا کوئی حساب نہیں ہے، اللہ انہیں اس چیز کا صلہ دیتا ہے جو وہ اللہ کے دین کی نصرت اور مدد کرتے ہیں، ان لوگوں کے پاس مال و دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے، ان کی دنیوی ضروریات ان کے پاس وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں، اس لیے کہ اللہ نے وعدہ فرمایا کہ جو میرے دین کی مدد اور نصرت کرے گا میں اس کی مدد اور نصرت کروں گا، اور اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے، بلکہ دنیا میں کون ہے جس کی بات اللہ کی بات سے زیادہ سچی ہو؟ کوئی نہیں ہے۔

کفار کی ہلاکت و شقاوت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾ محمد

جواب ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا سو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ ان کے اعمال کو ضائع

کر دے گا، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اس چیز کو مکروہ جانا جو اللہ نے نازل فرمائی سو اس نے ان کے اعمال کو اکارت کر دیا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ: جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور اس کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے ہلاکت اور شقاوت ہے، یہ کفار پر ذلت و رسوائی کی بد دعا کی جا رہی ہے۔

وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال باطل اور ضائع کر دیے چونکہ یہ اعمال شیطان کی طاعت میں تھے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: یہ ذلت و رسوائی اور ان کے اعمال کا ضائع کرنا اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں اور شرائع کو ناپسند کرتے تھے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں: یعنی کفار قرآن اور اس میں نازل ہونے والی شرعی ذمہ داریوں اور احکام کا انکار کرتے تھے، وہ اس سب کچھ کو بلا مقصد سمجھتے تھے اور ان کا تمام تر مطمع نظر ان کی شہوات و خواہشات تھیں اس لیے قرآن، شرائع اور احکام ان پر گراں گزرے۔ (الکشاف ۴:۲۵۳ بحوالہ صفوۃ التفاسیر)

فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ: اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے، چونکہ ایمان قبول اعمال کی شرط اول ہے اور شرک عمل کو ضائع کر دیتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفر کے انجام سے ڈرایا ہے۔

کفار کا انجام، مسلمانوں کا صلہ، اہل مکہ

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا {۱۰} ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ {۱۱} اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ {۱۲} وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ {۱۳} اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ {۱۴} محمد

جواب ترجمہ: کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے، سو انہوں نے نہیں دیکھا کیسا ہوا ان کا انجام جو ان سے پہلے تھے، اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور کافروں کے لیے اسی قسم کی چیزیں ہیں، یہ اس وجہ سے کہ اللہ ایمان والوں کا مولیٰ ہے اور بیشک کافروں کے لیے کوئی بھی مولیٰ نہیں، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اللہ انہیں ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے، اور بہت سی بستیاں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ یہ بستیاں آپ کی بستی سے زیادہ سخت تھیں جنہوں نے آپ کو نکال دیا، ان بستیوں کا کوئی مدد گار نہ ہوا، جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر ہوں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہوسکتے ہیں جن کی بد عملی ان کے لیے مزین کی گئی اور جو اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: کیا ان لوگوں نے سفر کر کے سابقہ سرکش امتوں مثلاً عاد، ثمود، قوم لوط وغیرہا پر نازل ہونے والے عذاب کو نہیں دیکھا اور ان کا انجام کیسا تھا؟ ان کے در و دیوار کے آثار ان کی خبریں دیتے ہیں، ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان پر برسنے والے خدائی کوڑے کی اطلاع دیتے ہیں۔

دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ: اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں مال و اولاد جو عطا کی تھی اس کا صفایا کر دیا، یہ ان کی مکمل تباہی تھی۔ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ: ابلغ ہے بنسبت دَمَّرَهُمْ: کے چونکہ دَمَّرَ عَلَیْهِمْ: کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے مال و متاع اور اولاد سمیت تباہ کر دیا، یعنی ان پر ایسی تباہ کن ہلاکت پڑی کہ کچھ بھی باقی نہ بچا۔

وَلِلْكٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا: کفار مکہ کے لیے ایسے ہی تباہ کن عذاب و انجام کی مثالیں ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا رکھوالا اور مدد گار ہے ان کے ایمان و ایقان کی وجہ سے۔

وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ کافروں کا کوئی معین و مدد گار نہیں اور کوئی بھی ان کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔

سوال یہاں کفار کے بارے میں کہا گیا کہ ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہے، حالانکہ دوسرے مقام پر کفار کے بارے میں فرمایا گیا کہ ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ کہ انہیں اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا، تو ان دونوں ارشادات میں تعارض دکھائی دیتا ہے؟

جواب: یہاں فرمایا گیا کہ کفار کا کوئی مولیٰ نہیں ہے، جب کہ دوسرے مقام پر آیا کہ انہیں اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا، ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ جس آیت میں فرمایا گیا کہ انہیں اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا وہاں مولیٰ سے مراد "مالک" ہے کہ انہیں اپنے سچے مالک کی طرف لوٹایا جائے گا جب کہ یہاں مولیٰ "مددگار" کے معنیٰ میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ملک اور تصرف کے اعتبار سے کفار اور مسلمانوں دونوں کا مولیٰ ہے، جب کہ مددگار کے طور پر خصوصی طور پر وہ مسلمانوں کا مولیٰ ہے، اس لیے ان دونوں ارشادات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اس کے بعد فریقین کا آخرت میں انجام بیان کیا ہے

إِنَّ اللهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ: اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بہشتوں میں داخل کرے گا جس میں ایسی نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، جو کسی کان نے نہیں سنیں اور نہ کسی دل میں کھٹکیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ: کفار دنیا میں شہوات و لذائذ سے عارضی نفع اٹھاتے ہیں اور چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں، ان کا تمام تر مطمح نظر پیٹ اور شرم گاہ کو سیر کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ: دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور آخرت میں ان کی منزل ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں: اَلْمُرَادُ أَنَّهُم يَنتَفِعُونَ بِمَتَاعِ الدُّنيَا أَيَّاماً قَلَائِلَ، وَيَأْكُلُونَ غَافِلِينَ غَيرَ مُفَكِّرِينَ فِي العَاقِبَةِ كَمَا تَأْكُلُ الأَنعَامُ فِي مَسَارِحِهَا وَمَعَالِفِهَا غَافِلَةً عَمَّا هِيَ بِصَدَدِهِ مِنَ النَّحرِ وَالذَّبحِ، وَالنَّارُ مَنزِلٌ وَّمَقَامٌ لَّهُم فِي الآخِرَةِ مراد یہ ہے کہ کفار دنیا کے مال و متاع سے تھوڑے دنوں نفع اٹھائیں گے، وہ انجام سے بے فکر غفلت میں پڑے کھائے

جارہے ہیں جیسے صبح و شام چوپائے کھاتے ہیں اور وہ اپنے انجام یعنی ذبح کرنے سے غافل ہوتے ہیں، یہی حال کفار کا ہے اور آخرت میں ان کی منزل دوزخ ہے۔ (الکشاف ۴: ۲۵۲ صفوۃ التفاسیر) اس کے بعد رسول کریم ﷺ کو تسلی دی ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ: کتنے سرکش و ظالم بستیوں والے ہیں جو اہل مکہ سے زیادہ طاقتور تھے، جن اہل مکہ نے آپ کو شہر سے نکالا۔

اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ: ہم نے انہیں مختلف اقسام کے عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیا، کسی نے بھی ان کی مدد نہیں کی، اسی طرح ہم ان لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب حضور نبی کریم ﷺ مکہ سے نکلے اور غار میں جا کر چھپ گئے پھر وہاں سے مدینہ ہجرت کر گئے، اس دوران آپ ﷺ نے مکہ کی طرف رخ انور کیا اور فرمایا: إِنَّكِ لَأَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللهِ، وَأَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمَكَ أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا خَرَجْتُ تو اللہ تعالیٰ کو سب شہروں میں سے زیادہ محبوب ہے اور مجھے بھی سب سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تجھ سے باہر نہ نکلتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (حاشیۃ الجمل علی الجلالین ۴: ۱۴۵ بحوالہ صفوۃ التفاسیر)

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ: جو شخص اپنے دین کے معاملہ میں حجت و بصیرت، ثبات و یقین پر قائم ہو تو کیا وہ

كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ: اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے عمل قبیح کو آراستہ کر دیا گیا ہو اور وہ اسے بڑا خوبصورت دیکھ رہا ہو؟

وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ: اور گمراہی میں وہ منہمک ہوں یہاں تک کہ خواہش نفس کے بندے بن گئے ہوں؟ یقیناً یہ اس جیسا نہیں ہو سکتا۔

اِتَّبَعُوْٓا: جمع کا صیغہ لایا ہے۔ **مَن:** موصولہ کے معنی کی رعایت سے۔ مفسرین کہتے ہیں: آیت میں **مَن كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ:** سے رسول کریم ﷺ مراد ہیں اور **زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ:** سے ابو جہل اور کفار قریش

مراد ہیں، لیکن الفاظ سے عموم مراد لینا ہے چونکہ غرض اللہ کے بندے اور ہوائے نفس کے بندے میں فرق واضح کرنا ہے، اسی لیے بعد میں بڑے فرق سے وضاحت کر دی ہے اور یہ فرق جنت اور دوزخ میں واضح کیا گیا ہے۔

جنت کی نہریں

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے جس میں جنت کی نہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۚ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ {۱۵} محمد.

جواب ترجمہ: متقی لوگوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو خراب ہونے والا نہیں، ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا، ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے سراپا لذت ہو گی، اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو نتھرا ہوا ہو گا، اور ان جنتیوں کے لیے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے، اور ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت! کیا یہ لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور انہیں گرم پانی پلایا جائے گا، چنانچہ وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟

خلاصہ تفسیر: یہاں اہل ایمان کے لیے اس جنت کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں جو ان کے لیے تیار کی گئی ہے، جنت کی صفات بیان کی گئی ہیں جو متقی اہل ایمان کے لیے تیار کی گئی ہے، اوصاف عجیبہ کا بیان ہے، قرآن کریم میں بتایا گیا کہ جنت میں پانی کی نہریں ہوں گی، دودھ کی نہریں ہوں گی، شراب کی نہریں ہوں گی، اور نتھرے شہد کی نہریں ہوں گی، یعنی ان چار قسم کے مشروبات کی نہریں جنت میں ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے صرف پانی کو مطلق بیان نہیں کیا بلکہ اس کی کوالٹی اور معیار بھی بیان فرمایا ہے، اسی طرح دودھ مطلق بیان نہیں کیا بلکہ اس کی کوالٹی اور معیار، اس کی لذت اور چاشنی کا بھی بیان فرمایا

ہے، اسی طرح شراب مطلق نہیں ہے بلکہ شراب کا اعلیٰ معیار اور لذت دار ہونا بھی بیان فرمایا ہے، شہد کو بھی مطلق بیان نہیں فرمایا بلکہ اس کی صفت بھی بیان فرمائی ہے۔

جن لوگوں نے تقویٰ کی زندگی گزاری یعنی اپنے دل و دماغ اور اپنی عملی اور انفعالی قوتوں میں ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پیروی کی، زندگی کے ہر مرحلے میں احکامِ شریعت کو اختیار کیا، ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ کے رسول کی سنت کو رہنما بنایا، ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی حقیقت تو قیامت کے دن ہی کھلے گی کہ وہ جنت کیسی ہے۔

لیکن اس کی تمثیل بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس میں صاف ستھرے اور نتھرے ہوئے پانی کی نہریں ہوں گی جس کی بو، مزے اور رنگ میں کسی طرح کا تغیر پیدا نہیں ہوا ہو گا، کیونکہ دنیا میں دریاؤں اور نہروں کا پانی عموماً گدلا ہوتا ہے، زمین کا سفر کرتے ہوئے ریت اور مٹی اور نباتات کسی صورت میں نہ جانے کیسی کیسی چیزیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں، اسی طرح چشموں سے ابلتا ہوا پانی بھی نہ جانے کہاں کہاں سے گزر کے آتا ہے، برف کی صورت میں کیسا پانی جمتا ہے جو پگھل کر چشموں کی صورت میں رواں ہو جاتا ہے، وہ یقیناً دریائی پانی سے بہت صاف ہوتا ہے، لیکن اس کے اندر بھی وہ صفائی یقیناً نہیں ہو سکتی جو جنت میں نکلنے والی نہر کے پانی کی ہو گی، ایسے پانی کو غیر آسن قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ خالص صاف ستھرا پانی ہو گا جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو گی۔

اسی طرح وہاں دودھ کی نہریں رواں دواں ہوں گی جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہوا دودھ نہ ہو گا، کیونکہ تھنوں سے نکلنے والا دودھ اگرچہ گوبر اور خون کے درمیان سے اللہ تعالیٰ نکال کے لاتا ہے جو بالکل سفید اور نہایت صاف ستھرا ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس میں ایک ہلکی سی بساند ہوتی ہے، جنت میں پایا جانے والا دودھ اس طرح کی ہر بساند سے پاک ہو گا اور وہ لطف و لذت میں بھی یقیناً دنیا میں پائے جانے والے دودھ سے بہت مختلف ہو گا۔

مزید فرمایا گیا کہ وہاں شراب کی نہریں بہیں گی، لیکن وہ شراب رنگ اور مزے اور بو میں دنیوی

شراب سے بالکل مختلف ہو گی، اس میں دنیا کی شراب کی طرح نہ کڑواہٹ ہو گی اور نہ سیاہی اور نہ اس کے پینے کے بعد خمار آئے گا، نہ وہ عقل پر غلبہ پائے گی، وہ اپنے پینے والوں کے لیے صرف لذیذ ہی نہیں بلکہ سراپا لذت ہو گی، اس کو صرف لذت کے لیے پینے والے پینا پسند کریں گے۔ اس کے پینے سے جس طرح لطف و لذت میں اضافہ ہو گا اسی طرح اس کا خمار اترنے سے جس طرح جسم ٹوٹتا ہے جنت کی شراب ان تمام کمزوریوں سے پاک ہو گی۔

مزید فرمایا کہ اس میں صاف ستھرے شہد کی نہریں رواں ہوں گی، دنیا میں جو شہد ملتا ہے اس کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں کسی نہ کسی حد تک مکھیوں کے اثرات ہوتے ہیں، وہ ان کے غل و غش سے پاک نہیں ہوتا، اس میں کہیں مری ہوئی مکھیوں کی ٹانگیں نکلتی ہیں اور کبھی موم اور چھتے کے ٹکڑے بر آمد ہوتے ہیں، لیکن جنت کی نہروں میں بہنے والا شہد ہر طرح کی آلودگی اور مکھیوں کے اثرات سے یکسر پاک ہو گا، کوئی اس پر مگس کی قے ہونے کی پھبتی چست نہ کر سکے گا۔

مزید فرمایا کہ اہل جنت کو اس میں ہر طرح کے پھل ملیں گے جس میں نہ موسم کی قید ہو گی نہ کسی علاقے کی پابندی۔ اہل جنت جس پھل کی بھی خواہش کریں گے وہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، آخر میں ایک ایسی نعمت کا ذکر فرمایا گیا ہے جو جنت کی ان تمام بیش بہا نعمتوں سے زیادہ قیمتی ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی، کیونکہ یہ وہ نعمت ہے جس کے ملنے کے بعد باقی تمام نعمتوں کا جواز پیدا ہوتا ہے، بلکہ جنت اسی نعمت کا ثمر ہے اور ایک مومن در حقیقت اسی نعمت کو حاصل کرنے کے لیے جیتا اور مرتا ہے اور زندگی میں جتنی قربانیاں دیتا ہے اس کے پیش نظر صرف اسی نعمت کا حصول ہوتا ہے، محض جنت کا حصول ایک مومن کے اہداف میں کبھی شامل نہیں رہا، یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ جب کسی کی مغفرت فرماتا ہے تو اسے جنت بھی عطا فرماتا ہے۔ (روح القرآن)

خلاصہ یہ کہ اہل جنت ہر قسم کی مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔ دنیا کی ہر مادی نعمت فناء پذیر ہوتی ہے۔ پانی سڑ جاتا ہے، دودھ بگڑ جاتا ہے، شراب میں تلخی ہوتی ہے شہد میں گدلا پن شامل

رہتا ہے۔ آیت میں ان سب چیزوں کی نفی کر کے بتلا دیا ہے کہ جنت کی کسی مادی نعمت میں کوئی خرابی نہ پیدا ہونے پائے گی، جنت کا ماحول، ناسوت کے ماحول سے بالکل مختلف ہو گا، اس لئے وہاں کی ”مادیت“ کا بھی یہاں کی مادیات سے بالکل مختلف ہونا قرین قیاس ہے، وہاں کی مادیات کا بھی یہاں بس صرف لفظ ہی مادیت ہوں گے۔ (تفسیر ماجدی)

منافقین اور مسلمانوں کا رویہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ {۱۶} وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ {۱۷} فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاۗءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَاۗءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ {۱۸} محمد

جواب ترجمہ: اور ان میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو اہل علم سے کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی کیا بات فرمائی تھی؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں، اور جو لوگ صحیح راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دیتا ہے، سو یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر دفعتاً آ پڑے، سو اس کی علامتیں تو آچکی ہیں سو جب قیامت ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس وقت ان کو سمجھنا کہاں میسر ہو گا؟

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ: اے محمد! ان منافقین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو بڑے غور سے آپ کی باتیں سنتی ہے۔ اس سے مراد وہ منافقین ہیں جو اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اپنے دلوں میں کفر اور عصیان کو چھپائے رکھتے تھے، یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں اس طرح حاضر ہوتے جس سے نبی کریم ﷺ کی توہین و بے ادبی کا پہلو نکلتا تھا، یہ لوگ آپ ﷺ کی بات غافل ہو کر سنتے تھے، یہ

لوگ نبی کریم ﷺ کی مجلس ، آپ کی ذات اقدس کا اس طرح خیال نہیں رکھتے تھے جس طرح آپ ﷺ کی مجلس اور آپ ﷺ کی ذات کا خیال رکھنے کا حق تھا۔

حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ: حتیٰ کہ جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر باہر نکل جاتے ہیں:

قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا: تو وہ علمائے صحابہ جیسے ابن عباس اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کہتے ہیں: محمد نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بلادت اور قلت فہم کے بارے میں خبر دی ہے چنانچہ منافقین رسول کریم ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور آپ ﷺ کی باتوں کو غور سے سنتے تھے اور آپ سے کچھ سمجھتے نہیں تھے اور جب مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے تھے تو علمائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھتے کہ محمد نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ آپ نے جو فرمایا ہوتا وہ سمجھتے نہیں تھے اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۳۳۳)

یہاں منافقین کے سوال سے بظاہر یہ لگتا تھا کہ وہ کسی چیز سے لاعلمی کی وجہ سے معلومات حاصل کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ آپ ﷺ کے ساتھ استہزا کے طور پر پوچھتے تھے کہ محمد نے اس گھڑی کیا کہا؟ اسے قرآن کریم نے اٰنِفًا کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر کفر کی مہر لگادی ہے، یہاں اُولٰٓئِكَ اسم اشارہ کا مشارالیہ وہ منافقین ہیں جن کی صفات قبیحہ بیان کی جارہی ہیں، ان کے دلوں پر مہر لگادی یہ تعبیر ہے اس بات کی کہ منافقین نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ مبارکہ کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے، خیر و بھلائی کی بات پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ: اور وہ اپنی باطل خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، اسی لیے تو وہ ایسے کام کرتے تھے جن میں خیر و بھلائی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے حق کی پیروی چھوڑی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مردہ کر دیا، جب منافقین کے دل مردہ ہوگئے تو اب سوچنے، سمجھنے اور فکر کرنے کی صلاحیتیں ختم ہوگئیں، جب یہ نعمت خداداد چھن گئی تو انہوں نے خواہشات باطلہ کی پیروی شروع کر دی، جسے اللہ تعالیٰ نے یہاں تعبیر فرمایا کہ انہوں نے خواہشات باطلہ کی اتباع کی۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ: رہی بات پرہیز گار مؤمنین کی، جنہوں نے راہ حق کی پیروی کی، سو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ہے اور انہیں رشد و ہدایت سے نواز دیا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے توجہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی باتیں، خیر کی باتیں، بھلائی کی باتیں سنیں، انہیں سمجھا، ان پر توجہ دی، ان پر غور کیا، عاجز و مسکین و محتاج بن کر سنتے رہے، اسے اپنی ضرورت سمجھتے رہے، تو اللہ نے ان کی رشد و ہدایت میں اضافہ فرمایا، اس سے ہدایت پانے والے راہبر و ہادی بن گئے، جو کل تک ھدایت کے محتاج تھے آج رشد و ہدایت کے اس عالی مرتبے پر فائز ہوئے کہ اوروں کے ھادی بن گئے، هُدًى سے یہاں توفیق اور الہام مراد ہے۔ انہیں تقوی عطا کیا سے مراد یہ ہے کہ ان کے تقویٰ پر ان کی اعانت کی اور ان کی رشد و ہدایت پر انہیں توفیق عطا کی۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لَمَّا بَيَّنَ اللهُ تَعَالَى أَنَّ الْمُنَافِقَ يَسْتَمِعُ وَلَا يَنْتَفِعُ، وَيَسْتَعِيدُ وَلَا يَسْتَفِيدُ، اللہ تعالیٰ نے منافق کے بارے میں وضاحت فرمادی کہ وہ بات غور سے سنتا ہے لیکن اس سے نفع نہیں اٹھاتا، اعادہ کا طالب ہوتا ہے لیکن استفادہ نہیں کرتا۔

پھر آگے واضح کر دیا کہ ہدایت یافتہ مؤمن کا حال منافق کی حالت کے برخلاف ہے، چنانچہ فَإِنَّهُ يَسْتَمِعُ فَيَفْهَمُ، وَيَعْمَلُ بِمَا يَعْلَمُ، وَالْمُنَافِقُ يَسْتَعِيدُ، وَالْمُهْتَدِي يُفَسِّرُ وَيُعِيدُ، مؤمن جو بات غور سے سنتا ہے اس سے نفع اٹھاتا ہے اور سمجھتا ہے اور اس کے پاس جو علم ہوتا ہے اس پر عمل کرتا ہے، اس تقابل میں ایک فائدہ ہے کہ منافق کے عذر کا خاتمہ ہو گیا چنانچہ اگر منافق کہتا کہ میں نے محمد ﷺ کی بات دقیق ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھی تو اس پر رد کیا جاسکتا ہے کہ مؤمن نے کیسے سمجھ لی اور اس سے استنباط کیسے کر لیا؟ یہ دلوں کو مقصود میں لگا دینے سے حاصل ہوتا ہے خفائے مطلوب نہیں۔ (الکبیر)

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً: منافقین تو صرف قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آن پڑے گی دراں حالیکہ وہ غفلت میں چل پھر رہے ہوں گے؟

فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا: اشراط شرط کی جمع ہے، اس کا معنیٰ نشانی اور علامت ہے، قیامت کی (کچھ)

علامات تو ظاہر ہو چکی ہیں، ان میں سے ایک خاتم المرسلین ﷺ کا مبعوث ہونا ہے، چاند کے دو ٹکڑے ہونا ہے، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قطع رحمی (رشتہ داری کو کاٹنا) عام ہو گی، شرفاء کی تعداد تھوڑی ہو جائے گی، کمینے لوگوں کی کثرت ہو گی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ العِلْمُ، وَيَكْثُرَ الجَهْلُ، وَيَكْثُرَ الزِّنَا، وَيَكْثُرَ شُرْبُ الخَمْرِ، وَيَقِلَّ الرِّجَالُ، وَيَكْثُرَ النِّسَاءُ حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً القَيِّمُ الوَاحِدُ (بخاری) قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا، جہالت زیادہ ہو جائے گی، زنا زیادہ ہو جائے گا، شراب نوشی زیادہ ہو جائے گی، مردوں کی تعداد کم ہو جائے گی، عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا نگران ایک ہی مرد ہو گا۔

فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ: جب قیامت آجائے گی تو ان کے پاس نصیحت کہاں سے آئے گی چونکہ اس وقت ندامت اور توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا؟

عصمت مصطفٰے ﷺ اور حکم استغفار

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ {۱۹} محمد

جواب ترجمہ: تو آپ اس کا یقین رکھیے کہ بجز اللہ کے اور کوئی لائق عبادت نہیں، اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی خبر رکھتا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: اے محمد! آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا جو علم ہے آپ اس پر قائم و دائم رہیں، آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ سعادت و نیک بختی کا مدار توحید پر ہے، جب کہ بد بختی و شقاوت شرک اور نافرمانی میں ہے، اس لیے آپ ﷺ اس علم پر ڈٹے اور ثابت قدم رہیں جو توحید

پر مبنی ہو، ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہاں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے جب کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں، ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ آپ ﷺ توحید پر ثابت قدم رہیے، ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اپنے علم میں اضافہ کیجیے۔ ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ قیامت کا ساتھ ہی ذکر ہے، گویا یوں فرمایا گیا کہ جب قیامت آجائے تو پھر کوئی ملجا وماویٰ وجائے پناہ نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن) ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ جب قیامت آجائے گی تو سارے ممالک باطل ہو جائیں گے، ساری بادشاہیاں ختم ہو جائیں گی، ملک اور حکم صرف ایک ذات کا چلے گا اسے اللہ کہتے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن)

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ: اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مغفرت طلب کریں، مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کے لیے بھی طلب کریں، آپ ﷺ اپنے گناہ کی معافی مانگیے، یہ تعبیر ہے اس چیز کی جو آپ ﷺ سے خلاف اَولیٰ کوئی بات صادر ہوئی، اس خلاف اَولیٰ کو آپ ﷺ کے عظیم الشان منصب جلیل کی طرف نظر کرتے ہوئے ''ذنب'' سے تعبیر کیا گیا کیونکہ نیکوکاروں کی نیکیاں قریبی لوگوں کی خطائیں سمجھی جاتی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو یہ فرمانا کہ اپنے گناہ کی معافی مانگیے یہ آپ ﷺ کی تواضع کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا، ورنہ آپ ﷺ تو معصوم عن الخطا تھے، اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے مطابق کسی نبی سے کوئی چھوٹا بڑا گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

ایک تفسیر میں ہے "ذنب" کا لفظ ہر طرح کی غلطی کے لیے بولا جاتا ہے، چاہے وہ گناہ کے درجہ کی ہو یا معمولی لغزش اور بھول چوک ہو، اس آیت میں اسی عام معنی میں فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ اپنی اور مسلمانوں کی غلطیوں کی معافی مانگا کیجیے، انبیاء علیہم السلام سے ایسی غلطی نہیں ہو سکتی، جو گناہ کے درجہ کی ہو، البتہ بھول چوک ہو سکتی ہے، یہاں آپ ﷺ کے حق میں بھول چوک مراد ہے اور امت کے حق میں ہر طرح کے بڑے چھوٹے گناہ۔ (تفسیر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں أَمْرٌ بِالِاسْتِغْفَارِ مَعَ أَنَّهُ مَغْفُورٌ لَهُ لِتَسْتَنَّ بِهِ أُمَّتُهُ یعنی آپ

ﷺ کو استغفار کا حکم دیا گیا حالانکہ آپ ﷺ کا سب کچھ بخشا جاچکا ہے تاکہ امت آپ ﷺ کا اتباع کرے، حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ أَنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لِأَسْتَغْفِرُ اللهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ بیشک میرے دل پر میل سا آتا ہے اور بیشک میں اللہ سے روزانہ سو دفعہ استغفار کرتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہر مجلس میں سو مرتبہ استغفار فرماتے ہیں۔ (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن)

اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے بخشش کا حکم دیا گیا، اس کی تفسیر میں امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں هٰذَا إِكْرَامٌ مِنَ اللهِ تَعَالَى لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ حَيْثُ أَمَرَ نَبِيَّهُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَسْتَغْفِرَ لِذُنُوبِهِمْ وَهُوَ الشَّفِيعُ الْمُجَابُ فِيهِمْ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کا اکرام ہے کہ ان کے نبی ﷺ کو حکم فرمایا کہ ان کے گناہوں کے لیے استغفار کریں آپ کی ذات گرامی کو اللہ نے شفاعت کرنے والا بھی بنایا اور شفاعت قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن)

وَاللهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ: اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہاری نقل و حرکت اور آخرت میں تمہارے ٹھکانے کو خوب جانتا ہے، لہٰذا آخرت کے لیے توشہ تیار رکھو۔

جہاد: مؤمنین اور منافقین کا طرز عمل

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

وَيَقُولُ الَّذِينَ اٰمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَإِذَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلٰى لَهُمْ {۲۰} محمد

جواب ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: کیا اچھا ہو کہ کوئی (نئی) سورت نازل ہو جائے؟ پھر جب کوئی جچی تلی سورت نازل ہو جائے، اور اس میں لڑائی کا ذکر ہو تو جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تم انہیں دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف اس طرح نظریں اٹھائے ہوئے ہیں جیسے

کسی پر موت کی غشی طاری ہو۔ بڑی خرابی ہے ایسے لوگوں کی۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والے لوگوں کے ایمان وایقان کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے مخالفین سے ہمہ وقت پنجہ آزمائی کے لیے تیار دکھائی دیتے تھے، اسی لیے وہ آرزو رکھتے تھے کہ کوئی نئی سورت اترے جس میں اللہ کی طرف سے حکم ملے کہ کافروں سے بھڑ جاؤ، جب کوئی محکم بیان وفرائض والی سورت نازل ہوتی جس میں جہاد کا تذکرہ ہوتا تو منافقین جن کے دلوں میں اللہ کے دین میں شک کی بیماری ہوتی وہ تعجب انگیز نگاہوں کے ساتھ آپ ﷺ کی طرف دیکھنے لگتے تھے، انہیں موت سے ڈر لگنے لگتا تھا، ان پر اس طرح غشی طاری ہو جاتی جس طرح مرنے والوں پر طاری ہوا کرتی ہے، ان کے دل میں یہ بیماری ہوتی تھی کہ کہیں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرنا پڑ جائے۔

مولانا اسلم صدیقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد عام خیال یہ تھا کہ اب مسلمانوں کو اطمینان سے اپنے دین پر عمل کرنے کا موقع ملے گا، وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے فیصلے کریں گے اور مدینہ کی چھوٹی سے بستی جو ایک ریاست کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی اس کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے، لیکن اہل مکہ نے انہیں یہاں بھی آرام سے رہنے کا موقع نہ دیا، وہ انہیں مرتد قرار دے کر اپنے دین میں واپس لے جانے کی فکر میں تھے کہ مسلمانوں کی ہجرت نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا اور وہ یہ سمجھے کہ ہمارا شکار ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا، اس لیے وہ انہیں بھگوڑے قرار دے کر ہر ممکن طریقے سے انھیں زچ کر دینا چاہتے تھے۔

لیکن مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جینے اور مرنے کا عہد کر رکھا تھا اور انھیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس رہتا تھا اس لیے وہ کسی قیمت پر بھی اہل مکہ کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ اہل مکہ کی بڑھتی ہوئی جارحیت کو دیکھ کر پہلے تو ان کے دل میں یہ خیال مچلنے لگا اور پھر زبانوں پر دبے دبے لہجے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مؤدبانہ سوال کی صورت اختیار کر گیا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی سورۃ یعنی کوئی ایسا حکم نازل کیوں نہیں فرماتے جس میں ہمیں جہاد کا

حکم دیا گیا ہو، تاکہ ان ظالموں سے ہم دو دو ہاتھ کر کے دیکھ لیں۔

مخلص مسلمانوں کی یہ گزارش تو ایک پس منظر رکھتی تھی اور اس کے اندر ان کے زخم بولتے ہوئے سنائی دیتے تھے، لیکن وہ لوگ جو صرف دعویٰ ایمان رکھتے اور حقیقی ایمان سے تہی دامن تھے، اور جنھیں منافقین کہا جاتا تھا، وہ بڑھ چڑھ کر اپنی فدائیت اور سرفروشی کا اظہار کرتے ہوئے اس گزارش کو بار بار دہراتے۔

یہی صورتحال جاری تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم نازل فرما دیا، جس میں پہلے اجازت دی گئی اور پھر حکم دیا گیا، تو اب منافقین کے لیے ایک امتحان سر پر آپہنچا، اب تک انھوں نے محض اپنی زبان آوری سے اپنی سرفروشی کا ثبوت بہم پہنچایا تھا، لیکن جہاد کے حکم کے بعد اب سوال یہ تھا کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو انھیں آگے بڑھ کر میدانِ جنگ میں اس کا ثبوت دینا ہو گا، اب انہوں نے تصور میں دیکھا کہ جنگ کا میدان گرم ہو چکا ہے، حق و باطل کی کشمکش جنگ کی صورت اختیار کر گئی ہے، اہل حق اور اہل باطل کے گروہ آپس میں متصادم ہو گئے ہیں، تلواریں چلنے لگی ہیں، خون بہہ رہا ہے، جسم کے اعضا کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، کندھوں سے گردنوں کا بوجھ اتر رہا ہے، انہیں محسوس ہوا کہ یہ تلواریں اور شمشیریں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں تو ان کی ایسی کیفیت ہو گئی جیسے کسی کی سکرات الموت کے طاری ہونے پر ہوتی ہے۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنحضرت ﷺ کو دیکھنے لگے، سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کیفیت کی تصویر کھینچتے ہوئے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ " تم نے ان لوگوں کو دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔" اب جو انہیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔ کہتے ہیں " اے ہمارے رب! یہ لڑائی کا حکم ہمیں کیوں دے دیا،، ہمیں ابھی کچھ اور مہلت کیوں نہ دی ؟" یعنی انھیں اس اسلام پر چلنے میں کوئی اعتراض نہ تھا جس میں تکلیف نہ اٹھانی پڑے، کوئی قربانی نہ دینی پڑے اور جان و تن کے لیے کوئی آزمائش سر نہ اٹھائے۔ لیکن

جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو جان بھی دینی پڑے گی، تو اب وہ پریشان ہو گئے۔ پروردگار نے ان کی اس حالت کے حوالے سے فرمایا: کہ افسوس ہے ان کے لیے۔

اولیٰ کا ایک معنی افسوس کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا معنی کے اعتبار سے وَیْل کا ہم معنی ہے۔ یہ لعنت اور اظہارِ نفرت کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو ان پر کہ انھوں نے ایمان کو بھی خالی زبان کا اقرار سمجھ رکھا تھا حالانکہ :

یہ قدم قدم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری
یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

منافقین کا انجام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ {۲۱} فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ {۲۲} اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ {۲۳} محمد

جواب ترجمہ: ان کی اطاعت اور بات چیت معلوم ہے، پھر جب مضبوطی کے ساتھ حکم آ گیا تو اگر یہ لوگ اللہ سے سچا وعدہ کرتے تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا، سو اگر تم والی بن جاؤ تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے کہ دنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع رحمی کر دو، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ: یعنی منافقین کو چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نازل ہو تنگ دل ہونے کی بجائے کہیں کہ ہمارا کام تو فرمان برداری کرنا اور اچھی بات کہنا یعنی دل سے اور زبان سے تسلیم کرنا ہے۔ (انوار البیان) علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے، اَیْ طَاعَةٌ لَّكَ یَا مُحَمَّدُ اور قَوْلٌ جَمِيْلٌ طَيِّبٌ خَيْرٌ لَّهُمْ یعنی اے محمد: تمہاری اطاعت بہتر ہے اور اچھی بات ان کے لیے بہتر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں، یہ کلام مستانف ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیری عبارت خَيْرٌ لَّهُمْ : ہے۔ مبتدا نکرہ جائز ہے بشرطیکہ اس میں تخصیص پیدا کر دی جائے، یہاں بھی صفت کے ساتھ تخصیص لائی گئی ہے۔ اَیْ طَاعَةٌ مُّخْلِصَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خَيْرٌ لَّهُمْ (التفسیر الکبیر ۲۸:۶۲)

فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ: چنانچہ جب جہاد کی فرضیت کا حکم پکا ہو جائے۔

فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: اگر یہ لوگ اپنی نیتوں کو خالص کر لیں اور صدق یقین کے ساتھ جہاد کریں تو یہ چیز ان کے لیے پیچھے ہٹنے اور عصیان و نافرمانی سے بہتر ہے، یہ جملہ جواب شرط ہے۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ: اگر تم اسلام سے اعراض کر جاؤ اور جاہلیت کے دین کی طرف لوٹ جاؤ تو ایسی صورت میں تم سے یہی امید ہے کہ تم زمین میں کفر و معاصی اور قطع رحمی سے فساد پھیلاؤ گے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی قوم اللہ کی کتاب سے اعراض کرتی ہے وہ زمین پر حرام خون بہاتی ہے، قطع رحمی کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اتر آتی ہے، ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ زمانہ فترت کے متعلق بات ہو رہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہو گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ: یہ وہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔

فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ: حق کی بات سننے سے انہیں بہرہ کر دیا ہے اور راہ ہدایت کے سمجھنے سے ان کے دلوں کو اندھا کر دیا ہے۔ لہٰذا راہ ہدایت انہیں نہیں سجھائی دیتی۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: أَخبَرَ تَعَالَى أَنَّ مَنْ فَعَلَ ذَلِكَ حَقَّتْ عَلَيْهِ لَعْنَتُهُ، وَسَلَبَهُ الِانْتِفَاعَ بِسَمْعِهِ وَبَصَرِهِ حَتَّى لَا يَنْقَادَ لِلْحَقِّ وَإِنْ سَمِعَهُ، فَجَعَلَهُ كَالْبَهِيمَةِ الَّتِي لَا تَعْقِلُ اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی ہے کہ جو شخص بھی ایسا کرتا ہے اس پر اللہ کی لعنت نازل ہوتی ہے، اس کے کانوں اور آنکھوں کا فائدہ اٹھانا سلب ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ حق کے لیے منقاد نہیں ہوتا اگرچہ وہ حق کو سن لے، اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو چوپایوں کی مانند قرار دیا ہے جو کچھ نہیں سمجھتے۔

منافقین مرتدین کی کارستانیاں، دلوں کی بیماریاں اور کینہ پروری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا {۲۴} اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَی الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰی لَهُمْ {۲۵} ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۖ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ {۲۶} فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ {۲۷} ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ {۲۸} اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ {۲۹} وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ {۳۰} محمد

جواب ترجمہ: سو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل ہیں۔ بیشک جو لوگ پشت پھیر کر پلٹ گئے اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت ظاہر ہو گئی تھی شیطان نے ان کے سامنے مزین کر دیا اور انہیں تاخیر والی باتیں سمجھا دیں، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ان لوگوں سے کہا جنہوں نے اللہ کے نازل کیے ہوئے فرمان کو ناپسند کیا کہ ہم بعض کاموں میں تمہاری اطاعت کریں گے، اور اللہ ان خفیہ باتیں کرنے کو جانتا ہے، سو ان کا کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی جانوں کو قبض کرتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پشتوں پر مار رہے ہوں گے، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اس چیز کا اتباع کیا جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اللہ کی خوشی کو ناپسند کیا پھر اس نے اکارت کر دیئے ان کے اعمال۔ کیا ان لوگوں نے خیال کیا ہے جن کے دلوں میں مرض ہے کہ اللہ ان کے کینوں کو نہ نکالے گا، اور اگر ہم چاہتے تو آپ کو انہیں دکھا دیتے، سو آپ انہیں ان کی نشانی سے پہچان لیتے اور آپ انہیں ضرور بالضرور بات کرنے کے ڈھنگ سے پہچان لیں گے، اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ: استفہام توبیخی ہے یعنی کیا یہ لوگ قرآن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس میں تدبر و غور نہیں کرتے تاکہ اس کے مواعظ و زواجر کو دیکھیں حتیٰ کہ وہ ہلاکتوں میں نہ پڑے۔

اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا: ام بل کے معنی میں ہے۔ یہاں کفار کے عدم تدبر پر توبیخ کے ساتھ کلام کا انتقال ان کے ظلمت قلوب کی طرف ہو رہا ہے، یہاں تک کہ ان کے دل غور و فکر اور تدبر کو قبول ہی نہیں کرتے، آیت کا معنی ہے بلکہ ان کے دل پتھر ہو گئے ہیں ان پر تاریکی چھائی ہوئی ہے گویا ان کے دل لوہے کے تالوں سے مقفل ہو چکے ہیں، اب ان تک نور کی رسائی ہی نہیں ہو پا رہی اور نہ ایمان پہنچ پاتا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اَلْقَلْبَ خُلِقَ لِلْمَعْرِفَةِ، فَإِذَا لَمْ تَكُنْ فِيهِ الْمَعْرِفَةُ فَكَأَنَّهُ لَا يُعْرَفُ، وَهٰذَا كَمَا يَقُولُ الْقَائِلُ فِي الْإِنْسَانِ الْمُؤْذِي: هٰذَا لَيْسَ بِإِنْسَانٍ هٰذَا سَبُعٌ، وَلِذٰلِكَ يُقَالُ هٰذَا لَيْسَ بِقَلْبٍ هٰذَا حَجَرٌ دل کو معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جب اس میں معرفت نہ ہو گویا وہ ہے ہی نہیں، جیسا کہ کسی نے موذی انسان کے بارے میں کہا جائے: یہ تو انسان نہیں یہ تو درندہ ہے۔ اسی طرح آیت میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ دل نہیں بلکہ پتھر ہے۔ (التفسیر الکبیر للرازی ۲۸:۶۶)

اِنَّ الَّذِيۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤى اَدۡبَارِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡهُدَى: یعنی ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹ گئے جب کہ دلائل اور معجزات سے راہ ہدایت واضح ہو چکی تھی پھر انہوں نے کفر اختیار کیا۔

الشَّيۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ وَاَمۡلٰى لَهُمۡ: یہ چیز شیطان نے ان کے لیے آراستہ کر دی اور انہیں لمبی لمبی امیدیں دلا کر دھوکا دیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ كَرِهُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ: یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے یہود سے کہا جنہوں نے قرآن کو حسد و عداوت کی وجہ سے ناپسند کیا۔

سَنُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ: بعض معاملات جن کا تم ہمیں حکم دو گے میں ہم تمہاری بات مانیں گے، جیسے جہاد میں شریک نہ ہونا اور مسلمانوں کو بد دل کرنا۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِسۡرَارَهُمۡ: اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے جو انہوں نے دلوں میں چھپا رکھی ہیں جیسے مکر و فریب، ضد و عداوت اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف سازشیں۔ مفسرین کہتے ہیں:

منافقین نے یہودیوں سے یہ بات خفیۃ کہی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کر دیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ: اس وقت کیا حال ہو گا جب عذاب کے فرشتے ان کی روحیں نکالنے کے لیے ان کے پاس حاضر ہوں گے اور ان کے پاس لوہے کی ہتھوڑے ہوں گے ان سے ان کے چہروں پر اور ان کی پیٹھوں پر ماریں گے؟

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت کا معنی تخویف ہے یعنی اگر عذاب مؤخر ہو جائے تو عمر پوری ہونے پر موت کے وقت انہیں عذاب ہو گا۔ (الجامع لاحکام القرآن ۱۶:۲۵۰) ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: منافقین میں سے جو بھی معصیت پر مرتا ہے فرشتے اس کے چہرے اور پیٹھ پر ہتھوڑے برساتے ہیں۔ (البحر المحیط ۸:۸۴ صفوۃ التفاسیر)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ: یہ عذاب اس وجہ سے ہو گا چونکہ یہ لوگ نفاق کے راستے پر چلے ہیں اور جہاد ایمان جیسے امور سے اللہ راضی ہوتا ہے ان امور کو انہوں نے ناپسند کیا اور ان پر ناگوار گزرے۔

فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ: تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا چونکہ یہ اعمال انہوں نے ایمان کی حالت میں نہیں کیے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ: منافقین جن کے دلوں میں شک اور نفاق ہے کیا وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حقیقت مؤمنین کے سامنے ہرگز نہیں رکھے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے بغض وعناد کو ظاہر نہیں کرے گا؟ لامحالہ! اگر ہم چاہیں تو منافقین کے متعین لوگ آپ کو دکھا دیں، تم ان کی علامات سے انہیں پہچان لیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر پردہ رکھا ہے تاکہ ان کا اور ان کے قرابتدار مسلمانوں کا لحاظ رہے، شاید کبھی توبہ کر کے راہ راست پر آجائیں۔ اَضْغَان: ضغنٌ کی جمع ہے، انتہائی شدید کینہ۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ: جو لوگ منافقین تھے انہیں اسلام سے اور مسلمانوں سے دشمنی تھی، بظاہر دوست بنے ہوئے تھے اور اندر سے دشمن تھے اس دشمنی کا کسی نہ کسی

طرح ظہور ہوتا رہتا تھا لیکن ان کا دعویٰ یہی تھا کہ ہم مسلمان ہیں یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تم میں سے ہیں اور یوں سمجھتے تھے کہ ہمارا باطن پوشیدہ رہے گا اور اسی طرح اپنے کفر کو چھپا کر مسلمانوں کے ساتھ چلتے رہیں گے اور ان سے جو منافع متعلق ہیں حاصل کرتے رہیں گے یہ ان کا خیال تھا منافق اپنے نفاق کو چھپاتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوشیار اور چالاک ہوں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ایک عرصہ تک ان اشخاص کی تعیین کرکے ان کی پہچان نہیں کرائی ہاں ان کے احوال اور اعمال بیان فرما دیئے سورۃ برات میں ان کے تفصیلی احوال بیان فرمائے ہیں اسی لیے اس سورت کا ایک نام فاضحہ یعنی رسوا کرنے والی بھی ہے بعض دوسری سورتوں میں بھی ان کی حرکتیں اور ان کے اعمال بیان فرمائے ہیں۔ (انوارالبیان)

یہاں اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو واضح طور پر ان منافقین میں سے ہر ایک کی الگ الگ پہچان کرادیں، مگر اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ ان کے رنگ ڈھنگ سے انہیں پہچان لیں گے، ان کا لب ولہجہ اور بات کرنے کا ڈھنگ بتادے گا کہ یہ منافق ہیں۔

اندر سے مومن نہیں ہیں کیونکہ غیر مخلص کا طریقہ کار اور طرز زندگی اور میل جول اور بول چال کا ڈھنگ مخلصین سے مختلف ہوتا ہے بلاوجہ قسمیں کھانا رک رک کر بات کرنا سوچ سوچ کر جواب دینا تاکہ الفاظ اور طرز گفتگو سے مخاطب کو بدعقیدگی کا پتہ نہ چل جائے یہ منافقین کے ڈھنگ ہوتے ہیں ایک عرصہ تو ایسا ہی رہا پھر بالآخر ایک دن وہ آیا کہ یہ لوگ سختی اور ذلت کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ سے نکال دیئے گئے۔ (انوارالبیان)

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ: اے میرے حبیب ﷺ! آپ منافقین کو ان کی گفتگو سے پہچان لیں گے، وہ ایسی باتیں کریں گے جن کا ظاہر اسلام اور باطن کفر ہوگا۔ کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جس منافق نے بھی رسول کریم ﷺ سے گفتگو کی آپ ﷺ نے اسے پہچان لیا۔ (الجامع لاحکام القرآن ۱۶:۲۵۳، صفوۃ التفاسیر)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ: اللہ تعالیٰ پر تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے لہٰذا وہ

تمہارے قصد کے مطابق تمہیں پورا پورا بدلہ دے گا، آیت میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی ہے۔

امتحان و آزمائش کا مقصد

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ {۳۱} اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ {۳۲} محمد

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم ضرور تم کو آزمائیں گے تاکہ ہم تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کر دیں اور تاکہ ہم تمہارے اعمال کو جانچ لیں۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا اور رسول کی مخالفت کی اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت ظاہر ہو گئی یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور وہ عنقریب ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ: اے لوگو! ہم جہاد کے ذریعے ضرور تمہارا امتحان لیں گے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون کون اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔

وَنَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ: اور ہم تمہارے اعمال کا بھی امتحان لیں گے کہ تمہارے اچھے اعمال کون سے ہیں اور برے اعمال کون سے۔ علامہ صابونی التسہیل کے حوالہ سے رقمطراز ہیں: حتیٰ نعلم: سے علم ظاہری مراد ہے جس پر اقامت حجت ہونی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کو جانتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حجت قائم کرنا چاہتا ہے فضل بن عیاض رحمہ اللہ جب یہ آیت تلاوت کرتے تو کہا کرتے تھے: اے اللہ ہمیں آزمائش میں نہ ڈالنا اور ہمارا امتحان نہ لینا چونکہ جب تو ہمارا امتحان لے گا ہمیں رسوا کر دے گا۔ (التسہیل، صفوۃ التفاسیر)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جن لوگوں نے اللہ کی آیات سے انکار کیا اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے منع کیا۔

وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى: انہوں نے پیغمبر سے عداوت کی اور وہ پیغمبر کی طاعت سے باہر نکل گئے اس کے بعد کہ ان کے سامنے پیغمبر کا سچا ہونا دلائل اور معجزات سے ثابت ہو چکا۔

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ: وہ کفر کے ذریعہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔ مثلاً انہوں نے جو صدقات کیے یا صلہ رحمی کی تو ایمان معدوم ہونے کی وجہ سے اکارت کر دیے، اب ان کے اعمال کا انہیں آخرت میں ثواب نہیں ملے گا۔

اطاعت ربانی و نبوی، اپنے اعمال باطل نہ کرو، مسلمانوں کی سربلندی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ {۳۳} اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ {۳۴} فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ {۳۵} محمد

جواب ترجمہ: اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو، بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا پھر وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے تو ہرگز اللہ ان کی مغفرت نہ فرمائے گا، سو تم سست نہ بنو اور صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال میں ہرگز کمی نہ کرے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: یعنی اللہ تعالیٰ کی اوامر اور پیغمبر کے اوامر بجا لاؤ۔ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ: کفر، نفاق، عجب و ریا جیسے رزائل اور گناہوں سے اپنے اعمال اکارت نہ کرو، جیسے منافقین نے اپنے اعمال اکارت کیے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا تُبْطِلُوْۤا أَعْمَالَكُمْ میں کئی وجوہ کا احتمال ہے، ایک یہ کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر ڈٹے رہو، دوام اور ہمیشگی اختیار کرو، شرک نہ کرو ورنہ تمہارے اعمال باطل ہو جائیں گے، شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

(الزمر: ۶۵) اگر آپ نے بھی شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔

دوسری یہ کہ تم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت چھوڑ کر اپنے اعمال کو باطل نہ کرو جیسے اہل کتاب کے اعمال رسول کو جھٹلانے اور اس کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے باطل ہوئے، اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے، جس میں فرمایا گیا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ إِلَى أَنْ قَالَ: أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (الْحُجُرَاتِ: ۲) اے اہل ایمان! تم اپنی آوازوں کو رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند نہ کو، ورنہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔

تیسری یہ کہ تم احسان کرنے کے بعد احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اپنے اعمال کو باطل نہ کرو، سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى (الْبَقَرَةِ: ۲۶۴) تم لوگ اپنے صدقات کو باطل نہ کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ (الْحُجُرَاتِ: ۱۷) وہ لوگ آپ پر احسان کرتے ہیں کہ وہ اسلام لائے، فرما دیجیے کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ کرو، جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے آپ ﷺ پر احسان کرتا ہے گویا کہ وہ یوں کہہ رہا ہے کہ میں نے آپ کے دل کی خاطر یہ کام کیا ہے، اگر آپ کی رضا مقصود نہ ہوتی تو میں یہ نہ کرتا، ایسا کرنا اخلاص کے خلاف ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ تو خالص عمل ہی قبول کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ: جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا اور لوگوں کو ہدایت و ایمان کے راستے سے روکا۔

ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ: اور پھر وہ حالت کفر پر مر گئے۔ یہ حکم ہر اس شخص کے لیے ہے جو حالت کفر میں مر گیا، اگرچہ اس آیت کا نزول قلیب بدر والوں کے لیے ہوا ہے، کیونکہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔

فَلَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ کسی حالت میں بھی ان کی مغفرت نہیں کرے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو شخص کفر پر مرا اس کی بخشش نہیں ہے، چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ

اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا۔ ابو سعود رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حکم ہر کافر کے لیے عام ہے جو کفر پر ہی مر جائے اگرچہ یہ آیت اصحاب قلیب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (ابو السعود ۵:۷۸)

فَلَا تَهِنُوۡا وَتَدۡعُوۡۤا اِلَى السَّلۡمِ: کمزوری نہ دکھاؤ کہ جنگ کے دوران تم کفار کو صلح کی دعوت دینے لگو۔

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت میں یہ دلالت موجود ہے کہ مشرکین سے صلح کی درخواست کرنا جائز نہیں بلکہ ممتنع ہے، اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب سے ان کے مسلمان ہونے تک قتال کے حکم کو مؤکد فرمایا تھا۔ آیت میں اس مؤکد حکم کا بیان ہے، نیز یہ بھی بیان ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عجم سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک وہ مسلمان نہیں ہو جاتے اور جزیہ ادا کرنے پر رضامند نہیں ہو جاتے، جزیہ ادا کرنے کی رضامندی کے بغیر صلح کرنے کی بات ان آیات کے مقتضیٰ سے خارج ہے جو ہماری بیان کردہ امور کی موجب ہیں۔

اس آیت میں صلح کی نہی کا نصاً ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اس نہی کو مؤکد کر دیا، اس میں یہ دلالت بھی موجود ہے کہ حضور ﷺ مکہ میں ازروئے صلح داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اسے بزور شمشیر فتح کیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضور ﷺ کو مشرکین کے ساتھ صلح کرنے سے روک دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مسلمان ہی غالب رہنے والے ہیں۔

اگر حضور ﷺ مکہ میں اہل مکہ کی رضامندی سے صلح کے تحت داخل ہوتے تو اس صورت میں مسلمان ان کے مساوی قرار پاتے کیونکہ جو صلح فریقین کی باہمی رضامندی سے عمل میں آتی ہے اس کا یہی حکم ہوتا ہے اور دونوں فریق اس میں یکساں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں کسی فریق کو دوسرے فریق کی بہ نسبت غلبہ حاصل کرنے کا بڑھ کر استحقاق نہیں ہوتا۔ (احکام القرآن)

تعارض: یہاں کافروں کے ساتھ صلح کی ممانعت کی گئی ہے، جب کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ اگر کافر صلح کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو تم ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھاؤ، اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں

تو آپ بھی مائل ہو جایئے، وہاں صلح کی اجازت اور یہاں صلح کی ممانعت دونوں آیات میں تعارض ہے۔

جواب دونوں مقامات پر آیات اپنا اپنا مفہوم ادا کر رہی ہیں، دونوں میں کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے، جس آیت میں صلح کی اجازت دی گئی ہے وہاں یہ شرط ہے کہ صلح کی پیش کش کفار کی طرف سے ہو، اس آیت میں جس صلح پر پابندی لگائی گئی ہے وہ صلح ہے جس میں مسلمانوں کی طرف سے جنگ بندی کی اپیل کی جائے، اس لیے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

علامہ ابو بکر جصاص رحمہ اللہ کی احکام القرآن کے حوالے سے فقہی مسئلہ لکھا جا چکا ہے، مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ابتداً صلح کر لینا بھی جائز ہے جبکہ مصلحت مسلمانوں کی اس میں دیکھی جائے، محض بزدلی اور عیش کوشی اس کا سبب نہ ہو اور اس آیت نے شروع میں فلا تھنوا کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ممنوع وہ صلح ہے جس کا منشاء بزدلی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے فرار ہو اس لیے اس میں بھی کوئی تعارض نہیں کہ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کی آیت کے حکم کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا جائے جس میں صلح جوئی کا سبب وہن اور سستی بزدلی نہ ہو بلکہ خود مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو۔ واللہ اعلم (معارف القرآن)

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: حقیقت میں تم ہی عزت والے ہو اور غالب تم ہی آکر رہو گے چونکہ تم صاحب ایمان ہو، غلبے کی وجہ ایمان بتائی گئی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکثر و بیشتر محاذوں پر فاتح بن کر لوٹے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اہل ایمان تھے، ان کے دلوں میں ایمان راسخ و مضبوط تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے پہلے ایمان سیکھا پھر قرآن سیکھا، ان کا ایمان ہی نصرت الٰہی کو کھینچ کھینچ کر لاتا تھا، اللہ نے ان کی انتہائی کمزور پوزیشن میں میدان بدر میں مدد کی، اُحد میں شدید ترین حالات کا سامنا ہوا پھر اللہ نے مدد کی، حنین میں حدت و شدت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد و نصرت کی، طائف میں ان کی مدد کی اور غنیمتوں کا مال ان کے قدموں میں ڈھیر کیا گیا، بہت سے مقامات پر ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود فاتح بن کر لوٹے۔

وَاللّٰهُ مَعَكُمْ: اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تمہارے ساتھ ہے، جب ایمان و ایقان کی بیش بہا دولت

انسان کے پاس موجود ہو تو اللہ کی معیت اسے حاصل ہوتی ہے، پھر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی دریا کی متلاطم موجوں کو دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ میرے ساتھ ہے، پھر غار ثور کی تاریکیوں میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے وفادار دوست سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ انتہائی خطرات کی زد میں تھے ایسے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان رحمت سے یہ الفاظ صادر ہوتے ہیں کہ اللہ ہمارے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ) ساتھ ہے۔

پوری تاریخ اسلامی کو کھنگالا جائے، مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہونے والے معرکوں پر غور وحوض کیا جائے تو ان کے ساتھ اللہ کی معیت اسی لیے رہی کہ وہ مومن تھے، ایمان ان کے قلب وجگر کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا، قرون اُولیٰ کے مسلمانوں کے بارے میں تو واضح فرمایا گیا کہ یہ کامیاب لوگ ہیں، یہ جنتی لوگ ہیں، ان کے ساتھ اللہ نے وعدہ جنت کیا ہوا ہے، جب ان کے ایمان کے تذکروں سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے تو یہاں اہل ایمان کے تذکرہ میں اللہ کی معیت اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ایمان کے ساتھ معیت خداوندی حاصل ہوتی ہے۔

نکتہ: ''اللہ تمہارے ساتھ ہے'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ کوئی اپنے طور پر غرور وفخر میں مبتلا نہ ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہی سربلند رہو گے، یہ سربلندی فخر و غرور کا سبب ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا یہ سربلندی تمہارا کمال نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ کی قدرت اور کمال ہے۔

یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہی سربلند رہو گے تو اہل ایمان اپنی کمزوری اور اسباب جنگ ووسائل حرب کے فقدان کی طرف نظر کیے ہوئے تھے، کفار کی شان وشوکت اور کثرت تعداد کی طرف دیکھ رہے تھے، یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کچھ دلوں میں یہ بات آرہی تھی کہ ایسی صورت حال میں غلبہ کیونکر اور کیسے ہو گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں اس میں شک وارتیاب نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے غلبہ تمہارا ہی ہو گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المجادلہ کی آیت ۲۱ میں فرمایا کہ میں اور میرے رسول ضرور بہ ضرور غالب آئیں گے، سورۃ الصافات کی آیت ۱۷۳ میں فرمایا ہمارا لشکر ہی غالب آئے گا۔

سوال آج مسلمان غالب نہیں مغلوب ہیں، اس آیت میں اہل ایمان کے غلبے کی بات کی گئی ہے؟

جواب یہ آیت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے اہل ایمان کے بارے میں خوشخبری سناتی ہے کہ جب ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا ہو گا تو غلبہ ہو گا، اللہ کی نصرت ہو گی، اللہ کی معیت ملے گی، قرونِ اولیٰ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قلیل تعداد کے باوجود ان کی مدد و نصرت کر کے دکھائی۔

وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ: اور وہ تمہارے اعمال کے ثواب میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: واللہ معکم: میں اللہ تعالیٰ نے دشمن پر فتح و نصرت کی عظیم بشارت دے دی ہے۔ (مختصر ابن کثیر ۳:۳۳۸)

اس فرمان گرامی میں کہ ”تمہارے اعمال میں وہ ہرگز کمی نہیں کرے گا“ میں دوسرا وعدہ ہے اور وہ ایسے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”بے شک اللہ تمہارے ساتھ ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدد و نصرت اللہ کی وجہ سے ہے تمہاری وجہ سے نہیں ہے، گویا کہنے والا یوں کہہ رہا ہے کہ میری طرف سے کوئی عمل ایسا نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں تعظیم و تکریم کا مستحق ٹھہرا، مگر اس عالی ذات نے فرمادیا کہ وہ تمہارے مدد کرے گا، اس کے ساتھ وہ تمہارے اعمال میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی نہیں کرے گا، وہ تمہیں ایسا کر دے گا گویا کہ نصرت و مدد تمہارے لیے ہے اور تمہاری ہی طرف سے ہے، گویا کہ تم لوگ برابر ایسے ہی رہو گے اور لگاتار تم لوگ اجر کے مستحق ٹھہرو گے۔

يَتِرُ: یہ **تِرَةٌ** سے ہے، جس کا معنیٰ نقص اور کمی ہے، میدان کارزار میں جب کافروں کا کوئی بندہ مارا جائے تو اس وقت کہیں گے **وُتِرُوا**، کیونکہ ان کی تعداد میں ایک شخص کی کمی ہو گئی ہے، ان کے اعمال برباد و تباہ ہو گئے ہیں، اس لیے اس لفظ کا وہاں اطلاق بر محل و بر موقع ہے۔

جب کہ کوئی مسلمان میدان کارزار میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہے تو ان کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے مگر ان کے عمل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور ہو بھی کیونکر؟ بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ مسلمانوں کی شہادت کی صورت میں بھی ان کی جانوں میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے، کیونکہ مسلمان میدان کارزار میں شہید ہو کر ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا، اسے اللہ کے ہاں رزق دیا جائے گا، وہ فرحت و سرور کی زندگی بسر کرے گا، اسی طرف قرآنی آیات میں اشارے دیے گئے ہیں، سورۃ البقرہ

اور سورۃ آل عمران میں تو یہاں تک فرمادیا گیا کہ تم لوگ ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں، فرمایا گیا کہ تم ان لوگوں کو مردہ گمان بھی نہ کرو جو اللہ کی راہ میں مارے گئے۔

دنیوی زندگی: لہو ولعب کھیل تماشہ

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ {۳۶} اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ {۳۷} هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ {۳۸} محمد

جواب ترجمہ: یہ دنیوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے، اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقوی اختیار کرو تو اللہ تمہارے اجر تمہیں دے گا، اور تمہارے مال تم سے نہیں مانگے گا۔ اگر وہ تم سے تمہارے مال طلب کرے، اور تم سے سب کچھ سمیٹ لے تو تم بخل سے کام لوگے، اور وہ تمہارے دل کی ناراضیوں کو ظاہر کردے گا۔ دیکھو! تم ایسے ہو کہ تمہیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں، اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے وہ خود اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اور اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہو جو محتاج ہو۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر: دنیوی زندگانی ایک کھیل تماشہ ہے، دھوکہ اور فریب نظر ہے، لیکن جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور تقویٰ والی زندگی اختیار کرتے ہیں، اللہ کی طرف سے تفویض کیے گئے فرائض بجالاتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہے تو ایسے خوش نصیب لوگوں کو ان کے اعمال کا اجر وثواب اللہ کی طرف سے ملے گا۔

الشیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو

اس دنیا کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے، کہ دنیا محض لہو ولعب ہے یعنی بدن کے لئے لعب اور قلوب کے لئے لہو، اس میں زہد کی ترغیب ہے، پس بندہ اپنے مال و متاع، اولاد، اپنی زیب وزینت، اپنی بیویوں، ماکولات ومشروبات سے حصول لذت، اپنے مساکن ومجالس، مناظر اور ریاست میں مگن ہو کر غافل اور ہر بے فائدہ عمل میں کھیلتا رہتا ہے بلکہ وہ بے کاری، غفلت اور گناہوں کے دائرے میں گھرا رہتا ہے، یہاں تک کہ اپنی دنیا کی زندگی کو مکمل کرلیتا ہے اور اس کی اجل آجاتی ہے۔

جب یہ تمام چیزیں منہ موڑ کر بندے سے جدا ہو جاتی ہیں اور بندے کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کا خسارہ اور محرومی واضح ہو جاتی ہے اور اس کا عذاب آموجود ہوتا ہے تو یہ چیز خردمند شخص کے لئے، دنیا میں زہد، عدمِ رغبت اور اس کے معاملے میں اہتمام کی موجب ہے۔

وہ کام جو ہر چیز سے زیادہ اہتمام کے لائق ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَاِن تُومِنُوا وَتَتَّقُوا** اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو، یعنی تم اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روز آخرت پر ایمان لاؤ اور تقویٰ پر قائم رہو جو ایمان کے لوازم اور اس کے تقاضوں میں سے ہے اور تقویٰ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو ترک کرتے ہوئے، دائمی طور پر اس کی رضا کے مطابق عمل کرنا، تو یہ عمل بندے کو فائدہ دیتا ہے اور یہی وہ عمل ہے جو اس لائق ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رغبت کر جائے اور اس کی طلب میں اپنے عزم وارادے اور اپنی جدوجہد کو صرف کیا جائے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے، ان پر رحمت اور لطف و کرم کی بنا پر مطلوب ومقصود ہے، تاکہ انہیں بے پایاں ثواب عطا کرے۔ (تفسیر السعدی)

اللہ تعالیٰ بندہ مومن پر کس قدر مہربان ہے کہ وہ اس کے سارے مال کو زکوٰۃ میں نہیں مانگتا بلکہ زکوٰۃ کا کچھ حصہ مانگتا ہے، اطاعت وفرمانبرداری کا اصل تقاضا تو یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دیں کہ اپنا سارے کا سارا مال اس کے راستے میں خرچ کر دو تو تم اس پر بھی خوشی سے راضی رہو، لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اس حکم کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ اور اس سے تمہارے دلوں میں ناپسندیدگی پیدا ہو گی، اس لیے اللہ تعالیٰ ایسا حکم نہیں دیتے۔ البتہ تمہارے مال کا کچھ حصہ وہ خود تمہارے فائدے

کے لیے جہاد میں خرچ کرنے کو کہہ رہا ہے، اپنے فائدے کے لیے نہیں۔ چنانچہ اس سے تمہیں بخل نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر پروردگار کے حکم کے مطابق خرچ کرنے سے بخل کروگے تو اس کا نقصان تم ہی کو پہنچے گا، پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں جہاد نہ ہوسکے گا اور دشمن غالب آجائے گا، یا مثلاً زکوٰۃ نہ دینے کی صورت میں فقر و فاقہ عام رہے گا، اور دوسرے اس لیے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا وبال بھگتنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ سینے کے بھید خوب اچھی طرح جانتا ہے، جب خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو ان لوگوں کے دلوں کے خیالات کو اچھی طرح جان لیتا ہے جو زکوٰۃ دیتے وقت دلوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے اے اہل ایمان! تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں جہاد اور اس کے دین کی مدد اور نصرت کے لیے مال خرچ کرو تو تم میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو راہ خدا میں مال لٹانے سے بخل سے کام لیتے ہیں۔

بخل سے کام لینے والوں کو علم ہونا چاہیے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ اس کا وبال اور نقصان انہی بخل کرنے والوں کو ہوگا، اللہ تعالیٰ تو بے پرواہ ذات ہے، اسے تمہاری اور تمہارے اموال کی کوئی پرواہ نہیں ہے، تمہی ہو جو اللہ کے محتاج اور فقیر ہو، اگر تم لوگ اللہ کے احکامات سے روگردانی کروگے، اس کے اوامر واحکامات کو نہیں مانوگے تو پھر وہ تمہیں ہلاکت کی وادی میں اتار دے گا، پھر تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو اس کے احکامات مانیں، اس کے اوامر کو تسلیم کریں اس کی نواہی سے احتراز کریں، پھر تمہارے جیسوں کی مثال بھی دنیا میں نہ ملے، اللہ تمہاری جگہ جس مخلوق کو لائے گا وہ اللہ کی اطاعت کریں گے، اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے، اللہ کے راستے میں دل و جان اور مال سے جہاد کریں گے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ: آج سورۃ محمد ﷺ کی تفسیر مکمل کی گئی ہے، اللہ رب العالمین سے التجا ہے کہ وہ اس متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول اور منظور فرمائے اور اسے میرے لیے، میرے والدین

ماجدین، میرے اساتذہ کے لیے، میرے مشائخ کے لیے، میرے مساعدین و معاونین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور ہم سب کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم ﷺ

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۱۲ مئی ۲۰۱۸ء بمطابق ۲۵ شعبان المعظم ۱۴۳۹ء یوم السبت ڈھائی بجے سہ پہر

نظر ثانی۔ ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ بروز اتوار ۶ بجے شام

اضافات جدیدہ، ترمیمات: ۲۴ جون ۲۰۲۶ء ۸ محرم الحرام ۱۴۴۸ھ، بروز بدھ، سوا گیارہ بجے دن

حال وارد کاشانہ فقیر۔ حدوٹ، مری

☼☼

سورۃ الفتح (تعارف)

سوال سورۃ الفتح کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الفتح قرآن مجید کی ۴۸ ویں سورت ہے، یہ مدنی سورت ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۲۹ ہے، اس سورت میں نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف کی گئی ہے اور انہیں فتح کی خوشخبری دی گئی ہے۔ (فتاویٰ الشبکۃ الاسلامیہ)

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام الفتح اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے، إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ہم نے آپ کو ایک کھلی فتح عطا فرمادی۔ یہاں فتح سے مراد: صلح حدیبیہ ہے اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دعوتی آزادی اور بالآخر فتح مکہ۔

منظر اور پس منظر: سورۃ الفتح کا نزول صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوا، اس وقت مسلمان مکہ مکرمہ کی طرف عمرہ کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے، لیکن قریش نے انہیں مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا، اس موقع پر حدیبیہ کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا جسے "صلح حدیبیہ" کہا جاتا ہے، اس معاہدے کو بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے "فتح مبین" قرار دیا

زمانہ نزول: یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کے نزول کا وقت صلح حدیبیہ کے بعد ہے، یعنی ۶ ہجری میں۔

اہم واقعات: صلح حدیبیہ کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملنے والی فتح کی خوشخبری۔ نبی اکرم ﷺ کی مغفرت اور آپ پر اللہ کی نعمتوں کی تکمیل کا ذکر۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف اور ان کے ایمان کی مضبوطی کا بیان۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو نصرت اور عزت بخشنے کا وعدہ۔ منافقین اور اہل کتاب کے رویے کا ذکر اور ان کے انجام کی خبر۔

☼☼

فتح مبین اور صلح حدیبیہ

سوال اس آیت کی تفسیر بیان کیجیے، نیز بتایئے کہ یہاں جس فتح مبین کا ذکر کیا گیا ہے وہ کون سی فتح مبین ہے؟

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا {۱} الفتح.

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب ﷺ! یقین جانیے ہم نے آپ کو واضح فتح عطا کر دی ہے۔

یہاں جس فتح مبین کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد یا تو صلح حدیبیہ ہے یا فتح مکہ ہے، حضرات مفسرین کرام نے اس آیت کے ذیل میں صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کے تفصیلی واقعات قلمبند فرمائے ہیں، صلح حدیبیہ کو فتح مکہ کا پیش خیمہ قرار دیا جاتا ہے۔

مفسر قرآن کریم حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں اپنی تفسیر میں تفصیلی واقعہ نقل فرماتے ہیں، جسے ہم من وعن نقل کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قریش مکہ نے بہت زیادہ تکلیفیں دی تھیں حتیٰ کہ آپ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ذی قعدہ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ عمرہ کرنے کے لیے اپنے پیچھے نمیلہ بن عبد اللہ لیثی کو امیر بنا کر روانہ ہو گئے، مدینہ منورہ کے رہنے والے اور آس پاس کے دیہات کے باشندوں کو بھی سفر میں ساتھ چلنے کے لیے فرمایا۔

آپ نے عمرہ کا احرام باندھ لیا اور حضرات صحابہ نے بھی، تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا مقصد جنگ کرنا نہیں ہے صرف بیت اللہ کی زیارت کرنا مقصود ہے آپ اپنے ساتھ ہدی کے جانور بھی لے گئے تھے (جو حج وعمرہ میں حرم مکہ میں ذبح کیے جاتے تھے) جب آپ مقام عسفان میں پہنچے تو بشر بن سفیان کعبی سے ملاقات ہوئی اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قریش مکہ کو آپ کی روانگی کا پتہ چل گیا ہے وہ مقام ذی طویٰ میں جمع ہو گئے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر یہ عہد کر رہے ہیں کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اور خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) اپنے سواروں کو لے کر کراع الغمیم (ایک مقام کا نام ہے) میں پہنچ چکے ہیں۔

آپ نے یہ سن کر راستہ بدل دیا اور داہنی ہاتھ کی طرف روانہ ہوگئے یہ باقاعدہ راستہ نہیں تھا گھاٹیاں تھیں دشوار گزار مقامات سے گزرنا پڑا یہاں تک کہ نرم زمین میں پہنچ گئے اور مقام حدیبیہ کے راستہ پر پڑ گئے، حدیبیہ مکہ اور جدہ کے درمیان ہے حرم کے حدود وہاں ختم ہو جاتے ہیں (عسفان سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے حدیبیہ واقع نہیں ہوتا لیکن چونکہ قریش کے آڑے آجانے کا امکان تھا اس لیے آپ راستہ بدل کر حدیبیہ پہنچ گئے۔)

جب قریش کے سواروں کو پتہ چلا کہ آپ ﷺ نے راستہ بدل دیا ہے تو واپس قریش کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے ادھر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مقام حدیبیہ میں پہنچ گئے وہاں پہنچے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی صحابہ نے کہا یہ تو آگے بڑھنے سے ہٹ کرنے لگی آپ نے فرمایا ہٹ کرنا اس کی عادت نہیں ہے اسے اسی ذات پاک نے روک دیا جس نے ہاتھی والوں کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا کیونکہ قریش مکہ کے آڑے آجانے اور مکہ معظمہ کے داخلہ میں رکاوٹ ڈالنے کا گمان تھا اس لیے آپ نے فرمایا کہ اگر آج قریش نے مجھ سے کسی ایسی بات کا سوال کیا جو صلہ رحمی کی بنیاد پر ہو تو میں اس میں اس کی موافقت کرلوں گا اور بعض روایات میں یوں بھی ہے کہ اگر مجھے کسی بات کی دعوت دیں گے جس میں ان چیزوں کی حرمت کا مطالبہ ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے معظم قرار دیا ہے تو ان کی بات مان لوں گا۔

حدیبیہ میں قیام تو فرمالیا لیکن وہاں پانی بہت ہی کم تھا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ یہاں تو پانی نہیں ہے نہ وضو کرسکتے ہیں نہ پینے کا انتظام ہے بس یہی تھوڑا سا پانی ہے جو آپ کے پیالہ میں ہے آپ نے اپنا دست مبارک اس پیالہ میں رکھ دیا آپ کی مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے۔

راوی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے پانی پیا وضو کیا کسی نے دریافت کیا کہ آپ حضرات کی کتنی تعداد تھی تو حضرت جابر نے کہا کہ ہم لوگ پندرہ سو تھے اگر ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی سب کے لیے کافی ہو جاتا۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت کریمہ میں جو فتح کا ذکر

ہے آپ لوگ اس سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں اور ہم بیعت رضوان کو فتح کا مصداق شمار کرتے تھے جو حدیبیہ کے موقع پر ہوئی ہم تعداد میں چودہ سو یا کچھ زیادہ تھے، حدیبیہ کے ایک کنوئیں میں تھوڑا سا پانی تھا ہم نے سارا پانی کھینچ کر استعمال کر لیا اور اس میں ایک قطرہ بھی نہ چھوڑا، رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ تشریف لائے اور اس کنوئیں کے کنارے پر بیٹھ گئے پھر فرمایا کہ اس میں سے نکالا ہوا ایک ڈول پانی لاؤ وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا آپ نے اس میں اپنا لعاب مبارک ڈال دیا اور ایک روایت میں ہے کہ وضو فرمایا اور کلی کی اور اس کنوئیں میں پانی ڈالا پھر فرمایا اسے کچھ دیر چھوڑ دو کچھ دیر کے بعد اس میں سے پانی لینا شروع کیا اور تمام حاضرین اپنی سواریوں سمیت سیر اب ہو گئے) اس میں اختلاف کی بات نہیں ہے چودہ سو سے اوپر جو افراد تھے ان کو بعض صحابہ نے پندرہ سو بتا دیا اور بعض نے چودہ سو بتا دیا کسر کا اعتبار نہیں کیا۔

اور اس میں بھی کوئی تعارض نہیں کہ پیالہ میں دست مبارک رکھنے سے چشمے جاری ہو گئے اور کنوئیں میں بھی آپ نے لعاب مبارک ڈال دیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے حدیبیہ میں قیام فرمالیا تو قریش مکہ نے یکے بعد دیگرے بدیل بن ورقاء اور مکرز بن حفص اور حلیس بن علقمہ اور عروہ بن مسعود ثقفی کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا آپ نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں لڑائی لڑنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت اور جانثاری: عروہ بن مسعود حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے عجیب منظر دیکھا، حضرات صحابہ کی محبت اور جانثاری دیکھ کر آنکھیں پھٹی رہ گئیں رسول اللہ ﷺ وضو فرماتے تھے جو پانی آپ کے اعضاء سے جدا ہوتا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اسے گرنے نہ دیتے تھے اور فوراً ہی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے جب آپ ناک کی ریزش ڈالتے تھے اسے بھی جلدی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے اور آپ کا اگر کوئی بال گرتا تو اسے بھی گرنے سے پہلے ہی اچک لیتے تھے۔

عروہ بن مسعود ثقفی نے واپس ہو کر قریش مکہ سے کہا کہ دیکھو میں کئی بار کسریٰ، قیصر اور نجاشی کے پاس گیا ہوں (یہ تینوں بادشاہ تھے) میں نے کسی بادشاہ کے ایسے فرمانبردار نہیں دیکھے جیسے محمد

رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں اگر تم نے جنگ کی تو یہ لوگ کبھی بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے اب دیکھ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب سے فرمایا کہ تم مکہ معظمہ جاؤ وہاں قریش کو بتادو کہ ہم جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے حضرت عمر نے معذرت پیش کر دی کہ قریش کو معلوم ہے کہ میں ان کا کتنا بڑا دشمن ہوں اور میرے قبیلہ بنی عدی میں سے وہاں ایسے افراد نہیں ہیں جو میری حفاظت کر سکیں میں آپ کو رائے دیتا ہوں کہ آپ عثمان بن عفان کو بھیج دیں قریش کے نزدیک وہ مجھ سے زیادہ معزز ہیں۔

چنانچہ آپ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ابو سفیان اور دیگر اشراف قریش کے پاس بطور نمائندہ بھیج دیا تاکہ وہ قریش کو بتادیں کہ آپ جنگ کے ارادہ سے تشریف نہیں لائے بلکہ صرف بیت اللہ کی زیارت کے لیے تشریف لائے ہیں۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قریش مکہ کو پیغام دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دیں البتہ تم چاہو تو طواف کر سکتے ہو انہوں نے جواب دیا کہ میں تنہا طواف نہیں کر سکتا رسول اللہ ﷺ طواف کریں گے تو میں بھی کروں گا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش مکہ نے روک لیا اور ادھر رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچ گئی کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

بیت رضوان کا واقعہ: جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اب ہم تو یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک قریش سے جنگ نہ کر لی جائے چونکہ بظاہر جنگ لڑنے کی فضاء بن گئی تھی اس لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لینا شروع کیا اور ایک شخص کے علاوہ آپ کے تمام اصحاب نے اس بات پر بیعت کر لی کہ ہم جم کر جنگ میں ساتھ دیں گے اور راہ فرار اختیار نہ کریں گے۔ حضرت عثمان چونکہ مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے اس لیے آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے خود بیعت کر لی اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ملایا اور فرمایا کہ یہ بیعت عثمان کی طرف سے ہے یہ بیعت ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی جو مقام حدیبیہ میں تھا اور اس کے بارے میں آیت کریمہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ نازل ہوئی اس لیے اس بیعت کا نام بیعۃ الرضوان معروف ہو گیا اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب الشجرہ کہا جانے لگا (شجرہ عربی میں درخت کو کہتے ہیں) اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر غلط ہے لیکن اس خبر کی وجہ سے جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کی اس کا ثواب مل گیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا تمغہ بھی نصیب ہو گیا جس کا قرآن مجید میں اعلان ہو گیا جو رہتی دنیا تک برابر پڑھا جاتا رہے گا۔

اس کے بعد قریش نے سہیل بن عمرو کو گفتگو کرنے کے لیے بھیجا اور یوں کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے صلح کی گفتگو کرو لیکن صلح میں اس سال عمرہ کرنے کی بات نہ آئے اگر ہم اس سال انہیں عمرہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو عرب میں ہماری بدنامی ہو گی اور اہل عرب یوں کہیں گے کہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوت اور زور سے مکہ میں داخل ہو گئے۔ سہیل بن عمرو نے خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر لمبی گفتگو کی پھر آپس میں صلح کی شرطیں طے ہو گئیں (صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد ص ۳۷۷ ج ۱ اور راجع معالم التنزیل ص ۱۹۹ ج ۴ تا ص ۲۰۳)

صلح حدیبیہ کا متن اور مندرجہ شرائط ؟: صحیح بخاری ۳۷۱، ۳۸۲ اور صحیح مسلم ۱۰۴ ج ۲ میں ہے کہ حضرت علی صلح نامہ لکھنے لگے تو اس میں انہوں نے بطور عنوان لکھ دیا ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ، اس پر سہیل بن عمرو اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو آپ کے رسول اللہ ہونے کا اقرار ہی نہیں کرتے اگر ہم اس کو مانتے ہوتے تو آپ کو عمرہ کرنے سے کیوں روکتے ؟ آپ محمد بن عبد اللہ لکھیے آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ بھی ہوں محمد بن عبد اللہ بھی ہوں پھر حضرت علی سے فرمایا کہ لفظ "رسول اللہ" کو مٹا دو حضرت علی نے عرض کیا کہ میں تو کبھی بھی آپ کی اس صفت کو نہیں مٹاؤں گا (یہ نافرمانی کی قسم نہیں ہے ناز و انداز کی بات ہے) اس کے بعد صلح نامہ کے شروع میں ھذا ما قاضی علیہ محمد بن عبد اللہ لکھا گیا۔

صحیح مسلم ۱۰۵ ج ۲ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم اس پر سہل بن عمرو نے کہا کہ یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کیا ہے ہم اس کو نہیں جانتے بلکہ

وہ لکھو جو ہم پہچانتے ہیں اور وہ باسْمِكَ اَللّٰهُمَّ ہے (آپ نے اس کو بھی منظور فرمالیا۔) (کما ذکر النووی)

صلح نامہ کا متن یہ ہے اُكْتُبْ هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو، اصْطَلَحَا عَلَى وَضْعِ الْحَرْبِ عَنِ النَّاسِ عَشْرَ سِنِينَ يَأْمَنُ فِيهِنَّ النَّاسُ وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ، عَلَى أَنَّهُ مَنْ أَتَى مُحَمَّدًا مِنْ قُرَيْشٍ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهِ رَدَّهُ عَلَيْهِمْ، وَمَنْ جَاءَ قُرَيْشًا مِمَّنْ مَعَ مُحَمَّدٍ لَمْ يَرُدُّوهُ عَلَيْهِ، وَأَنَّ بَيْنَنَا عَيْبَةً مَكْفُوفَةً، وَأَنَّهُ لَا إِسْلَالَ وَلَا إِغْلَالَ، وَأَنَّهُ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَدْخُلَ فِي عَقْدِ مُحَمَّدٍ وَعَهْدِهِ دَخَلَ فِيهِ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَدْخُلَ فِي عَقْدِ قُرَيْشٍ وَعَهْدِهِمْ دَخَلَ فِيهِ.فَتَوَاثَبَتْ خُزَاعَةُ فَقَالُوا: نَحْنُ فِي عَقْدِ مُحَمَّدٍ وَعَهْدِهِ وَتَوَاثَبَتْ بَنُو بَكْرٍ فَقَالُوا: نَحْنُ فِي عَقْدِ قُرَيْشٍ وَعَهْدِهِمْ، وَأَنَّكَ تَرْجِعُ عَامَكَ هَذَا فَلَا تَدْخُلُ عَلَيْنَا مَكَّةَ، وَأَنَّهُ إِذَا كَانَ عَامٌ قَابِلٌ خَرَجْنَا عَنْكَ فَدَخَلْتَهَا بِأَصْحَابِكَ، فأقمت بها ثلاثاً مَعَكَ سِلَاحُ الرَّاكِب السيوف فى الْقُرُبِ لَا تَدْخُلُهَا بِغَيْرِهَا (البدایہ والنہایہ ۴/ ۱۹۳)

ترجمہ: یہ وہ صلح نامہ ہے جس کی محمد بن عبد اللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی، ان باتوں پر صلح کی گئی۔ ① دس سال تک آپس میں جنگ نہیں کریں گے، ان دس سالوں میں لوگ امن وامان سے رہیں گے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے رکے رہیں گے۔ ② قریش میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد ﷺ کے پاس آجائے گا اسے واپس کرنا ہوگا۔ ③ اور محمد ﷺ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس آجائے گا وہ اسے واپس نہیں کریں گے۔

④ اور ایک یہ بات ہے کہ ہمارے درمیان گٹھڑی بند رہے گی (یعنی آپس میں جنگ نہ کریں گے لڑائی والی بات کو گٹھڑی کی طرح باندھ کر ڈال دیں گے اور بعض حضرات نے گٹھڑی بند رکھنے کا یہ معنی بتایا ہے جو کچھ ہم نے صلح کی ہے یہ سچے دل سے ہے دل گٹھڑیوں کی طرح ہیں جن میں راز کی چیزیں رکھی جاتی ہیں لہٰذا ہماری یہ گٹھڑی نہ کھلے گی) اور کوئی فریق دھوکہ یا خیانت کا کام نہ کرے گا۔

⑤ نہ کوئی ظاہری طور پر چوری کرے گا اور نہ خیانت کے طور پر کسی کو تکلیف دے گا (ظاہر اور باطن

کے اعتبار سے ہر شرط کی پابندی کی جائے گی) ⑥ اور جو شخص محمد ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ اور معاقدہ کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے۔ ⑦ اور جو جماعت قریش سے کوئی معاہدہ اور معاقدہ کرنا چاہے اسے اس کا اختیار ہے۔ ⑧ آپ اس سال واپس ہو جائیں مکہ معظمہ میں داخل نہ ہوں۔ ⑨ اور آئندہ سال اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے آئیں اس وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوں اور صرف تین دن رہیں۔ ⑩ اس وقت جب عمرہ کے لیے آئیں تو آپ کے ساتھ مختصر سے ہتھیار ہوں جنہیں مسافر ساتھ لے کر چلتا ہے تلواریں نیاموں میں ہوں گی اس کا لحاظ کرتے ہوئے داخل ہو سکیں گے۔

جب یہ شرطیں لکھی گئیں تو شرط نمبر ۴ کے مطابق بنو خزاعہ نے اعلان کر دیا کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہیں اور بنو بکر نے اعلان کر دیا کہ ہم قریش کے عہد میں ہیں پھر یہی معاہدہ فتح مکہ کا سبب بن گیا کیونکہ قریش مکہ نے بنو بکر کی مدد کر دی جب بنو خزاعہ سے ان کی جنگ چھڑی معاہدہ کی جو شرطیں اوپر مذکور ہوئیں ان میں سے بعض صحیح بخاری (صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد ص ۳۷۳ ج ۱ اور راجع معالم التنزیل ص ۱۹۹ ص ۲۰۳ ج ۴) اور بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں اور بعض سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تردد اور سوال و جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بعض شرطوں کا قبول کرنا ناگوار ہوا وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور کیا قریش مکہ باطل پر نہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر ہیں ! پھر سوال کیا کیا ہمارے مقتولین جنت میں نہیں اور کیا ان کے مقتولین دوزخ میں نہیں ہیں ؟ آپ نے فرمایا ہاں ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور ان کے مقتولین دوزخ میں ہیں۔ عرض کیا پھر کیوں ہم اپنے دین میں ذلت گوارا کریں اور ہم کیوں اللہ کے فیصلے کے بغیر جو ہمارے ان کے درمیان (قتال کے ذریعہ) ہو واپس ہو جائیں ؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اس کی نافرمانی نہیں کرتا ہوں وہ میری مدد فرمائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف

کریں گے ؟ آپ نے فرمایا کیا میں نے اسی سال کے بارے میں کہا تھا؟ اس کے بعد حضرت ابو بکر سے بھی ان کا یہی سوال و جواب ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے صلح کرلی اور پورا صلح نامہ لکھ دیا گیا ابو جندل نے مسلمانوں سے کہا کہ دیکھو میں مسلمان ہو کر آیا ہوں مشرکین کی طرف واپس کیا جارہا ہوں مجھے بڑی بڑی تکلیفیں دی گئی ہیں مجھے اپنے ساتھ لے چلو لیکن رسول اللہ ﷺ کے سامنے کچھ نہیں کرسکتے تھے صلح کی جو شرطیں آپ نے منظور فرمالی تھیں سب کے مطابق عمل کرنا لازم تھا بالآخر ابو جندل کو وہیں چھوڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہمارا بن کر ہم کو چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو ہم سے دور فرمادے گا (اس کی ہمیں ضرورت نہیں) اور جو شخص ان میں سے ہو گا اور ہمارا بن کر آئے گا (پھر ہم شرط کے مطابق اسے واپس کر دیں گے تو) اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔ (صحیح مسلم ص ۱۰۵ ج ۱)

حلق رؤس اور ذبح ہدایا: جب صلح نامہ لکھا جاچکا تو آنحضرت سرور عالم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے ہدایا کو ذبح کرو اور سر منڈالو یہ بات سن کر کوئی بھی کھڑا نہ ہوا کیونکہ حضرات صحابہ اس امید میں تھے کہ شاید کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وقت سے پہلے احرام کھولنا نہ پڑے اور عمرہ کرنے کا موقع مل ہی جائے۔ آپ کے تین بار ارشاد فرمانے کے بعد بھی جب کوئی کھڑا نہ ہوا تو آپ اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے پوری صورت حال بیان کی (کہ میں ہدایا کے ذبح کرنے کا اور سر مونڈنے کا حکم دے چکا ہوں لیکن صحابہ اس پر عمل نہیں کر رہے ہیں)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ذبح اور حلق والے کام کر گزریں تو آپ باہر تشریف لے جاکر کسی سے بات کیے بغیر اپنے اونٹوں کو ذبح فرمادیں اور بال مونڈنے والے کو بلا کر اپنے سر کے بال منڈوادیں آپ باہر تشریف لائے اور ایسا ہی کیا جب آپ کو حضرات صحابہ نے دیکھا کہ آپ ہدایا ذبح فرمارہے ہیں اور حلق کروالیا ہے تو سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ہدایا کو ذبح کر دیا اور ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے۔ (صحیح بخاری ص ۳۸۰)

حضرت ابو بصیر اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ: وہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اہل مکہ میں سے

جو شخص ہمارے پاس آئے گا اور اسے شرط کے مطابق واپس کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راستہ نکال دے گا اس کے مطابق اس کا حل یہ نکلا ابو بصیر ایک صحابی مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

مکہ والوں نے ان کو واپس کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے، رسول اللہ ﷺ نے شرط کے مطابق ان کو واپس کر دیا واپسی میں جب ذوالحلیفہ پہنچے تو حضرت ابو بصیر نے ان دو آدمیوں میں سے جو انہیں لینے آئے تھے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ کر مدینہ منورہ میں آکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ ضرور اسے کوئی خوفناک بات پیش آئی ہے اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا ساتھی تو قتل کیا جا چکا ہے اور میں بھی قتل ہونے والا ہوں پیچھے سے حضرت ابو بصیر بھی حاضر خدمت ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی جو ذمہ داری تھی وہ تو اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی ہے آپ نے مجھے واپس کر دیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے نجات دے دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لڑائی کو بھڑکانے والا ہے کاش! اسے کوئی سمجھانے والا ہوتا یہ سن کر ابو بصیر نے سمجھ لیا کہ آپ مجھے پھر واپس کر دیں گے لہٰذا وہ مدینہ منورہ سے نکل گئے اور سمندر کے کنارے پر پڑاؤ ڈال لیا۔ جب ابو جندل کو اس کا پتہ چلا تو وہ بھی ابو بصیر کے پاس پہنچ گئے اور اب جو بھی کوئی شخص قریش مکہ میں سے مسلمان ہوتا ابو بصیر کے پاس پہنچ جاتا یہاں تک کہ وہاں سمندر کے کنارے ایک جماعت اکٹھی ہو گئی قریش کا جو بھی قافلہ شام کی طرف جاتا تھا یہ لوگ اسے روک لیتے اور قافلے کے آدمیوں کو قتل کر دیتے اور ان کے اموال چھین لیتے تھے۔

جب یہ صورت حال سامنے آئی تو قریش مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو بلا لیں اور اب ہم اس شرط کو واپس لیتے ہیں کہ ہمارا کوئی شخص آپ کے پاس جائے گا تو اسے واپس کرنا ہو گا جو بھی شخص ہم میں سے آپ کے پاس پہنچے گا تو اسے واپس کرنے کی ذمہ داری آپ پر نہ ہو گی اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو پیغام بھیج دیا کہ واپس آجائیں۔ (صحیح البخاری)

رسول اللہ ﷺ نے ابو بصیر کے نام لکھ دیا کہ مدینہ منورہ آجائیں جب گرامی نامہ پہنچا تو وہ سکرات

موت میں تھے ان کی موت اس حالت میں ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی ان کے ہاتھ میں تھا، حضرت ابو جندل نے انہیں دفن کر دیا اور وہاں ایک مسجد بنا دی اور پھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ میں حاضر ہو گئے اور برابر وہیں رہتے رہے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام کی طرف چلے گئے اور وہیں جہاد میں شہید ہو گئے۔ (فتح الباری ص ۳۵۱ ج ۵)

فتح: انعامات کی برسات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا {۲} وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا {۳} هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا {۴} لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا {۵} وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۤنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَاۤئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاۤءَتْ مَصِيْرًا {۶} وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا {۷} اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا {۸} لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا {۹} الفتح

جواب ترجمہ: تاکہ اللہ آپ کی اگلی پچھلی سب بھول چوک معاف کر دے اور تاکہ اپنی نعمت آپ پر مکمل کر دے اور آپ کو سیدھی راہ چلاتا رکھے۔ اور (تاکہ) اللہ تمہاری ایسی مدد کرے جو سب پر غالب آجائے۔ وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکون اتارا تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ خوب جانتا حکمت رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں، ہمیشہ اسی میں رہنے کے لیے اور ان سے ان کی لغزشوں کو دھو دے اور اللہ کے یہاں یہی بڑی

کامیابی ہے۔ اور تاکہ وہ منافق مردوں اور عورتوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو عذاب میں مبتلا کرے جو اللہ سے برا گمان کرنے والے ہیں، ان ہی پر ہے مصیبت کا چکر اللہ ان پر غصہ ہوا اور ان پر پھٹکار کی اور ان کے لیے دوزخ تیار کی اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ یقیناً ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کا احترام کرو اور صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرو۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ عظیم فتح اس لیے عطا فرمائی کہ اس کے نتیجے میں آپ کو بڑی بڑی نعمتیں حاصل ہوں، ان میں سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی تمام لغزشوں کی معافی کا اعلان فرما دیا، یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، ان سے چھوٹا بڑا گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، قرآنِ کریم میں نبی کے بارے میں جہاں بھی ذنب (گناہ) کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد عام لوگوں کے گناہ جیسے گناہ نہیں ہوتے، بلکہ وہ کام ہوتے ہیں جو اگرچہ جائز ہوتے ہیں، مگر نبی کے بلند مرتبے کے لحاظ سے ان سے بہتر کام ممکن ہوتا ہے، اسی کو خلافِ اولیٰ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ آیت میں جو پہلے اور بعد کی لغزشوں کی معافی کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے مقام کو مزید بلند کرنے کے لیے ہر طرح کی کمی کو معاف فرما دیا۔

اس فتح کے بعد چونکہ اسلام بہت تیزی سے پھیلا، لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے اور دین کی دعوت ہر طرف عام ہو گئی، اس لیے رسول اللہ ﷺ کے اجر وثواب میں بہت زیادہ اضافہ ہوا، اور زیادہ اجر اللہ کے ہاں بلندیِ درجات اور لغزشوں کے مٹنے کا سبب بنتا ہے۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ: اتمامِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین کے ذریعے اپنے رسول ﷺ پر اپنی نعمت کو مکمل فرما دیا، یعنی جو نعمتیں پہلے سے عطا ہو چکی تھیں، جیسے نبوت، رسالت، دین کی دعوت اور حق کی سربلندی، اب انہیں ان کے کمال تک پہنچا دیا گیا، اس فتح کے بعد دینِ اسلام کو

قوت، استحکام اور غلبہ حاصل ہوا، دعوت کے نتائج ظاہر ہوئے، اور رسول اللہ ﷺ کے دل کو اطمینان اور سکون نصیب ہوا کہ آپ کا مشن کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ چکا ہے۔ یوں ظاہری فتح کے ساتھ باطنی نعمتیں بھی اپنے اعلیٰ درجے تک پہنچ گئیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے پورے کمال کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو گئی۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا: یہ اس فتح پر ملنے والی دوسری بڑی نعمت ہے، بظاہر تو رسول اللہ ﷺ پہلے ہی سیدھے راستے پر تھے اور ساری دنیا کو اسی راستے کی طرف بلا رہے تھے، مگر یہاں ہدایت کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے راستہ معلوم نہیں تھا۔ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قرب اور رضا کے اور زیادہ اعلیٰ درجے عطا فرمائے۔ اللہ کی رضا کے درجے بے شمار ہیں اور ایک درجہ حاصل ہونے کے بعد اگلے درجے کی طلب باقی رہتی ہے۔ اسی لیے ہم ہر نماز میں دعا کرتے ہیں **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ**، چنانچہ اس فتحِ مبین کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اپنے قرب اور رضا کا ایک بہت اونچا مقام عطا فرمایا، اور اسی روحانی ترقی کو آیت میں صراطِ مستقیم کی ہدایت کہا گیا ہے۔

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا: اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی ایسی مدد کرے گا جو پوری عزت، طاقت اور غلبے کے ساتھ ہو گی، ایسی نصرت جس کے سامنے دشمن کی ساری تدبیریں ناکام ہو جائیں گی، اور حق کو دائمی سربلندی حاصل ہو گی۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ: اللہ نے مومنوں کے دلوں میں اطمینان اور سکون نازل کیا تاکہ ان کا ایمان مزید مضبوط ہو جائے، خاص طور پر صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حالات مشکل تھے۔

وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: آسمانوں اور زمینوں کے تمام لشکر وسپاہ اللہ ہی کے لیے ہیں، اس آیت کو یہاں لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اصل طاقت اور غلبہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تمام قوتیں، اسباب اور لشکر اسی کے تابع ہیں۔ جب اللہ کسی کی مدد کا فیصلہ فرمالے تو پھر کسی ظاہری کمی، قلتِ تعداد یا دشمن کی طاقت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ فتح و نصرت

انسانوں کی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ کے حکم پر موقوف ہے، اسی لیے فتحِ مبین اور آئندہ نصرتِ عزیزہ کا اصل سبب بھی اللہ ہی کی مدد ہے، نہ کہ محض انسانی طاقت۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ ہر چیز کو جاننے والا اور حکمت والا ہے، اس کے تمام فیصلے علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ **لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ:** اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنتوں میں داخل کرے گا، ایسی جنتیں جن کے درمیان سے نہریں رواں دواں ہوں گی، یہ ان جنتوں میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کرے گا، اور یہ ان کے لیے عظیم کامیابی ہے۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا: جنت میں داخل ہو جانا، جہنم کی شعلہ زن آگ سے محفوظ ہو جانا، گناہوں کا مٹ جانا، جنت میں ہمیشہ کی زندگی پالینا یہ اللہ کے ہاں بڑی کامیابی ہے، کامرانی ہے۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ: الخ ایمان والوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ منافق مرد و عورت اور مشرک مرد و عورت کو عذاب دے گا، جو اللہ کے بارے میں بدگمانی رکھتے ہیں۔ ان پر اللہ کا غضب، لعنت اور جہنم کی وعید ہے۔ اللہ نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے، جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس آیت میں آسمان و زمین کے لشکروں کا ذکر دوبارہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات پوری طرح بٹھا دی جائے کہ فتح اور شکست کا اصل فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے موقع پر اس کا ذکر وعدۂ نصرت کو مضبوط کرنے کے لیے تھا، اور یہاں اس تکرار کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جو فیصلے اللہ نے فرمائے ہیں، وہ مکمل قوت اور گہری حکمت پر مبنی ہیں۔ یہ آیت مسلمانوں کے لیے تسلی بھی ہے اور منافقوں اور کفار کے لیے تنبیہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بے شمار لشکر ہیں، وہ جب چاہے جس کے ذریعے چاہے مدد فرمائے یا پکڑ لے۔ اس لیے کسی کو اپنی طاقت پر گھمنڈ اور کسی کو کمزوری پر مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: کیونکہ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے، یعنی غالب ہے اور حکیم بھی ہے، یعنی اس

کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا: ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ.: اس رسالت و نبوت کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، رسول کی مدد اور تعظیم کریں، اور اللہ کی صبح و شام تسبیح کریں۔

بیعت الرضوان

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ مسلمانوں نے جو بیعت نبی کریم ﷺ سے کی تھی اسے کیا کہا جاتا ہے؟ اور یہ بیعت کیوں کی گئی تھی؟

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا {۱۰} الفتح

جواب ترجمہ: اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں در حقیقت وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، اس کے بعد جو کوئی عہد توڑے گا، اس کے عہد کو توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا، اور جو کوئی اس عہد کو پورا کرے گا، جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اس کو زبردست ثواب عطا کرے گا۔

یہ بیعت جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے مقام پر ببول کے درخت کے نیچے نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر فرمائی تھی اسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ یہ بیعت اس پر کی گئی تھی کہ مسلمان مشرکین مکہ سے لڑیں گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس بیعت کا ذکر ہے وہ بیعت الرضوان ہے جو ایک ببول کے درخت تلے حدیبیہ کے میدان میں ہوئی تھی اس دن بیعت کرنے والے صحابہ کی تعداد تیرہ سو چودہ سو یا پندرہ سو تھی ٹھیک یہ ہے کہ چودہ سو تھی اس واقعہ کی حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

بخاری شریف میں ہے ہم اس دن چودہ سو تھے بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے آپ نے اس پانی

میں ہاتھ رکھا پس آپ کی انگلیوں کے درمیان سے اس پانی کی سوتیں ابلنے لگیں۔ یہ حدیث مختصر ہے اس حدیث سے جس میں ہے کہ صحابہ سخت پیاسے ہوئے پانی تھا نہیں حضور ﷺ نے انہیں اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر دیا انہوں نے جا کر حدیبیہ کے کنویں میں اسے گاڑ دیا اب تو پانی جوش کے ساتھ ابلنے لگا یہاں تک کہ سب کو کافی ہو گیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اس روز تم کتنے تھے ؟ فرمایا چودہ سو لیکن اگر ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی اس قدر تھا کہ سب کو کافی ہو جاتا، بخاری کی روایت میں ہے کہ "پندرہ سو تھے" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں پندرہ سو بھی مروی ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں فی الواقع تھے تو پندرہ سو اور یہی حضرت جابر کا قول تھا پھر آپ کو کچھ وہم سا ہو گیا اور چودہ سو فرمانے لگے ابن عباس سے مروی ہے کہ سوا پندرہ سو تھے۔ لیکن آپ سے مشہور روایت چودہ سو کی ہے اکثر راویوں اور اکثر سیرت نویس بزرگوں کا یہی قول ہے کہ چودہ سو تھے ایک روایت میں ہے اصحاب شجرہ چودہ سو تھے اور اس دن آٹھواں حصہ مہاجرین کا مسلمان ہوا۔

سیرت محمد بن اسحاق میں ہے کہ حدیبیہ والے سال رسول مقبول ﷺ اپنے ساتھ سات سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر زیارت بیت اللہ کے ارادے سے مدینہ سے چلے قربانی کے ستر اونٹ بھی آپ کے ہمراہ تھے ہر دس اشخاص کی طرف سے ایک اونٹ، ہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کے ساتھی اس دن چودہ سو تھے ابن اسحاق اسی طرح کہتے ہیں اور یہ ان کے اوہام میں شمار ہے، بخاری و مسلم جو محفوظ ہے وہ یہ کہ ایک ہزار کئی سو تھے۔

اس بیعت کا سبب سیرت محمد بن اسحاق میں ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کو بلوایا کہ آپ کو مکہ بھیج کر قریش کے سرداروں سے کہلوائیں کہ حضور ﷺ لڑائی بھڑائی کے ارادے سے نہیں آئے بلکہ آپ بیت اللہ شریف کے عمرے کے لئے آئے ہیں لیکن حضرت عمر نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ میرے خیال سے تو اس کام کے لئے آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجیں کیونکہ مکہ میں میرے خاندان میں سے کوئی نہیں یعنی بنو عدی بن کعب کا قبیلہ نہیں جو میری حمایت کرے آپ جانتے ہیں کہ

قریش سے میں نے کتنی کچھ اور کیا کچھ دشمنی کی ہے اور وہ مجھ سے وہ کس قدر خار کھائے ہوئے ہیں مجھے تو وہ زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے اس رائے کو پسند فرما کر جناب عثمان ذوالنورین کو ابو سفیان اور سرداران قریش کے پاس بھیجا آپ جا ہی رہے تھے کہ راستے میں یا مکہ میں داخل ہوتے ہی ابان بن سعید بن عاص مل گیا اور اس نے آپ کو اپنے آگے سواری پر بٹھالیا اپنی امان میں انہیں اپنے ساتھ مکہ میں لے گیا آپ قریش کے بڑوں کے پاس گئے اور حضور ﷺ کا پیغام پہنچایا انہوں نے کہا کہ اگر آپ بیت اللہ شریف کا طواف کرنا چاہیں تو کر لیجئے آپ نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے میں طواف کرلوں، اب ان لوگوں نے جناب ذوالنورین کو روک لیا ادھر لشکر اسلام میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر ڈالا گیا، اس وحشت اثر خبر نے مسلمانوں کو اور خود رسول ﷺ کو بڑا صدمہ پہنچایا اور آپ نے فرمایا کہ اب تو ہم بغیر فیصلہ کئے یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور ان سے بیعت لی ایک درخت تلے یہ بیعت الرضوان ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں یہ بیعت موت پر لی تھی یعنی لڑتے لڑتے مر جائیں گے لیکن حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ موت پر بیعت نہیں لی تھی بلکہ اس اقرار پر کہ ہم لڑائی سے بھاگیں گے نہیں جتنے مسلمان صحابہ اس میدان میں تھے سب نے آپ سے بہ رضامندی بیعت کی سوائے جد بن قیس کے جو قبیلہ بنو سلمہ کا ایک شخص تھا یہ اپنی اونٹنی کی آڑ میں چھپ گیا پھر حضور ﷺ اور صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ غلط تھی اس کے بعد قریش نے سہیل بن عمرو، حویطب بن عبد العزیٰ اور مکرز بن حفص کو آپ کے پاس بھیجا یہ لوگ ابھی یہیں تھے کہ بعض مسلمانوں اور بعض مشرکوں میں کچھ تیز کلامی شروع ہوگئی نوبت یہاں تک پہنچی کہ سنگ باری اور تیر باری بھی ہوئی اور دونوں طرف کے لوگ آمنے سامنے ہو گئے۔

ادھر ان لوگوں نے حضرت عثمان وغیرہ کو روک لیا ادھر یہ لوگ رک گئے اور رسول اللہ ﷺ کے منادی نے ندا کر دی کہ روح القدس اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور بیعت کا حکم دے گئے

آؤ اللہ کا نام لے کر بیعت کر جاؤ اب کیا تھا مسلمان بے تابانہ دوڑے ہوئے حاضر ہوئے آپ اس وقت درخت تلے تھے سب نے بیعت کی اس بات پر کہ وہ ہر گز ہر گز کسی صورت میں میدان سے منہ موڑنے کا نام نہ لیں گے اس سے مشرکین کانپ اٹھے اور جتنے مسلمان ان کے پاس تھے سب کو چھوڑ دیا اور صلح کی درخواست کرنے لگے۔

بیہقی میں ہے کہ بیعت کے وقت اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا الٰہی عثمان تیرے اور تیرے رسول ﷺ کے کام کو گئے ہوئے ہیں پس آپ نے خود اپنا ایک ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھا گویا حضرت عثمان کی طرف سے بیعت کی۔ پس حضرت عثمان کے لئے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ان کے اپنے ہاتھ سے بہت افضل تھا۔

اس بیعت میں سب سے پہل کرنے والے حضرت ابو سنان اسدی تھے، انہوں نے سب سے آگے بڑھ کر فرمایا حضور ﷺ ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں بیعت کرلوں آپ نے فرمایا کس بات پر بیعت کرتے ہو؟ جواب دیا جو آپ کے دل میں ہو اس پر۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لڑکے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے پہلے اسلام قبول کیا دراصل واقعہ یوں نہیں۔ بات یہ ہے کہ حدیبیہ والے سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو ایک انصاری کے پاس بھیجا کہ جا کر اپنے گھوڑے لے آؤ اس وقت رسول اللہ ﷺ لوگوں سے بیعت لے رہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا یہ اپنے طور پوشیدگی سے لڑائی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے تو یہ بیعت سے مشرف ہوئے پھر گھوڑا لینے گئے اور گھوڑا لا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا حضور ﷺ بیعت لے رہے ہیں اب جناب فاروق آئے اور حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اس بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ بیٹے کا اسلام باپ سے پہلے کا ہے۔ بخاری کی دوسری روایت میں ہے لوگ الگ الگ درختوں تلے آرام کر رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ہر ایک کی نگاہیں حضور ﷺ پر ہیں اور لوگ آپ کو گھیرے ہوئے ہیں

حضرت عبد اللہ سے فرمایا جاؤ ذرا دیکھو تو کیا ہو رہا ہے ؟ یہ آئے دیکھا کہ بیعت ہو رہی ہے تو بیعت کر لی پھر جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر کی۔ چنانچہ آپ بھی فوراً آئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب ہم نے بیعت کی ہے اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور آپ ایک ببول کے درخت تلے تھے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس موقع پر درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کو آپ کے سر سے اوپر کو اٹھا کر میں تھامے ہوئے تھا ہم نے آپ سے موت پر بیعت نہیں کی بلکہ نہ بھاگنے پر بیعت کی تھی۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے مرنے پر بیعت کی تھی آپ فرماتے ہیں ایک مرتبہ بیعت کر کے میں ہٹ کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا تو آپ نے مجھ سے فرمایا سلمہ تم بیعت نہیں کرتے ؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ! میں نے تو بیعت کر لی آپ نے فرمایا خیر آؤ بیعت کرو، چنانچہ میں نے قریب جا کر پھر بیعت کی۔

حدیبیہ کے کنویں میں صرف اتنا پانی تھا کہ پچاس بکریاں بھی آسودہ نہ ہو سکیں آپ فرماتے ہیں کہ دوبارہ بیعت کر لینے کے بعد آپ نے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں بے سپر ہوں تو آپ نے مجھے ایک ڈھال عنایت فرمائی پھر لوگوں سے بیعت لینی شروع کر دی پھر آخری مرتبہ میری طرف دیکھ کر فرمایا سلمہ تم بیعت نہیں کرتے ؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ پہلی مرتبہ جن لوگوں نے بیعت کی میں نے ان کے ساتھ ہی بیعت کی تھی پھر بیچ میں دوبارہ بیعت کر چکا ہوں آپ نے فرمایا اچھا پھر سہی چنانچہ اس آخری جماعت کے ساتھ بھی میں نے بیعت کی۔

آپ نے پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا سلمہ تمہیں ہم نے جو ڈھال دی تھی وہ کیا ہوئی ؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ حضرت عامر سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس دشمن کا وار روکنے والی کوئی چیز نہیں میں نے وہ ڈھال انہیں دے دی تو آپ ہنسے اور فرمایا تم بھی اس شخص کی طرح ہو جس نے اللہ سے دعا کی کہ اے الٰہی میرے پاس کسی ایسے کو بھیج دے جو مجھے میری جان سے زیادہ عزیز ہو۔

پھر اہل مکہ سے صلح کی تحریک کی آمد و رفت ہوئی اور صلح ہو گئی میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ کا خادم تھا ان کے گھوڑے کی اور ان کی خدمت کیا کرتا تھا وہ مجھے کھانے کو دے دیتے تھے میں تو اپنا گھر بار بال بچے مال دولت سب راہ اللہ میں چھوڑ کر ہجرت کر کے چلا آیا تھا، جب صلح ہو چکی ادھر کے لوگ ادھر ادھر کے ادھر آنے لگے تو میں ایک درخت تلے جا کر کانٹے وغیرہ ہٹا کر اس کی جڑ سے لگ کر سو گیا اچانک مشرکین مکہ میں سے چار شخص وہیں آئے اور حضور ﷺ کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمات سے آپس میں باتیں کرنے لگے مجھے بڑا برا معلوم ہوا۔

میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے درخت تلے چلا گیا، اب لوگوں نے اپنے ہتھیار اتارے درخت پر لٹکا کر وہاں لیٹ گئے تھوڑی دیر گذری ہو گی جو میں نے سنا کہ وادی کے نیچے کے حصہ سے کوئی منادی ندا کر رہا ہے کہ اے مہاجر بھائیو! حضرت دہیم قتل کر دیئے گئے میں نے جھٹ سے تلوار تان لی اور اسی درخت تلے گیا جہاں چاروں سوئے ہوئے تھے جاتے ہی پہلے تو ان کے ہتھیار قبضے میں کئے اور اپنے ایک ہاتھ میں انہیں دبا کر دوسرے ہاتھ سے تلوار تول کر ان سے کہا سنو اس اللہ کی قسم جس نے حضرت محمد ﷺ کو عزت دی ہے تم میں سے جس نے بھی سر اٹھایا میں اس کا سر قلم کر دونگا۔

جب وہ اسے مان چکے میں نے کہا اٹھو اور میرے آگے آگے چلو چنانچہ ان چاروں کو لے کر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ادھر میرے چچا حضرت عامر بھی مکرز نامی ایک مشرک کو گرفتار کر کے لائے اور بھی اسی طرح کے ستر مشرکین حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر کئے گئے تھے آپ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا انہیں چھوڑ دو برائی کی ابتدا بھی انہی کے سر رہے اور پھر اس کی تکرار کے ذمہ دار بھی یہی رہیں چنانچہ ان سب کو رہا کر دیا گیا۔

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے والد بھی اس موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے آپ کا بیان ہے کہ اگلے سال جب ہم حج کو گئے تو اس درخت کی جگہ ہم پر پوشیدہ رہی ہم معلوم نہ کر سکے کہ کس جگہ حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی تھی اب اگر تم پر یہ پوشیدگی کھل گئی ہو تو تم جانو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا آج زمین پر جتنے ہیں ان سب

پر افضل تم لوگ ہو، آپ فرماتے ہیں اگر میری آنکھیں ہوتیں تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ دکھا دیتا، حضرت سفیان فرماتے ہیں اس جگہ کی تعین میں بڑا اختلاف ہے حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جن لوگوں نے اس بیعت میں شرکت کی ہے ان میں سے کوئی جہنم میں نہیں جائے گا (بخاری و مسلم)

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جن لوگوں نے اس درخت تلے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے سب جنت میں جائیں گے مگر سرخ اونٹ والا، ہم جلدی دوڑے دیکھا تو ایک شخص اپنے کھوئے ہوئے اونٹ کی تلاش میں تھا ہم نے کہا چل بیعت کر اس نے جواب دیا کہ بیعت سے زیادہ نفع تو اس میں ہے کہ میں اپنا گم شدہ اونٹ پالوں۔

مسند احمد میں ہے آپ نے فرمایا کون ہے جو ثنیۃ المرار پر چڑھ جائے اس سے وہ دور ہو جائے گا جو بنی اسرائیل سے دور ہوا، پس سب سے پہلے قبیلہ خزرج کے ایک صحابی اس پر چڑھ گئے پھر تو اور لوگ بھی پہنچ گئے پھر آپ نے فرمایا تم سب بخشے جاؤ گے مگر سرخ اونٹ والا ہم اس کے پاس آئے اور اس سے کہا تیرے لئے رسول اللہ ﷺ سے استغفار طلب کریں تو اس نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم مجھے میرا اونٹ مل جائے تو میں زیادہ خوش ہوں گا بہ نسبت اس کے کہ تمہارے صاحب میرے لئے استغفار کریں۔

یہ شخص اپنا گم شدہ اونٹ ڈھونڈ رہا تھا حضرت حفصہ نے جب حضور ﷺ کی زبانی یہ سنا کہ اس بیعت والے دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے تو کہا ہاں ہوں گے آپ نے انہیں روک دیا تو مائی صاحبہ نے آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا مریم :۷۱) پڑھی یعنی تم میں سے ہر شخص کو اس پر وارد ہونا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا اس کے بعد ہی فرمان باری ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مریم :۷۲)(مسلم) یعنی پھر ہم تقویٰ والوں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل اس میں گرا دیں گے۔

حضرت حاطب بن ابو بلتعہ کے غلام حضرت حاطب کی شکایت لے کر حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ حاطب ضرور جہنم میں جائیں گے آپ نے فرمایا تو جھوٹا ہے وہ جہنمی نہیں

وہ بدر میں اور حدیبیہ میں موجود رہا ان بزرگوں کی ثنا بیان ہو رہی ہے کہ یہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے اس بیعت کو توڑنے والا اپنا ہی نقصان کرنے والا ہے اور اسے پورا کرنے والا بڑے اجر کا مستحق ہے۔

پیچھے رہ جانے والوں کی مصنوعی باتیں

سوال صلح حدیبیہ میں پیچھے رہ جانے والے دیہاتی نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف کس وجہ سے نہ نکلے؟ اور ان کے پیچھے رہ جانے کی وجہ کیا تھی؟ ان آیات کی روشنی میں وضاحت کی جائے۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا {۱۱} بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا {۱۲} الفتح.

جواب ترجمہ: وہ دیہاتی جو (حدیبیہ کے سفر میں) پیچھے رہ گئے تھے، اب وہ تم سے ضرور یہ کہیں گے کہ: ہمارے مال و دولت اور ہمارے اہل و عیال نے ہمیں مشغول کر لیا تھا، اس لیے ہمارے لیے مغفرت کی دعا کر دیجیے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ (ان سے) کہو کہ: اچھا تو اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا فائدہ پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اللہ کے سامنے تمہارے معاملے میں کچھ بھی کرنے کی طاقت رکھتا ہو؟ بلکہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھا تھا کہ رسول ﷺ اور دوسرے مسلمان کبھی اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے، اور یہی بات تمہارے دلوں کو اچھی معلوم ہوتی تھی، اور تم نے برے برے گمان کیے تھے، اور تم ایسے لوگ بن گئے تھے جنہیں برباد ہونا تھا۔

یہ لوگ موت کے ڈر کی وجہ سے اپنے گھروں سے نہیں نکلے تھے، ان کا خیال تھا کہ کفار کی زبردست طاقت انہیں ملیامیٹ کر دے گی، اس خوف کے باعث وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ کی

طرف نہ گئے، مگر اس کے بر خلاف وہ اپنی زبانوں سے یوں کہنے لگے کہ یارسول اللہ! چونکہ ہمیں ہمارے اموال اور اہل وعیال نے مشغول کر دیا تھا اس لیے ہم آپ کے ساتھ جانہ سکے، حالانکہ ان کی یہ بات خلاف حقیقت تھی۔

جو اعراب لوگ جہاد سے جی چرا کر رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر موت کے ڈر کے مارے گھر سے نہ نکلتے تھے اور جانتے تھے کہ کفر کی زبردست طاقت ہمیں چکنا چور کر دے گی اور جو اتنی بڑی جماعت سے ٹکر لینے گئے ہیں یہ تباہ ہو جائیں گے بال بچوں کو ترس جائیں گے اور وہیں کاٹ ڈالے جائیں گے جب انہوں نے دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ مع اپنے پاکباز مجاہدین کی جماعت کے ہنسی خوشی واپس آرہے ہیں تو اپنے دل میں مسودے گانٹھنے لگے کہ اپنی مشیخت بنی رہے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے ہی سے خبر دار کر دیا کہ یہ بد باطن لوگ آکر اپنے ضمیر کے خلاف اپنی زبان کو حرکت دیں گے اور عذر پیش کریں گے کہ حضور بال بچوں اور کام کاج کی وجہ سے نکل نہ سکے ورنہ ہم تو ہر طرح تابع فرمان ہیں ہماری جان تک حاضر ہے اپنی مزید ایمان داری کے اظہار کے لئے یہ بھی کہہ دیں گے کہ حضرت آپ ہمارے لئے استغفار کیجئے۔

تو آپ انہیں جواب دے دینا کہ تمہارا معاملہ سپرد اللہ ہے وہ دلوں کے بھید سے واقف ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچائے تو کون ہے جو اسے دفع کر سکے؟ اور اگر وہ تمہیں نفع دینا چاہے تو کون ہے جو اسے روک سکے؟ تصنع اور بناوٹ سے تمہاری ایمانداری اور نفاق سے وہ بخوبی آگاہ ہے ایک ایک عمل سے وہ باخبر ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں دراصل تمہارا پیچھے رہ جانا کسی عذر کے باعث نہ تھا بلکہ بطور نافرمانی کے ہی تھا۔ صاف طور پر تمہارا نفاق اس کے باعث تھا تمہارے دل ایمان سے خالی ہیں اللہ پر بھروسہ نہیں رسول ﷺ کی اطاعت میں بھلائی کا یقین نہیں اس وجہ سے تمہاری جانیں تم پر گراں ہیں تم اپنی نسبت تو کیا بلکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رسول ﷺ کی نسبت بھی یہی خیال کرتے تھے کہ یہ قتل کر دیئے جائیں گے ان کی بھوسی اڑادی جائے گی ان میں سے ایک بھی نہ بچ سکے گا جو ان کی خبر تولا کر دے۔

ان بد خیالیوں نے تمہیں نامرد بنا رکھا تھا تم دراصل برباد شدہ لوگ ہو کہا گیا ہے کہ (بورا) لغت

عمان ہے جو شخص اپنا عمل خالص نہ کرے اپنا عقیدہ مضبوط نہ بنالے اسے اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ میں عذاب کرے گا گو دنیا میں وہ بہ خلاف اپنے باطن کے ظاہر کرتے رہے پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ملک اپنی شہنشاہی اور اپنے اختیارات کا بیان فرماتا ہے کہ مالک و متصرف وہی ہے بخشش اور عذاب پر قادر وہ ہے لیکن ہے غفور اور رحیم جو بھی اس کی طرف جھکے وہ اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور جو اس کا در کھٹکھٹائے وہ اس کے لئے اپنا دروازہ کھول دیتا ہے خواہ کتنے ہی گناہ کئے ہوں جب توبہ کرے اللہ قبول فرمالیتا ہے اور گناہ بخش دیتا ہے بلکہ رحم اور مہربانی سے پیش آتا ہے۔

کفار کے لیے وعید: اللہ کی حاکمیت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا {۱۳} وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا {۱۴} الفتح

جواب ترجمہ: اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کو نہ مانے گا تو یقیناً ہم نے انکار کرنے والوں کے لیے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت تمام تر اللہ ہی کی ہے، وہ جس کو چاہے بخش دے، اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ سَعِيْرًا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتا، اس کے لیے ہم نے "سعیر" یعنی بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ یہاں "سعیر" کو نکرہ (غیر معرفہ) لایا گیا ہے تاکہ اس کی ہولناکی اور شدت کو بیان کیا جائے، یعنی یہ ایسی آگ ہے جس کی شدت اور عذاب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول دونوں پر ایمان نہ لائے، وہ کافر ہے اور اس کا انجام جہنم کی آگ ہے۔ اس میں منافقین اور وہ سب لوگ شامل ہیں جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر دل سے ایمان نہیں لاتے یا رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ: اس آیت میں اللہ

تعالیٰ اپنی قدرت اور بادشاہت کو بیان فرماتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور سرکشی و کفر پر اصرار کرنے والوں کو عذاب دیتا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے"، یعنی اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اور وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔

غنیمت کی تلاش میں پیچھے رہ جانے والے

سوال ان آیات کریمہ کی تفسیر کیجیے

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا {۱۵} قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا {۱۶} الفتح.

جواب ترجمہ: (مسلمانو) جب تم غنیمت کے مال لینے کے لیے چلو گے تو یہ (حدیبیہ کے سفر سے) پیچھے رہنے والے تم سے کہیں گے کہ: ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ وہ چاہیں گے کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ تم کہہ دینا کہ: تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ اللہ نے پہلے سے یوں ہی فرما رکھا ہے۔ اس پر وہ کہیں گے کہ: دراصل آپ لوگ ہم سے حسد رکھتے ہیں۔ نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خود ہی ایسے ہیں کہ بہت کم بات سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے کہہ دینا کہ: عنقریب تمہیں ایسے لوگوں کے پاس (لڑنے کے لیے) بلایا جائے گا جو بڑے سخت جنگجو ہوں گے، کہ یا تو ان سے لڑتے رہو، یا وہ اطاعت قبول کر لیں۔ اس وقت اگر تم (جہاد کے اس حکم کی) اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا، اور اگر تم منہ موڑو گے جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا تھا تو اللہ تمہیں دردناک

عذاب دے گا۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے سفر میں جس جاں نثاری اور اطاعت کے جذبے سے کام لیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں یہ وعدہ فرمایا تھا کہ مکہ مکرمہ کی فتح سے پہلے انہیں ایک اور فتح حاصل ہو گی، جس میں بہت سا مال غنیمت بھی حصے میں آئے گا، اس سے مراد خیبر کی فتح تھی، چنانچہ سن ۷ ہجری میں جب آپ خیبر کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق خیبر ضرور فتح ہو گا اور وہاں سے مال غنیمت بھی حاصل ہو گا، اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب یہ موقع آئے گا تو جو منافق حدیبیہ کے سفر میں حیلے بہانے کر کے پیچھے رہ گئے تھے، وہ خیبر کے سفر میں تمہارے ساتھ چلنا چاہیں گے کیونکہ انہیں یقین ہو گا کہ اس سفر میں فتح ہو گی اور مال غنیمت بھی ملے گا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ کریں اور انہیں ساتھ لے جانے سے انکار کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی یہ حکم دیا تھا کہ خیبر کے سفر میں صرف ان حضرات کو شرکت کی اجازت دیں جو حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے، اسی حکم کی طرف اس آیت میں اللہ کی بات فرما کر اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اس سے پہلے قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں ہے کہ خیبر کی جنگ میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جو حدیبیہ میں شامل تھے، بلکہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا، اور آپ نے لوگوں تک پہنچایا، اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے احکام آیا کرتے تھے، اور وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہوتے تھے۔ لہٰذا منکرین حدیث جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے علاوہ کسی اور وحی کا کوئی ثبوت نہیں ہے یہ آیت اس کی واضح تردید کر رہی ہے۔ (توضیح القرآن)

معذور کے لیے رخصت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا {۱۷} الفتح

جواب ترجمہ: نابینا پر کوئی الزام نہیں اور نہ پیروں سے معذور شخص پر کوئی الزام ہے اور نہ مریض کے لیے حرج ہے اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات مانے گا اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو منہ موڑے گا اس کو دردناک عذاب دے گا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ان لوگوں کے لیے رخصت بیان فرمائی ہے جو جسمانی معذوری یا بیماری کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے۔ یعنی: نابینا، لنگڑے اور بیمار پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوں، کیونکہ ان کی جسمانی حالت انہیں اس فرض کی ادائیگی سے معذور کر دیتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شریعت کی آسانی کا بیان ہے کہ جو شخص واقعی معذور ہو، اس پر شریعت کے احکام میں تخفیف ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: یعنی: جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، چاہے وہ معذور ہو یا تندرست، اللہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اطاعت سے مراد اللہ اور رسول کے تمام احکام کی پیروی ہے، اور یہاں خاص طور پر جہاد کے معاملے میں اطاعت مراد ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيْمًا: یعنی: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑے (یعنی جان بوجھ کر پیچھے ہٹے اور عذر نہ ہو)، اللہ اسے دردناک عذاب دے گا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو بغیر کسی شرعی عذر کے جہاد یا دیگر احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔

بیعت الرضوان کے صلہ میں فتح خیبر

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً {۱۸} وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا {۱۹} الفتح

جواب یقیناً اللہ ان مومنوں سے بڑا خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ بھی اللہ کو معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت اتار دی، اور ان کو انعام میں ایک قریبی فتح عطا فرما دی۔ اور بہت سا مال غنیمت بھی جو ان کے ہاتھ آئے گا اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے

یہ اسی بیعت الرضوان کا ذکر ہے جو نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر ایک کیکر کے درخت کے نیچے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لی تھی، اللہ تعالیٰ ان بیعت کرنے والوں سے خوش ہوا، جنہوں نے دل کی گہرائیوں سے بیعت کی تھی سچے دل سے بیعت کی تھی، ایمان، صدق اور وفاداری کی مثال قائم کی تھی، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے مضبوط کیا اور ان پر سکینہ نازل فرمایا، اللہ تعالیٰ نے انہیں صلح حدیبیہ کے صلہ میں عظیم فتح عطا فرمائی جسے فتح خیبر کہا جاتا ہے، یہاں آیت کے آخر میں اسی فتح کا ذکر ہے۔ اس فتح میں قلعے فتح ہوئے، یہود کی طاقت محدود ہوئی، اور مسلمانوں کی دولت، طاقت اور عزت میں اضافہ ہوا، صلہ حدیبیہ سنہ ۶ ھ میں ہوئی، فتح خیبر اس کے دو ماہ بعد ہو گئی تھی۔

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں کو بہت سے غنائم عنایت فرمائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی سے بھی نوازا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سکینہ کو اتارا اور ان کو قریبی فتح بھی عنایت کر دی کہ جس میں وہ یہود خیبر کے کثیر اموال حاصل کریں گے اللہ تعالیٰ نے یہ اموال خصوصا بیعت رضوان والوں کے ساتھ خاص کر دیئے۔ (طبری)

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ اپنے انتظام میں زبردست ہے جن دشمنوں سے وہ انتقام لیتا ہے اور اپنی مخلوقات کی تدبیر و تصرف میں اس کے فیصلے حکمت کے مطابق ہوتے ہیں۔

معانم کثیرہ کا وعدہ

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز وہ مغانم کثیرہ کون سے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا {۲۰} وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا {۲۱} الفتح

جواب ترجمہ: اللہ نے تم سے بہت سے مال غنیمت کا وعدہ کر رکھا ہے جو تم حاصل کرو گے، اب فوری طور پر اس نے تمہیں یہ فتح دے دی ہے، اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا، تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے، اور تمہیں اللہ سیدھے راستے پر ڈال دے۔ اور ایک فتح اور بھی ہے جو ابھی تمہارے قابو میں نہیں آئی، لیکن اللہ نے اس کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد پر جان دینے والے لوگو! ہم نے تم سے بہت سی غنیمتوں کے وعدے کر رکھے ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں جب تم ایک ایک کر کے ان سے بہرہ ور کیے جاؤ گے۔ یعنی ایسی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ جس کے نتیجے میں تمام مخالف قوتیں یکے بعد دیگرے سرنگوں ہو جائیں گی اور ان کے اموال اور ان کی زمینیں مال غنیمت کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گی۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ یوں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پورا بھروسہ ہے لیکن محض تمہاری حوصلہ افزائی کے لیے ہم اپنے وعدوں کی تصدیق کے طور پر ایک نقد فتح تمہیں عطا کر رہے ہیں۔

اور یہ فتح ایسی ہے جو آئندہ کی فتوحات کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے خیبر کی فتح اور اس کی غنیمت مراد لی ہے۔ لیکن الفاظ پر غور کرنے سے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے جسے قرآن کریم نے فتحِ مبین قرار دیا ہے۔ کیونکہ فتحِ خیبر کا ذکر گزشتہ آیت میں ہو چکا ہے اور اسے فتحِ قریب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اور وہ فتحِ قریب ان معنوں میں ہے کہ حدیبیہ سے واپسی پر صرف تین ماہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ فتح عطا فرمائی۔ لیکن یہاں جملہ فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعجیل قریب سے پہلے کی چیز ہے۔ صلح حدیبیہ کے تین ماہ بعد جو فتح عطا فرمائی گئی اسے فتحِ قریب کہنا یقیناً ہر طرح درست ہے۔ لیکن وہ فتح جو فوری طور پر عطا کر دی گئی وہ فتحِ قریب نہیں بلکہ وہ فتح ہے جو سورۃ کے نازل ہونے سے پہلے عطا فرمائی گئی، اور وہ یہی صلح حدیبیہ ہے۔ اور اس کو فتحِ مبین اس لیے قرار دیا گیا کہ اس صلح میں جو معاہدہ طے پایا اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے راستے کے تمام موانع ختم ہو گئے۔

تبلیغ و دعوت کے راستے بھی کھل گئے، نئے نئے تعلقات کی استواری کے مواقع بھی پیدا ہو گئے۔ اور اگر کسی مخالف قوت پر حملہ کیا گیا تو ان کے لیے اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ وہ مسلمانوں کے مخالفین سے مدد لے سکیں۔ چنانچہ یہی وہ اسباب ہیں جن کا اس معاہدے میں حاصل ہو جانا ایک ایسی فتحِ مبین تھی جو بعد کی فتوحات کے لیے مقدمہ ثابت ہوئی۔

اس فتحِ مبین کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس پر مزید اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہوا کہ اس نے تم سے لوگوں کے ہاتھوں کو روک دیا۔ یہاں الناس سے مراد قریش ہیں۔ یہ لوگ ہر چند کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو کسی طرح اشتعال میں لا کر جنگ کی صورتحال پیدا کر دیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان غیر مسلح ہیں ان کے پاس افرادی قوت کی بے حد کمی ہے اور وہ اپنے مرکز سے اڑھائی سو میل کے فاصلے پر ہیں۔ وہ کوشش بھی کریں تو ان کے مرکز سے انھیں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ لیکن قریش ہر لحاظ سے ان سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ اگر لڑائی چھڑ جائے تو قریش کی فتح کے امکانات واضح ہیں۔ اور اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کے مشن کو شدید نقصان پہنچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ قریش خواہش رکھنے کے باوجود بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکے۔

سراسر مخالفانہ ماحول اور جنگی نقطہ نگاہ سے تمام کمزوریوں کے باوجود قریش کا کوئی اقدام نہ کر سکنا اور مسلمانوں کا ہر طرح محفوظ رہنا بلکہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا، محض اس وجہ سے ہوا تاکہ یہ

سب کچھ اصحابِ ایمان کے لیے اس حقیقت کی نشانی بن جائے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ثابت قدم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حق اور راستی کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نامساعد حالات میں بھی اس کے لیے حالات کو حسب حال کر دیتا ہے۔ کمزوری کے باوجود دشمن کے دل میں اس کا رعب ڈال دیتا ہے اور قدم قدم پر اس طرح اسے اپنی تائید و نصرت سے نوازتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو کمزور اور بے بس نہیں دیکھتا۔ چنانچہ آنے والے حالات میں حدیبیہ میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ایک نشانی، ایک رہنمائی اور مشعل راہ بنا رہا اور جب بھی کبھی کوئی تشویشناک صورتحال پیدا ہوئی تو بجائے اپنی بے بسی کو دیکھنے کے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر بھروسہ میں اور اضافہ ہو گیا۔

مسلمانوں کو غیر معمولی تائید و نصرت سے نوازنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ اور صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد یہ ہے کہ ان کے اندر یہ عزم توانا کر دے اور ان کی بصیرت پر یہ نکتہ کھول دے کہ تمہاری اصل منزل اللہ تعالیٰ کے گھر کو دشمنوں سے واگزار کرا کے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دین کا مرکز بنانا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو مرکز بنایا تھا۔

کفر کی قہرمانی طاقتوں نے ایک عرصے سے اللہ تعالیٰ کی توحید کے اس مرکز کا راستہ بند کر رکھا ہے اب وقت آگیا ہے کہ از سر نو اسے کھولا جائے۔ اور یہ مرکز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ماننے والوں کے لیے نئی توانائی کا باعث بنے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اُخْرٰی کے لفظ سے ایک اور فتح کی خبر سنائی گئی ہے جس سے مراد فتحِ مکہ ہے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کا گھر حقیقی معنی میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا مرکز بن سکے گا۔ اور جب تک مکہ فتح نہیں ہوتا اور قریش کی طاقت شکست و ریخت کا شکار نہیں ہوتی اس وقت تک جزیرہ عرب میں بت پرستی اور شرک کے تمام امکانات کو غذا ملتی رہے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس بند راستے کو کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ فتح کرائے گا۔

بلاشبہ آج مسلمانوں میں اس کی فتح کے لیے حالات ساز گار نہیں۔ اور نہ وہ ابھی اس قدر مضبوط ہوئے ہیں کہ طاقت کے زور سے مکہ پر غلبہ پالیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا راستہ کون روک سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اگرچہ مکہ کی فتح پر قادر نہیں ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو گھیر رکھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا مضبوط ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے اس میں گویا بشارت ہے اس بات کی کہ بہت جلدی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس گھر کی فتح کے اسباب پیدا کر دے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

سنت اللہ یعنی دستور ربانی

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ ان آیات میں جس سنت اللہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا {۲۲} سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا {۲۳} الفتح

جواب ترجمہ: اور یہ کافر لوگ تم سے لڑتے تو یقیناً پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، پھر انہیں کوئی یار و مددگار بھی نہ ملتا۔ جیسا کہ اللہ کا یہی دستور ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (سورۃ الفتح)

صلح حدیبیہ کے واقعات اور اس کی مصلحتوں کو بیان کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہے کہ بیشک اللہ نے کفار کو مسلمانوں پر حملہ کرنے اور جوابی کارروائی کرنے سے اور جذباتی لمحات میں اہل ایمان کو کفار پر حملہ کرنے سے روک دیا تھا لیکن اگر مسلمانوں کی غربت و بے بسی کے باوجود جنگ ہو جاتی تو کفار کو پیٹھ دکھا کر بھاگنا پڑتا اور ان کفار کی کسی قبیلے یا قوم کی طرف سے کوئی مدد نہ ہو سکتی اور ان کفار کو زبردست شکست اور شرمندگی کا سامان کرنا پڑتا لیکن اللہ کی مصلحت یہ تھی کہ اس وقت جنگ نہ ہو تاکہ فساد اور شر پھیلانے والوں کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جائے اور جنگ کے نتیجے میں وہ بہت سے لوگ جو ایمان قبول کر چکے تھے یا ذہنی طور پر دین اسلام سے متاثر ہو کر اپنے ایمانی جذبوں کو چھپائے ہوئے تھے ان کو

کوئی نقصان نہ پہنچے کیونکہ جب باہمی جنگ شروع ہو جاتی تو کفار اہل ایمان کو نقصان پہنچاتے یا اہل ایمان جب حملہ کرتے تو بے خبری میں سب کو روندتے چلے جاتے۔

اس لیے اللہ نے ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ ہر حال میں صلح ہو جائے اور جنگ کی نوبت نہ آسکے۔ صلح حدیبیہ جس کو اہل ایمان اس کی بعض شرائط کی وجہ سے اپنے لئے توہین آمیز سمجھ رہے تھے اس میں بہت سی مصلحتیں پوشیدہ تھیں جب کہ بہترین اثرات کو ہر اہل ایمان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں اور مصلحتوں کو زیر مطالعہ آیات میں بیان ارشاد فرمایا ہے۔

اگر یہ صلح نہ ہوتی اور تم کافروں سے قتال و جہاد کرتے تو یہ کفار پیٹھ پھیر کر بھاگتے اور اس وقت ان کفار کی حمایت اور مدد کرنے کوئی نہ پہنچتا۔ اللہ کا یہی دستور اور قانون ہے (کہ جو اس نے ہمیشہ کفار و مشرکین کے متعلق اختیار فرمایا ہے)

نبی ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اللہ کے قانون اور دستور میں کبھی تبدیلی نہ پائیں گے۔ اس اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے تھے اور وہ بھی عین مکہ (مقام حدیبیہ جو مکہ سے قریب ہے) جب کہ اس نے تمہیں ان کفار پر غلبہ بھی دیدیا تھا۔ (بصیرت قرآن)

سنت اللہ سے مراد وہ ہے جو اللہ نے اپنی مخلوق میں اس سے پہلے جاری فرمایا ہے کہ وہ کافروں کو شکست دیتا ہے اور سچے اور کھرے مؤمنوں کی مدد اور نصرت کرتا ہے۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔ اب اللہ فرماتا ہے کہ یہی حکمت تھی کہ وادی مکہ میں اللہ نے کافروں کو توفیق نہ دی کہ وہ مسلمانوں پر ہاتھ ڈالیں اور مسلمانوں کو بھی توفیق نہ دی کہ وہ مشرکین مکہ پر اس وقت ہاتھ ڈالیں جب وہ ان کے قابو میں آگئے تھے۔ یہ ان چالیس آدمیوں کی طرف اشارہ ہے۔ چالیس ہوں یا کم و بیش۔ جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ یہ پکڑے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے معاف کر دیا۔ (فی ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ نے (کفار کیلئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور آپ اللہ کے دستور میں رد و بدل ہر گز نہیں پائیں گے۔ یعنی اللہ نے یہ طریقہ ہمیشہ سے جاری کر دیا ہے کہ اللہ کے اولیاء و

انبیاء علیہم السلام، اللہ کے دشمنوں پر غالب رہیں گے۔ اس نے ارشاد فرمادیا ہے: لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ میں اور میرے رسول بلاشبہ غالب آئیں گے۔ دوسری آیت میں آیا ہے: اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہوگا۔ تیسری جگہ ہے: اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ اللہ کا گروہ ہی غالب رہے گا۔ (تفسیر مظہری)

قدرت والے کا حسن تدبیر

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

وَھُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ عَنْھُمْ بِبَطْنِ مَکَّۃَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْھِمْ وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا {۲۴} الفتح

جواب ترجمہ: اور وہی اللہ ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان تک پہنچنے سے روک دیا، جبکہ وہ تمہیں ان پر قابو دے چکا تھا، اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔

اللہ قادر وقدیر ذات ہے، جسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، وہی ذات ہے جس نے وادی مکہ میں مشرکین کے ہاتھ اہل ایمان کے گریبان تک جانے سے روکے، اور وہی ذات برحق ہے جس نے اہل ایمان کے ہاتھوں کو کفار مکہ کے گریبانوں تک جانے سے روکے باوجودیکہ مسلمان ان کفار پر قابو پاچکے تھے، یہ کفار مسلمانوں کے شکنجے میں آچکے تھے۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ جب حضرت عثمان مکہ مکرمہ جاکر قریش کے لوگوں کو صلح کا پیغام دے رہے تھے، اس وقت مکہ مکرمہ کے کافروں نے پچاس آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہ خفیہ طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرکے (معاذاللہ) آپ کو شہید کردیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار کرادیا، دوسری طرف جب قریش نے ان آدمیوں کی گرفتاری کی خبر سنی تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو روک لیا، اس وقت اگر مسلمان ان پچاس آدمیوں کو قتل کردیتے تو جواب میں قریش کے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرتے، اور مکمل جنگ چھڑ جاتی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ ان قیدیوں کو قتل نہ کریں، اور مسلمانوں کے ہاتھوں کو ان کے قتل سے روک دیا، حالانکہ وہ ان کے قابو میں آچکے تھے، اور دوسری طرف قریش کے ہاتھوں کو مسلمانوں سے لڑنے سے اس طرح روک دیا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ صلح پر راضی ہوگئے، حالانکہ حضرت عثمان سے وہ صاف انکار کر چکے تھے۔ (توضیح القرآن)

مسجد حرام اور بیت اللہ کے اصل حقدار

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا {۲۵} اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا {۲۶} لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا {۲۷} الفتح.

جواب ترجمہ: یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، اور تمہیں مسجد حرام سے روکا، اور قربانی کے جانوروں کو جو ٹھہرے ہوئے کھڑے تھے، اپنی جگہ پہنچنے سے روک دیا، اور اگر کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں (مکہ میں) نہ ہوتیں جن کے بارے میں تمہیں خبر بھی نہ ہوتی کہ تم انہیں پیس ڈالو گے، اور اس کی وجہ سے بے خبری میں تم کو نقصان پہنچ جاتا (تو ہم ان کافروں سے تمہاری صلح کے بجائے جنگ کروا دیتے، لیکن ہم نے جنگ کو اس لیے روکا) تاکہ اللہ جس کو چاہے، اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ (البتہ) اگر وہ مسلمان وہاں سے ہٹ جاتے تو ہم ان (اہل مکہ) میں سے جو کافر تھے،

انہیں دردناک سزا دیتے۔ (چنانچہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں اس حمیت کو جگہ دی جو جاہلیت کی حمیت تھی تو اللہ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں پر سکینت نازل فرمائی۔ اور ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا ہے جو واقعے کے بالکل مطابق ہے۔ تم لوگ انشاء اللہ ضرور مسجد حرام میں اس طرح امن وامان کے ساتھ داخل ہوگے کہ تم (میں سے کچھ) نے اپنے سروں کو بے خوف و خطر منڈوایا ہوگا اور (کچھ نے) بال تراشے ہوں گے۔ اللہ وہ باتیں جانتا ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے ایک قریبی فتح طے کر دی ہے۔

قریش مکہ میں جو لوگ کافر تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کیا، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حدیبیہ کے دن مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے قربانی کرنے سے روکا تھا، اور ان قربانیوں کو انہوں نے قربان گاہ تک پہنچنے سے روکا تھا، اور ان جانوروں کی قربان گاہ حرم مکہ تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کفار قریش کے درمیان ایک مصلحت کے تحت جنگ نہیں ہونے دی وہ مصلحت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں بہت سے مسلمان موجود تھے، اور اب حضرت عثمان اور ان کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جنگ ہوتی تو پورے زور وشور سے ہوتی، اور اس گھمسان کی جنگ میں مکہ مکرمہ کے مسلمانوں کو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں بے خبری میں نقصان پہنچ سکتا تھا جس پر بعد میں خود مسلمانوں کو ندامت اور نقصان کا احساس ہوتا۔ (توضیح القرآن) اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کے مسلمانوں پر یہ رحمت فرمائی کہ انہیں قتل ہونے سے بچالیا، اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں پر یہ رحمت فرمائی کہ انہیں اپنے دینی بھائیوں کے قتل سے بچالیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مکہ مکرمہ میں جو مسلمان کافروں کے ہاتھوں ظلم سہہ رہے تھے، وہ وہاں سے کہیں اور چلے گئے ہوتے تو ہم ان کافروں سے مسلمانوں کی جنگ کروادیتے جس کے نتیجے میں وہ دردناک شکست سے دوچار ہوتے۔ (توضیح القرآن)

شیخ الاسلام تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ قریش اگرچہ آخر کار صلح پر راضی ہو گئے تھے، لیکن جب صلح نامہ لکھنے کا وقت آیا تو انہوں نے محض اپنے تکبر اور اپنی جاہلانہ حمیت کی وجہ سے کچھ ایسی باتوں پر اصرار کیا جو صحابہ کرام کو بہت ناگوار ہوئیں۔ مثلاً صلح نامے کے شروع میں آنحضرت ﷺ نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم لکھوایا تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا اور اس کے بجائے باسمک اللھم لکھوانے پر زور دیا۔

نیز آنحضرت ﷺ کے نام نامی کے ساتھ رسول اللہ لکھا گیا تھا، انہوں نے اسے مٹانے پر اصرار کیا۔ ان باتوں کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت غصہ تھا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو صلح منظور تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں تحمل پیدا فرما دیا، اسی تحمل کو یہاں سکینت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

تقویٰ کی بات یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی اطاعت کی جائے، چاہے وہ بات نفس کو کتنی ناگوار معلوم ہو رہی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی پر عمل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تقویٰ کا کلمہ لازم کیا، جو کہ لا الہ الا اللہ ہے، اس لیے کہ لا الہ الا اللہ ہی تو تمام تقووں کی بنیاد ہے، جڑ ہے، اور نبی کریم ﷺ اور ان کے ہمنشین اہل ایمان مشرکین کی بہ نسبت کلمہ تقویٰ کے زیادہ مستحق اور حق دار تھے، اور یہی لوگ اس کلمہ کے اہل تھے نہ کہ مشرکین، اللہ جل شانہ خوب خوب جاننے والی ذات ہے، اس سے کوئی چیز مخفی، پوشیدہ اور اوجھل نہیں ہے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا اس نے آپ ﷺ کو ہدایت اور حق کے ساتھ بھیجا۔ مفسرین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ والے سفر میں روانہ ہونے سے پہلے ہی مدینہ منورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خواب دکھا دیا گیا تھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ امن وامان سے مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور وہاں کچھ لوگ سر مونڈیں گے اور کچھ لوگ بال کتروائیں گے۔

آپ نے یہ خواب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتا دیا تھا خواب سن کر سب بہت خوش ہوئے اور اس امید پر روانہ ہو گئے کہ اس سال مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ نصیب ہو گا جب حدیبیہ میں پہنچے اور

مشرکین مکہ آڑے آگئے جس کی وجہ سے صلح کرلی گئی اور مکہ معظمہ میں داخل ہوئے بغیر واپس آگئے تو رسول اللہ ﷺ کے صلح کرنے کو حق جانتے اور مانتے ہوئے طبعی طور پر اس بات سے صحابہ کو رنج ہو رہا تھا کہ ہم مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہوسکے بلکہ صلح کے وقت ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کرلیا تھا کہ آپ نے تو یہ خبر دی تھی کہ مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے یہ تو اس کے خلاف ہے رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت اس کا جواب دے دیا تھا اس جواب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہوگئے تھے۔ (کما فی صحیح فطابت نفسہ ص ۱۰۶ ج ۲)

اطمینان عقلی کے ہوتے ہوئے طبعی طور پر جو رنج تھا اس کو دور فرمانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی جس میں یہ بتادیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو خواب دکھایا تھا تم انشاء اللہ مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہوگے وہاں کوئی بال منڈوائے گا اور کوئی بال کتروائے گا اور کسی کو کسی کا ڈر نہیں ہوگا یہ خواب اللہ تعالیٰ نے صحیح دکھایا تھا۔ واقعہ کے مطابق تھا جس کا آئندہ سال مظاہرہ ہوا اور چونکہ خواب میں اسی سال داخل ہونے کی خبر نہیں دی گئی تھی اس لیے خواب کے سچا ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑا اس میں جو لفظ انشاء اللہ فرمایا ہے یہ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ تحقیق اور تاکید کے لیے ہے۔ اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ان یہاں اذ کے معنی میں ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جب اللہ چاہے داخل ہو جاؤ گے۔

اور یہ جو فرمایا فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۲۷ (سو اللہ نے جان لیا جو تم نے نہیں جانا) اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کے داخل ہونے میں جو تاخیر کی گئی اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی جس کا تمہیں علم نہ تھا۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اسی سال عمرہ کرنے کی ضد کرتے اور مشرکین مکہ سے قتل و قتال کیا جاتا اور صلح نہ ہوتی تو دو ڈھائی مہینے بعد جو خیبر فتح ہوا اس کے لیے سفر کرنا مشکل ہو جاتا اور اگر سفر میں چلے جاتے تو یہ خطرہ رہتا کہ اہل مکہ کہیں پیچھے سے حملہ نہ کردیں پس صلح کرنے میں اور دخول مکہ کی تاخیر میں جو فائدہ پہنچا اس کا تمہیں علم نہیں تھا۔ (تفسیر انوار البیان) یہاں فتح قریب سے مراد

خیبر کی فتح ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو نصیب فرمائی تھی۔

غلبہ دین اسلام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا {۲۸} الفتح

جواب ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ ہی گواہی کے لیے کافی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ: اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا۔ ہدایت سے مراد واضح رہنمائی، علم نافع، دلائل قطعیہ اور قرآن ہے، اور دینِ حق سے مراد اسلام ہے، جو تمام باطل ادیان کے مقابلے میں سچا اور برحق دین ہے۔

لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ: یعنی اللہ نے اپنے رسول کو اس لیے بھیجا کہ وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اس غلبے کی صورتیں دو ہیں ① دلائل و حجت کے ذریعے، یعنی اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات کی مضبوطی سے دیگر ادیان باطل ثابت ہو جائیں۔ ② عملی طور پر، یعنی اسلام کو زمین پر عزت و غلبہ حاصل ہو، اور اس کے ماننے والے دیگر ادیان کے ماننے والوں پر غالب آ جائیں۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ غلبہ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت مکمل طور پر ظاہر ہو گا، جب صرف اسلام ہی باقی رہ جائے گا۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا: یعنی اللہ کی گواہی کافی ہے کہ اس نے اپنے رسول کو حق کے ساتھ بھیجا اور اس وعدے کو پورا کرے گا۔ اللہ کی شہادت سے مراد اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی نشانیوں کا ظہور ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور دینِ اسلام کی حقانیت پر دلیل ہیں۔

اصحاب محمد ﷺ

سوال آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ الفتح.

جواب ترجمہ: محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں (اور) آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔ تم انہیں دیکھو گے کہ کبھی رکوع میں ہیں، کبھی سجدے میں، (غرض) اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی علامتیں سجدے کے اثر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ہیں ان کے وہ اوصاف جو تورات میں مذکور ہیں۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہو گئی، پھر اپنے تنے پر اس طرح سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کاشتکار اس سے خوش ہوتے ہیں۔ تاکہ اللہ ان (کی اس ترقی) سے کافروں کا دل جلائے۔ یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور زبردست ثواب کا وعدہ کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ یہاں اصحاب پیغمبر ﷺ کی تعریف وستائش کر رہے ہیں جو آپ ﷺ کے دین پر قائم تھے اور ان کی نرالی شان یہ تھی کہ وہ کافروں پر بڑے سخت تھے، مگر وہ باہمی ایک دوسرے سے محبت رکھتے اور شیر وشکر تھے، ان کی عبادت کی نرالی شان یہ تھی کہ دیکھنے والا کبھی انہیں حالت رکوع میں دیکھتا اور کبھی حالت سجدہ میں دیکھتا، وہ کافروں پر سختی، باہمی اخوت ومحبت، اور رکوع اور سجدہ ریزیوں سے اپنے رب کی رحمت اور اس کے فضل کے امیدوار تھے۔

وہ ان بھلائی کے کاموں کے بدلے میں امیدوار تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا فرمائے، اللہ ان سے راضی ہو جائے، ان کی ظاہری طاعت وفرمانبرداری کی ایک نشانی نمایاں طور پر ان کے چہروں پر پیشانیوں میں دکھائی دیتی تھی، اور یہ ان کے نشانہائے سجدہ تھے، کثرت عبادت کے باعث جو نمازیوں

کو پیشانی پر کالا سا نشان پڑ جاتا ہے یہ ان لوگوں کی پیشانیوں پر صاف دکھائی دیتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا خوش نصیب گروہ تھا جن کے چرچے اور تذکرے صرف قرآن کریم ہی میں نہیں ہیں بلکہ ان کے چرچے تورات میں بھی ہیں، ان کی صفات تورات میں بھی بیان کی گئی ہیں، ان کی صفات انجیل میں بھی بیان کی گئی ہیں۔

ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال ایک کھیتی جیسی ہے، جو اپنے تنے اور ساق پر کھڑی ہو گئی ہو، پھر اس سے آگے بہت سی شاخیں نکل آئی ہوں، پھر وہ کھیتی پک گئی ہو، اور اپنے تنوں پر کھڑی حسن و جمال کا منظر پیش کر رہی ہو، اس کے حسن و جمال اور شادابی کو دیکھ کر کسان کو بڑا اچھا لگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کھیتی کے ذریعے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شکل میں تیار فرمائی کافروں کو غصہ دلانا چاہتا ہے، ان کے غیظ و غضب میں اضافہ فرمانا چاہتا ہے، اللہ اللہ کیسا نکتہ نکل آیا کہ جو صحابہ کرام سے بغض و عناد رکھے گا وہ کافر ہی ہو گا، کوئی مسلمان ان سے بغض اور عناد نہیں رکھ سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں سے جو اللہ اور رسول اللہ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور اللہ کے احکامات پر عمل کرنے والے ہیں اور اللہ نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے رک جانے والے ہیں، جنت کا وعدہ فرمایا ہے، ان کے لیے بخشش کا وعدہ فرمایا ہے، ان کو گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

انہیں اجر جزیل عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے، جو کبھی ختم نہیں ہو گا، اور وہ مقام جہاں انہیں یہ سب کچھ ملے گا اسے جنت کہا جاتا ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، جو صحابہ کرام کی پیروی اور اتباع کرے گا اسے بھی ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا، اس کے گناہ معاف فرمائے گا، اس کی بخشش فرمائے گا، اسے اجر عظیم ہی نہیں بلکہ جزیل بھی عطا فرمائے گا جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو فضیلت حاصل ہے وہ اس امت میں کسی اور کو حاصل نہیں ہے، انہیں جو کمال ملا وہ اس امت میں کسی اور کو نہیں ملا، ان کو جو رضا کا پروانہ ملا کسی اور کو نہیں ملا، ان کے لیے جو

وعدے کیے گئے کسی اور کے نصیب میں نہیں ہیں۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب پر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی استفادہ فرماتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان آیات کے زیل میں ارشادات نبوی کو بھی کسی خوبصورت نگینے کی طرح سجاتے دکھائی دیتے ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ پھر ان کا اور وصف بیان فرمایا کہ نیکیاں بکثرت کرتے ہیں خصوصاً نماز جو تمام نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہے پھر ان کی نیکیوں میں چار چاند لگانے والی چیز کا بیان یعنی ان کے خلوص اور اللہ طلبی کا کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔

یہ اپنے اعمال کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں جو جنت ہے اور اللہ کے فضل سے انہیں ملے گی اور اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی بھی انہیں عطا فرمائے گا جو بہت بڑی چیز ہے جیسے فرمایا وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ: ۷۲) اللہ تعالیٰ کی ذرا سی رضا بھی سب سے بڑی چیز ہے، اور رضائے خداوندی کامل جانا بڑی کامیابی کی بات ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ چہروں پر سجدوں کے اثر سے علامت ہونے سے مراد اچھے اخلاق ہیں مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں خشوع اور تواضع ہے، حضرت منصور رحمہ اللہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے کہتے ہیں میرا تو یہ خیال تھا کہ اس سے مراد نماز کا نشان ہے جو ماتھے پر پڑ جاتا ہے آپ نے فرمایا یہ تو ان کی پیشانیوں پر بھی ہوتا ہے جن کے دل فرعون سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نماز ان کے چہرے اچھے کر دیتی ہے بعض سلف سے منقول ہے جو رات کو بکثرت نماز پڑھے گا اس کا چہرہ دن کو خوبصورت ہو گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ابن ماجہ کی ایک مرفوع حدیث میں بھی یہی مضمون ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ نیکی کی وجہ سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے چہرے پر روشنی آتی ہے روزی میں کشادگی ہوتی ہے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ جو شخص اپنے اندرونی پوشیدہ حالات کی اصلاح

کرے اور بھلائیاں پوشیدگی سے کرے اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کی سلوٹوں پر اور اس کی زبان کے کناروں پر ان نیکیوں کو ظاہر کر دیتا ہے الغرض دل کا آئینہ چہرہ ہے جو اس میں ہوتا ہے اس کا اثر چہرہ پر ہوتا ہے پس مومن جب اپنے دل کو درست کر لیتا ہے اپنا باطن سنوار لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں سنوار دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اپنے باطن کی اصلاح کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو بھی آراستہ و پیراستہ کر دیتا ہے۔

طبرانی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص جیسی بات کو پوشیدہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اسی کی چادر اڑھا دیتا ہے اگر وہ پوشیدگی بھلی ہے تو بھلائی کی اور اگر بری ہے تو برائی کی۔

مسند احمد میں آپ کا فرمان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی ٹھوس چٹان میں گھس کر جس کا نہ کوئی دروازہ ہو نہ اس میں کوئی سوراخ ہو کوئی عمل کرے گا اللہ اسے بھی لوگوں کے سامنے رکھ دے گا برائی ہو تو یا بھلائی ہو تو۔ مسند کی اور حدیث میں ہے نیک طریقہ، اچھا خلق، میانہ روی نبوت کے پچیسویں حصہ میں سے ایک حصہ ہے۔ الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نیتیں خالص تھیں اعمال اچھے تھے پس جس کی نگاہ ان کے پاک چہروں پر پڑتی تھی اسے ان کی پاکبازی سچ جاتی تھی اور وہ ان کے چال چلن اور ان کے اخلاق اور ان کے طریقہ کار پر خوش ہوتا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

صحابی کی تعریف: صحابی اس مسلمان کو کہتے ہیں جس نے بہ حالت بیداری اپنی آنکھوں سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں یعنی دین واسلام پر اس کا خاتمہ ہوا ہو اگرچہ اس درمیان میں ارتداد بھی خلل انداز ہوا ہو جیسے اشعب یا اشعث ابن قیس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے صحابی ہونے کے لئے طول صحبت کو شرط قرار دیا ہے یعنی ان کے نزدیک " صحابی " اسی مسلمان کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں کافی عرصہ تک رہا ہو، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتساب علم کیا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شامل ہوا ہو ان حضرات نے "طول صحبت" یا کافی عرصہ " کی کم سے کم مدت چھ مہینہ بیان کی ہے لیکن اس چھ مہینہ کے تعین کی

دلیل ان کے پاس کیا ہے یہ معلوم نہیں، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس نے زیادہ سے زیادہ عرصہ آنحضرت ﷺ کی خدمت و صحبت میں گزارا اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا اس کا مرتبہ ان لوگوں کی بہ نسبت یقیناً بڑھا ہوا ہے جنہیں زیادہ عرصہ کی خدمت و صحبت کا موقع نہیں ملا، جو آپ ﷺ کے ساتھ کسی جہاد میں شریک نہیں ہوئے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو محض ایک دور کی نظر سے دیکھا آنحضرت ﷺ سے کلام و گفتگو کی سعادت سے بہت کم سرفراز ہوئے یا جنہوں نے صرف طفولیت کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا، اگرچہ مجرد شرف صحبت سب کو حاصل ہے۔ (مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مراتب و درجات: شرح السنۃ میں ابو منصور بغدادی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہمارے تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ان میں بھی ترتیب کا اعتبار ہے یعنی سب سے افضل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، ان کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے بعد سب سے افضل وہ تمام صحابہ ہیں جن کو "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد سب سے افضل وہ صحابہ ہیں جو جنگ بدر میں شریک تھے، ان کے بعد سب سے افضل وہ صحابہ ہیں جو جنگ احد میں شریک تھے، ان کے بعد بیعت رضوان میں شریک صحابہ افضل ہیں۔

ان کے بعد وہ انصار صحابہ جنہوں نے دونوں مرتبہ بیعۃ العقبۃ الاولی اور بیعۃ العقبۃ الثانیہ کے موقع پر مکہ میں آکر آنحضرت ﷺ سے بیعت کی تھی۔ اسی طرح وہ صحابہ جن کو "سابقون اولون" کہا جاتا ہے یعنی جنہوں نے قبول اسلام میں سبقت کی اور ابتداء اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اور جن کو دونوں قبلوں یعنی بیت المقدس اور کعبہ مکرمہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ملا ان صحابہ سے افضل ہیں جو ان کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ (شرح السنہ، مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح)

فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ عظیم ہستیاں ہیں جن کے فضائل و مناقب، محاسن و محامد قرآن کریم کی آیات اور فرامین نبوی ﷺ میں بیان کیے گئے ہیں، بندہ راقم الحروف کی تصانیف فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم اور شان صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی کافی مواد پیش کیا گیا ہے، یہاں مختصر افضائل صحابہ رضی اللہ عنہم تحریر کیے جاتے ہیں۔

ایک شخص نے امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت کی تو امام مالک رضی اللہ عنہ نے اس کے سامنے الفتح: ۲۹ کی پوری آیت پڑھی اور کہا: اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عزت دی ہے، جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے وہ اپنے غیظ میں جل کر راکھ ہو جائے۔ اللہ ان مؤمنوں سے راضی ہو گیا جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ (الفتح)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي، فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ (ترمذی) میرے اصحاب کو برا نہ کہو اگر تم میں سے کوئی ایک شخص احد پہاڑ جتنا سونا خیرات کر دے، پھر بھی وہ ان کے دیئے ہوئے ایک کلو یا نصف کلو کے برابر نہیں ہو گا۔

چونکہ نور نبوت نے پہلے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ آگے چل کر میری امت میں لوگ بھی پیدا ہوں گے، جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہیں گے، ان کی شان میں گستاخیاں کرے گے (جیسا کہ روافض و خوارج کی صورت میں مختلف گروہ ایک دوسرے کے ممدوح صحابہ کے حق میں سب و شتم کرتے ہیں) اس لے آپ ﷺ نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں احترام صحابہ کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے حکم دیا کہ شخص میرے کسی صحابی کو برا نہ کہے۔

مد اس زمانہ کے ایک پیمانہ کا نام تھا جس میں سیر بھر کے قریب جو وغیرہ آتا تھا، حدیث کے اس جزء کی مراد ان صحابہ کے بلند و بالا مقام و مرتبہ کا تعین کرنا ہے کہ ان لوگوں کے کمال اخلاص وللہیت کی بناء پر ان کا چھوٹا سا نیک عمل اپنے بعد والوں کے اسی طرح کے بڑے سے بڑے نیک عمل پر بھاری ہے مثلاً اگر ان صحابہ میں سے کوئی شخص سیر بھر یا آدھ سیر جو وغیرہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اس عمل

پر ان کو جتنا ثواب ملتا ہے اتنا ثواب ان کے بعد والوں کو اس صورت میں بھی نہیں مل سکتا کہ اگر وہ اللہ کے راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دیں۔

اور یہ اس وجہ ہے کہ اخلاص وصدق نیت اور جذبہ ایثار وللّٰہیت کا جو کمال ان کے اندر تھا وہ بعد والوں کو نصیب نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ ان کا مال خالص طیب وپاکیزہ ہوتا تھا اور ان کی اپنی حاجتیں وضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی تھیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کریں لیکن اس کے باوجود اپنی استطاعت کے مطابق وہ اللہ کی راہ میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتے اور اپنی تمام ضرورتوں کو پس پشت ڈال دیتے۔ (مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح)

ابو بردہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا: النُّجُومُ أَمَنَةٌ لِلسَّمَاءِ، فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُومُ أَتَى السَّمَاءَ مَا تُوعَدُ، وَأَنَا أَمَنَةٌ لِأَصْحَابِي، فَإِذَا ذَهَبْتُ أَتَى أَصْحَابِي مَا يُوعَدُونَ، وَأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِأُمَّتِي، فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتَى أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ (مسلم) ستارے آسمان کے لئے امن وسلامتی کا باعث ہیں جس وقت یہ ستارے جاتے رہیں گے تو آسمان کے لئے وہ چیز آجائے گی جو موعود ومقدر ہے، میں اپنے صحابہ کے لئے امن وسلامتی کا باعث ہوں، جب میں (اس دنیا سے) چلا جاؤں گا تو میرے صحابہ میری امت کے لئے امن وسلامتی کا باعث ہیں جب میرے صحابہ (اس دنیا سے) رخصت ہو جائیں گے تو میری امت پر وہ چیز آپڑے گی جو موعود ومقدر ہے۔ (صحیح مسلم)

آسمان کے لئے جو چیز موعود ومقدر ہے "سے مراد قیامت کے دن آسمانوں کا پھٹ جانا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑنا ہے، اس کی خبر قرآن کریم نے دی ہے۔ صحابہ کے لئے موعود ومقدر چیز "سے مراد فتنہ وفساد، اختلاف ونزاعات باہمی جنگ وجدل اور بعض اعرابی قبائل کا مرتد ہو جانا۔

اسی طرح "امت کے لئے موعود ومقدر چیز "سے مراد بداعتقادی وبدعملی کے فتنوں کا امنڈ پڑنا، بدعات کا زور ہو جانا، مسلمانوں پر دینی وملی سانحات وحادثات کا واقع ہونا، اہل خیر وبرکت کا اس دنیا

سے اٹھ جانا، اہل شر کا باقی رہنا اور ان (اہل شر) پر قیامت قائم ہونا، پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہل خیر کا وجود شر کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب اہل خیر اٹھ جاتے ہیں تو شر کو در آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ (مظاہر حق شرح مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَصْحَابِي، لاَ تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا بَعْدِي، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ، وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ (ترمذی) میرے اصحاب کے متعلق اللہ سے ڈرو، میرے اصحاب کے متعلق اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد طنز کا نشانہ نہ بناؤ، جس نے ان سے محبت رکھی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی، اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو اذیت دی اس نے بیشک مجھ کو اذیت دی اور جس نے مجھ کو اذیت دی اس نے بیشک اللہ کو اذیت دی اور جس نے اللہ کو اذیت دی، عنقریب اللہ اس کو پکڑ لے گا۔

اللہ سے ڈرو" یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید و مبالغہ کے لئے دو بار ارشاد فرمائے صحابہ کے حق میں اللہ سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی عزت و توقیر کی جائے۔ ان کی عظمت و فضیلت کو ہر حالت میں ملحوظ رکھا جائے اور صحبت رسول کا جو بلند ترین مقام ان کو حاصل ہے اس کا حق ادا کیا جائے۔

"نشانہ ملامت نہ بناؤ" کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف بد گوئی کے تیر مت پھینکو، ان کی عظمت کے منافی کوئی بات زبان سے نہ نکالو، ان کی عیب جوئی اور نکتہ چینی سے پرہیز کرو۔"

میری وجہ سے ان کو دوست رکھتا ہے" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ان کو دوست رکھنے والا اس سبب سے دوست رکھتا ہے کہ میں ان کو دوست رکھتا ہوں، یا یہ مطلب ہے کہ ان کو دوست رکھنے والا اس سبب سے دوست رکھتا ہے۔ کہ میں ان کو دوست رکھتا ہوں بہر حال اس ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ میرے صحابہ کو دوست رکھنے والا مجھ کو دوست رکھنے والا ہے اور میرے صحابہ کو دشمن رکھنے والا مجھ کو دشمن رکھنے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مالکیہ کا یہ مسلک حق ہے کہ جس شخص نے صحابہ کو برا

کہاوہ دنیامیں واجب القتل قرار پاتا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی ذات سے محبت کے صحیح وصادق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ محبت محبوب کی ذات سے گزر کر اس کے متعلقین تک پہنچ جائے، پس حق تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے رسول سے بھی محبت ہو اور رسول سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے آل واصحاب سے بھی محبت ہو۔

جب اللہ اس کو پکڑے گا کا یہ مطلب ہے کہ جو شخص اپنے اس جذبہ و عمل کے ذریعہ یہ ظاہر کرے گا کہ گویا وہ اللہ کو اذیت پہنچانے کے درپے ہے تو وہ شخص اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا یعنی آخرت میں تو وہ عذاب خداوندی میں گرفتار ہو گا ہی۔(مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَسُبُّونَ أَصْحَابِي فَقُولُوا: لَعْنَةُ اللهِ عَلَى شَرِّكُمْ (ترمذی) جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے اصحاب کو برا کہتے ہیں تو کہو کہ اللہ تمہارے شر پر لعنت کرے۔

شرح مسلم میں لکھا ہے جاننا چاہئے کہ صحابہ کرام کو برا کہنا جرم ہے اور اکبر فواحش (سخت بڑے گناہوں) میں سے ہے ہمارا اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جو کوئی صحابہ کو برا کہے اس کو سزا دی جائے اور بعض مالکیہ نے کہا ہے کہ اس کو قتل کیا جائے، اسی طرح کی بات طیبی نے بھی لکھی ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ میں سے کسی کو بھی برا کہنا گناہ کبیرہ ہے اور ہمارے بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص شیخین (یعنی ابو بکر و عمر) کو برا کہے وہ مستوجب قتل ہے۔

مشہور کتاب الاشباہ والنظائر کی کتاب السیر میں لکھا ہے جو بھی کافر اپنے کفر سے توبہ کرلے اس کے لئے دنیا وآخرت کے لئے معافی ہے۔ لیکن جو لوگ اس بناء پر کافر قرار پائے ہوں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو برا کہا تھا، یا شیخین کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو برا کہا تھا یا سحر کاری کے مرتکب ہوئے تھے اور یا زندقہ میں مبتلا تھے اور پھر توبہ کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرلیا گیا ہو تو اب اگر وہ توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہیں ہو گی اور ان کو معافی نہیں ملے گی اسی طرح صاحب اشباہ علامہ ابن نجیم نے یہ

بھی کہا ہے کہ، شیخین کو برا کہنا یا ان کو لعنت کرنا کفر ہے۔ (الاشباہ والنظائر)

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والے کی برائی (لعنت) خود اسی کی طرف لوٹ جاتی ہے کیونکہ فتنہ و شر والا تو وہی ہوتا ہے۔ جب کہ صحابہ اہل خیر میں سے ہیں اور اس اعتبار سے وہ صرف رضا اور رحمت کے سزاوار ہیں نیز حدیث میں مذکور حکم اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس شخص (جو صحابہ کو برا کہے) کی ذات پر لعنت کرنے کے بجائے اس کے فعل پر لعنت کرنا احتیاط کے قرین ہے۔

عبد اللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ أَصْحَابِي يَمُوتُ بِأَرْضٍ إِلَّا بُعِثَ قَائِدًا وَنُورًا لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ میرے اصحاب میں سے جو شخص کسی علاقہ میں فوت ہو جائے تو قیامت کے دن وہ شخص اس علاقہ والوں کے لئے قائد اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔ (سنن ترمذی)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا مَثَلُ أَصْحَابِي فِي أُمَّتِي كَالْمِلْحِ فِي الطَّعَامِ لَا يَصْلُحُ الطَّعَامُ إِلَّا بِالْمِلْحِ» قَالَ الْحَسَنُ: فَقَدْ ذَهَبَ مِلْحُنَا فَكَيْفَ نصلح؟ (مشکوٰۃ) میری امت کے درمیان میرے صحابہ کی مثال کھانے میں نمک کی سی ہے کھانا اس وقت تک اچھا یعنی خوش ذائقہ نہیں ہوتا جب تک اس میں نمک نہ ہو"

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے (اس حدیث کو سن کر) فرمایا ہمارا نمک جاتا رہا پھر ہم اچھے کیسے ہوں، انہوں نے اس حدیث کو سن کر اپنا جو تاثر بیان کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ امت کے درمیان صحابہ کا وجود چونکہ امت کے بناؤ اور سنوار کا ضامن تھا اس لئے اب جب کہ صحابہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہم اچھے اور سنورے ہوئے ہیں۔ حضرت حسن بصری کے اس تاثر میں زبردست حسرت ہے اور انہوں نے اس حسرت کا اظہار اس حقیقت کے باوجود کیا کہ ان کے زمانہ میں کچھ صحابہ موجود تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں

فرماتے ہوئے سنا ہے سَأَلْتُ رَبِّي عَنِ اخْتِلَافِ أَصْحَابِي مِنْ بَعْدِي فَأَوْحَى إِلَيَّ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّ أَصْحَابَكَ عِنْدِي بِمَنْزِلَةِ النُّجُومِ فِي السَّمَاءِ بَعْضُهَا أَقْوَى مِنْ بَعْضٍ وَلِكُلٍّ نُورٌ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنِ اخْتِلَافِهِمْ فَهُوَ عِنْدِي عَلَى هُدًى قَالَ: وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ (مشکوٰۃ المصابیح)

میں نے اپنے پروردگار سے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف کے بارے میں پوچھا جو (شریعت کے فروعی مسائل میں) میرے بعد واقع ہو گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ مجھ کو آگاہ کیا کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت یہ ہے کہ تمہارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان پر ستارے، (جس طرح) ان ستاروں میں سے اگرچہ بعض زیادہ قوی یعنی زیادہ روشن ہیں لیکن نور (روشنی) ان میں سے ہر ایک میں ہے (اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے مرتبہ اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق نور ہدایت رکھتا ہے) پس جس شخص نے (علمی و فقہی مسائل میں) ان اختلاف میں سے جس چیز کو بھی اختیار کر لیا میرے نزدیک وہ ہدایت پر ہے حضرت عمر کہتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں (پس تم ان کی پیروی کرو) ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ (رزین)

ایسے ہیں جیسے آسمان کے ستارے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھپ اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے مسافروں کو دریا و جنگل کے راستوں کا نشان بتاتے ہیں، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سچائی کے راستے کو ظاہر کرنے اور برائی کے اندھیروں کو دور کرنے والے ہیں کہ ان کے نورانی وجود، ان کے اخلاق و کردار اور ان کی روایات و تعلیمات کی روشنی میں راہ حق نمودار ہوتی ہے اور بدی کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔

"میرے نزدیک وہ ہدایت پر ہے" اس سے ثابت ہوا کہ ائمہ دین کا باہمی اختلاف امت کے لئے رحمت ہے، لیکن جیسا کہ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے اختلاف سے مراد وہ اختلاف ہے جو دین کے فروعی و ذیلی مسائل میں ہو نہ کہ اصول دین میں۔

اور سید جمال الدین رحمہ اللہ نے لکھا ہے: بظاہر یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جس اختلاف کی طرف اشارہ ہے، اس سے وہ اختلاف مراد ہے۔ جو دینی معاملات و مسائل میں رونما ہو نہ کہ وہ اختلافات جو دنیوی معاملات میں رونما ہوئے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اس اختلاف پر کوئی اشکال وارد نہیں ہو گا، جو خلافت وامارت کے سلسلہ میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان رونما ہوئے۔

لیکن اس موقع پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ خلافت وامارت سے متعلق رونما ہونے والے اختلافات بھی "فروع دین میں اختلاف" کے زمرہ میں آتے ہیں کیونکہ اس بارے میں ان کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا وہ اجتہادی تھا نہ کہ کسی دنیاوی غرض اور نفسانی جذبہ وخواہش کے تحت، جیسا دنیاوی بادشاہوں کے ہاں ہوتا ہے۔۔

جس کی پیروی کروگے ہدایت پاجاؤ گے "چونکہ وکل نور (نور ان میں سے ہر ایک میں ہے) کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ہر صحابی اپنے اپنے مرتبہ واستعداد کے مطابق علم فقہ کا نور ہدایت ضرور رکھتا ہے اور اس اعتبار سے کوئی بھی صحابی دین وشریعت کے علم سے خالی نہیں ہے، اس لئے جو بھی صحابی اپنے مرتبہ واستعداد کے مطابق دین وشریعت کی جو بھی بات بیان کرتا ہے، اس کی پیروی ہدایت کی ضامن ہوگی۔ (مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح)

بعض جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب نام لے لے کر بیان فرمائے گئے ہیں، جیسے حضرات عشرہ مبشرہ ہیں، حضرات خلفائے راشدین ہیں۔

ہمیں مسلمان ہونے کے ناطے چاہیے کہ ہم تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عزت، شرعی عظمت، ان کے مقام رفیع ومرتبہ شامخہ کا ہمہ وقت خیال رکھیں، کسی آن اور لمحے ان کے بارے میں ایسے کلمات کی ادائیگی سے اپنی زبانوں کو محفوظ رکھیں جو ان کے شایان شان نہیں ہیں، بندہ عاجز (حدوٹی) نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب پر ایک کتاب "فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم" دوسری کتاب "شان صحابہ رضی اللہ عنہم" تیسری کتاب "شاتم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم" تحریر کی ہے، ان تینوں کتابوں

میں عاجز نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب قرآن کریم، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر اُمت کے ارشادات کی روشنی میں بیان کیے ہیں، علاوہ ازیں تفسیر ''معارف الفرقان'' کا مطالعہ کرنے والے ارباب ذوق کے لیے ہم نے جن آیات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ان کی بھی عمدہ تفسیر پیش کی ہے۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج سورۃ الفتح کی تفسیر مکمل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اعزہ اقربا اور رشتہ داروں کے لیے، میرے شاگردوں اور ساتھیوں کے لیے، میرے معاونین اور مساعدین کے لیے اور میری اہل واولاد کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور اسے ہم سب کے لیے باعث نجات بنائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور)

۱۳ مئی ۲۰۱۸ء بمطابق ۲۶ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ بروز اتوار، رات پونے تین بجے

نظر ثانی: اضافات وترمیمات: ۲۱ جنوری ۲۰۲۶ء بروز بدھ پونے گیارہ بجے دن

☼☼

سورۃ الحجرات (تعارف)

سوال سورۃ الحجرات کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الحجرات قرآن مجید کی ۴۹ ویں سورت ہے، یہ مدنی سورت ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۱۸ ہے۔ اس سورت کو "الحجرات" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے "کمرے" یا "حجرے"۔ اس سورت میں مسلمانوں کو معاشرتی آداب، اخلاق، بھائی چارہ، اور نبی اکرم ﷺ کے ادب و احترام کے اہم اصول سکھائے گئے ہیں۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام الحجرات اس کی چوتھی آیت سے لیا گیا ہے، إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ یہاں الحجرات سے مراد نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کے حجرے (کمرے) ہیں۔ چونکہ اس سورت میں ان حجروں کا ذکر آیا ہے، اس لیے اسے سورۃ الحجرات کہا جاتا ہے۔ حجرات جمع ہے حجرہ کی، جس کا مطلب ہے گھر یا کمرہ۔

شان نزول: سورۃ الحجرات کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ اعراب (دیہاتی لوگ) نبی اکرم ﷺ کے گھروں کے باہر آکر بلند آواز سے آپ کو پکارتے تھے، جس میں ادب و احترام کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویے کی اصلاح کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں اور مسلمانوں کو سکھایا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس طرح ادب و احترام سے پیش آنا چاہیے۔

اہم مضامین ①: نبی اکرم ﷺ کے ادب و احترام کے آداب: اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنی رائے یا آواز بلند نہ کرنا۔ نبی ﷺ کو ان کے گھروں کے باہر سے نہ پکارنا۔ ② مسلمانوں کے باہمی تعلقات: مسلمانوں کے درمیان صلح کروانا۔ آپس میں بھائی چارہ اور اخوت کو فروغ دینا۔ کسی کا مذاق نہ اُڑانا، نہ طعنہ دینا، نہ برے القاب سے پکارنا۔ ③ بدگمانی، تجسس اور غیبت سے اجتناب: مسلمانوں کو بدگمانی، تجسس اور غیبت سے منع کیا گیا ہے۔ ④ ایمان اور اسلام میں فرق: صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں، بلکہ دل سے ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے۔ ⑤ اللہ تعالیٰ کی علمیت

رسول ﷺ کا ادب

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا کیا معنٰی ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ {۱} الحجرات

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سب کچھ سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔

شان نزول: ان آیات کے شان نزول کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار بنو تمیم کے لوگ حضرت نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، آپ ﷺ کے ہاں یہ بات زیر غور تھی کہ قبیلہ بنو تمیم کا حاکم کسے بنایا جائے؟ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت قعقاع بن معبد کے بارے میں فرمایا کہ انہیں بنایا جائے، اور حضرت عمر نے حضرت اقرع بن حابس کے بارے میں فرمایا کہ انہیں قبیلہ بنو تمیم کا حاکم بنایا جائے، اس معاملے میں شیخین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کی مجلس میں گفتگو شروع ہو گئی، ان دونوں بڑوں کی گفتگو اس قدر بڑھی کہ آواز تھوڑی سی معمول سے بلند سنائی دی جانے لگی، تو ان کی بلند آہنگی کے باعث یہ آیات نازل ہوئیں۔ (بخاری شریف)

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ سورت کی یہ ابتدائی پانچ آیتیں ایک خاص موقع پر نازل ہوئی تھیں، حضور اقدس ﷺ کے پاس عرب کے قبائل کے بہت سے وفد آتے رہتے تھے، اور آنحضرت ﷺ ان میں سے کسی کو آئندہ کے لئے قبیلے کا امیر مقرر فرما دیتے تھے، ایک مرتبہ قبیلہ تمیم کا ایک وفد آپ کی خدمت میں آیا، ابھی آپ نے ان میں سے کسی کو امیر نہیں بنایا تھا، اور نہ اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی، لیکن آپ کی موجودگی میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے یہ مشورہ شروع کر دیا کہ ان میں سے کس کو امیر بنایا جائے؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک نام لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرا، پھر ان دونوں بزرگوں نے اپنی

اپنی رائے کی تائید اس طرح شروع کر دی کہ کچھ بحث کا سا انداز پیدا ہو گیا، اور اس میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، اس پر پہلی تین آیتیں نازل ہوئیں۔

پہلی آیت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ آنحضرت ﷺ کو کرنا ہو اور آپ نے ان کے بارے میں کوئی مشورہ بھی طلب نہ فرمایا ہو ان معاملات میں آپ سے پہلے ہی کوئی رائے قائم کر لینا اور اس پر اصرار یا بحث کرنا آپ کے ادب کے خلاف ہے۔ اگرچہ یہ پہلی آیت اس خاص واقعے میں نازل ہوئی تھی لیکن الفاظ عام استعمال فرمائے گئے ہیں تاکہ یہ اصولی ہدایت دی جائے کہ کسی بھی معاملے میں آنحضرت ﷺ سے آگے بڑھنا مسلمانوں کے لئے درست نہیں ہے، اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کے ساتھ چلنا ہو تو آپ سے آگے نہ بڑھنا چاہیے۔

نیز آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حدود مقرر فرمائے ہیں ان سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، اس کے بعد دوسری اور تیسری آیتوں میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ کی مجلس میں بیٹھ کر اپنی آواز آپ کی آواز سے بلند نہیں کرنی چاہیے، اور آپ سے کوئی بات کہنی ہو تو وہ بھی بلند آواز سے نہیں کہنی چاہیے بلکہ آپ کی مجلس میں آواز پست رکھنے کا اہتمام ضروری ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ اور رسول ﷺ (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو (یعنی جب تک قرائن قویہ سے یا بالتصریح گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو جیسا کہ واقعہ مذکورہ جو سبب نزول ان آیات کا ہوا اس میں انتظار کرنا چاہئے تھا کہ یا تو آپ خود کچھ فرماتے یا آپ حاضرین مجلس سے پوچھتے بدون انتظار کے از خود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا کیونکہ گفتگو کا جواز اذن شرعی پر موقوف تھا خواہ یہ اذن قطعی ہو یعنی صریح طور پر یا ظنی قرائن قویہ کے ذریعہ غلطی یہ ہوئی انتظار نہیں کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی) اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو) سننے والا (اور تمہارے افعال کو) جاننے والا ہے۔ (تفسیر بیان القرآن)

حضرت امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے شان نزول میں چھ اقوال ذکر فرمائے ہیں ① ابن

جریج رحمہ اللہ کی حدیث سے واحدی نے اسے ذکر کیا ہے: کہا: حضرت ابن ملیکہ نے حضرت عبد اللہ بن زبیر سے روایت نقل کی ہے

① کہ بنو تمیم کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: قعقاع بن معبد کو امیر مقرر کیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اقرع بن حابس کو امیر مقرر کیجئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے محض میری مخالفت کی وجہ سے یہ بات کی ہے۔ حضرت عمر نے جواب دیا: میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا۔ دونوں نے گفتگو لمبی کی یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اس بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (بخاری عن حسن بن عمر)

② روایت بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ طیبہ پر نائب بنائیں جب آپ خیبر کی طرف تشریف لے گئے حضرت عمر نے ایک اور آدمی کے بارے میں مشورہ دیا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اسے بھی مہدوی نے ذکر کیا ہے۔

③ ماوردی رحمہ اللہ نے ضحاک رحمہ اللہ سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوبیس صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنی عامر کی طرف بھیجا بنی عامر نے انہیں قتل کر دیا مگر تین آدمی پیچھے رہ گئے وہ سلامت رہے اور مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے وہ بنو سلیم کے دو آدمیوں سے ملے انہوں نے ان دو افراد سے ان کے نسب کے بارے میں پوچھا: دونوں نے کہا: بنی عامر سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ بنی عامر بنو سالم سے زیادہ معزز شمار ہوتے تھے۔ ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ بنی سلیم کے کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے عرض کی: ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہے اور ہم میں سے دو آدمی قتل کر دیئے گئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دیت سو اونٹ عطا فرمائی، ان دو آدمیوں کے قتل کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

④ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: کچھ لوگ کہا کرتے تھے کاش: میرے بارے میں ایسی آیت نازل ہوتی، کاش میرے بارے میں ایسی آیت نازل ہوتی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

⑤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہیں منع کیا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کلام کریں۔

مجاہد نے کہا: تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے پہلے ہی حکم نہ دے دیا کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان پر حکم دے، اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔

⑥ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے نماز ادا کرنے سے قبل ہی قربانیاں کر دی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ دوبارہ ذبح کریں۔ ابن جریج نے کہا: وہ وقت جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اس سے قبل تم اطاعات کے اعمال نہ کرو۔ (تفسیر قرطبی)

امام قرطبی رحمہ اللہ یہاں فرماتے ہیں کہ یہ آخری پانچ اقوال قاضی ابو بکر بن عربی نے ذکر کیے ہیں یہ سب صحیح ہیں عموم کے تحت داخل ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے جو ان آیات کے نزول کا سبب ہے ممکن ہے بغیر سبب کے نازل ہوئیں ہوں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ قاضی ابو بکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ہم یہ کہیں کہ یہ طاعات کو ان کے اوقات سے پہلے لانے میں نازل ہوئی تو وہ بھی صحیح ہے کیونکہ ہر وہ عبادت جس کا ایک خاص وقت ہو تو وقت سے پہلے اسے ادا کرنا جائز نہیں ہوتا جس طرح نماز، روزہ، حج یہ سب واضح ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

مگر علماء نے زکوۃ پر اختلاف کیا ہے جو عبادت مالیہ ہے۔ اور معنیٰ مفہوم کے لئے مطلوب ہے وہ فقیر کی حاجت کو پورا کرتا ہے: کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عباس سے دو سال کا صدقہ جلدی لیا جب ایسی روایات آئی ہیں کہ صدقہ فطر کو عید الفطر سے پہلے جمع کیا جاتا تاکہ عید الفطر کے روز مستحق لوگوں کو وہ چیز دے دی جائے تو یہ امر سال یا دو سال پہلے زکوۃ کی ادائیگی کے جواز کو ثابت کرتا ہے اگر سال کا اختتام نہ ہوا اور نصاب اپنی حالت پر تھا تو زکوۃ کی ادائیگی ہو گئی اگر سال کا اختتام ہوا جبکہ نصاب تبدیل ہو چکا تھا تو واضح ہو گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ ہے۔ (تفسیر قرطبی)

لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یعنی مجلس میں کوئی کچھ پوچھے تو حضرت کی راہ دیکھو کہ کیا فرمادیں تم اپنی عقل سے آگے جواب نہ دے بیٹھو۔ خلاصہ: یہ کہ بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ کسی کی بات میں دخل دے کر خود جواب دینے لگتے ہیں پیغمبر

علیہ السلام کی مجلس میں بھی کسی نے ایسا کیا ہو گا کہ حضور ﷺ سے سوال کرنے والے کا جواب حضور ﷺ سے پہلے خود جواب دینا شروع کر دیا ہو گا یہ بہت بڑے عیب کی بات ہے اور بالخصوص پیغمبر ﷺ کی مجلس میں یہ بڑی بے ادبی ہے اس لئے مسلمانوں کو اس قسم کی سبقت اور پیش قدمی اور آگے بڑھنے سے منع فرمایا۔ (موضح القرآن)

لَا تُقَدِّمُوْا: بعض اہل علم نے کہا: لَاتُقَدِّمُوْا فعل متعدی ہے اور مفعول محذوف ہے۔ مفعول اگر ذکر کیا جاتا تو محدود ہو جاتا اور مقصود تھا عموم، مفعول یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے پیش دستی نہ کرو۔ نہ قول میں، نہ فعل میں یا مفعول بالکل متروک ہے اور فعل متعدی کو بجائے لازم کے ذکر کیا یعنی تمہاری جانب سے پیش قدمی نہ ہو۔ (مظہری)

بَيْنَ يَدَيْ: (دونوں ہاتھوں کے درمیان) بطور استعارہ اس مسافت کو کہتے ہیں جو دو متقابل جہتوں یعنی دائیں بائیں جہتوں کے درمیان قریب ہی ہو۔ آیت میں تقدم زمانی کو تقدّم مکانی سے تشبیہ دی گئی ہے (اور تقدّم مکانی کا لفظ بول کر تقدّم زمانی مراد لیا ہے) یعنی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان سے پہلے اپنا فیصلہ نہ کرو، نہ قولی نہ فعلی۔ ضحاک نے کہا: یعنی جہاد اور قوانین دین کے معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے پہلے فیصلہ نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ عرب کہتے ہیں جلست بین یدی فلان، جبکہ تم یمین و شمال کو چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھو۔ دونوں جہتوں کو یدین سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ وہ دونوں ہاتھوں کی سمتوں میں پائی جاتی ہیں، ان اطراف سے قرب کے باوجود توسعًا ایسا کیا گیا ہے، جیسا کہ کسی چیز کو مجاورت کی وجہ سے کسی اور نام سے پکار لیتے ہیں۔ اس عبارت میں مجاز کی قسم تمثیل پائی جاتی ہے اور اس میں ایک عظیم الشان فائدہ ہے، یہ اس شناعت اور برائی کی تصویر ہے جو اس صورت میں پائی جاتی ہے، جبکہ وہ کتاب و سنت کی امثلہ کی اتباع کی بجائے امور منہیہ میں سے کسی امر کا ارتکاب کرے۔ (مدارک التنزیل)

اس کا مطلب ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرو نہ اپنی سمجھ اور رائے کو ترجیح دو، بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو، اپنی طرف سے دین میں اضافہ یا بدعات کی ایجاد، اللہ

اور رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی ناپاک جسارت ہے جو کسی بھی صاحب ایمان کے لائق نہیں۔ اسی طرح کوئی فتوٰی قرآن وحدیث میں غور وفکر کے بغیر نہ دیا جائے۔ مومن کی شان تو اللہ ورسول ﷺ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ (تفسیر مکہ)

ہمارے ہاں بہت سی ایسی باتیں ضروری خیال کی جارہی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں نبی کریم ﷺ نے کیں اور نہ ہی آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیں، بلکہ قرون اولیٰ کے اکابرین میں سے بھی کسی نے نہیں کیں، آج دین میں انہیں ضروری سمجھا جارہا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے قابل گردن زدنی سمجھا جارہا ہے، جب کہ قرآن کی نص سے پتا چلتا ہے کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے ہٹ کر اپنے طور پر دین کی تعبیر وتشریح نہ کریں، اس لیے کہ دنیا میں جتنے بھی فتنے ابھرتے ہیں وہ اپنی طرف سے من مانی تعبیریں اور شرحیں کرنے کی وجہ سے ابھرتے ہیں۔

مجلس نبوی ﷺ کے آداب

سوال حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت عالیہ میں تشریف رکھتے وقت آواز کو پست رکھنے کا جو حکم دیا گیا ہے ان آیات کریمہ کی روشنی میں وضاحت کی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ{۲}اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ{۳}اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ {۴}وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۵} الحجرات.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ ان سے بات کرتے ہوئے اس طرح زور سے بولا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں، اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔ یقین جانو جو لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس

اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے خوب جانچ کر تقویٰ کے لیے منتخب کرلیا ہے، ان کو مغفرت بھی حاصل ہے اور زبردست اجر بھی۔ (اے پیغمبر) جو لوگ تمہیں حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر کو عقل نہیں ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس وقت تک صبر کرتے جب تک تم خود باہر نکل کر ان کے پاس آجاتے، تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ دوسرا ادب مجلس نبوی کا بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا کیا کرتے ہیں ایک قسم کی بے ادبی گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول سے صحابہ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (در منشور عن البیہقی) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کذا فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سن کر وہ بہت ڈرے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا۔ (بیان القرآن از در منشور)

روضہ اقدس کے سامنے بھی بہت بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ممنوع ہے: قاضی ابو بکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور ادب آپ کی وفات کے بعد بھی ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپ کی قبر شریف کے سامنے ہی زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے، اسی طرح جس مجلس میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث پڑھیں یا بیان کی جا رہی ہوں اس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے کیونکہ آپ کا کلام جس وقت آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اس وقت سب کے لئے خاموش ہو کر اس کا سننا واجب و ضروری ہے اسی طرح بعد وفات جس مجلس میں آپ کا کلام سنایا جاتا ہو وہاں شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔

مسئلہ: جس طرح تقدم علی النبی ﷺ کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء علیہم السلام ہونے کے

داخل ہیں اسی طرح رفع صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے ان کی آواز دب جائے۔ (قرطبی)

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ : معنٰی آیت کے یہ ہوئے کہ اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو بسبب اس خطرہ اور خوف کے کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ حبط اعمال یعنی اعمال صالحہ کو ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہل سنت والجماعت صرف کفر ہے۔ کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمال صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مومنین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے اور لفظ یاایھا الذین امنوا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر نہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبط اعمال کیسے ہوا؟

دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے مومن نہیں ہوتا اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہو سکتا اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ، یعنی تمہیں خبر بھی نہ ہو تو حبط اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی۔ (معارف القرآن)

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدی حضرت حکیم الامت (حضرت تھانوی رحمہ اللہ) نے بیان القرآن میں اس کی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ سب اشکالات وسوالات ختم ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسول سے پیش قدمی یا ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول کا اگرچہ صحابہ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذا کا سبب بنے۔ (معارف القرآن) لیکن بعض اعمال وافعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا نہ ہوں پھر

بھی ان سے ایذا کا احتمال ہے اسی لئے ان کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے۔

اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبط اعمال کا، کسی اپنے دینی مقتداء استاد یا مرشد کی ایذا رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھہریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہو جائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچادے جس سے تمام اعمال صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصداً ایذا کا نہ کہا تھا اس لئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہو گی کہ اس ابتلاء کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہو اس کے ساتھ گستاخی و بے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاع ایمان کو بھی ضائع کر دیتی ہے نعوذ باللہ منہ۔ (تفسیر معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ : اس آیت میں نبی کریم ﷺ کا ایک تیسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوارپن کے ساتھ کہ نام لے کر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے عقل والوں کے لیے یہ کام نہیں۔ حجرات، حجرہ کی جمع ہے اصل لغت میں حجرہ ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقف عمارت ہو۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات مدینہ طیبہ میں نو تھیں ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک حجرہ الگ الگ تھا جن میں آپ باری باری تشریف فرما ہوتے تھے۔ (تفسیر معارف القرآن)

حجرات اُمہات المومنین : ابن سعد رحمہ اللہ نے بروایت عطا خراسانی رحمہ اللہ لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں سے بنے ہوئے تھے اور ان کے دروازوں پر موٹے سیاہ اون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے میرا گمان یہ ہے کہ حجرہ کے دروازہ سے مسقف بیت تک چھ سات ہاتھ ہو گا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اونچائی سات آٹھ ہاتھ ہو گی۔ یہ حجرات امہات المومنین ولید بن عبد الملک کی حکومت میں ان کے حکم سے مسجد نبوی میں شامل کر دیئے گئے۔ مدینہ میں اس روز لوگوں پر گریہ وبکا طاری تھی۔ (معارف القرآن)

شان نزول: امام بغوی رحمہ اللہ نے بروایت قتادہ ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ یہ دوپہر کے وقت مدینہ میں پہنچے جبکہ آپ کسی حجرہ میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ لوگ اعراب آداب معاشرت سے ناواقف تھے، انہوں نے حجرات کے باہر ہی سے پکارنا شروع کر دیا، اُخْرُجْ اِلَيْنَا يَا مُحَمَّدُ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس طرح پکارنے کی ممانعت اور انتظار کرنے کا حکم دیا گیا۔ (مظہری)

صحابہ و تابعین نے اپنے علماء و مشائخ کے ساتھ بھی اسی ادب کا استعمال کیا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ جب میں کسی عالم صحابی سے کوئی حدیث دریافت کرنا چاہتا تھا تو ان کے مکان پر پہنچ کر ان کو آواز یا دروازہ پر دستک دینے سے پرہیز کرتا اور دروازہ کے باہر بیٹھ جاتا تھا کہ جب وہ خود ہی باہر تشریف لاویں گے اس وقت ان سے دریافت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر فرماتے کہ اے رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی، آپ نے دروازہ پر دستک دے کر کیوں نہ اطلاع کر دی تو ابن عباس نے فرمایا کہ عالم اپنی قوم میں مثل نبی کے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کی شان میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ان کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔

حضرت ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی عالم کے دروازہ پر جا کر دستک نہیں دی بلکہ اس کا انتظار کیا کہ وہ خود ہی جب باہر تشریف لاویں گے اس وقت ملاقات کروں گا (روح المعانی)

فاسق کی خبر: تحقیق لازم

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا

فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ {۶} الحجرات

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح جانچ لو کہ کہیں تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہو۔

خلاصہ تفسیر: یہ آیت مؤمنین کو مخاطب کرتی ہے اور ان سے کہتی ہے کہ جب کسی فسق اور نافرمانی کرنے والے شخص سے کوئی خبر پہنچے تو فوراً اس پر یقین نہ کریں، خاص طور پر اگر خبر میں کسی کو نقصان یا تکلیف پہنچانے کا امکان ہو، تو پہلے تحقیق اور تصدیق کریں کہ خبر درست ہے یا نہیں، لفظ فاسق سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اور نَبَأٌ سے مراد اہم اور سنگین خبر ہے۔ فَتَبَيَّنُوا کا مطلب ہے کہ خبر کی سچائی کی جانچ کریں اور بغیر تحقیق کوئی فیصلہ یا ردعمل نہ کریں۔

شان نزول: یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ کی وصولی کے لیے بنو مصطلق کی طرف بھیجا تھا، دور جاہلیت میں اس کے اور ان لوگوں کے درمیان عداوت تھی، جب ان لوگوں نے اس کے آنے کی خبر سنی تو ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اس خبر کی بڑی تعظیم کی، شیطان نے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ وہ خوف زدہ ہو کر راستے سے ہی رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس لوٹ گیا اور آپ ﷺ سے کہا کہ بنو مصطلق نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے قتل کرنا چاہا، اس پر رسول اللہ ﷺ سخت غصے ہوئے اور ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا، لوگوں کو ولید کے واپس لوٹنے کی اطلاع ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے انہوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے بھیجے ہوئے ایلچی کی اطلاع ملی تو ہم اس کے استقبال کرنے اور ان کی تعظیم کرنے نکلے اور اللہ کا جو ہم پر حق بنتا ہے اسے ادا کرنے کے لیے نکلے، لیکن اس کو واپس لوٹنا مناسب معلوم ہوا۔

ہمیں اندیشہ ہوا کہ شاید ان کا راستے سے واپس لوٹنا آپ کے کسی خط کی بنا پر ہو جس میں آپ ﷺ نے ہم پر غصے اور ناراضگی کا اظہار فرمایا ہو ہم اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے پناہ

مانگتے ہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ اگر یہ آیت نہ نازل ہوتی تو رسول ﷺ فوراً لشکر بھیج دیتے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے تحقیق کی ہدایت دی تاکہ عجولانہ فیصلہ نہ ہو۔

حکمت: یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ بغیر تحقیق کسی خبر پر یقین کرنے سے ناانصافی اور نقصان ہو سکتا ہے، بعد میں حقیقت سامنے آنے پر انسان پچھتا سکتا ہے، اس لیے مؤمن کو چاہیے کہ وہ صبر و تحقیق اختیار کرے، کیونکہ جلد بازی شیطان کی صفات میں شامل ہے۔ سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا اور اخبارات میں بے پر کی خبریں اڑتی دکھائی دیتی ہیں، ایسے میں ہمارے اوپر لازم اور ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اس تعلیم کو پیش نظر رکھیں، اس سے کئی خرابیوں سے حفاظت ہو جائے گی۔

اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ① فسق شخص کی خبر صرف تحقیق کے بعد قبول کریں۔ ② عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کریں۔ ③ جلد بازی ظلم اور پچھتاوے کا سبب بن سکتی ہے۔ ④ تحقیق اور صبر مؤمن کی خوبی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب ایمان سے مزین، کفر و فسق سے خالی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۸﴾ الحجرات

جواب ترجمہ: اور جان رکھو کہ اللہ کے رسول تم میں موجود ہیں، اگر وہ اکثر چیزوں میں تمہاری بات مانیں گے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، البتہ اللہ ہی نے تمہارے لیے ایمان میں رغبت پیدا فرما دی اور تمہارے دلوں میں اسے سجا دیا اور کفر اور گناہ اور معصیت سے تمہیں بیزار کیا، یہی لوگ ہیں جو سیدھے راستہ پر ہیں۔ محض اللہ کے فضل اور اس کے انعام سے، اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ: جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنبیہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں تمہارا فرض ہے کہ ان کی تعظیم

کرو، ان کی بات کو مقدم رکھو، اور ان کے فیصلے کو اپنی ذاتی آراء پر ترجیح دو۔ یہاں "فیکم" کو مقدم لانے میں تاکید اور توبیخ ہے، یعنی تم میں رسول اللہ ﷺ ہیں، پھر بھی تم اپنی رائے کو ان پر مقدم کرتے ہو؟

لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ: اگر رسول اللہ ﷺ تمہاری ہر بات ماننے لگیں اور تمہاری آراء پر عمل کریں تو تم مشقت اور گناہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ نبی ﷺ کی رائے اور وحی پر مبنی فیصلہ ہی اصل ہے، اور اگر وہ صحابہ رضی اللہ عنہم یا کسی اور کے مشورے پر ہر معاملے میں عمل کریں تو اس میں امت کے لیے مشقت اور نقصان ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کا شانِ نزول بھی اسی سے متعلق ہے کہ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی رائے پیش کرتے یا بعض لوگ غلط خبریں پہنچاتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ تم میں ہیں، وہ تمہارے حالات سے باخبر ہیں اور اللہ انہیں صحیح رہنمائی عطا فرماتا ہے۔

وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ: اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا۔

وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ: اور کفر، فسق (یعنی اللہ کی نافرمانی) اور معصیت کو تمہارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا۔ اس میں اللہ کی نعمت اور فضل کا بیان ہے کہ ایمان کی محبت اور گناہوں سے نفرت اللہ ہی کی طرف سے ہے، اور یہ اس کے خاص فضل سے ملتی ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ: یعنی: یہی لوگ ہدایت یافتہ اور عقل مند ہیں، جن کے دلوں میں ایمان کی محبت اور گناہوں سے نفرت ہے۔

فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ: یہ سب اللہ کے فضل اور اس کی نعمت سے ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ ایمان، ہدایت اور نیکی کی توفیق اللہ کے فضل سے ملتی ہے، اور اسی کے علم و حکمت سے بندوں کو یہ نعمتیں عطا ہوتی ہیں۔

ان آیات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور ان کی رائے کو مقدم رکھنا چاہیے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ایمان کی محبت اور گناہوں سے

نفرت دلوں میں ڈال دی، یہ سب اللہ کا فضل اور اس کی نعمت ہے، اور اسی میں ہدایت و فلاح ہے۔

دو مسلمان جماعتوں کے درمیان صلح

سوال جب اہل ایمان کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تو اس وقت باقی مسلمانوں کی ڈیوٹی اور ذمہ داری کیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں کیا کردار ادا کریں؟ اس آیت کی روشنی میں سمجھایئے۔

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ {۹} الحجرات.

جواب ترجمہ: اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ چنانچہ اگر وہ لوٹ آئے، تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو، اور (ہر معاملے میں) انصاف سے کام لیا کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن کریم ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ ہم باہم دست و گریبان دو اہل ایمان گروہوں کے بیچ میں پڑ جائیں اور ان کی لڑائی ختم کروائیں اور ان کے درمیان صلح کروائیں، ان دونوں کے درمیان صلح وصفائی کے لیے باقی اہل ایمان کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشن تعلیمات سے راہنمائی حاصل کریں، انہیں ترغیب دیں کہ وہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی تعلیمات کے مطابق ایک دوسرے کا خیال رکھیں، وہ دونوں اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں اپنے کو سرنڈر کردیں، اللہ اور رسول اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائیں۔ اس طرح کرنے سے کافی حد تک ممکن ہے کہ وہ دونوں سر تسلیم خم کرلیں۔

بصورت دیگر ان میں سے کوئی فریق اگر حد سے تجاوز کرتا ہے، حد سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ان روشن تعلیمات سے اثر قبول نہیں کرتا تو اس گروہ کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کی جائے یہاں تک کہ وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، اگر وہ پلٹ آئے تو پھر بھی اہل

ایمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔

ایسا فیصلہ کیا جائے جو اللہ اور رسول اللہ کی تعلیم کے تحت ہو، کہیں ایسا فیصلہ نہ کیا جائے جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے متجاوز ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عادلوں کو پسند کرتے ہیں، جو اپنے فیصلوں میں مخلوق خدا کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہاں جس صفت محبت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے وہ محبت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے، جو اس کی جلالت شان کے مناسب اور لائق ہے۔

امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں حکم ہو رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کی کوئی دو جماعتیں لڑنے لگ جائیں تو دوسرے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان میں صلح کرادیں آپس میں لڑنے والی جماعتوں کو مومن کہنا اس سے حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ نافرمانی گو کتنی ہی بڑی ہو وہ انسان کو ایمان سے الگ نہیں کرتی۔ خارجیوں کا اور ان کے موافق معتزلہ کا مذہب اس بارے میں خلاف حق ہے۔

اس آیت کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے آپ کے ساتھ منبر پر حضرت حسن بن علی بھی تھے آپ کبھی ان کی طرف دیکھتے کبھی لوگوں کی طرف اور فرماتے کہ میرا یہ بچہ سید ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو بڑی بڑی جماعتوں میں صلح کرادے گا۔

آپ کی یہ پیش گوئی سچی نکلی اور اہل شام اور اہل عراق میں بڑی لمبی لڑائیوں اور بڑے ناپسندیدہ واقعات کے بعد آپ کی وجہ سے صلح ہوگئی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے اگر ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑائی کی جائے تاکہ وہ پھر ٹھکانے آجائے حق کو سنے اور مان لے۔

صحیح حدیث میں ہے اپنے بھائی کی مدد کر ظالم ہو تو مظلوم ہو تو بھی۔ حضرت انس نے پوچھا کہ مظلوم ہونے کی حالت میں تو ظاہر ہے لیکن ظالم ہونے کی حالت میں کیسے مدد کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اسے ظلم سے باز رکھو یہی اس کی اس وقت یہ مدد ہے۔

مسند احمد میں ہے حضور ﷺ سے ایک مرتبہ کہا گیا کیا اچھا ہو اگر آپ عبد اللہ بن ابی کے ہاں چلیں چنانچہ آپ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور صحابہ آپ کی ہمرکابی میں ساتھ ہو لیے زمین شور تھی جب حضور ﷺ وہاں پہنچے تو یہ کہنے لگا مجھ سے الگ رہیے اللہ کی قسم آپ کے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا۔

اس پر ایک انصاری نے کہا واللہ رسول اللہ ﷺ کے گدھے کی بو تیری خوشبو سے بہت ہی اچھی ہے اس پر ادھر سے ادھر کچھ لوگ بول پڑے اور معاملہ بڑھنے لگا بلکہ کچھ ہاتھا پائی اور جوتے چھڑیاں بھی کام میں لائی گئیں۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اوس اور خزرج قبائل میں کچھ چشمک ہو گئی تھی ان میں صلح کرا دینے کا اس آیت میں حکم ہو رہا ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عمران نامی ایک انصاری تھے ان کی بیوی صاحبہ کا نام ام زید تھا اس نے اپنے میکے جانا چاہا خاوند نے روکا اور منع کر دیا کہ میکے کا کوئی شخص یہاں بھی نہ آئے، عورت نے یہ خبر اپنے میکے کہلوا دی وہ لوگ آئے اور اسے بالا خانے سے اتار لائے اور لے جانا چاہا ان کے خاوند گھر پر تھے نہیں خاوند والوں نے اس کے چچازاد بھائیوں کو اطلاع دے کر انہیں بلا لیا اب کھینچا تانی ہونے لگی اور ان کے بارے میں یہ آیت اتری۔

رسول اللہ ﷺ نے دونوں طرف کے لوگوں کو بلا کر بیچ میں بیٹھ کر صلح کرا دی اور سب لوگ مل گئے پھر حکم ہوتا ہے دونوں فریقوں میں عدل کرو، اللہ عادلوں کو پسند فرماتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں دنیا میں جو عدل و انصاف کرتے رہے وہ موتیوں کے منبروں پر رحمن عزوجل کے سامنے ہوں گے اور یہ بدلہ ہو گا ان کے عدل و انصاف کا (نسائی)

مسلم کی حدیث میں ہے یہ لوگ ان منبروں پر رحمن عزوجل کے دائیں جانب ہوں گے یہ اپنے فیصلوں میں اپنے اہل و عیال میں اور جو کچھ ان کے قبضہ میں ہے اس میں عدل سے کام لیا کرتے تھے۔

پھر فرمایا کل مومن دینی بھائی ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اسے اس

پر ظلم وستم نہ کرنا چاہیے۔ صحیح حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے جب کوئی مسلمان اپنے غیر حاضر بھائی مسلمان کے لئے اس کی پس پشت دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے آمین۔ اور تجھے بھی اللہ ایسا ہی دے۔ صحیح حدیث میں ہے مسلمان سارے کے سارے اپنی محبت رحم دلی اور میل جول میں مثل ایک جسم کے ہیں جب کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم تڑپ اٹھتا ہے کبھی بخار چڑھ آتا ہے کبھی شب بیداری کی تکلیف ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے مومن مومن کے لئے مثل دیوار کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا اور مضبوط کرتا ہے پھر آپ نے اپنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر بتایا۔ مسند احمد میں ہے مومن کا تعلق دوسرے اہل ایمان سے ایسا ہے جیسے سر کا تعلق جسم سے ہے، مومن اہل ایمان کے لئے وہی دردمندی کرتا ہے جو دردمندی جسم کو سر کے ساتھ ہے۔

پھر فرماتا ہے دونوں لڑنے والی جماعتوں اور دونوں طرف کے اسلامی بھائیوں میں صلح کرادو اپنے تمام کاموں میں اللہ کا ڈر رکھو۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت تم پر نازل ہوگی پرہیزگاروں کے ساتھ ہی رب کا رحم رہتا ہے۔ (ابن کثیر)

رشتہ اخوت و بھائی چارگی کی اہمیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ {۱۰} الحجرات

جواب ترجمہ: تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کو قائم رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت ہو۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ تمام اہل ایمان آپس میں دینی بھائی ہیں اور یہ اخوت نسبی اخوت سے بھی زیادہ مضبوط اور دائمی ہے، کیونکہ نسبی اخوت کفر کی وجہ سے ختم ہو سکتی ہے، جبکہ دینی اخوت باقی رہتی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ: ایمان کی بنیاد پر سب مسلمان بھائی بھائی ہیں، چاہے ان کے درمیان نسبی تعلق نہ ہو، اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت، تعاون اور خیر خواہی کا معاملہ کریں اور باہمی اختلافات یا لڑائی کی صورت میں اصلاح کی کوشش کریں۔

فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ: اگر دو مسلمانوں کے درمیان اختلاف یا لڑائی ہو جائے تو تمہارا فرض ہے کہ ان کے درمیان صلح کراؤ اور انہیں اللہ و رسول کے حکم پر راضی کرو، یہاں "اخویکم" سے مراد ہر وہ دو مسلمان ہیں جن کے درمیان نزاع ہو اور بعض ارباب تفسیر نے کہا کہ اس سے مراد خاص طور پر اوس و خزرج کے قبائل ہیں، جن کے درمیان اختلاف ہوا تھا۔ میرے خیال میں قرآنی احکامات میں عمومی طور پر اس انداز میں حکم دیا جاتا ہے جو قیامت تک آنے والوں کو خطاب ہوتا ہے، قیامت تک آنے والے لوگ ان احکامات کے مخاطب ہوتے ہیں، کیونکہ یہ اس علیم و خبیر ذات کا کلام ہے جو ماضی، حال اور استقبال سب پر نظر رکھے ہوئے ہے، مسلمانوں کے مابین اگر اس زمانے میں نوک جھونک ہوتی تھی جو خیر القرون کا زمانہ تھا تو جوں جوں لوگ اس زمانہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں ان اصلاحیات کی انہیں زیادہ ضرورت پیش آ رہی ہے۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ: اللہ سے ڈرو، اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور اصلاح میں عدل و انصاف سے کام لو، تاکہ اللہ کی رحمت تم پر ہو۔

فرمان نبوی ﷺ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو باہمی اخوت، اصلاح ذات البین، اور تقویٰ کی تلقین کی گئی ہے، اگر مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو ان کی صلح کرانا فرض ہے اور اس میں عدل و انصاف اور اللہ کا خوف لازم ہے، تاکہ اللہ کی رحمت حاصل ہو۔

رشتہ اخوت کے لیے نقصان دہ باتوں سے اجتناب لازم

سوال سورت حجرات کی ان آیات میں اسلام کے کچھ فضائل اور کچھ آداب بین الناس بیان کیے گئے ہیں انہیں بیان کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ {۱۱} يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ {۱۲} الحجرات.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! نہ تو مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہے ہیں) خود ان سے بہتر ہوں، اور نہ دوسری عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اڑا رہی ہیں) خود ان سے بہتر ہوں۔ اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بہت بری بات ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں تو وہ ظالم لوگ ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

اے لوگو! جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق کی اور ان کی شریعت پر عمل پیرا ہوئے، ایمان والوں میں سے کوئی ایمان والا کسی مومن کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ ان سے افضل و بہتر ہو جو مذاق اڑا رہے ہوں۔ اسی طرح ایمان والی عورتوں میں سے کوئی کسی ایمان والی عورت کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہو وہ اس سے افضل

وبہتر ہو جو مذاق اڑا رہی ہے۔

قرآن کریم نے ایک تربیت یہ فرمائی ہے کہ کوئی تم میں سے ایک دوسرے کو عیب نہ لگائے، اور تم میں کوئی ایک دوسرے کو ایسے ناموں اور القابات سے یاد نہ کرے جو ناپسندیدہ ہوں اور لمز اور برے القابات اختیار کرنے سے گریز لازم ہے، اہل ایمان کے ساتھ بد گمانی سے بچو، کیونکہ بعض بد گمانی گناہ ہے، اسی طرح مسلمانوں کی پردہ دری نہ کرو، ان کے راز عام نہ کرو، اسی طرح کوئی کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کرے، جسے وہ ناپسند کرتا ہو، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، حالانکہ تم خود ایسے کرنے کو ناپسند کرتے ہو، اسی طرح اس کی غیبت کو بھی ناپسند کرو۔

ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ پیشِ نظر آیت کریمہ اور اس کے بعد والی آیت میں ان برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں میں اخوت کے رشتے کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ یہ بظاہر معمولی برائیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن جس طرح ایک شعلہ ابتداء میں بہت معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن جب وہ بھڑکتا اور پھیلتا ہے تو آلاؤ کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور آبادیوں کو پھونک دیتا ہے۔ یہ برائیاں بھی ابتداء میں معمولی دکھائی دیتی ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے نہایت تباہ کن ہیں۔ کیونکہ شروع میں ان باتوں کی وجہ سے دلوں میں کدورتیں جنم لیتی ہیں جو دلآزاری کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ پھر اسی سے نفرت پیدا ہوتی ہے جو افراد میں دوری پیدا کرتی ہے اور بڑھتے بڑھتے دشمنی کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

اور افراد گروہ کی صورت اختیار کر جائیں تو یہی دشمنیاں معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ نہ مردوں کے لیے یہ بات مناسب ہے کہ وہ دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں اور نہ عورتوں کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ کیونکہ جو شخص دوسرے کی تضحیک کرتا ہے اور مذاق اڑاتا ہے وہ درحقیقت اس کی تحقیر کرتا اور اس کی عزت نفس پر حملہ کرتا ہے۔ اور اپنے اندر کبر و غرور کی بیماری کو ہوا دیتا ہے۔

اور پھر یہ مذاق اڑانا صرف زبان ہی کا عمل نہیں بلکہ کسی کی نقل اتارنا، اس کی طرف اشارے

کرنا، اس کے کسی عیب یا نقص کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا تاکہ دوسرے لوگ بھی اس پر ہنسیں۔ اور جاوبے جا اس کو مذاق کا نشانہ بنانا، یہ سب باتیں مذاق اڑانے میں شامل ہیں۔

مذاق اڑانے والا اس لیے دوسرے سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور جس کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ جب اپنی عزت نفس کو مجروح ہوتے ہوئے اور اپنی شہرت کو نقصان پہنچتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک نفرت کا لاوا ابلتا ہے جس سے پہلے دوری پیدا ہوتی اور پھر نفرت جنم لیتی ہے۔ اور یہ بیماری جس طرح مردوں میں ہے اسی طرح عورتوں میں بھی ہے۔ اس لیے دونوں کو متوجہ کرنے کے لیے الگ الگ خطاب فرمایا، اور الگ الگ ذکر کیا تاکہ وہ اس برائی کی شناعت کو محسوس کریں اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس سے دور رہنے کی کوشش کریں۔

ان دونوں کا الگ الگ ذکر شاید یہ بتانے کے لیے بھی ہے کہ اسلام میں مخلوط سوسائٹی کا کوئی وجود نہیں۔ ایک دوسرے کی تضحیک عموماً بے تکلف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے اور اسلام میں یہ گنجائش رکھی ہی نہیں گئی کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح مذاق اڑانا اخوت کے رشتے کو نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح مرد و عورت کی مخلوط سوسائٹی اسلامی اخوت کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔ اور اس میں وہ بنیادی نزاکتیں پامال ہو جاتی ہیں جو مردوں کو مرد بناتی ہیں اور عورتوں کو عورتیں۔ اور جس تہذیب اور جس تعلیم میں ان بنیادی قدروں کا تحفظ نہ کیا جائے وہ آخر تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہو نازن　　کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اس حکم کے آخر میں اس کی حکمت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ایک مرد دوسرے مرد کا مذاق اڑاتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر اور اس کو خود سے کمتر سمجھتا ہے۔ اور یہی حال عورتوں کا بھی ہے، لیکن انھیں کیا خبر کہ جنھیں وہ اپنے آپ سے کمتر اور فروتر سمجھ رہے ہیں، ممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے بہتر ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتری کا فیصلہ حُسنِ عمل اور تقویٰ پر ہوگا، نہ کہ مال و دولت، حُسنِ صورت یا حسب و نسب پر اور تقویٰ کی حقیقت آخرت میں کھلے

گی کہ کون اس سے زیادہ بہرہ ور تھا اور کون اس سے محروم۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ ابن مسعود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو صحابہ ان کی پتلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ بات ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا کہ تم عبداللہ کی پنڈلیاں دیکھ کر ہنستے ہو، تمہیں کیا خبر کہ قیامت کے دن ان پنڈلیوں کا وزن کوہ احد سے بھی زیادہ ہو گا۔ (تفسیر روح القرآن)

اس آیت کریمہ میں جس دوسری برائی سے روکا گیا ہے، اس کے بارے میں ارشاد فرمایا وَلَآ تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ جس کا معنٰی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ تَلْمِزُوْٓا لمز سے ہے جس میں عیب لگانے کے علاوہ دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں۔ مثلاً کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارے کرنا، کوئی طنز آمیز فقرہ چست کرنا، چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، عیب چینی کرنا یا اشاروں سے کسی کو نشانۂ ملامت بنانا یہ سب مفہومات بھی اس میں داخل ہیں۔

یہ تمام چیزیں چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑنے اور معاشرے میں فساد برپا کرنے کا باعث ہوتی ہیں، اس لیے ان سے روکا گیا ہے۔ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ اپنے آپ کو کبر و غرور میں مبتلا کر کے ہلاک کرتا ہے، اور دوسرے شخص میں احساسِ کمتری پیدا کرتا ہے، اس کی اقدامی قوتوں کو سرد کر کے رکھ دیتا اور اس کی شخصیت کی نشو و نما روک دیتا ہے اور کبھی اس سے نفرت و عناد بھی جنم لیتے ہیں۔

یہ تمام احساسات معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والے ہیں۔ اس کی زہرناکی کو نمایاں کرنے کے لیے اَنْفُسَكُمْ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا معنٰی ہے اپنا آپ۔ تو جملے کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ۔ حالانکہ اپنے آپ کو تو عیب کوئی نہیں لگاتا اور نہ اپنے آپ پر کوئی طعن کرتا ہے۔

اس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا آپس کا رشتہ چونکہ اخوت کا رشتہ ہے اس لیے جب کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر طعن کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے بھائی پر طعن کرتا ہے اور اپنے بھائی پر طعن کرنا ایسا ہی ہے جیسا اپنے اوپر طعن کرنا اور اپنے ہی سینہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا۔

اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جو شخص دوسروں پر عیب لگاتا اور طعن کرتا اور دوسرے کی

دلآزاری کرتا ہے وہ درحقیقت دوسرے کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ اس پر عیب لگائے اور طعن کرے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ ایک رویہ دوسرے رویئے کو جنم دیتا ہے۔

جب ایک آدمی دوسرے پر عیب لگاتا ہے تو دوسرا بھی پلٹ کر جب بھی اس کو موقع ملے گا اس پر عیب لگائے گا۔ کیونکہ یہ تیر ایسا ہے جو صرف دوسرے کے سینے کو چھلنی نہیں کرتا بلکہ پلٹ کر بھی آتا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

دلوں کو زخم نہ دو حرف ناملائم سے یہ تیر وہ ہے جو لوٹ کر بھی آتا ہے

مزید ایک حکم یہ دیا وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ "ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد نہ کرو اور نام نہ ڈالو ایک دوسرے کے چڑانے کو۔ جس طرح کسی شخص کو اچھے القاب سے ملقب کرنا اس کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی پر برے القاب کا چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل بھی ہے۔ کیونکہ یہ القاب عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ شخص بری طرح اس لقب کے مفہوم کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور کوشش کے باوجود اس کے اثرات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بعض دفعہ پشتوں تک اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

اس لیے اسلام نے ایسا کوئی بھی لقب کسی کو دینے سے منع فرمایا ہے۔ اور عرب جب کسی کی ہجو کرتے تھے تو وہ ایسے ہی طریقے اختیار کرتے تھے اور اس میں ان کو بہت مہارت حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی وہ ایک قوم نہ بن سکے۔ ہر قبیلے کا خطیب اور شاعر اپنے قبیلے کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور دوسروں کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگا رہتا۔ تو اس سے قبیلے کی بنیادیں تو مستحکم ہوتیں لیکن قومی شعور کبھی پیدا نہ ہوتا۔

اسلام نے جو عربوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں ان ہی میں یہ احسان بھی ہے کہ انھیں قبائل کے تنگنائے سے نکالا اور قوم کا وسیع تر تصور ان کے دماغوں میں اتارا۔ اور اسی کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ البتہ اس میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی لقب ظاہری صورت کے اعتبار سے توہین نما ہوتا ہے لیکن وہ کثرت استعمال سے کسی شخصیت کی پہچان بن جاتا ہے۔

مثلاً محدثین میں الاعمش کا لفظ یا الاحدب کا لقب اگرچہ معنوی اعتبار سے یہ کوئی اچھے القاب نہیں لیکن شناخت بن جانے کے بعد آج تک ان کا استعمال ہو رہا ہے۔ صحابہ کرام میں بھی ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے بھی محبت سے بعض دفعہ بعض صحابہ کو ایسے لقب دیئے جو معنوی اعتبار سے زیادہ مناسب نہ تھے لیکن موقع و محل کے اعتبار سے ان کے لیے باعث افتخار بن گئے جیسے ابوتراب اور ابوہریرہ۔ ایسا اگر کوئی لقب ہو تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ (روح القرآن)

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ کسی کو چڑانے کے لیے کوئی لقب نہ دیا جائے۔ مثلاً کسی کو اس کے سابق مذہب کی طرف منسوب کرنا یا اس کے خاندان کی بری شہرت کے حوالے سے اسے پکارنا۔ یا اس میں کوئی جسمانی عیب پایا جاتا ہے تو اسی کو اس کا لقب بنا دینا۔ تو جب اسے ایسے القاب سے پکارا جائے گا تو یقیناً وہ اس سے چڑے گا جو بالآخر تعلقات کی خرابی پر منتج ہو گا۔

اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوتی لیکن اگر اسے تکرار کے ساتھ کہا جائے تو سننے والا چڑ جاتا ہے۔ تو یہ رویہ بھی اس ممانعت میں داخل ہے۔

عبدالمجید سالک مرحوم نے اپنی سرگزشت میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن جیل میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے یہ لطیفہ سنایا کہ لدھیانے کی جامع مسجد میں کوئی عالم دین اسی آیت پر تقریر کرتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ کسی کی چڑ مقرر نہیں کرنی چاہیے، آدمی اس سے چڑ جاتا ہے اور لڑائی ہو جاتی ہے، مجمع میں ایک تحصیلدار صاحب بیٹھے تھے، وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے صاحب سے کہنے لگے یہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں، آخر آدمی کسی بات سے کیسے چڑ جاتا ہے، کوئی کہتا رہے اور سننے والا نہ چڑے تو کیسے لڑائی ہو جائے گی۔

دوسرے صاحب نے کہا کہ تحصیلدار صاحب یہ انسانی فطرت ہے کہ آپ بار بار کسی کو ایک ہی بات کہیں تو وہ چڑ جائے گا۔ لیکن تحصیلدار صاحب نہیں مانے۔ دوسرے صاحب نے انھیں سبق سکھانے کے لیے ان ہی پر تجربہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ تقریر کے دوران ہی اس نے پوچھا کہ صاحب آپ کے یہاں شلجم کا اچار ہو گا۔ وہ کہنے لگے نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر پوچھا،

تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں نے کہا کہ ہمارے یہاں نہیں ہے۔ اس نے چند منٹ کے بعد پھر اپنا سوال دہرایا۔

اب آہستہ آہستہ تحصیلدار صاحب کا پارہ چڑھنے لگا، چھٹی ساتویں دفعہ پوچھنے پر تحصیلدار صاحب نے جوتا اٹھالیا کہ ارے کمبخت تو نے مجھے مذاق بنا رکھا ہے۔ وہ پہلے ہی جوتا سنبھالے بیٹھے تھے وہ اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہجوم کو پھلانگتے ہوئے باہر نکل گئے اور ہر دس قدم کے بعد پلٹ کر اپنا سوال دہراتے اور تحصیلدار صاحب گالیاں دیتے ہوئے ان کے پیچھے، اسی طرح انھوں نے سارا بازار طے کیا۔ وہ بار بار اپنا سوال دہراتے تھے اور تحصیلدار صاحب غصے کے مارے بے قابو ہوئے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ تمام بازار والوں کو پتہ چل گیا کہ تحصیلدار صاحب شلجم کے اچار سے بہت چڑتے ہیں، اگلی صبح تحصیلدار صاحب جب بازار میں کوئی گوشت اور سبزی خریدنے کے لیے آئے تو دکانداروں کو رات کا لطیفہ یاد تھا، وہ بہانے بہانے سے ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے یہ سوال دہرانے لگے۔ تحصیلدار صاحب سمجھ گئے کہ یہ مجھے چڑایا جارہا ہے۔ چنانچہ وہ غصے کے مارے گالیاں دیتے ہوئے بغیر کچھ خریدے گھر کو لوٹ گئے۔ اور یہ مصیبت اس قدر دراز ہوئی کہ انھیں اپنا تبادلہ کراکے دوسرے شہر جانا پڑا۔

اس لیے فرمایا گیا کہ کسی کی چڑ مقرر نہ کرو، یہ ساری باتیں فسق اور گناہ کی باتیں ہیں اور گناہ کا نام لینا بھی ایک صاحب ایمان کے لیے ایمان لانے کے بعد نہایت بری بات ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور اگر پہلے وہ یہ گناہ کرچکے ہیں تو اب انھیں اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ اور جو اس قدر وضاحت کے بعد بھی توبہ نہیں کرے گا تو وہ ظالموں میں شمار ہوگا اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ (تفسیر روح القرآن)

معیار فضیلت تقویٰ ہے

سوال اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگوں کے درمیان باہمی فضیلت کا پیمانہ کیا ہے؟ آیت کی روشنی میں بتائیں

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ {۱۳} الحجرات.

جواب ترجمہ: اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا، سب سے زیادہ شرافت والا، سب سے زیادہ بزرگی والا وہ شخص ہے جو تقویٰ، طہارت، للّٰہیت میں سب سے بڑھ کر ہے، اس آیت مبارکہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جو مٹی سے پیدا ہوئے تھے ان کی طرف سے نسبت میں توکل جہان کے آدمی ہم مرتبہ ہیں اب جو کچھ فضیلت جس کسی کو حاصل ہو گی وہ امر دینی اطاعت اللہ اور اتباع نبوی کی وجہ سے ہو گی یہی راز ہے جو اس آیت کو غیبت کی ممانعت اور ایک دوسرے کی توہین و تذلیل سے روکنے کے بعد وارد کی کہ سب لوگ اپنی پیدائشی نسبت کے لحاظ سے بالکل یکساں ہیں کنبے قبیلے برادریاں اور جماعتیں صرف پہچان کے لئے ہیں تاکہ جتھا بندی اور ہمدردی قائم رہے۔ فلاں بن فلاں قبیلے والا کہا جاسکے اور اس طرح ایک دوسرے کی پہچان آسان ہو جائے ورنہ بشریت کے اعتبار سے سب قومیں یکساں ہیں حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں قبیلہ حمیر اپنے حلیفوں کی طرف منسوب ہوتا تھا اور حجازی عرب اپنے قبیلوں کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے۔

ترمذی میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ تَعَلَّمُوا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُونَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ؛ فَإِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْأَهْلِ، مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ، مَنْسَأَةٌ فِي الْأَثَرِ (ترمذی) نسب کا علم حاصل کرو تاکہ صلہ رحمی کر سکو صلہ رحمی سے لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے تمہارے مال اور تمہاری زندگی میں اللہ برکت دے گا۔

پھر فرمایا حسب نسب اللہ کے ہاں نہیں چلتا وہاں تو فضیلت، تقویٰ اور پرہیز گاری سے ملتی ہے، صحیح بخاری شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ أَيُّ النَّاسِ أَكْرَمُ؟ قَالَ: أَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاهُمْ قَالُوا: لَيْسَ عَنْ هَذَا نَسْأَلُكَ. قَالَ: فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوسُفُ نَبِيُّ اللهِ،

ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ، ابْنِ خَلِيلِ اللّٰهِ. قَالُوا: لَيْسَ عَنْ هَذَا نَسْأَلُكَ. قَالَ: فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُونِي؟ قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ: فَخِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا، سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو لوگوں نے کہا ہم یہ عام بات نہیں پوچھتے فرمایا پھر سب سے زیادہ بزرگ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو خود نبی تھے نبی زادے تھے دادا بھی نبی تھے پر دادا تو خلیل اللہ تھے انہوں نے کہا ہم یہ بھی نہیں پوچھتے۔ فرمایا پھر عرب کے بارے میں پوچھتے ہو؟ سنو! ان کے جو لوگ جاہلیت کے زمانے میں ممتاز تھے وہی اب اسلام میں بھی پسندیدہ ہیں جب کہ وہ علم دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔

صحیح مسلم شریف میں ہے حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ، اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔

مسند احمد میں ہے حضور ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا اُنْظُرْ، فَإِنَّكَ لَسْتَ بِخَيْرٍ مِنْ أَحْمَرَ وَلَا أَسْوَدَ إِلَّا أَنْ تَفْضُلَهُ بِتَقْوَى، خیال رکھ کہ تو کسی سرخ و سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا ہاں تقویٰ میں بڑھ جا تو فضیلت ہے۔ طبرانی میں رسول کریم ﷺ کا فرمان عالی شان ہے الْمُسْلِمُونَ إِخْوَةٌ، لَا فَضْلَ لِأَحَدٍ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا بِالتَّقْوَى، مسلمان سب آپس میں بھائی ہیں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے ساتھ۔

مسند بزار میں رسول کریم رؤف ورحیم ﷺ کا فرمان گرامی ہے كُلُّكُمْ بَنُو آدَمَ، وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ، وَلَيَنْتَهِيَنَّ قَوْمٌ يَفْخَرُونَ بِآبَائِهِمْ، أَوْ لَيَكُونُنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجِعْلَانِ (مسند البزار) تم سب اولاد آدم ہو اور خود حضرت آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں لوگو! اپنے باپ دادوں کے نام پر فخر کرنے سے باز آؤ ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ریت کے تودوں اور آبی پرندوں سے بھی زیادہ ہلکے ہو جاؤ گے۔

ابن ابی حاتم میں ہے نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فتح مکہ والے دن اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہو کر

طواف کیا اور ارکان کو آپ اپنی چھڑی سے چھو لیتے تھے۔ پھر چونکہ مسجد میں اس کے بٹھانے کو جگہ نہ ملی تو لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ اتارا اور اونٹنی کو بطن مسیل میں لے جا کر بٹھایا۔

اس کے بعد آپ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر لوگوں کو خطبہ سنایا جس میں اللہ تعالیٰ کی پوری حمد و ثنا بیان کر کے فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ اللهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عصبِّية الْجَاهِلِيَّةِ وَتُعَظُّمَهَا بِآبَائِهَا، فَالنَّاسُ رَجُلَانِ: رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيمٌ عَلَى اللهِ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللهِ، لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے اسباب اور جاہلیت کے باپ دادوں پر فخر کرنے کی رسم اب دور کر دی ہے و پس انسان دو ہی قسم کے ہیں یا تو نیک پرہیز گار جو اللہ کے نزدیک بلند مرتبہ ہیں یا بدکار غیر متقی جو اللہ کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مسند احمد میں ہے رحمت دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ إِنَّ أَنْسَابَكُمْ هَذِهِ لَيْسَتْ بِمَسَبَّةٍ عَلَى أَحَدٍ، كُلُّكُمْ بنو آدم طَفَّ الصاع لم يملؤه، لَيْسَ لِأَحَدٍ عَلَى أَحَدٍ فَضْلٌ إِلَّا بِدِينٍ وَتَقْوَى، وَكَفَى بِالرَّجُلِ أَنْ يَكُونَ بَذِيًّا بَخِيلًا فَاحِشًا، تمہارے نسب نامے دراصل کوئی کام دینے والے نہیں تم سب بالکل برابر کے حضرت آدم کے لڑکے ہو کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہاں فضیلت دین و تقویٰ سے ہے انسان کو یہی برائی کافی ہے کہ وہ بدگو، بخیل، اور فحش کلام ہو۔

ابن جریر کی اس روایت میں ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا النَّاسُ لِآدَمَ وَحَوَّاءَ، طَفَّ الصَّاعُ لَمْ يَمْلَئُوهُ، إِنَّ اللهَ لَا يَسْأَلُكُمْ عَنْ أَحْسَابِكُمْ وَلَا عَنْ أَنْسَابِكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عند الله أتقاكم، اللہ تعالیٰ تمہارے حسب نسب کو قیامت کے دن نہ پوچھے گا تم سب میں سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو تم سب سے زیادہ پرہیز گار ہوں۔

مسند احمد میں ہے نبی کریم ﷺ منبر پر تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) سب سے بہتر کون ہے ؟ آپ نے فرمایا خَيْرُ النَّاسِ أَقْرَؤُهُمْ، وَأَتْقَاهُمْ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَآمَرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، وَأَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَأَوْصَلُهُمْ لِلرَّحِمِ، جو سب سے زیادہ مہمان نواز سب سے زیادہ پرہیز گار سب سے زیادہ اچھی بات کا حکم دینے والا سب سے زیادہ بری بات سے روکنے

والا سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے۔ مسند احمد میں ہے مَا أَعْجَبَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا، وَلَا أَعْجَبَهُ أَحَدٌ قَطُّ، إِلَّا ذُو تُقًى، حضور ﷺ کو دنیا کی کوئی چیز یا کوئی شخص کبھی بھلا نہیں لگتا تھا مگر تقوے والے انسان۔

ایمان اور اسلام میں فرق

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ اس آیت میں لَا يَلِتْكُمْ کا کیا مطلب ہے؟

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۱۴} الحجرات.

جواب ترجمہ: یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ: تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم واقعی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کے ثواب) میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

کچھ اعرابی لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنے ایمان کا بڑھا چڑھا کر دعویٰ کرنے لگتے تھے حالانکہ دراصل ان کے دل میں اب تک ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں ان کو اللہ تعالیٰ اس دعوے سے روکتا ہے یہ کہتے تھے ہم ایمان لائے۔ اللہ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ ان کو کہیے اب تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا تم یوں نہ کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے یعنی اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے نبی کی اطاعت میں آئے ہیں اس آیت نے یہ فائدہ دیا کہ ایمان اسلام سے مخصوص چیز ہے جیسے کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

جبریل علیہ السلام والی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے جبکہ انہوں نے اسلام کے بارے میں سوال کیا پھر ایمان کے بارے میں پھر احسان کے بارے میں۔ پس وہ زینہ بہ زینہ چڑھتے گئے عام سے خاص کی طرف آئے اور پھر خاص سے اخص کی طرف آئے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضور ﷺ نے چند لوگوں کو عطیہ اور انعام دیا اور ایک شخص کو کچھ بھی نہ دیا اس پر حضرت سعد نے عرض کیا یارسول اللہ! ﷺ آپ نے فلاں فلاں کو دیا اور فلاں کو بالکل چھوڑ دیا حالانکہ وہ مومن ہے، حضور ﷺ نے فرمایا مسلمان؟ تین مرتبہ یکے بعد دیگرے حضرت سعد نے یہی کہا اور حضور ﷺ نے بھی یہی جواب دیا پھر فرمایا، اے سعد! میں لوگوں کو دیتا ہوں اور جو ان میں مجھے بہت زیادہ محبوب ہوتا ہے اسے نہیں دیتا ہوں، دیتا ہوں اس ڈر سے کہ کہیں وہ اوندھے منہ آگ میں نہ گر پڑیں۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے، اس حدیث میں بھی حضور ﷺ نے مومن و مسلم میں فرق کیا اور معلوم ہو گیا کہ ایمان زیادہ خاص ہے بہ نسبت اسلام کے۔

اس حدیث میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ یہ شخص مسلمان تھے منافق نہ تھے اس لئے کہ آپ نے انہیں کوئی عطیہ عطا نہیں فرمایا اور اسے اس کے اسلام کے سپرد کر دیا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ اعراب جن کا ذکر اس آیت میں ہے منافق نہ تھے، تھے تو مسلمان لیکن اب تک ان کے دلوں میں ایمان صحیح طور پر مستحکم نہ ہوا تھا اور انہوں نے اس بلند مقام تک اپنی رسائی ہو جانے کا ابھی سے دعویٰ کر دیا تھا اس لئے انہیں ادب سکھایا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا یہی مطلب ہے اور اسی کو امام ابن جریر نے اختیار کیا ہے ہمیں یہ سب یوں کہنا پڑا کہ حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ لوگ منافق تھے جو ایمان ظاہر کرتے تھے لیکن دراصل مومن نہ تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بلکہ تم (اسلمنا) کہو اس سے مراد یہ ہے کہ ہم قتل اور قید بند ہونے سے بچنے کے لئے تابع ہو گئے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بنو اسد بن خزیمہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے بارے میں اتری ہے جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے حالانکہ اب تک وہاں پہنچے نہ تھے پس انہیں ادب سکھایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ اب تک ایمان تک نہیں پہنچے اگر یہ منافق ہوتے تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی اور ان کی رسوائی کی جاتی جیسے کہ سورۃ برأت میں منافقوں کا ذکر کیا گیا لیکن یہاں تو انہیں صرف ادب سکھایا گیا۔

پھر فرماتا ہے اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرماں بردار رہو گے تو تمہارے کسی عمل کا اجر مارا نہ جائے گا۔ جیسے فرمایا وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور ۲۱) ہم نے ان کے اعمال میں سے کچھ بھی نہیں گھٹایا۔ ہر انسان کی جان اپنی کمائی کے بدلے رہن رکھی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا جو اللہ کی طرف رجوع کرے برائی سے لوٹ آئے اللہ اس کے گناہ معاف فرمانے والا اور اس کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھنے والا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ کامل ایمان والے صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر دل سے یقین رکھتے ہیں پھر نہ شک کرتے ہیں نہ کبھی ان کے دل میں کوئی نکما خیال پیدا ہوتا ہے بلکہ اسی خیال تصدیق پر اور کامل یقین پر جم جاتے ہیں اور جمے ہی رہتے ہیں اور اپنے نفس اور دل کی پسندیدہ دولت کو بلکہ اپنی جانوں کو بھی راہ اللہ کے جہاد میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ سچے لوگ ہیں یعنی یہ ہیں جو کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں یہ ان لوگوں کی طرح نہیں جو صرف زبان سے ہی ایمان کا دعویٰ کر کے رہ جاتے ہیں۔

مسند احمد میں ہے نبی ﷺ فرماتے ہیں دنیا میں مومن کی تین قسمیں ہیں

(اَلَّذِيْنَ) آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. وَالَّذِيْ يَأْمَنُهُ النَّاسُ عَلٰى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ الَّذِيْ إِذَا أَشْرَفَ عَلٰى طَمَعٍ تَرَكَهُ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ،

① وہ جو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر اس نے شک شبہ نہ کیا اور اپنی جان اور اپنے مال سے راہ اللہ میں جہاد کیا۔

② وہ جن سے لوگوں نے امن پالیا نہ یہ کسی کا مال ماریں نہ کسی کی جان لیں۔

③ وہ جو طمع کی طرف جب جھانکتے ہیں اللہ عزوجل کی یاد کرتے ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ کیا تم اپنے دل کا یقین و دین اللہ کو دکھاتے ہو؟ وہ تو ایسا ہے کہ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ اس سے مخفی نہیں وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ پھر فرمایا جو اعراب اپنے اسلام لانے کا بار احسان تجھ پر رکھتے ہیں ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ تم اگر اسلام قبول کرو گے میری فرماں برداری کرو گے میری مدد کرو گے

تو اس کا نفع تمہیں کو ملے گا۔ بلکہ دراصل ایمان کی دولت تمہیں دینا یہ اللہ ہی کا احسان ہے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

سچے ایمان والے اور کچے ایمان والے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ {۱۵} قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۱۶} يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ {۱۷} اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ {۱۸} الحجرات

جواب ترجمہ: ایمان والے تو وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر یقین کیا پھر وہ شک میں نہیں پڑے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے انہوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، سچے لوگ تو وہی ہیں۔ کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنا دین جتلاتے ہو جبکہ اللہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب جانتا ہے اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ وہ آپ پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لے آئے کہہ دیجیے کہ اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر مت رکھو، البتہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھایا اگر تم (واقعی) سچے ہو۔ یقیناً اللہ آسمانوں اور زمین کے ڈھکے چھپے سے واقف ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس پر اس کی پوری نگاہ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے مؤمنین کی صفات بیان فرمائیں: وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر اپنے ایمان میں شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوئے۔

وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ: یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ یعنی صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں، بلکہ دل میں یقین اور عمل میں جہاد و قربانی بھی ضروری ہے۔ اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو صرف زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر دل میں شک رکھتے تھے یا عمل میں کوتاہی کرتے تھے۔

قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ: اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتے ہیں کہ ان لوگوں سے کہہ دو: کیا تم اللہ کو اپنے دین کے بارے میں بتا رہے ہو؟ یعنی تم اپنے ایمان کا دعویٰ کر کے گویا اللہ کو خبر دے رہے ہو، حالانکہ اللہ تو سب کچھ جانتا ہے، تمہارے دلوں کے حال بھی اور آسمان و زمین کی ہر چیز بھی۔ اس میں ان اعراب کی سرزنش ہے جو زبانی دعویٰ ایمان کر رہے تھے، لیکن ان کے دلوں میں ایمان راسخ نہ تھا۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: یہ لوگ اپنے اسلام لانے کو آپ ﷺ پر احسان جتلاتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کر کے آپ پر احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان سے کہہ دو کہ اپنے اسلام کو مجھ پر احسان نہ سمجھو، بلکہ اصل احسان تو اللہ کا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔ یعنی اگر تمہارا ایمان واقعی سچا ہے تو یہ اللہ کا فضل ہے، تمہارا احسان نہیں۔

مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں لفظ اَسْلَمُوْا نے اس بات کو ظاہر کر دیا اور ایک بات اور سمجھ میں آئی وہ یہ کہ اس میں احسان دھرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ جب سچے دل سے ایمان لانے والوں کے لیے اسلام قبول کرنے پر احسان دھرنا صحیح نہیں تو اوپر کے دل سے اسلام کا دعویٰ قبول کرنے والوں کو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر احسان دھرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

اس میں رہتی دنیا تک آنے والوں اور دین اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے اگر سچے دل سے قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام کا ماننے والا فرد تسلیم کیا جائے گا اور اس کے ساتھ یہ بات بھی بتا دی کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ اپنے بھلے کے لیے قبول کرتا ہے وہ مسلمانوں پر احسان نہ دھرے کہ میں مسلمان ہو گیا لہٰذا تم لوگ

میرے لیے چندہ کرو اور روٹی رزق کا انتظام کرو، مسلمانوں کو چاہیے تو سہی کہ وہ اس کی مدد کریں لیکن اسے چاہیے کہ مسلمانوں پر احسان نہ دھرے اور نہ ان سے کچھ طلب کرے خود کمائے کھائے آخر زمانہ کفر میں بھی تو کسب کرتا تھا۔

إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ: یقیناً اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چھپی اور ظاہر چیز کو جانتا ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ اس میں تاکید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن، نیت و عمل سب سے باخبر ہے، اس لیے تمہاری اصل حقیقت اللہ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ: اللہ ہی کے فضل و کرم سے آج سورۃ حجرات کے چیدہ اور چنیدہ مقامات کی تفسیر مکمل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی عالی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما کر اسے میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے اساتذہ ومشائخ کے لیے، میرے معاونین ومساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور اخروی نجات کا سامان بنائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

۱۴ مئی ۲۰۱۸ء بمطابق ۲۷ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ، ساڑھے سات بجے علی الصبح

نظر ثانی: ۲۹ مئی ۲۰۱۸ھ، بمطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ بوقت ساڑھے بارہ شب

اضافات وترمیمات: ۲۲ جنوری ۲۰۲۶ء بروز جمعرات، ۲ شعبان ۱۴۴۷ء ۱۲ بجے شب

☼☼

سورۃ ق (تعارف)

سوال سورۃ ق کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ ق قرآن مجید کی ۵۰ ویں سورت ہے۔ یہ مکی سورت ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۴۵ ہے۔ اس سورت کو "ق" کہا جاتا ہے، جو اس کے آغاز میں مذکور ہے۔ مفسرین کے اجماع کے مطابق یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام "ق" اس کے پہلے حرف سے لیا گیا ہے۔ "ق" حروف مقطعات میں سے ہے، اور اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: بعض نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک نام ہے۔ بعض نے کہا یہ قرآن کا نام ہے۔ بعض نے کہا یہ ایک عظیم پہاڑ کا نام ہے جو زمین کے گرد ہے۔ بعض نے کہا یہ سورت کا نام ہے۔ بعض نے کہا اس کا مطلب "قضی الامر" یعنی "فیصلہ ہو چکا" ہے

شان نزول: سورۃ ق کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب کفارِ مکہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور قیامت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے (بعث بعد الموت) کا انکار کرتے تھے۔ وہ تعجب کرتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے ہوں گے۔ اس سورت میں ان کے اس تعجب اور انکار کا جواب دیا گیا ہے اور دلائل کے ساتھ قیامت اور بعث بعد الموت کو ثابت کیا گیا ہے۔

اہم مضامین: ① توحید، نبوت اور آخرت: اس سورت میں توحید، نبوت اور قیامت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ ② بعث بعد الموت (قیامت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا): کفار کے اس تعجب اور انکار کا جواب کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا کیسے ممکن ہے۔ ③ قرآن کی عظمت: قرآن کی عظمت اور اس کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ④ انسان کی تخلیق اور موت: انسان کی پیدائش، موت اور اس کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ ⑤ اعمال کا حساب اور جزا و سزا: انسان کے اعمال کا ریکارڈ، حساب کتاب، اور قیامت کے دن جزا و سزا کا ذکر۔ ⑥ گذشتہ اقوام کا انجام: سابقہ امتوں (قوم نوح، عاد، فرعون وغیرہ) کے انجام کا ذکر، تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

⑦ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور کفار کی مخالفت: نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور کفار کی مخالفت کا ذکر۔ ⑧ موت اور اس کی سختیاں: موت کی حقیقت اور اس کی سختیوں کا ذکر۔ ⑨ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل: آسمان، زمین، نباتات وغیرہ کی تخلیق کے دلائل۔

خلاصہ: سورۃ ق میں قیامت، بعث بعد الموت، توحید، نبوت، اور اعمال کے حساب کا بیان ہے۔ اس سورت میں کفار کے شبہات کا جواب اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی عظمت اور سابقہ اقوام کے انجام سے عبرت دلائی گئی ہے۔

قرآن، صاحب قرآن اور منکرین

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۭ {۱} بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ {۲} ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۧ {۳} قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۭ {۴} بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ {۵} ق

جواب ترجمہ: ق، قرآن مجید کی قسم! (ان کافروں نے پیغمبر کو کسی دلیل کی وجہ سے نہیں جھٹلایا) بلکہ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ کوئی (آخرت سے) ڈرانے والا خود انہی میں سے (کیسے) آگیا، چنانچہ ان کافروں نے یہ کہا ہے کہ: یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ بھلا کیا ہم مر کھپ جائیں اور مٹی ہو جائیں گے، (اس وقت ہمیں پھر زندہ کیا جائے گا؟) یہ واپسی تو ہماری سمجھ سے دور ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ زمین ان کے جن حصوں کو (کھا کر) گھٹا دیتی ہے ہمیں ان کا پورا علم ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سب کچھ محفوظ رکھتی ہے۔ دراصل انہوں نے سچ کو اسی وقت جھٹلا دیا تھا جب وہ ان کے پاس آیا تھا، چنانچہ وہ متضاد باتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

سورۃ "ق" ایسی سورت ہے جسے نبی کریم ﷺ عید کی نماز میں پڑھا کرتے تھے، اسی طرح جمعہ کے دن جب لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے منبر پر سورۃ ق پڑھا کرتے تھے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایات نقل کی ہیں، جن کے مطابق نبی کریم ﷺ سورۃ ق بڑے بڑے اجتماعات میں تلاوت کرتے

تھے، جیسے جمعہ اور عید کے اجتماعات، اس لیے کہ سورۃ ق ابتدائے آفرینش، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے، احوال آخرت، احوال قیامت، حساب، جنت اور دوزخ، ثواب وسزا، ترغیب وترہیب کے مضامین پر مشتمل ہے۔

ام ہشام بنت حارثہ بن النعمان کہتی ہے کہ (رسول اللہ ﷺ کے بہت قریب میرا مکان تھا) دو سال کے قریب ہمارا اور رسول اللہ ﷺ کا تنور (جس میں روٹی پکتی تھی) ایک ہی تھا، مجھے سورۃ ق پوری اس طرح حفظ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ یہ سورت ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ میں تلاوت فرماتے تھے (رواہ مسلم از قرطبی)

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیثی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ عیدین کی نمازوں میں کونسی سورت پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: ق وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ، اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں بکثرت سورۃ ق تلاوت فرماتے تھے، (یہ سورت خاصی بڑی ہے) مگر اس کے باوجود نماز ہلکی رہتی تھی (قرطبی) یہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تلاوت کا خاص اثر تھا کہ بڑی سے بڑی سورت اور طویل سے طویل نماز بھی پڑھنے والوں پر ہلکی رہتی تھی۔

بعض اسلاف نے "ق" کے بارے میں جو فرمایا کہ یہ پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسرائیلی خرافات میں سے قرار دیا ہے، علامہ ابن کثیر نے کہا کہ اس طرح کی روایات اس لیے لی جاتی ہیں کہ ان کی تصدیق کی جاسکتی اور نہ ہی تکذیب، اسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ لوگ ان روایات کو نقل کرتے ہیں تو باقی لوگ ان روایات کو لے اڑتے ہیں، علامہ نے سخت نکیر کی ہے۔ پھر اس کرم اور عظمت والے قرآن کی قسم کھائی جس کے آگے سے یا پیچھے سے باطل نہیں آسکتا جو حکمتوں اور تعریفوں والے اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ قسم ہے قرآن مجید کی (یعنی جس کو دوسری کتابوں پر فضیلت وشرف ہے کہ ہم نے آپ کو عذاب قیامت سے ڈرانے کے لئے بھیجا

ہے مگر ان لوگوں نے نہ مانا) بلکہ ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی (کی جنس) میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایک ڈرانے والا (پیغمبر) آ گیا (جس نے ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا) سو (اس پر) کافر لوگ کہنے لگے کہ (اول تو خود) یہ (ایک) عجیب بات ہے (کہ بشر پیغمبر ہو، دوسرے پھر دعویٰ بھی عجیب بات کا کرے کہ دوبارہ زندہ ہوں گے بھلا) جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے یہ دوبارہ زندہ ہونا (امکان سے) بہت ہی بعید ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اول تو وہ ہم جیسے انسان ہیں ان کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں، پھر وہ اپنے دعوے میں ایک محال چیز کا دعویٰ کرتے ہیں، کہ مرنے اور مٹی ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاویں گے، اس کے جواب میں حق تعالیٰ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا امکان ثابت کر کے ان کے محال کہنے کو رد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کو تم جو غیر ممکن کہتے ہو اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔

یا تو یہ کہ جن چیزوں کے زندہ ہونے کو کہا گیا ہے ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، یہ تو مشاہدہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ اس وقت تمہارے سامنے زندہ موجود ہیں، اگر زندگی کی صلاحیت ہی نہ ہوتی تو اس وقت کیسے زندہ ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت اس لئے نہ ہو کہ جو اجزاء میت کے مٹی ہو کر منتشر ہو گئے وہ اس کو معلوم نہ ہوں کہ کہاں بکھرے ہیں۔

تو اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ) ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی ہے اور) کم کرتی ہے اور (یہ نہیں کہ آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم تو قدیم ہے، حتیٰ کہ ہم نے قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیئے تھے اور اب تک) ہمارے پاس (وہ) کتاب (یعنی لوح) محفوظ (موجود) ہے (جس میں ان اجزاء منتشر کا مکان اور وضع اور مقدار اور وصف سب کچھ ہے۔

سو اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو یوں ہی سمجھ لے کہ وہ دفتر جس میں سب کچھ ہے، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے مگر یہ لوگ پھر بھی بلاوجہ تعجب ہی میں ہیں اور صرف تعجب ہی نہیں) بلکہ

سچی بات کو (جس میں مسئلہ نبوت اور آخرت کی دوبارہ زندگی بھی ہے) جبکہ وہ ان کو پہنچتی ہے جھٹلاتے ہیں، غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں (کہ کبھی تعجب ہے، کبھی تکذیب ہے۔ (بیان القرآن)

آسمان، زمین اور پانی کی پیدائش

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ {٦} وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ {٧} تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ {٨} وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ {٩} ق

جواب ترجمہ: بھلا کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے؟ اور ہم نے اسے خوبصورتی بخشی ہے، اور اس میں کسی قسم کے رخنے نہیں ہیں۔ اور زمین ہے کہ ہم نے اسے پھیلا دیا ہے اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے ہیں، اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائی ہیں۔ جو ذریعہ ہے دانائی کا اور نصیحت کا ہر رجوع ہونے والے بندہ کیلئے۔ اور ہم نے آسمان سے برکتوں والا پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے باغات اور وہ اناج کے دانے اگائے جن کی کٹائی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا ہے، جس کے تحت اس نے آسمان کھڑا کر دیا، جس کے نیچے کوئی سہارا اور ستون نہیں ہے، جس کو روشنیوں سے مزین کر دیا ہے، جس کی طرف انسانی نگاہیں دیکھتی ہیں تو حیران ہو کر زمین پر آن جمتی ہیں، یہ تہہ بہ تہہ سات آسمان ہیں، جو اللہ کی کاریگری کا عظیم شاہکار ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ ایک شخص نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ آسمان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ موج مکفوف ہے، یعنی ایک تھمی ہوئی موج ہے۔ (در منثور، العظمت لابی الشیخ، تفسیر ابن کثیر)

حضرت ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ آسمان زمین پر قبہ کی مثل ہے، جس نے زمین کو تمام اطراف سے قبہ کی شکل میں محیط کر رکھا ہے۔(العظمت، ابن جریر، در منثور) قرآن کریم کے بیانیہ کے مطابق آسمان وزمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر اللہ نے انہیں جدا کیا، اس کی تفسیر میں ابو صالح حنفی فرماتے ہیں کہ سب آسمان ایک تھے، پھر ان میں فاصلے کر کے سات آسمان کر دیے گئے اور زمینیں بھی ایک تھیں، ان میں فاصلے کر کے سات زمینیں کر دی گئیں۔(تفسیر طبری، العظمت، در منثور)

انسانی نگاہ آسمان کی طرف جب اٹھتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ یہ آسمان نیلے رنگ کا ہے، بحر الابیض المتوسط کے ساحل پر کھڑے ہو کر میں نے پانی کے اندر خوب نظارہ کیا تو مجھے نیلا ہی نیلا آسمان دکھائی دیا، مگر اللہ کی شان قدرت دیکھیے، حضرت کعب فرماتے ہیں کہ آسمان دودھ سے بھی زیادہ سفید رنگ کا ہے۔(تفسیر در منثور) قرآن کریم میں آسمان کے بارے میں فرمایا گیا کہ والسماء ذات الحبک اس کی تفسیر میں ابو صالح حنفی فرماتے ہیں کہ آسمان پیدائش کے لحاظ سے بہت ہی مضبوط ہے۔

مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما السماء ذات الحبک کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آسمان بہت ہی پر رونق اور خوبصورت ہے، اس کی تعمیر تہہ بہ تہہ برف کی ہے، حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ آسمان خوبصورت تخلیق والا ہے، رب تعالیٰ نے اسے ستاروں سے مزین کیا ہے۔(تفسیر ابن کثیر، تفسیر در منثور، ابن ابی حاتم) قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ خلق سبع سموات طباقا سات آسمان اوپر نیچے پیدا کیے گئے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہیں، ایک سے دوسرے آسمان کے درمیان جو خلا ہے اس میں مخلوق بھی موجود ہے، اس مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات بھی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کے دن میں پیدا فرمایا اور ہر آسمان میں اس کے متعلق وحی فرمائی۔(تفسیر طبری، در منثور، الھئیۃ السنیہ للسیوطی رحمہ اللہ) حضرت ربیع ابن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا آسمان تھمی ہوئی موج سے بنایا گیا، دوسرا آسمان چٹان کا ہے، تیسرا آسمان لوہے کا ہے، چوتھا آسمان تانبے کا ہے، پانچواں آسمان چاندی کا ہے، چھٹا آسمان سونے کا ہے، ساتواں آسمان یاقوت کا ہے۔

(در منثور، ابن جریر)

پہلے آسمان کا نام "رقیع" ہے، دوسرے کا "ارقلون" ہے، تیسرے کا "قیدوم" ہے، چوتھے کا نام "ماعون" ہے، پانچویں کا نام "ریعا" ہے، چھٹے آسمان کا نام "دِفتا" ہے، ساتویں آسمان کا نام "عریبا" ہے۔(ماخوذ از خطبات دعوت مولفہ: راقم الحروف حدوٹی) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے آسمان کا نام رقیع ہے جب کہ ساتویں آسمان کا نام ضراح ہے۔(الدر منثور، العظمت لابی الشیخ،) ابن حجر عسقلانی نے صراح بیت المعمور فرشتوں کے قبلے کا نام بھی نقل فرمایا ہے۔(فتح الباری)

اہل علم و عرفان نے اللہ کی قدرت کے بہت سے شاہکار بیان فرمائے ہیں، جنہیں دیکھ کر اور پڑھ کر انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن انس بن عامر سلمی سے فرمایا کہاے عباس! جس ذات نے مجھ پر وحی نازل فرمائی، اس نے مجھے فصیح عربی زبان کے ساتھ تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، سات مضبوط آسمانوں کے اوپر سے سات موٹے اور مضبوط آسمانوں کی طرف ہر مخلوق کی طرف جو کچھ فیصلہ کرتے ہیں بغیر کسی کمی بیشی کے اپنا حکم نازل کرتے ہیں۔

حضرت عباس بن انس بن عامر سلمی نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان مضبوط اور موٹے کیسے بنائے اور کیوں بنائے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کو پیدا کیا تو اسے محفوظ چھت بنایا، اور اس میں سخت پہریدار اور شہابیے لگا دیے، اس میں رہنے والے فرشتے دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، ان کی شکلیں اور صورتیں بیل جیسی ہیں، ان کی تعداد اس قدر ہے جس قدر ستارے ہیں، ان کا پینا نور اور تسبیح کرنا ہے، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہنے میں وقفہ نہیں کرتے۔

دوسرے آسمان پر رہنے والے فرشتے مقدار میں بارش کے قطرات کے برابر، شکل میں عقاب، نہ تو وہ اکتاتے ہیں نہ کوئی کوتاہی کرتے ہیں، اور نہ ہی سوتے ہیں، انہی سے بادل نکلتا ہے، حتیٰ کے آسمان کے اطراف سے نمودار ہو کر فضائے آسمانی میں بکھر جاتا ہے، اس کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں، جو اس کو وہیں لے جاتے ہیں جہاں کا ان کو حکم دیا جاتا ہے، ان کی آوازیں تسبیح ہیں اور ان کی تسبیح خوف دلاتا ہے۔

تیسرے آسمان کے رہنے والے فرشتے ریت کے ذرات کی تعداد میں ہیں، انسانوں کی شکل میں یہ

فرشتے ہوا بھرنے کی طرح برجوں پر پھونک رہے ہیں، رات دن اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ کی طلب میں رہتے ہیں گویا کہ جس کا ان کو وعدہ دیا گیا اس کو بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔

چوتھے آسمان کے فرشتوں کی تعداد درختوں کے رنگوں کے برابر ہے، صف بستہ ہیں، ان کے کاندھے باہمی ملے ہوئے ہیں، شکلیں حور عین کی طرح ہیں، کوئی رکوع کی حالت میں ہیں، کوئی سجدہ کی حالت میں ہیں، تسبیحات کی وجہ سے ان کے چہرے ساتوں آسمانوں اور ساتویں زمین تک کے مابین کو روشن کر رہے ہیں۔

پانچویں آسمان کے فرشتوں کی تعداد تمام مخلوقات کی تعداد سے دوگنی ہے، ان کی صورتیں گدھ کی ہیں، ان میں سے کچھ کرام برره، نیکوکار ہیں، اور کچھ احکام وحی لکھنے والے علماء ہیں، جب یہ تکبیر کہتے ہیں تو ان کے اللہ سے ڈرنے کی وجہ سے عرش کانپ اٹھتا ہے، اور فرشتوں کی چیخ نکل جاتی ہے، ان میں سے ہر فرشتہ کا ایک پر آسمان اور زمین کی درمیانی فضا کو پر کر سکتا ہے۔

چھٹے آسمان پر اللہ کا غالب آنے والا لشکر ہے اور اس کا سب سے بڑا لشکر ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان فرشتوں میں سے کسی ایک کو حکم دے دے کہ آسمانوں اور زمین کو اپنے ایک ہی پر سے اکھاڑ دے تو اکھار سکتا ہے، یہ نشان زدہ گھوڑوں کی شکل میں ہیں۔

ساتویں آسمان میں رہنے والے مقرب فرشتے ہیں، جو اعمال کو اعمالناموں سے اٹھاتے ہیں اور میزان کو جھکاتے ہیں، ان فرشتوں کے اوپر عرش کو اٹھانے والے کروبیون فرشتے ہیں، ان فرشتوں میں سے ہر فرشتے کا جوڑ چالیس ہزار سال کی مسافت کے برابر ہے، یا فرمایا کہ چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے۔

حضرت ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے آسمان وزمین کے عجائبات اور تخلیقات سے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے عثمان نہدی کو اس بارے میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور ہر آسمان کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا (ان آسمانوں کے نام بندہ راقم الحروف نے اپنی کتاب خطبات دعوت اور دوسری کتب کے حوالے سے اوپر نقل کر دیے ہیں) ہر آسمان میں ایک قسم

کے فرشتے ٹھہرائے جو اس کی عبادت کرتے رہیں، ہر آسمان کی طرف اپنے احکامات جاری کیے۔

اللہ تعالیٰ نے آسمان دنیا کو پیدا کیا، اس کا نام رکھا، اسے حکم دیا کہ سبز زمرد ہو جا تو وہ سبز زمرد ہو گیا، دوسرے آسمان کا نام رکھا اور اسے حکم دیا کہ تو سفید چاندی ہو جا تو وہ سفید چاندی ہو گیا، اس میں ایسے فرشتے مقرر فرمائے جن کو جب سے اللہ نے پیدا کیا تب سے وہ حالت قیام میں ہی اللہ کی عبادت میں مصروف ہیں۔

تیسرے آسمان کا نام رکھا اور اسے حکم دیا کہ تو سرخ یاقوت ہو جا، وہ سرخ یاقوت ہو گیا، پھر اس میں ایسے فرشتے مقرر کیے جو رکوع کی حالت میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں، ان کے کاندھے ان کی صفوں سے مختلف نہیں ہوتے، ان فرشتوں کی صفیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ اگر ان پر پانی کا ایک قطرہ بھی گرے تو اس کو بھی نکلنے کا راستہ نہ ملے۔

اور چوتھے آسمان کا نام رکھا اور اسے حکم دیا کہ تو سفید گوہر بن جا تو وہ سفید گوہر بن گیا، پھر اس پر ایسے فرشتے مقرر کیے جو رکوع والے فرشتوں کی طرح سجدہ کی حالت میں اللہ کی عبادت میں مصروف ہیں۔

پھر پانچویں کو پیدا کیا، اس کا نام رکھا اور اسے حکم دیا کہ تو سرخ سونا ہو جا تو وہ سرخ سونا ہو گیا، پھر اس کو ایسے فرشتوں سے آباد کیا جن کی مسافت پیٹ کے لحاظ سے ہے اور ان کے چہرے اور پاؤں آسمان کے نچلے آخری کنارہ پر اور ان کے سر قریبی آسمان کے سامنے والے کنارے تک ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے روتے ہیں، ان کا نام ملائکہ نواحین (رونے والے فرشتے) رکھا ہے۔

پھر چھٹا آسمان بنایا، اس کا نام رکھا، اسے حکم دیا کہ تو زرد یاقوت ہو جا وہ ہو گیا، پھر اس میں سجدہ ریز فرشتے مقرر کیے، جن کے جوڑ پھڑکتے اور سر ہلتے ہیں، ان کی آوازیں بلند ہیں، جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس بیان کرتے ہیں، اگر یہ اپنے پاؤں کے بل کھڑے ہوں تو ان کی ٹانگیں ساتویں نچلی زمین تک جا پہنچیں اور سر اوپر والے آسمان تک جا لگیں، یہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پاؤں کے بل کھڑے ہوں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان کو بنایا، اس کا نام رکھا، اسے حکم دیا کہ تو نور ہو جا تو وہ چمکنے والا نور

ہو گیا، پھر اس پر ایسے فرشتے بسائے جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم، قرب، اور خوف کی وجہ سے ایک پاؤں پر کھڑے ہیں اور ان کے پاؤں ساتویں نچلی زمین سے بھی نیچے تک چلے گئے ہیں اور ان کے یہ قدم ساتویں نچلی زمین کے نیچے ہیں، دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے وہ سفید جھنڈے ہوں، ان کے نیچے تیز ترین ہوا چلتی ہے جو جھنڈوں (کی مانند کے فرشتوں کے نظر آنے والے اجسام) کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان فرشتوں کے سر عرش کے نیچے ہیں، مگر عرش تک نہیں پہنچ سکے، ان کی عبادت کے کلمات یہ ہیں

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ، سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوتِ، سُبْحَانَ ذِي الْعَرْشِ، سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوتِ، سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ، سُبْحَانَ الَّذِي يُمِيتُ الْخَلَائِقَ وَلَا يَمُوتُ، سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحُ، قُدُّوسٌ قُدُّوسٌ، سُبْحَانَ رَبِّنَا الْأَعْلَى، سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوتِ وَالْمَلَكُوتِ، وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ، وَالسُّلْطَانِ وَالنُّورِ، سُبْحَانَهُ أَبَدَ الْآبِدِينَ، اس تسبیح اور تقدیس کے بعد یہ فرشتے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں، پھر اپنی وہی تسبیح شروع کر دیتے ہیں، جب سے یہ فرشتے پیدا کیے گئے ہیں تب سے وہ یونہی اللہ کی عبادت و تسبیح میں مصروف ہیں، قیامت تک وہ اسی طرح اللہ کی تسبیح اور عبادت کرتے رہیں گے۔

حضرت عبد اللہ فرماتے ہیں کہ آسمان وزمین کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے، ہر دو آسمانوں کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال کی ہے، ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے، ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے، کرسی اور پانی کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے، اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے، اور اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔ (العظمت) یہ حیران کن باتیں اسی رب العالمین کی قدرت کا شاہکار ہیں، جس نے آسمانوں کو بلندی، زمینوں کو پستی، دریاؤں کو روانی اور سمندروں کو سیلانی عطا فرمائی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے عظیم الشان شاہکار زمین کو بچھانے اور پھیلانے کا ذکر کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ الْقَلَمَ، فَقَالَ لَهُ:

اُكْتُبْ فَقَالَ: يَا رَبِّ، مَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ، فَجَرَى بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ: فَارْتَفَعَ بُخَارُ الْمَاءِ فَخَلَقَ مِنْهُ السَّمَاوَاتِ، ثُمَّ خَلَقَ النُّونَ الَّذِي عَلَيْهِ الْأَرْضُ، فَبَسَطَ الْأَرْضَ مِنْ فَوْقِهِ، فَتَحَرَّكَ النُّونُ فَمَادَتِ الْأَرْضُ، فَأُثْبِتَتْ بِالْجِبَالِ، فَإِنَّ الْجِبَالَ لَتَفْخَرُ عَلَى الْأَرْضِ بِأَنَّهَا أُثْبِتَتْ بِهَا (العظمة) رب تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، پھر قلم کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے عرض کی کہ یا اللہ! میں کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تقدیر میں ہے سب لکھو، اللہ کے حکم پر قلم نے قیامت تک ہونے والے امور کو لکھ دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پھر پانی بلند ہوا تو اس نے آسمانوں کو پیدا فرمایا، پھر نون (مچھلی) کو پیدا فرمایا، جس پر زمین قائم ہے، پھر اس پر زمین کو بچھا دیا، جب مچھلی نے حرکت کی تو زمین بھی حرکت میں آگئی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا، اس پر پہاڑ زمین پر فخر کرنے لگے کہ انہیں کی وجہ سے زمین کو ساکن کیا گیا۔ (طبری، در منثور، الاسماء والصفات، العظمت لابی الشیخ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وُضِعَ الْبَيْتُ فِي الْمَاءِ عَلَى أَرْبَعَةِ أَرْكَانٍ قَبْلَ أَنْ تُخْلَقَ الدُّنْيَا بِأَلْفَيْ سَنَةٍ، ثُمَّ دُحِيَتِ الْأَرْضُ تَحْتَ الْبَيْتِ، زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف کو چار زاویوں کے ساتھ پانی پر رکھا گیا، پھر بیت اللہ شریف کے نیچے سے زمین کو پھیلایا گیا۔ (العظمت لابی الشیخ)

حضرت کعب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الْأَرْضُونَ السَّبْعُ عَلَى صَخْرَةٍ، وَالصَّخْرَةُ فِي كَفِّ مَلَكٍ، وَالْمَلَكُ عَلَى جَنَاحِ الْحُوتِ، وَالْحُوتُ فِي الْمَاءِ، وَالْمَاءُ عَلَى الرِّيحِ، وَالرِّيحُ عَلَى الْهَوَاءِ رِيحٌ عَقِيمٌ لَا تُلْقِحُ، وَإِنَّ قُرُونَهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ (ابو الشیخ۔، در منثور، الھیئۃ السنیہ) ساتوں زمینیں ایک چٹان پر ہیں، اور چٹان ایک فرشتہ کی ہتھیلی پر ہے اور یہ فرشتہ مچھلی کے پر کے اوپر ہے اور مچھلی پانی میں ہے اور پانی ہوا پر ہے اور ہوا بڑی ہوا پر ہے اور یہ ایسی ہوا ہے جس سے کوئی پیداوار نہیں ہوتی، اس ہوا کے کنارے عرش سے لگے ہوئے ہیں۔

حضرت وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کو دھویں سے پیدا کیا، یہ دھواں

زمین کے ساتھ جڑا ہوا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں یعنی آسمان وزمین کو بلایا تو انہوں نے دعوت پر لبیک کہی اور اس کے حکم کی تعمیل کی پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کو حکم دیا تو وہ اوپر چلا گیا اور زمین کو ہوا کی طرف کھینچا اور حکم دیا تو وہ پھیل گئی اور اس کا پھیلاؤ کعبہ سے شروع ہوا۔

پھر ہوا کو پیدا کیا اور اس کو پھیلا دیا، جس نے پانی پر پہنچ کر اس کو موج در موج اور جھاگ بنا دیا اور پانی سے دھواں اور بخارات ہوا میں اڑنے لگے، پھر جب وہ وقت آ گیا جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا تھا تو جھاگ کو حکم دیا تو وہ منجمد ہو گئی، پھر اس سے زمین کو پیدا کیا اور موجوں کو حکم دیا تو وہ منجمد ہو گئیں، اور ان کو گڑے ہوئے پہاڑ بنا دیا۔

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا جب کہ وہ دھواں کی حالت میں تھا، تو اس کو اور زمین کو فرمایا تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی سے آؤ، مطلب یہ ہے کہ ہمارے احکام تکوینیہ جو تم دونوں میں جاری ہوا کریں گے مثلاً آسمان میں اس کے بعد ہی تغیر ہونے والا تھا کہ اس کے ایک مادہ سے سات آسمان بننے والے تھے اور زمین میں بے انتہاء تغیر قیامت تک چلے جائیں گے تو ان کا جاری ہونا تو تمہارے اختیار سے باہر ہے، لیکن جو ادراک وشعور تم کو دیا گیا ہے اس سے تمہاری حالت کے مناسب رضا وعدم رضا دونوں کا تحقق ہو سکتا ہے، جیسے مرض یا موت انسان کے لیے کہ باوجود غیر اختیاری ہونے کے کوئی اس پر راضی ہے کوئی ناراض سو تم دیکھ لو کہ ہمارے ان احکام پر راضی رہا کرو گے یا کراہت کرو گے؟ دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے ان احکام کے لیے حاضر ہیں اور ہر آسمان میں اس کے متعلق احکام جاری کیے اور ان کو جدا جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ (العظمت)

حضرت حسان بن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس زمین سے نیچے والی زمین پر دوزخیوں کے لیے آگ کی چٹانیں ہیں اور اس سے نچلی زمین پر ریح عقیم (بانجھ ہوا) ہے اور اس سے نچلی زمین پر دوزخیوں کے لیے بچھو ہیں، کسی نے پوچھا کہ کیا اس میں بچھو ہیں؟ فرمایا، ہاں! خچروں کی طرح بچھو ہیں، ان کے ڈنک نیزوں جیسے ہیں اور اس سے نچلی زمین پر دوزخیوں کے لیے سانپ ہیں، وہاں کے سانپ کیسے ہیں؟ فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کا منہ بڑی وادی کے برابر ہے، اور اس سے نچلی زمین پر سب شیطانوں سے بڑا

شیطان رہتا ہے۔ (العظمت لابی الشیخ الاصفہانی، مرآۃ الزمان، کنز الدرر، الھیئۃ السنیہ)

قرآن کریم میں سجین کا ذکر ہے، سجین کی تفسیر امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے یہ فرمائی ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے دوزخ میں ایک چٹان ہے، اس کو الٹا کر اس کے نیچے بدکاروں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں۔ (العظمت، تفسیر طبری، در منثور، الھیئۃ السنیہ)

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْأَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيدُ، فَخَلَقَ عَلَيْهَا الْجِبَالَ فَأَرْسَاهَا، فَتَعَجَّبَتِ الْمَلَائِكَةُ فَقَالَتْ: يَا رَبِّ، هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْحَدِيدُ يُكْسَرُ بِهَا الْجِبَالُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ، هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْحَدِيدِ؟ قَالَ: نَعَمْ، النَّارُ يُلَيَّنُ بِهَا الْحَدِيدُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ، هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْمَاءُ. قَالَتْ: فَهَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الرِّيحُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ، هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الرِّيحِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْإِنْسَانُ يَتَصَدَّقُ بِيَمِينِهِ يَكَادُ أَنْ يُخْفِيَهَا مِنْ يَسَارِهِ (العظمت)

جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ حرکت کرنے لگی، پھر اللہ نے اس پر پہاڑوں کو پیدا فرما کر اس میں گاڑ دیا، اس پر فرشتوں کو حیرانی ہوئی، پھر وہ کہنے لگے، یارب! کیا آپ کی مخلوق میں پہاڑوں سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہاں! لوہا ہے جو پہاڑوں کو توڑ دیتا ہے، فرشتوں نے پوچھا، اے رب! کیا آپ کی مخلوق میں لوہے سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں! آگ ہے جس کے ذریعے لوہے کو نرما یا جاتا ہے، فرشتوں نے کہا، اے رب! کیا آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا، ہاں! پانی ہے، فرشتوں نے پوچھا کہ اے رب! کیا آپ کی مخلوق میں پانی سے بھی کوئی چیز زیادہ سخت ہے؟ فرمایا، ہاں! ہوا ہے، فرشتوں نے پوچھا، اے رب! کیا تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا کہ ہاں، انسان کا اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ کرنا ہے جس کا بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔

حضرت وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے

رب! وہ مچھلی دکھائیں جس پر زمینوں کو ٹھہرایا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ آپ مجمع البحار (جہاں سمندر جمع ہوتے ہیں) تشریف لائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے سمندر کے جانوروں میں سے ایک جانور کو حکم دیا تو اس نے اپنی پشت ظاہر کرنا شروع کی اور لگاتار تین مہینے رات اور دن اپنی پشت ظاہر کرتا رہا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے تین ماہ بعد عرض کیا، یارب! کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ یہ اپنا سر اور اپنی دم ظاہر کرے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ اے سلیمان! اگر اگلے سال تک دن اور رات یونہی یہ اپنی پشت ظاہر کرتا رہے تو پھر بھی اپنی دم اور سر ظاہر نہیں کر سکے گا۔

اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس مچھلی کا علم ہے جس کی پشت پر زمین ٹھہری ہوئی ہے کہ اس کا رزق کتنا ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرض کیا کہ مجھے کوئی علم نہیں ہے، مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے جتنا کہ آپ بتادیں، سلیمان علیہ السلام عرض کرنے لگے کہ وہ مچھلی اس مچھلی کی طرح ہو گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، سلیمان اس کا صبح کا کھانا اس جیسی ستر ہزار مچھلیاں ہیں، اسی طرح اس کا شام کا کھانا اس جیسی ستر ہزار مچھلیاں ہیں، اس کا رزق ایک لحظہ کے لیے بھی رکتا نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم دیا کہ فَارْجِعْ يَا سُلَيْمَانُ، فَإِنَّكَ لَا تُطِيقُ أَنْ تَرَى هَذِهِ، فَكَيْفَ تُطِيقُ أَنْ تَنْظُرَ إِلَى السَّمَكَةِ الَّتِي عَلَيْهَا قَرَارُ الْأَرَضِينَ؟ اے سلیمان! لوٹ جایئے، آپ اسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے، تو آپ اس مچھلی کو کیسے دیکھ پائیں گے جس پر زمینیں ٹھہری ہوئی ہیں۔ یہ حکم سننے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے عرض کی کہ لَا سُلْطَانَ إِلَّا سُلْطَانَكَ، وَلَا مُلْكَ إِلَّا مُلْكَكَ اللہ آپ کی بادشاہی کے سوا کسی کی بادشاہی نہیں ہے، آپ کے ملک کے سوا کسی کا ملک نہیں ہے۔ (العظمت لابی الشیخ الاصفہانی)

راقم الحروف کے خطبات پر مشتمل کتاب "خطبات دعوت" میں زمینوں کے نام بھی مرقوم ہیں، بندہ نے معارف الفرقان کی پہلی جلد میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، پہلی زمین کا نام "ادیم" ہے، دوسری زمین کا نام "بسیط" ہے، تیسری زمین کا نام "ثقیل" ہے، چوتھی زمین کا نام "بطیح" ہے، پانچویں زمین کا نام "حین" ہے، چھٹی زمین کا نام "ماسکہ" اور ساتویں زمین کا نام ثریٰ" ہے۔ (خطبات دعوت ۱۱۱)

یہ تو آسمان وزمین کی تخلیق اور قدرت والے کی قدرت کے دو عظیم شاہکاروں کا ذکر تھا، یہاں اللہ تعالیٰ نے پانی کا بھی ذکر فرمایا ہے، پانی بھی قدرت والے کی قدرت کا عظیم الشان شاہکار ہے، دنیا ومافیہا کی ساری نعمتیں اپنی جگہ قابل قدر اور قابل استفادہ ہیں مگر ان سب کے باوجود پانی نہ ہو تو زندگی کا مزہ ہی نہیں رہتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَمَّا أَرَادَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَخْلُقَ الْمَاءَ خَلَقَ مِنَ النُّورِ يَاقُوتَةً خَضْرَاءَ، غِلَظُهَا كَغِلَظَةِ سَبْعِ سَمَاوَاتٍ وَسَبْعِ أَرَضِينَ وَمَا فِيهِنَّ وَمَا بَيْنَهُنَّ، ثُمَّ دَعَاهَا، فَلَمَّا أَنْ سَمِعَتْ كَلَامَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ ذَابَتِ الْيَاقُوتَةُ فَرَقًا حَتَّى صَارَتْ مَاءً، فَهُوَ مُرْتَعِدٌ مِنْ مَخَافَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَكَذَلِكَ إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهِ رَاكِدًا أَوْ جَارِيًا يَرْتَعِدُ، وَكَذَلِكَ يَرْتَعِدُ فِي الْآبَارِ مِنْ مَخَافَةِ اللهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ خَلَقَ الرِّيحَ فَوَضَعَ الْمَاءَ عَلَى الرِّيحِ، ثُمَّ خَلَقَ الْعَرْشَ، فَوَضَعَ الْعَرْشَ عَلَى الْمَاءِ، فَذَالِكَ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: {وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا} (هود: ۷) (العظمت لابی الشیخ)

جب اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو نور سے سبز یاقوت پیدا فرمایا، اس سبز یاقوت کی موٹائی سات آسمانوں، سات زمینوں اور جو کچھ ان کے اندر ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کی موٹائی کے برابر تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اس سبز یاقوت کو بلایا تو وہ اللہ کا کلام سنتے ہی ٹکڑے ہو کر پگھل گیا، یہاں تک کہ پانی ہو گیا، پانی اللہ کے ڈر کی وجہ سے قیامت تک کانپتا رہے گا، آپ جب بھی پانی کو ٹھہرے ہوئے یا رواں دواں دیکھیں گے تو وہ کانپ رہا ہو گا، یونہی وہ چشموں میں اللہ کے ڈر کی وجہ سے قیامت تک کانپتا رہے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا کیا پھر پانی کو ہوا پر رکھا، پھر عرش کو پیدا فرمایا اور عرش کو پانی پر رکھا، یہی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ ہود میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ہے، مبارک پانی

سے مراد نفع بخش پانی ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے باغات اگائے، کھیتی اگائی، پانی کے ذریعے زمین میں وتر پڑتا ہے۔ پانی آتا اوپر کی طرف سے جب کہ چیزیں، باغات، کھیتیاں زمین سے اگائی جاتی ہیں، قرآن کریم میں دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ ہم نے ہر چیز پانی سے زندہ کی ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں بارش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ (بارش) کس قدر خیر وبرکت کا موجب ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے باغات نشوونما پاتے ہیں۔ اناج اگتا ہے۔ اور لمبی لمبی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کے خوشے خوب گتھے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ سب اس لئے ہے کہ اللہ کے بندے اپنے لئے رزق اور قوت کا سامان مہیا کریں۔

پھر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ دیہات کے دیہات بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک اور بے آب ہو جاتے ہیں۔ اور جب ابر رحمت کے۔ چند چھینٹے پڑ جاتے ہیں۔ تو ان میں تروتازگی عود کر آتی ہے۔ گویا وہ دوبارہ زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ جو لوگ حشر اجساد کے منکر ہیں۔ اور جن کی سمجھ میں یہ حقیقت نہیں آتی، کہ کیونکر عالم انسانی موت کے بعد زندگی کی کیفیتوں سے لذت اندوز ہو سکے گا، وہ اس واقعہ پر غور کریں، کہ بارش کے چند قطرے کیونکر زمین کے سینہ سے زندگی کو نکال کر محمل وریحان سے بدل دیتے ہیں؟ جب یہ ممکن ہے اور ممکن ہی نہیں، مشاہدہ ہے کہ روزانہ ہم عدم کو وجود میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں۔ تو پھر استحالہ کیسا؟ اسی طرح اللہ کی قدرت سے قیامت کے دن مردے جی اٹھیں گے اور اس کے حضور میں پیش ہوں گے۔ (سراج البیان)

حضرت امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت یحی بن ابی کثیر رحمہ اللہ نے ان سے بیان کیا کہ حضرت کعب رحمہ اللہ سے پوچھا گیا، (حضرت کعب رحمہ اللہ بنی اسرائیل سے نقل کرتے تھے) کہ اس زمین کے نیچے کیا ہے؟ تو حضرت کعب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس زمین کے نیچے پانی ہے، پھر ان سے پوچھا گیا کہ پانی کے نیچے کیا ہے؟

تو انہوں نے کہا کہ زمین ہے، پھر ان سے پوچھا گیا کہ زمین کے نیچے کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ پانی ہے، پھر ان سے پوچھا گیا کہ پانی کے نیچے کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ زمین ہے، پھر پوچھا گیا کہ

زمین کے نیچے کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ پانی ہے، پھر پوچھا گیا کہ پانی کے نیچے کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ زمین ہے؟ پھر پوچھا گیا کہ زمین کے نیچے کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ پانی ہے، پھر پوچھا گیا کہ پانی کے نیچے کیا ہے؟

تو انہوں نے فرمایا کہ زمین ہے، پھر پوچھا گیا کہ زمین کے نیچے کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ چٹان ہے، پھر ان سے پوچھا گیا کہ چٹان کے نیچے کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ہے، پھر پوچھا گیا کہ فرشتہ کے نیچے کیا ہے؟

تو انہوں نے فرمایا کہ ایک مچھلی ہے، جس کے کنارے عرش سے لٹکے ہوئے ہیں، پوچھا گیا کہ مچھلی کے نیچے کیا ہے؟ تو فرمایا کہ ہوا اور تاریکی ہے اور ان کا علم ختم ہو گیا۔ اس روایت کو اخبار بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے۔ (شرح تفسیر ابن کثیر لعبد العزیز بن عبد اللہ بن عبد الرحمان الراجحی)

کھجور کی فضیلت اور اقسام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ {۱۰} ق.

جواب اور کھجور کے اونچے اونچے درخت جن میں تہہ بر تہہ خوشے ہوتے ہیں۔

ابن مردویہ رحمہ اللہ نے قطبہ سے روایت کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کے وقت میں یہ پڑھتے ہوئے سنا جب آپ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ پر پہنچے (اور لمبے لمبے کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گوندے ہوئے ہیں) تو فرمایا قطبہ میں کہتا ہوں وہ کھجور کے درخت جن کو بہت لمبا بنایا گیا۔ (مستدرک حاکم) حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ سے مراد ہے لمبی کھجوریں۔ (ابن جریر)

عبد اللہ بن عثمان بن خثیم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے عکرمہ رحمہ اللہ سے "والنخل بسقت" کے بارے میں پوچھا میں نے کہا کہ اس کا بسوق کیا ہے؟ فرمایا "بسوقھا" سے مراد ہے کھجور کا گچھا، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بکری کے لئے کہا جاتا ہے جب اس کے بچے پیدا کرنے کا وقت قریب ہوتا ہے تو کہا جاتا

ہے کہ "بسقت" عبد اللہ بن عثمان نے کہا پھر میں سعید بن جبیر کی طرف لوٹ آیا، میں نے ان سے یہ بات کہی تو انہوں نے فرمایا اس نے خلاف حقیقت بات کہی ہے، ایسا نہیں ہے، "بسقت النخل" سے مراد کلام عرب میں اس کا لمبا اور طویل ہونا ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "والنخل بسقت" (لمبی لمبی کھجوریں) پھر فرمایا "طلع نضید" (پھل تہ بہ تہ)

حضرت عبد اللہ بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "والنخل بسقت" سے مراد ہے ان کا سیدھا کھڑا ہونا۔ (ابن جریر) حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ "بسوقھا" سے مراد ہے اس کا لپٹنا یعنی کھجوروں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہونا۔ (ابن المنذر) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "طلع نضید" (اس کے پھل ہیں تہ بہ تہ) یعنی ان کے گچھوں میں پھل کا ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ہونا۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

طلع "کھجور کے اس گدرے گدرے پھل کو کہتے ہیں جو پہلے پہلے نکلتا ہے، "نضید" کے معنی ہیں : تہ بہ تہ، اس سے پہلے "جنت" کا لفظ تھا، جس کا معنی ہے: پھلوں کے باغات اور پھلوں میں کھجور بھی شامل ہے لیکن اس کو خصوصیت سے الگ ذکر فرمایا کیونکہ عرب میں کھجور کی ایک خاص اہمیت ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درختوں میں ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے گرتے نہیں ہیں اور وہ مسلمان کی مثل ہے مجھے بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ صحابہ کے خیالات جنگل کے درختوں کی طرف چلے گئے اور میرے دل میں یہ آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، پس مجھے حیاء آئی، پھر صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! بتایئے وہ کون سا درخت ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

آپ نے فرمایا: کھجور کا درخت مسلمان کی مثل ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ کھجور کے درخت کی ہر چیز کام میں آجاتی ہے، اس کا تنا گاڈر کی طرح چھت بنانے میں کام آتا ہے، اس کے پتوں کی چٹائیاں اور ہاتھ کے پنکھے بنائے جاتے ہیں، اس کا پھل گدرا بھی کھایا جاتا ہے، تر و تازہ بھی، خوب پکنے کے بعد اور سوکھ جائے تو چھوہارا بن جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان ثواب کی نیت سے جو کام بھی کرے اس پر اجر ملتا

ہے حتیٰ کہ اس کے سونے، جاگنے اور کھانے پینے پر بھی اجر ملتا ہے۔ (تبیان القرآن)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: درختوں میں ایک درخت ایسا ہے کہ اس کے پتے نہیں گرتے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مسلمان۔ بتاؤ وہ کونسا درخت ہے؟ لوگوں کا خیال صحرائی درختوں کی طرف گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ کھجور کا درخت ہے۔ (بخاری)

یہ بھی رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: اپنی پھوپھی یعنی کھجور کے درخت کی عزت کرو۔ تمہارے باپ آدم کی جسمانی ساخت سے جو مٹی بچ رہی تھی، اس سے اس (درخت) کو بنایا گیا اور جس درخت کے نیچے مریم بنت عمران کے بطن سے (عیسیٰ کی) پیدائش ہوئی۔ اس سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک کوئی درخت نہیں۔ پس تم اپنے اہل وعیال کو کھجوریں کھلاؤ اور اگر کھجوریں نہ ہوں تو چھوارے کھلاؤ۔

کھجور کا یہاں خصوصیت کا ساتھ الگ ذکر کرنے کی وجہ حضرات مفسرین کرام نے بیان فرمائی ہے کہ عرب کا خاص میوہ یہی تھا جو ان کے لیے بہترین پھل بھی تھا اور بڑی حد تک ان کی غذائی ضرورت بھی پوری کرتا تھا۔ اس کی دراز قامتی اور اس کے تہ بہ تہ خوشوں کی طرف اشارہ مخاطب کے اندر مشاہدۂ کائنات کی حس اور شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہے کہ وہ قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھے اور ان سے وہ اثر لے جو ایک حساس اور بیدار دل کو لینا چاہیے۔

کھجوروں کے درخت پر تم کو لمبے لمبے اور بے ڈھنگے سوکھے ہوئے تنے اور ان پر جھاڑ کے سے پتے نظر آرہے ہیں ان پر غور کرو اور ان کے پکنے کے قریب گندھے ہوئے گچھوں پر نظر کرو اور پھر اس درخت کے نیچے کی زمین کو بھی ایک بار دیکھ لو کیا ان میں کوئی مشابہت تم کو نظر آتی ہے؟ اچھا ذرا اس کو ایک بار چکھ کر بھی دیکھو سبحان اللہ!

یہ تازہ کھجوریں اور یہ کھجور کا درخت اور پھر اس کا تنا اور اس کے پاؤں کی زمین، وہ کون ہے جس نے اس شور زمین سے میٹھا رس نچوڑ کر اس تازہ کھجور کے اندر بھر دیا ہے جو خود بھی میٹھا ہے اور پھر اتنا میٹھا ہے کہ اپنے سے بہت زیادہ چیزوں کو بھی میٹھا کر دیتا ہے اور تم اس مٹھاس سے کتنے ہی کام ہیں جو ذرا عقل وفکر سے کام لے کر رہے ہو کیا اس سے توحید الٰہی اور ربوبیت خداوندی کے دلائل حاصل کرنا

چاہو تو نہیں حاصل کر سکتے۔

کھجور کے بہت سے فوائد بیان کیے گئے ہیں، کھجور جلد ہضم ہونے والی غذا ہے، توانائی کو فوری طور پر بحال کرتی ہے، کمزوری دور کرتی ہے، رنگ نکھارتی ہے، خون پیدا کرتی ہے، سر درد کے لیے مفید ہے، بلغم کو خارج کرتی ہے، معدے کے زخموں کے لیے مفید ہے، قبض کا بہترین علاج ہے، پیٹ کے کیڑے مارتی ہے، کھجور کھانے والوں کی نظر کمزور نہیں ہوتی، دل کی بیماریوں کو دور کرتی ہے، دانتوں اور مسوڑھوں کو مضبوط کرتی ہے، اور کوئی فائدہ نہ بھی ہو تو یہی فائدہ کس قدر بڑا ہے کہ کھجور کھانا پیارے نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

حدیث شریف میں کھجور کے لیے مختلف نام استعمال ہوئے ہیں، ان میں ایک نام بلح ہے، ایک نام بسر ہے، ایک نام تمر ہے، ایک نام جمار ہے، ایک نام رطب ہے، ایک نام طلح ہے، ایک نام طلع ہے، ایک نام عجوہ ہے، حدیث کی کتابوں میں یہ نام موجود ہیں۔

بلح: بلح وہ کھجور ہے جو کچی ہو اور نمو کے دوسرے مرحلے میں ہو، اس کا ذکر سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں ہے، حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ إِذَا نَظَرَ إِلَى ابْنِ آدَمَ يَأْكُلُ الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ يَقُولُ: بَقِيَ ابْنُ آدَمَ حَتَّى أَكَلَ الْحَدِيثَ بِالْعَتِيقِ، کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ کھاؤ، اس لیے کہ جب شیطان ابن آدم کو کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ ابن آدم رہ گیا، جو نئی چیز کو پرانی کے ساتھ ملا کر کھا رہا ہے۔ محدثین نے اس حدیث کے ایک راوی کو منکر قرار دیا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں بلح کھجور کے بارے میں ارشاد ہے كُلُوا الْبَلَحَ بِالتَّمْرِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْزَنُ إِذَا رَأَى ابْنَ آدَمَ يَأْكُلُهُ يَقُولُ: عَاشَ ابْنُ آدم حَتَّى أَكَلَ الْجَدِيدَ بِالْخَلَقِ (مسند البزار) کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ کھاؤ، کیونکہ شیطان جب کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ کھاتے دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ابن آدم کیسی زندگی گزار رہا ہے کہ نئی کھجور

کو پرانی کے ساتھ کھائے جارہا ہے۔

مسلم طبیبوں کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ تناول فرمانے کا حکم دیا ہے، نیم کچی کھجور کو چھوہارے کے ساتھ کھانے کا ارشاد نہیں فرمایا، اس لیے کہ کچی کھجور بارد یا بس ہوتی ہے اور چھوہارہ حار رطب ہوتا ہے، ان دونوں کو ایک ساتھ کھانے سے ایک دوسرے کی اصلاح ہوگی اور نیم پختہ کو چھوہارے کے ساتھ کھانے سے یہ بات نہیں پیدا ہوگی، کیونکہ دونوں ہی گرم ہیں، اگرچہ چھوہارے کی حرارت نیم پختہ کھجور سے زیادہ ہے اور فن طب کے اعتبار سے بھی دو گرم یا دو بارد چیزوں کو ایک ساتھ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب طب نبوی میں لکھا ہے کہ یہاں اس حدیث میں فن طب کے بنیادی اصول کی جانب راہنمائی مقصود ہے اور یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ ایسی تدابیر پیش نظر رکھنی چاہیے جن سے غذا اور دوا کی کیفیات کا ایک دوسرے سے دفاع ہوسکے اور اس طبی قانون کی بھی رعایت کرنی چاہیے، جس سے صحت کو بحال رکھا جاسکے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کچی کھجور کا مزاج سرد اور خشک ہے، منہ، مسوڑھے اور معدہ کی بیماریوں میں مفید ہے اور سینہ پھیپھڑے کی بیماری میں یہ نقصان دہ ہے، کیونکہ اس میں خشونت پائی جاتی ہے، یہ دیر سے ہضم ہوتی ہے، اس میں معمولی غذائیت بھی ہوتی ہے۔

بلح کی کھجوروں کے درمیان وہی حیثیت ہے جو حصرم (کچے انگور) کی پختہ انگوروں میں ہتی ہے، دونوں ریاح پیدا کرتے ہیں، خصوصاً ان دونوں کے کھانے کے بعد جب پانی پی لیا جائے تو پیٹ میں گڑبڑ پیدا ہوجاتی ہے، ان کا نقصان چھوہارے کے استعمال سے جاتا رہتا ہے، شہد اور مکھن کے استعمال سے بھی اس کا نقصان ختم ہوجاتا ہے۔ (طب نبوی)

بسر: نیم پختہ کھجور کو بسر کہا جاتا ہے، بسر کا بھی ذکر حدیث شریف میں ہے، أَنَّ أَبَا الْهَيْثَمِ بْنَ التَّيِّهَانِ، لَمَّا ضَافَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وأبو بكر وعمر رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، جَاءَهُمْ بِعَذْقٍ وَهُوَ مِنَ النَّخْلَةِ كَالْعُنْقُودِ مِنَ الْعِنَبِ فَقَالَ لَهُ: هَلَّا انْتَقَيْتَ لَنَا مِنْ

رطبه فقال: أحببت أن تنقوا مِنْ بُسْرِهِ وَرُطَبِهِ، جب ابو ہیثم بن تیہان نے حضرت نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمر کی مہمان نوازی کی تو اس موقع پر وہ کھجور کا ایک خوشہ ان کی خدمت میں لایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تازہ کھجوروں کو چن کر لائے ہوتے، اس پر ابو الہیثم بن تیہان نے کہا کہ میری خواہش یہ تھی کہ نیم پختہ اور پختہ کھجوروں میں سے جسے آپ پسند کریں چن کر کھالیں۔

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نیم پختہ کھجور حار یابس ہے، اس کی خشکی اس کی حرارت سے بڑھی ہوئی ہے، رطوبات کو خشک کرتی ہے، معدہ کو صاف کرتی ہے، پائخانہ کو روکتی ہے، منہ اور مسوڑہ کے لیے فائدہ مند ہے، اس کی سب سے زیادہ نفع بخش وہ قسم ہوتی ہے جو آسانی سے چور ہو جائے اور میٹھی ہو، اس کا زیادہ استعمال اور اسی طرح کچی کھجوروں کا زیادہ کھانا آنتوں میں سدے پیدا کرتا ہے۔

تمر: تمر کا ذکر بھی حدیث صحیح میں موجود ہے، تمر چھوہاروں کو کہا جاتا ہے، بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ تَصَبَّحَ بِسَبْعِ تَمَرَاتٍ وَفِي لَفْظٍ: مِنْ تَمْرِ الْعَالِيَةِ لَمْ يَضُرَّهُ ذَلِكَ الْيَوْمَ سُمٌّ وَلَا سِحْرٌ، جس نے صبح کے وقت سات چھوہارے کھائے اور دوسرے لفظوں میں یوں ہے کہ جس نے عوالی مدینہ کے ساتھ چھوہارے کھائے نہ اسے زہر نقصان دے گا اور نہ اس پر جادو کا اثر ہو گا۔ ایک مرفوع روایت میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے، آپ نے فرمایا بَيْتٌ لَا تَمْرَ فِيهِ جِيَاعٌ أَهْلُهُ (مسلم)

جس گھر میں چھوہارے نہ ہوں اس گھر کے لوگ بھوکے ہیں، نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے چھوہارے کو پنیر کے ساتھ اور روٹی کے ساتھ کھایا اور اسی طرح بلا کسی چیز کے صرف چھوہارے کا کھانا بھی ثابت ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مزاج تیسرے درجہ میں گرم ہے، پہلے درجہ میں رطب ہے یا یابس ہے؟ دونوں اقوال اطباء سے منقول ہیں، یہ جگر کے لیے مقوی ہے، پائخانہ کو ڈھیلا کرتا ہے، مقوی باہ ہے، خصوصاً جب صنوبر کے ساتھ اس کا استعمال ہو تو باہ کو قوی کرنے میں طاق ہے۔

اور حلق کی خشونت سے نجات دلاتا ہے اور ٹھنڈے علاقے کے لوگ جو اس کے کھانے کے

عادی نہ ہوں اس کے استعمال کرنے سے ان میں سدے پیدا ہوتے ہیں، اور دانتوں کو اذیت درد سر پیدا کرتا ہے، بادام اور دانہ پوستہ کے ذریعہ اس کے ضرر کو دفع کیا جاسکتا ہے۔

پھلوں میں سب سے زیادہ جسم کے لیے اس میں غذائیت ہوتی ہے، کیونکہ اس میں حار رطب جوہر موجود ہے، نہار منہ اس کے کھانے سے پیٹ کے کیڑے مر جاتے ہیں، کیونکہ اس میں حرارت ہونے کے ساتھ ہی تریاقی قوت موجود ہے اور اگر اس کو نہار منہ ہمیشہ استعمال کرتے رہیں، تو کیڑے کی تولید کم ہو جاتی ہے اور اسے کمزور کر دیتا ہے، یا کم کر دیتا ہے، یا اس کو بالکل فنا کر دیتا ہے، یہ پھل، غذا، دوا، او رمشروب اور حلوہ بھی ہے۔

جمار: کھجور کے گابھے کو جمار کہا جاتا ہے، قلب النخل درخت کھجور کے تنے کا اندرونی نرم حصہ جمار کہلاتا ہے، بخاری اور مسلم شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ بَيْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جُلُوسٌ، إِذْ أُتِيَ بِجُمَّارِ نَخْلَةٍ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً مِثْلَ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا (بخاری و مسلم) ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ آپ ﷺ کی خدمت میں کھجور کا گابھا لایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جو مسلمان آدمی کی طرح ہے، جس پر خزاں کبھی نہیں آتی اور اس کے پتے کبھی جھڑ کر نہیں گرتے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمار کا مزاج پہلے درجہ میں باردیابس ہے، زخموں کو مندمل کرتا ہے، نفث الدم میں مفید ہے، دست کو روکتا ہے، مرہ صفراء کے غلبہ کو ختم کرتا ہے، ہیجان دم پیدا کرتا ہے، معمولی طور پر تغذیہ بدن کرتا ہے، دیر ہضم ہے، اس کے درخت کا ہر حصہ مفید ہے، اسی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے مرد مومن سے اس کی تشبیہ دی ہے، اس لیے اس کے منافع بہت زیادہ ہیں اور اس کا خیر غیر معمولی ہے۔

رطب: تازہ کھجور کو رطب کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں رطب کا ذکر موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً

جَنِيًّا فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْناً (سورۃ مریم ۲۵) اور کھجور کے درخت کو اپنی طرف ہلا وہ تجھ پر ترو تازہ کھجوریں گرائے گا پھر اسے کھاؤ اور پانی پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔

حضرت عبد اللہ بن جعفر سے مروی ہے، انہوں نے بیان فرمایا کہ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم يأكل القثّاء بالرطب (بخاری) میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ککڑی تر کھجور کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ سنن ابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُفْطِرُ عَلَى رُطَبَاتٍ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَتَمَرَاتٍ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَمَرَاتٌ، حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ ، رسول کریم ﷺ چند تازہ کھجوروں سے روزہ افطار کرتے، پھر نماز مغرب پڑھتے، اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوہاروں سے افطار فرماتے، اگر چھوہارے بھی میسر نہ ہوتے تو چند گھونٹ پانی پی کر افطار کر لیتے۔ (سنن ابی داؤد)

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تازہ کھجور کا مزاج پانی کی طرح گرم تر ہے، بارد معدوں کو تقویت دیتی ہے، اور اس کے عین موافق ہے، قوت باہ میں اضافہ کرتی ہے، جسم کو شاداب بناتی ہے، سرد مزاج کے لوگوں کو یہ راس آتی ہے اور کثیر غذا ہونے کی وجہ سے خاصی غذائیت دیتی ہے۔

مدینہ والے اور ان جیسے دوسرے ان ممالک کے لیے جہاں کھجور پھل شمار کی جاتی ہے، سب سے اعلیٰ ترین پھل ہے، بدن کے لیے انتہائی نفع بخش ہے، اگر کوئی اس کا عادی نہ ہو وہ بکثرت استعمال کرے تو اس کے بدن میں بہت تیزی سے تعفن پیدا کرتی ہے، اور اس سے خراب خون پیدا ہوتا ہے، اس کے بکثرت استعمال سے سر درد پیدا ہوتا ہے اور سوداء میں اضافہ ہوتا ہے، دانتوں کو نقصان پہنچاتی ہے، اس کی اصلاح سکنجبین وغیرہ سے کی جاتی ہے۔

تازہ کھجور، چھوہارہ یا پانی سے نبی کریم ﷺ کے روزہ افطار کرنے میں بہت لطیف حکمت پوشیدہ ہے، اس لیے کہ روزہ کی وجہ سے معدہ غذا سے خالی ہو جاتا ہے، اب جگر کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی جس کو جذب کر کے قوی اور اعضاء کو بدل مایتحلل کے طور پر دے اور شیریں چیز جگر کو بہت زیادہ مرغوب ہے، اس لیے جگر کی طرف بہت جلد سرایت کر جاتی ہے، اور اگر تازہ کھجور ہے تو جگر اسے اور

زیادہ بڑھ کر قبول کرتا ہے، چنانچہ اس سے قوی اور جگر دونوں ہی کو قوت ملتی ہے، اگر کھجور نہ ہو تو چھوہارہ اپنی شیرینی اور غذائیت کے لحاظ سے بہتر ہے، اگر یہ بھی نہ ہو تو چند گھونٹ پانی ہی معدہ کی لپٹ اور روزہ کی گرمی کو بجھا دیتا ہے، پھر اس کے بعد کھانے کی خواہش ابھرتی ہے، اور پوری رغبت سے کھانا کھایا جاتا ہے۔

طلح: خرما یا کیلے کے شگوفے کو طلح کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں طلح منضود کا ذکر موجود ہے، بہت سے مفسرین کرام نے طلح سے کیلا مراد لیا ہے، منضود تہہ بہ تہہ، ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی کنگھی کی طرح، بعضوں نے طلح کو کانٹے دار درخت کے معنیٰ میں لیا ہے، جس کے کانٹے کی جگہ میں ایک پھل دبا ہوتا ہے، چنانچہ اس کا پھل ایک دوسرے پر چڑھا ہوا تہہ بہ تہہ ہوتا ہے، جس طرح کیلے کا پھل ہوتا ہے، یہی قول راجح ہے۔

طلع: کھجور کے گابھے طلع کو کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں سورۃ ق کی آیت ۱۰ میں طلع نضید کا ذکر موجود ہے، اور لمبی کھجوریں پیدا کرتے ہیں جن کے گابھے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے اور کھجوروں میں جن کے شگوفے بہت نازک اور تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ (سورۃ شعراء ۱۴۸)

شگوفہ: شگوفہ کھجور جو پھل آنے کے شروع میں کھجور کے درختوں پر پھوٹتا ہے، اس کے چلکھے کو کفری کہتے ہیں، نضید منضود کے معنیٰ میں ہے، کہ کنگھی کی طرح ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی، جب تک شگوفہ غلاف میں بند رہے اسے نضید کہیں گے اور جب غلاف سے باہر نکل آیا تو وہ نضید نہ رہا، ہضیم اور نضید دونوں کا معنیٰ ایک ہی ہے۔

شگوفہ کی دو اقسام ہیں: تلقیح، نر کے مادے کو جو پسے ہوئے آٹے کی طرح ہوتا ہے، مادہ میں داخل کر دینا، جسے عرف میں تابیر کہتے ہیں، اور یہ عمل نر و مادہ کے درمیان جفتی کے حکم میں ہوتا ہے، مسلم شریف میں حضرت طلحہ بن عبید سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا مَرَرْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَخْلٍ، فَرَأَى قَوْمًا يُلَقِّحُونَ، فَقَالَ: مَا يَصْنَعُ هَؤُلَاءِ؟ قَالُوا: يَأْخُذُونَ مِنَ الذَّكَرِ فَيَجْعَلُونَهُ فِي الْأُنْثَى، قَالَ: مَا أَظُنُّ ذَالِكَ يُغْنِي شَيْئًا، فَبَلَغَهُمْ، فَتَرَكُوهُ،

فَلَمْ يَصْلُحْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا هُوَ ظَنٌّ، فَإِنْ كَانَ يُغْنِي شَيْئًا، فَاصْنَعُوهُ، فَإِنَّمَا أَنَا بشر مثلكم، وإنّ الظنّ يخطىء وَيُصِيبُ، وَلَكِنْ مَا قُلْتُ لَكُمْ عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ. فَلَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللهِ، میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک کھجور کے درخت کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ لوگ تابیر کر رہے ہیں، آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ یہ نر کھجور کا مادہ لے کر مادہ میں داخل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میرے خیال سے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے، جب یہ خبر لوگوں کو ملی تو انہوں نے اس کو چھوڑ دیا، چنانچہ اس سال پھل عمدہ نہیں ہوا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرا ایک خیال تھا، اگر اس سے کچھ فائدہ ہو تو اس کو کرو، اس لیے کہ میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، اور خیال کبھی غلط اور کبھی صحیح ثابت ہوتا ہے، لیکن جو باتیں میں وحی الٰہی سے کہتا ہوں تو میں اس میں ہرگز جھوٹ نہیں بولتا۔ (مسلم)

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شگوفہ کھجور قوت باہ کے لیے مفید ہے، قوت جماع بڑھاتا ہے، اگر عورت اس کے سفوف کا جماع کرنے سے پہلے حمول کرے تو حاملہ ہونے میں بھرپور مدد ملتی ہے، اس کا مزاج دوسرے درجہ میں سرد خشک ہے، معدہ کو تقویت پہنچاتا ہے، اور اس کی حفاظت کرتا ہے اور خون کو گاڑھا کر کے اس کے ہیجان کو روکتا ہے، دیر ہضم ہے۔

گرم مزاجوں کے لیے ہی اس کا استعمال مفید ہے اور اگر اس میں زیادتی ہو جائے تو اس صورت میں گرم جوارشات کا استعمال کرنا چاہیے، پائخانہ بستہ کرتا ہے، آنتوں کو مضبوط بناتا ہے اور جمار (صمغ کھجور) اسی کے حکم میں ہے، اسی طرح کچی اور نیم پختہ کھجور کا درجہ ہے، اس کا بکثرت استعمال معدہ اور سینے کے لیے ضرر رساں ہے، اس کے کھانے سے کچھ قولنج بھی ہو جاتا ہے، اس کا ضرر دور کرنے کے لیے گھی یا مذکورہ اصلاح پسند چیزوں میں سے کسی کو اس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ (طب نبوی ابن جوزی)

عجوہ: تازہ کھجور کی ایک عمدہ قسم ہے، بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ تَصَبَّحَ بِسَبْعِ تَمَرَاتٍ عَجْوَةً، لَمْ يَضُرُّهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ سُمٌّ وَلَا سِحْرٌ، جس نے صبح کے وقت عجوہ کھجور کے سات دانے کھا لیے اس کو اس دن

زہر اور جادو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

سنن نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اَلْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَهِيَ شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ، عجوہ جنت سے آئی ہے یہ زہر کے لیے شفاء ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس عجوہ سے مراد مدینہ منورہ کی عجوہ کھجور ہے، جو وہاں کی کھجور کی ایک عمدہ قسم ہے، حجازی کھجوروں میں سب سے عمدہ اور مفید ترین کھجور ہے، یہ کھجور کی اعلیٰ قسم ہے، انتہائی لذیذ اور مزیدار ہوتی ہے، جسم اور قوت کے لیے موزوں ہے، تمام کھجوروں سے زیادہ رس دار لذیذ اور عمدہ ہوتی ہے۔

دقل: حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہر وہ کھجور جس کا کوئی نام نہیں ہے اسے دقل کہا جاتا ہے، اس کی واحد دقلۃ ہے، اس کی جمع ادقال ہے، اس کا تثنیہ دقلتان ہے، حضرت ابوالحسن فرماتے ہیں کہ اشیاء کی اجناس میں ایک کھجور ایسی جنس ہے جس کی جمع آتی ہے، ورنہ باقی اجناس کی جمع استعمال نہیں ہوتی، حضرت ابو عبیدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دقل کھجور کے رنگوں کو کہا جاتا ہے۔

ام جرذان: یہ بھی کھجور کی ایک قسم ہے، مدینہ کی کھجور کو ام جرذان اسی طرح کہا جاتا ہے جیسے ایرانی کھجور کو برنی کہا جاتا ہے، ام جرذان کو فارسی میں موشان بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے درخت کے نیچے چوہے جمع ہو جاتے ہیں۔

کبیس: جب کھجور خشک ہو جائے تو اسے کبیس کہا جاتا ہے۔ اہل بحرین کے نزدیک جب کھجور خشک ہو جائے تو اسے کبیس اور جب تر ہو تو اسے ام جرذان کہا جاتا ہے۔

ھلبات: حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بصرہ کی تر کھجور کو ھلبات کہا جاتا ہے، اسی طرح بسر الجھندر، بسر المجدر، جناسری، خوارزمی، باہین، طیاب، غوانی، عمری، بسر الطبری بھی کھجور ہی کی قسمیں ہیں۔

الطریق: کھجور کی ایک قسم ہے، جو کہ لمبی ہوتی ہے۔

صفراء البسر: حجاز کی کھجور کے ابتدائی پھل کو صفراء البسر، برشومہ اور شقمہ کہا جاتا ہے، بصرہ کی کھجور کے

ابتدائی پھل کو قسب اور عزف کہا جاتا ہے،

عرف: کھجور کے درخت سے پہلے پہل جو پھل کھایا جاتا ہے اسے عرف کہا جاتا ہے۔

مقدام: عمان کی کھجور کے پہلے پہل پھل کو مقدام کہا جاتا ہے۔

اعشوا: کھجور کی پیوند کاری سے لے کر پھل آنے تک کے مرحلے کی کھجور کو رطب کہا جاتا ہے، پھر پچاس راتوں تک کی کھجور کو اعشوا کا نام دیا جاتا ہے، پھر آخری پھل تک اس کا یہی نام رہتا ہے۔

باہین: باہین بھی کھجور کی ایک قسم ہے، ہجر کی کھجور کو باہین کہا جاتا ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ پورا سال اس پر پھل رہتا ہے، سوائے ایک ماہ کے۔

عمانیہ: بصرہ میں کھجور کا ایک درخت ہے جسے عمانیہ کہا جاتا ہے۔

تعضوض: یہ کھجور کی ایک قسم ہے، اس کی واحد تعضوضہ ہے، اس کی کھجوریں بڑی بڑی ہوتی ہیں۔

حمر اور حومر: ہندی کھجور کو کہا جاتا ہے، اس کا پتا اس کے غلاف کی طرح ہوتا ہے، جسے بلخی بھی کہا جاتا ہے، اس کے پھل کو صبار کہا جاتا ہے، یوں بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا درخت اخروٹ کے درخت کی طرح ہوتا ہے۔

صقرہ لذیذہ: تمر کی عمدہ قسم کو عربی زبان میں صقرہ لذیذہ کہا جاتا ہے۔

طن: سرخ رنگ کی رطب کی ایک قسم ہے جسے طن کہا جاتا ہے، یہ بہت ہی میٹھی کھجور ہوتی ہے، بہت رسیلی کھجور ہوتی ہے، اس کے اندر بھرپور رس کی وجہ سے اسے سیلانی بھی کہا جاتا ہے، جب انہیں اکٹھا کیا جاتا ہے تو نچوڑے بغیر ہی ان کا رس نکلنے لگتا ہے، ان میں رطوبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

عقدان: یہ بھی کھجور کی ایک قسم ہے۔ سکر: اس کا درخت آگ کے درخت کی طرح ہوتا ہے۔

فوفل: کھجور کی ایک قسم ہے، جو سرخ اور کالی ہوتی ہیں۔ جدم: یہ بھی کھجور کی ایک قسم ہے۔

بیذخ۔ یہ بھی کھجور کا ایک مشہور درخت ہے۔ خاروج۔ یہ بھی کھجور کی ایک قسم ہے۔

معالیق: یہ بھی کھجور کی ایک قسم ہے۔ ناقم: یہ تمر کی ایک قسم ہے۔

عجمضی۔ تمر کی ایک قسم ہے۔ بجون: رطب مدینہ کی ایک قسم ہے۔

معمد: رطب کھجور کی ایک قسم ہے۔ عجاف: کھجور کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔
مجدول: مراکش و اُردن کی مشہور کھجور ہے، اس کا سائز میں بڑا ہوتا ہے، یہ نرم ہوتی ہے، یہ کھجور بہت میٹھی ہوتی ہے، مجدول "کھجوروں کی ملکہ" کہلاتی ہے، فوری توانائی، فائبر اور پوٹاشیم سے بھرپور۔
دیگلت نور: تیونس و الجزائر کی سب سے مشہور قسم کی کھجور ہے، یہ نیم خشک ہوتی ہے، شفاف سنہری رنگت کی ہوتی ہے، قرآن خوانی وروزمرہ استعمال میں عام، یہ کھجور دیرپا ذخیرہ کے لیے موزوں ہے۔
زاہدی: یہ کھجور کی قسم عراق و ایران میں عام پائی جاتی ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کی رنگت زرد مائل ہوتی ہے، کم مٹھاس والی کھجور ہوتی ہے، شوگر کے مریضوں کے لیے بہتر ہے، اسے خشک کرلیا جائے تو زیادہ دیر تک استعمال ہو سکتی ہے۔
خضراوی: عراقی کھجور کی اقسام میں سے ایک خضراوی ہے، یہ نرم کھجور ہوتی ہے، گہرے بورے رنگ کی ہوتی ہے، معدے کے لیے ہلکی ہوتی ہے، بچوں اور بوڑھوں کے لیے موزوں ہوتی ہے۔
حلوی: حلو عربی زبان میں میٹھے یا مٹھاس کو کہا جاتا ہے، یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، میٹھی کھجور ہوتی ہے، نرم ہوتی ہے، کیریمل جیسا ذائقہ رکھتی ہے، توانائی بخش ہوتی ہے، کمزور لوگوں کی صحت کے لیے مفید ہے۔ برحی: زرد رنگ کی ہوتی ہے، تر حالت میں کھائی جاتی ہے، سیب کی طرح کرکری ہوتی ہے، زیادہ تر تازہ (رطب) استعمال ہوتی ہے، بازار میں مہنگی شمار ہوتی ہے۔ صفاوی: یہ مدینہ منورہ کی مشہور کھجور ہے، عجوہ سے ملتی جلتی ہے مگر قدرے لمبی ہوتی ہے، خون کی کمی میں مفید ہے، عام طور پر سردیوں میں استعمال ہوتی ہے۔
سکری: سعودی عرب کی نہایت میٹھی کھجور ہے، شوگر (ذیابیطس) کے مریضوں کے لیے نامناسب ہے، قوتِ باہ میں اضافہ کرتی ہے، بہت زیادہ استعمال کی جائے تو کھجور دانتوں کے لیے نقصان دہ ہے۔
مبروم: یہ کھجور کی قسم مدینہ منورہ کی اعلیٰ اقسام کی کھجور میں شمار ہوتی ہے، یہ لمبی ہوتی ہے، پتلی ہوتی ہے، ہلکی مٹھاس والی ہوتی ہے، معدہ کے لیے بہتر ہوتی ہے۔
انبرہ: یہ کھجور بہت بڑی جسامت والی ہوتی ہے، یہ مدینہ منورہ کی کھجور ہے، دل اور اعصاب کے لیے مفید

ہوتی ہے، یہ کھجور وہ ہے جو خاص مہمانوں کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

ربیعہ: یہ یمن و حجاز میں معروف و مشہور ہے، گہرے رنگ کی ہوتی ہے، دیرپا ذخیرہ کے قابل ہے، یہ سفر میں استعمال کی جاتی ہے۔ ثوری: الجزائر کی قدیم قسم کی کھجور ہے، سخت ہوتی ہے، تاثیر میں خشک ہے، یہ کھجور مجاہدین اور مسافروں کی خوراک سمجھی جاتی تھی، اس کھجور کی خصوصیت یہ ہے کہ بہت دیر تک خراب نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں اس سورت کی آیت میں کھجور کے درخت کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، یہ اس کی حکمت کاملہ اور حجت بالغہ ہے کہ وہ اشارے میں بات کرتا ہے مگر اس کی تہہ میں علم و عرفان کے بحر ذخار موجزن اور متلاطم ہوتے ہیں، ان کی ایک ایک موج میں کئی علمی موجیں رواں دواں ہوتی ہیں، کھجور کا یہاں اگرچہ مختصر ذکر کیا گیا ہے، مگر اس پر تحقیق کاروں نے کیا کچھ رقم کر دیا، دیکھ اور پڑھ کر بے ساختہ سبحان اللہ کہنے کا جی چاہتا ہے۔ وہی ذات حق ہے جسے خالق، جسے الباری، جسے البدیع اور المصور کہا جاتا ہے۔

بندگان خدا کا رزق

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

رِزْقًا لِّلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ {۱۱} ق

جواب ترجمہ: بندوں کی روزی کے لیے اور اس سے ہم نے مردہ علاقہ کو زندہ کر دیا بس ایسے ہی ہو گا نکلنا (قبروں سے)

رِزْقًا لِّلْعِبَادِ: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، اس سے باغات، کھیتیاں اور کھجور کے درخت اگائے، اور یہ سب کچھ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے رزق کے طور پر پیدا کیا۔ یہاں "عباد" سے مراد تمام انسان ہیں، چاہے وہ مومن ہوں یا کافر، کیونکہ سب اللہ کے بندے ہیں اور سب کو اللہ ہی رزق دیتا ہے۔ اس میں اللہ کی عام رحمت اور اس کی ربوبیت کا بیان ہے کہ وہ سب کو رزق دیتا ہے، چاہے وہ اس کی اطاعت کریں یا نہ کریں۔

وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا: اسی پانی کے ذریعے ہم نے مردہ (بنجر) زمین کو زندہ کر دیا۔ بارش سے پہلے وہ زمین مردہ اور بے آب و گیاہ تھی، لیکن جب بارش برسی تو وہ سرسبز ہو گئی، اس میں کھیتیاں اور باغات اگ آئے۔

كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ: یعنی جس طرح اللہ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے، اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو قبروں سے زندہ کر کے نکالے گا۔ یہ ایک مثال ہے کہ جس طرح تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ مردہ زمین بارش سے زندہ ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ کے لیے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا بھی آسان ہے۔ اس میں قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے (بعث بعد الموت) پر دلیل دی گئی ہے۔

اصحاب الرس کا عبرت ناک منظر

سوال آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتایئے اصحاب الرس کون تھے؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ {۱۲} وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ {۱۳} ق

جواب ترجمہ: ان سے پہلے نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور ثمود کے لوگوں نے بھی (اس بات کو) جھٹلایا تھا۔ نیز قوم عاد اور قوم فرعون اور لوط کے بھائیوں نے بھی۔

اصحاب الرس کا تذکرہ قرآن کریم میں دو مقامات پر ہوا ہے، ایک سورۃ الفرقان میں ہے اور ایک یہاں سورۃ ق میں ہے۔ الرس کلام عرب میں اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس کے گرد منڈیر نہ ہو، یعنی معادن کے کنوئیں، کتب لغت میں مرقوم ہے کہ الرس اس کنوئیں کا نام تھا جو قوم ثمود کے بقیہ کاوٹھکانا ایک قول یہ ہے کہ الرس بنو اسد کے پانی اور ان کے باغات کا نام ہے۔

علامہ عبد الکریم قشیری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ پہاڑوں پر جو تہ بہ تہ برف جم جاتی ہے اس کو الرس کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ الرس وہ کنواں ہے جس کے گرد منڈیر نہ ہو۔ ایک قول یہ کہ یہ کنواں آذربائیجان میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کنواں یمامہ میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ انطاکیہ میں ہے۔

علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رس کا معنیٰ ہے دھنسا دینا، لوگوں نے اپنے نبی کو اس میں دھنسا دیا تھا، اس لئے اس کنوئیں کو الرس کہتے ہیں۔ (تفسیر زاد المسیر)

علامہ ابن جوزی نے اپنی تفسیر زاد المسیر میں فرمایا کہ اصحاب الرس کے مصداق میں پانچ اقوال ہیں

① حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصحاب الرس ایک قوم ہے جو درخت کی عبادت کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ابن یعقوب کی اولاد سے ان کی طرف ایک نبی بھیجا، انہوں نے ایک کنواں کھود کر اس نبی کو اس کنوئیں میں گرا دیا، اس کی پاداش میں ان کو عذاب سے ہلاک کر دیا گیا۔

② سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ وہ قوم ہے جس کے نبی کا نام حنظلہ بن صفوان تھا، انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیج کر ان کو ہلاک کر دیا۔

③ وھب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا یہ قوم ایک کنوئیں کے پاس رہتی تھی، یہ لوگ اس کنوئیں سے پانی لیتے تھے اور ان کے مویشی بھی تھے۔ یہ لوگ بتوں کی عبادت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت شعیب کو بھیجا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو یہ کنواں منہدم ہو گیا (ڈھے گیا) اور ان لوگوں کو اور ان کے گھروں کو اس کنوئیں میں دھنسا دیا گیا۔

④ سدی رحمہ اللہ نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حبیب النجار کو قتل کر کے اپنے کنویں میں ڈال دیا تھ، ان ہی کے متعلق یہ آیت ہے: یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ۔ (یٰسین: ۲۰)

⑤ ابن السائب نے کہا یہ وہ قوم ہے جو اپنے نبی کو قتل کر کے کھا گئی تھی اور یہ وہ قوم ہے جس کی عورتوں نے سب سے پہلے جادو کیا تھا۔ (زاد المسیر ابن جوزی رحمہ اللہ)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بہت سے اقوال اپنی تفسیر میں نقل فرمائے ہیں، حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ وہ قوم تھی جو صنوبر کے درخت کی پوجا کرتی تھی ان کے نبی نے ان کے خلاف بد دعا کی جو یہود کی اولاد میں سے تھے وہ درخت خشک ہو گیا لوگوں نے اس نبی کو قتل کر دیا اور اس کنویں میں بند کر دیا سیاہ بادل ان لوگوں پر سیاہ فگن ہو گیا اور انہیں جلا دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آذربائیجان میں ایک قوم تھی جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا ان کے

درخت اور کھیتیاں خشک ہو گئیں وہ بھوک اور پیاس سے مر گئے۔ ابن وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا وہ کنویں والے تھے وہ اس کے ارد گرد بیٹھا کرتے تھے اور وہ مویشیوں کے مالک تھے وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا اور آپ کو اذیتیں دیں اور اپنے کفر و سرکشی میں حد سے بڑھ گئے۔ اسی اثناء میں کہ وہ اپنے گھروں میں اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو وہ انہیں اور ان کے گھروں کو بہا کر لے گئے اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں دھنسا دیا اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔

قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اصحاب رس اور اصحاب ایکہ دو امتیں تھیں دونوں کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے آپ کو جھٹلایا اللہ تعالیٰ نے دو مختلف عذابوں میں انہیں مبتلا کیا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: رس ایک دیہات تھا جو یمامہ کے علاقہ میں تھا۔ عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایسی قوم تھے جنہوں نے اپنے نبی کو زندہ ایک کنویں میں دفن کر دیا تھا، اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن کعب قرظی سے نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اس راوی سے نقل کی جس نے یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَوَّلُ النَّاسِ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَبْدٌ أَسْوَدُ وَذٰلِكَ أَنَّ اللهَ تَعَالَى بَعَثَ نَبِيًّا إِلَى قَوْمِهِ فَلَمْ يُؤْمِنْ بِهِ إِلَّا ذَالِكَ الْأَسْوَدُ فَحَفَرَ أَهْلُ الْقَرْيَةِ بِئْرًا وَأَلْقَوا فِيهِ نَبِيَّهُمْ حَيًّا وَأَطْبَقُوا عَلَيْهِ حَجَرًا ضَخْمًا وَكَانَ الْعَبْدُ الْأَسْوَدُ يَحْتَطِبُ عَلَى ظَهْرِهِ وَيَبِيعُهُ وَيَأْتِيهِ بِطَعَامِهِ وَشَرَابِهِ فَيُعِينُهُ اللهُ عَلَى رَفْعِ تِلْكَ الصَّخْرَةِ حَتَّى يُدْلِيَهُ إِلَيْهِ فَبَيْنَمَا هُوَ يَحْتَطِبُ إِذْ نَامَ فَضَرَبَ اللهُ عَلَى أُذُنِهِ سَبْعَ سِنِينَ نَائِمًا ثُمَّ هَبَّ مِنْ نَوْمِهِ فَتَمَطَّى وَاتَّكَأَ عَلَى شِقِّهِ الْآخَرِ فَضَرَبَ اللهُ عَلَى أُذُنِهِ سَبْعَ سِنِينَ ثُمَّ هَبَّ فَاحْتَمَلَ حُزْمَةَ الْحَطَبِ فَبَاعَهَا وَأَتَى بِطَعَامِهِ وَشَرَابِهِ إِلَى الْبِئْرِ فَلَمْ يَجِدْهُ وَكَانَ قَوْمُهُ قَدْ أَرَاهُمُ اللهُ تَعَالَى آيَةً فَاسْتَخْرَجُوهُ وَآمَنُوا بِهِ وَصَدَّقُوهُ وَمَاتَ ذٰلِكَ النَّبِيُّ

قیامت کے روز جنت میں سب سے پہلے ایک حبشی غلام داخل ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے ایک نبی اس کی اپنی قوم کی طرف بھیجا اس نبی پر اس سیاہ غلام کے سوا کوئی ایمان نہ لایا بستی والوں نے ایک گڑھا کھودا اور اپنے نبی کو زندہ اس میں پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا۔ وہ سیاہ غلام اپنی پشت پر لکڑیاں کاٹ کر لاتا، انہیں بیچتا، اس سے کھانا اور مشروب خرید تا اس پتھر کو ہٹانے میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا یہاں تک کہ وہ کھانا اس نبی تک لٹکا دیتا۔

اس اثناء میں کہ وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ وہ سو گیا تو اللہ تعالیٰ نے سات سال تک اسے سلائے رکھا پھر وہ نیند سے بیدار ہوا پھر وہ دراز ہو گیا اور بائیں پہلو پر ٹیک لگائی تو اللہ تعالیٰ نے سات سال تک اسے سلائے رکھا پھر وہ اٹھا، لکڑیوں کا گٹھا اٹھایا اسے بیچا اور کھانا پانی کنویں کے پاس لایا تو اس نبی کو نہ پایا۔ اس نبی کی قوم کو اللہ نے ایک نشانی دکھائی تو انہوں نے اسے نکالا، اس پر ایمان لائے، اس کی تصدیق کی اور وہ نبی وصال کر گئے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ ذٰلِكَ الْعَبْدَ الْأَسْوَدَ لَأَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وہ سیاہ غلام سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گا۔ (تفسیر قرطبی فی تفسیر سورۃ الفرقان)

اس واقعہ کو مہدوی اور ثعلبی نے ذکر کیا ہے الفاظ ثعلبی کے ہیں۔ کہا: یہ لوگ اپنے نبی پر ایمان لے آئے تھے تو یہ جائز نہیں کہ یہ لوگ اصحاب الرس ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رس کے بارے میں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں برباد کر دیا مگر یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نبی کے بعد کوئی ایسے افعال کیے ہوں جن کی وجہ سے انہیں برباد کیا گیا ہو۔

کلبی رحمہ اللہ نے کہا: اصحاب رس سے مراد ایسی قوم ہے اللہ تعالیٰ نے جن کی طرف نبی بنا کر بھیجا تو وہ اپنے نبی کو کھا گئے۔ یہ وہ پہلے لوگ ہیں جن کی عورتوں نے ہم جنسی کا عمل کیا، ماوردی نے اسی کا ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: اس سے مراد اصحاب اخدود ہیں جنہوں نے خندقیں کھودیں اور مومنوں کو ان میں جلایا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ قوم ثمود کے بقایا لوگ تھے رس وہی کنواں ہے جس کا ذکر سورۃ حج میں و بئر معطلۃ میں ہوا۔

امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے: أَصْحَابُ الرَّسِّ قَوْمٌ كَانُوا يَسْتَحْسِنُونَ لِنِسَائِهِمُ السَّحْقَ، وَكَانَ نِسَاؤُهُمْ كُلُّهُمْ سَحَّاقَاتٍ، اصحاب رس ایسی قوم ہے

جو اپنی عورتوں کے لیے سحق (ہم جنسی) کو پسند کرتے تھے ان کی تمام عورتیں ہم جنس پرست تھیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَكْتَفِيَ الرِّجَالُ بِالرِّجَالِ وَالنِّسَاءُ بِالنِّسَاءِ وَذَلِكَ السَّحْقُ، قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ مرد مردوں اور عورتیں اور عورتوں پر اکتفا کریں گی"۔ یہی سحق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ق میں اس مقام پر اصحاب رس کا یوں ذکر فرمایا كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ {۱۲} ق، ان سے پہلے نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور ثمود کے لوگوں نے بھی (اس بات کو) جھٹلایا تھا۔

اصحاب الایکہ اور قوم تبع

سوال اصحاب الایکہ اور قوم تبع کون تھی؟

وَأَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ {۱۴} ق.

جواب ترجمہ: اور اصحاب الایکہ اور تبع قوم نے بھی۔ ان سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا، اس لیے میں نے جس عذاب سے ڈرایا تھا، وہ سچ ہو کر رہا۔

حضرات مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ اصحاب الایکہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تھی، اور قوم تبع یمن کے بادشاہ کی قوم تھی، جو اسلام لے آیا تھا اور اس نے اپنی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دی تھی مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا تھا۔

اصحاب ایکہ وہ لوگ تھے جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، یہ لوگ مشرک تو تھے ہی تھے، ساتھ ہی ناپ تول میں کمی بھی کرتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں بہتیرا سمجھایا مگر ان لوگوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، بے ایمان کے بے ایمان رہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا تھا۔

ایکہ کے معنیٰ بن کے ہیں۔ ایکہ ایک جنگل تھا جو مدین کے قریب تھا اس جنگل میں درخت اور پھل بہت تھے۔ ایکہ مدین کے متصل ایک مقام کا نام ہے حضرت شعیب علیہ السلام من جانب اللہ دو قوموں

کی طرف مبعوث ہوئے ایک اصحاب ایکہ کی طرف اور مدین کی طرف یہ لوگ بت پرست ہونے کے علاوہ بدکار اور اوباش تھے کیل اور وزن میں کمی کرتے تھے جس پر بقائے باہمی کا دارومدار ہے جبکہ شعیب علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں میں تمہارے لیے رسول امین ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور تم سے اس وعظ اور تبلیغ پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا میری مزدوری تو صرف رب العالمین پر ہے۔

میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کا حق ربوبیت ادا کرو اور بندوں کی حق تلفی نہ کرو۔ پیمانہ پورا بھر کر دیا کرو اور نقصان پہنچانے والوں اور حق کم کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

ناپ تول میں کمی کرنا یہ بھی ایک قسم کا فساد ہے بلکہ چوری اور رہزنی کا ایک نمونہ ہے اور اس خدائے برتر سے ڈرو جس نے اپنی قدرت کاملہ سے تم کو اور تم سے پہلی امتوں کو پیدا کیا اور تم کو عدم سے وجود میں لایا اور وہ تمہارے مٹانے اور فنا کرنے پر بھی قادر ہے لہذا تم پر اس کی فرمانبرداری لازم ہے۔

اہل ایکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی اس نصیحت کے جواب میں بولے اور بطور حقارت ان سے یہ کہا کہ جز ایں نیست کو تو ان لوگوں میں سے ہے کہ جن پر جادو کر دیا گیا اس لیے تو بہکی ہوئی باتیں کر رہا ہے۔ تو رسول الٰہی کیسے ہو سکتا ہے اور نہیں ہے تو مگر ہم ہی جیسا ایک آدمی، تجھے ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے ان نادانوں نے ظاہری صورت و شکل کی مماثلت سے یہ سمجھا کہ ہم اور وہ برابر ہیں۔

اور یہ خیال نہ کیا کہ صورت اور شکل کے اعتبار سے تو عاقل اور غافل اور عالم اور جاہل میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا اور بولے کہ ہم تو بلاشبہ تجھ کو جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں پس اگر تو دعوائے نبوت میں سچا ہے تو آسمان کا یا بادل کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تو سچا نبی ہے اور تیری تکذیب کی وجہ سے ہم پر یہ بلا نازل ہوئی۔

شعیب علیہ السلام نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو وہ تمہیں تمہارے اعمال کی سزا دے گا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کو وہ تم کو کیا سزا دے گا بالآخر ان کو یہی سزا مل گئی جو انہوں نے مانگی تھی۔

پس اس قوم نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا پس پکڑ لیا ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے سیاہ ابر سائبان کی شکل میں نمودار ہوا جس میں سے آگ برسی اور سب جل گئے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کو دو قوموں کی طرف بھیجا ایک اصحاب ایکہ کی طرف اور ایک اہل مدین کی طرف۔ اصحاب ایکہ کو اللہ تعالیٰ نے عذاب ظلہ سے ہلاک کیا اور اہل مدین پر جبریل امین نے ایک چیخ ماری جس سے سب کے کلیجے پھٹ گئے۔

اہل مدین کو ایک چیخ اور چنگھاڑ نے پکڑ لیا۔ بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا اس قوم پر سات دن تک سخت گرمی پڑتی رہی کسی چیز سے ان کو تسلی نہیں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا اس کو غنیمت سمجھ کر اس کے سائے میں آئے اور سب اس کے نیچے جمع ہو گئے۔ بادل میں سے آگ برسنی شروع ہوئی۔ سب جل کر مر گئے۔

اصحاب مدین قوم ثمود کی طرح صیحہ سے ہلاک ہو گئے اور اصحاب ایکہ عذاب یوم ظلہ سے ہلاک ہوئے۔ بیشک قوم ایکہ کی اس سرگذشت میں اللہ کی قدرت کی بڑی نشانی ہے اور باوجود اس کے ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے نہ ہوئے اور بیشک تیرا پروردگار وہی غالب اور مہربان ہے کہ اہل ایمان کا کافروں سے اس طرح سے انتقام لیتا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

تفسیر مظہری میں قوم تبع کے بارے میں قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں وَ قَوْمُ تُبَّعٍ: بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ نے بیان کیا۔ تُبَّع یمن کے بادشاہوں میں سے ایک حمیری بادشاہ تھا۔ یہ اپنی فوجیں لے کر حیرہ اور سمرقند تک گیا تھا۔ اس کے تابع بہت زیادہ لوگ تھے، اسی لیے اس کو تبع کہا جاتا تھا۔ تبع بھی بہت تھے اور چونکہ ایک دوسرے کے پیچھے (بغیر فصل کے) بادشاہ ہوتا تھا۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو تبع کہا جاتا ہے۔ تبع پہلے آتش پرست تھا، پھر اسلام لے آیا اور اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

محمد بن اسحاق وغیرہ نے بوساطت عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا بیان نقل کیا ہے کہ آخری تبع اسعد بن ابو کرب بن ملیک بن یکرب تھا، اسعد مشرق سے آتے ہوئے مدینہ پر سے گزرا اور مدینے میں اپنے ایک بیٹے کو اپنا قائم مقام بنا کر خود چلا گیا۔ بیٹے کو کسی نے قتل کر دیا یہ خبر پا کر اسعد

مدینہ کو اس بات کا پختہ ارادہ کر کے آیا کہ مدینہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دے گا۔ انصار کے اس قبیلہ (یعنی اوس اور خزرج) کو جب اسعد کے اس ارادے کی اطلاع ملی تو اسعد سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ کے باہر جمع ہو گئے۔

قبائل انصار اسعد کے لشکر سے دن میں تو لڑتے تھے اور رات کو ان کی مہمانی کرتے (یعنی کھانا کھلاتے) تھے۔ اسعد کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگا: یہ بڑے شریف لوگ ہیں۔ انہی ایّام میں بنی قریظہ کے دو یہودی عالم کعب اور اسد، اسعد کے پاس آئے اور عرض کیا: بادشاہ سلامت آپ کو اپنے ارادے سے باز آجانا چاہیے اگر آپ اپنی ضد پر قائم رہے تب بھی آپ کی مراد حاصل نہ ہو گی۔ کوئی (غیبی) رکاوٹ پڑ جائے گی۔ اس صورت میں آپ کسی (غیبی) فوری مصیبت سے مامون نہیں رہیں گے۔ یہ ایک نبی کی ہجرت گاہ ہے، جو اس قبیلۂ قریش میں پیدا ہو گا اس کا نام محمد ﷺ ہو گا۔ مکہ اس کی جائے پیدائش اور مدینہ مقام ہجرت ہے۔ یہاں جس جگہ آپ اترے ہیں اسی جگہ اس نبی کے ساتھیوں کی اور اس کے دشمنوں کی لڑائی ہو گی، جس میں کچھ لوگ مجروح و مقتول ہوں گے، اسعد نے کہا: جب وہ نبی ہو گا تو اس سے لڑے گا کون؟ کعب اور اسعد نے کہا: اس کی قوم والے یہاں آکر اس سے لڑیں گے۔

یہودیوں کی یہ باتیں سن کر اسعد اپنے خیال سے باز آگیا۔ دونوں عالموں نے اس کو اپنے دین یعنی اصل یہودی مذہب کی طرف بلایا تو اس نے یہ دعوت قبول کر لی اور یہودی دین اختیار کر لیا اور دونوں عالموں کی بڑی عزت کی اور مدینہ سے واپس چلا گیا۔ واپسی میں ان دونوں کو اور کچھ اور یہودیوں کو ساتھ لے کر یمن جانے کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔

راستہ میں قبیلہ ہذیل کے کچھ آدمی اس سے ملے اور کہنے لگے: ہم آپ کو ایک ایسا گھر بتاتے ہیں جس کے اندر موتیوں اور زبرجد اور چاندی کا خزانہ (مدفون) ہے۔ اسعد نے کہا: مکہ میں ایسا کونسا گھر ہو سکتا ہے؟ حقیقت میں بنی ہذیل نے اسعد کو ہلاک کرنا چاہا تھا کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ بیت اللہ کے متعلق برا ارادہ رکھنے والا ہلاکت سے بچ نہیں سکتا۔

یہودی علماء سے جب اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا اس (کعبہ) کے علاوہ کوئی اور ایسا گھر

ہمارے علم میں نہیں ہے (جس کے متعلق برا ارادہ کرنے والا ہلاک نہ کر دیا گیا ہو) آپ اسی گھر کو عبادت خانہ بنالیں۔ اس کا حج کریں، قربانی کریں اور اس کے پاس سر منڈوائیں۔

یہودی عالموں سے جب اسعد نے یہ بات سنی تو ہذیل کے ان آدمیوں کو (جنہوں نے اسعد کو اغوا کرنا چاہا تھا) پکڑ کر ہاتھ پاؤں کٹوا کر، آنکھوں میں سلائی پھیر کر صلیب پر لٹکوا دیا۔ پھر مکہ میں جا کر شعب مصالح میں اترا اور کعبہ کو غلاف پہنایا۔

اسعد ہی پہلا شخص تھا جس نے کعبہ کو غلاف پوش کیا۔ شعب میں چھ ہزار اونٹوں کی قربانی کی، چھ دن یہاں قیام کیا۔ طواف کیا اور سر منڈوایا پھر واپس چلا گیا۔ جب یمن کے قریب پہنچا اور حدود یمن میں داخل ہونا چاہا تو قبیلہ حمیر والوں نے یمن میں داخلہ سے روکا اور کہا: تم نے ہمارا مذہب چھوڑ دیا اس لیے یمن کے اندر تم داخل نہیں ہو سکتے۔ اسعد نے حمیر والوں کو مذہب یہودیت کی دعوت دی اور کہا: یہ دین تمہارے دین سے بہتر ہے۔ حمیر والوں نے کہا: چلو آگ کے پاس یہ معاملہ رکھو۔ آگ سے فیصلہ کراؤ۔

یمن کے اندر ایک پہاڑ کے نشیب میں ایک آگ تھی۔ لوگ نزاعی معاملات اس کے پاس لے جاتے تھے۔ آگ (غار کے اندر سے) نکل کر ظالم کو کھا جاتی تھی اور مظلوم کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچاتی تھی۔

تبع نے کہا: تم نے یہ بات انصاف کی کہی۔ چنانچہ حمیر والے اپنے بتوں کو اور ان کے دین پر جو بھینٹ کی چیزیں ہوتی تھیں، ان سب کو لے کر نکلے اور دونوں یہودی عالم اپنی مذہبی کتابیں گلے میں ڈال کر برآمد ہوئے اور یہ سب لوگ اس جگہ جا کر بیٹھ گئے، جہاں سے آگ نکلتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد آگ نکلی اور سب کو ڈھانک لیا۔ بتوں کو اور بھینٹ کے سامان کو تو کھا لیا اور یہودی عالم جن کی گردنوں میں مذہبی صحیفے آویزاں تھے، برابر ان کو پڑھتے رہے۔ پیشانی سے پسینہ تو بہنے لگا اور کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ آگ جہاں سے نکلی تھی، وہیں واپس چلی گئی۔ اس کے بعد حمیر والوں نے بھی بالاتفاق اصل دین یہودیت اختیار کر لیا۔ ابو حاتم نے رقاشی کا قول نقل کیا ہے کہ ابو کرب اسعد حمیری تبابعہ میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے سات سو سال پہلے ہی آپ پر ایمان لے آیا تھا۔ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ

کعب نے کہا: اللہ نے تبع کی قوم کی تو مذمت کی، تبع کی مذمت نہیں کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں تبع کو برا مت کہو وہ اسلام لے آیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ تبع نبی تھے یا نہ تھے۔ (مظہری)

تخلیق اول اور تخلیق ثانی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ{۱۵} ق.

جواب ترجمہ: بھلا کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے تھک گئے تھے؟ نہیں! لیکن یہ لوگ از سر نو پیدا کرنے کے بارے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

حیات بعد الموت (مرنے کے بعد دوبارہ زندگی) کا انکار کرنے والے یہ کہتے تھے کہ جب سارے لوگ مر کھپ جائیں گے تو انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے سات آسمانوں کو بغیر کسی سہارے اور ستون کے بلند کیا، ہم نے پانی کی سطح پر زمین کو بچھایا، ہم نے ڈھولتی اور متحرک زمین میں مضبوط پہاڑ جما دیے، زمین کو ہری بھری گھاس، بیل بوٹوں، درختوں، نہروں، دریاؤں، سمندروں، صحراؤں اور ٹیلوں، میدانوں اور پہاڑوں سے مزین کر دیا، یہ ابتدائی کام بغیر کسی نمونے کے کس قدر مشکل دکھائی دیتا ہے، ہم نے اپنی کاریگری اور قدرت سے یہ کام کیا، تو دوبارہ پیدا کرنا، دوبارہ وجود میں لانا، ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، پہلے مشکل نہیں تھا تو اب کیونکر ہو گا۔

انسان نہیں تھا، مٹی سے وجود دیا، روح پھونکی، پھر انسانی نسل چلائی، ایک پانی کی بوند سے لوتھڑا، لوتھڑے سے بوٹی، بوٹی سے ہڈی، ہڈی پر پھر گوشت چڑھایا، اندھیرے میں اس انسان کی نقشہ گری ہوتی رہی، اس کے نین نقش وجود پاتے رہے، بے جان جاندار بنتا گیا، بے حس احساس پاتا گیا، بے حرکت حرکت کرتا گیا۔

انسان نو ماہ شکم مادر میں رہنے کے بعد دنیا میں ایسے انداز میں آیا کہ رونے کی آواز سنتے کان سن رہے تھے، بچے کے کان تھے سن نہیں سکتا تھا، آنکھیں تھیں دیکھ نہیں سکتا تھا، زبان تھی بول نہیں

سکتا تھا، ہاتھ تھے مضبوطی سے پکڑ نہیں سکتا تھا، پاؤں تھے چل نہیں سکتا تھا، رفتہ رفتہ ہم نے اسے بولنا سکھایا، ہم نے اسے دیکھنا سکھایا، ہم نے اسے پکڑنا سکھایا، ہم نے اسے چلنا سکھایا۔

بغیر کسی نمونے اور ماڈل کے پہلی بار کوئی بھی کام کرنا دشوار ہوتا ہے، مشکل ہوتا ہے، بسا اوقات نمونہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا جاتا ہے، مگر اللہ جل شانہ وہ ذات اور ہستی ہیں کہ بغیر کسی نمونے، بغیر کسی ماڈل اور ڈیزائین کے اپنی قدرت کے نقش بکھیر دیے کہ ہر آنکھ حیرت سے دیکھتی ہے، ہر زبان پکار اٹھتی ہے سبحان الملک القدوس۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلی مرتبہ جب ساری چیزوں کو عدم سے وجود بخشا تو ہمیں ایسا کرنے نے تھکا نہیں دیا کہ ہم دوبارہ بے بس ہوگئے اور اب یہ کام نہیں کرسکتے، ہم نے جو کام پہلے کیا وہ اب بھی کرسکنے پر قادر ہیں، اس لیے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ موت کے بعد زندگی کیسے دے گا، مارنے کے بعد زندہ کیسے کرے گا، انہیں اپنے دماغوں کا علاج کروانا ازبس ضروری ہے تاکہ ان پر یہ بات کھل سکے کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

عارف باللہ، قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں قاموس میں ہے عَیَّ بِالْاَمْرِ اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا راستہ نہیں پایا یا حصول مقصود سے عاجز ہوگیا اور طاقت نہیں رہی، اَفَعَیِیْنَا : میں ہمزہ انکاری ہے اور فَ عاطفہ تعقیبیہ ہے۔ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ سے مَآءٍ. پر اس کا عطف ہے اور کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ : سے آخر تک معترضہ جملے ہیں۔

خلاصہ مطلب اس طرح ہوگا، ہم نے آسمان کو بغیر کسی شگاف اور رخنہ کے بنایا۔ زمین کو پھیلایا، پہاڑوں کو جمایا۔ آسمان سے پانی برسایا۔ پانی سے کھیتیوں کو اگایا اور تمہارا مشاہدہ اور اعتراف ہے کہ ہم پہلی مرتبہ ان سب چیزوں کو پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوئے تو دوبارہ تخلیق سے کس طرح عاجز ہوسکتے ہیں۔ تخلیق اوّل ، تخلیق دوم سے آسان نہیں تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ تخلیق اوّل کا اعتراف کرنے والے تخلیق ثانی کے منکر ہیں۔

فِیْ لَبْسٍ : لبس کا معنی ہے مخلوط ہو جانا، مشتبہ ہو جانا، اس جگہ مراد ہے شک، لبس کا لغوی ترجمہ ہے

چھپانا، شک کی حالت میں بھی باطل حق کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے اور حق کو چھپا لیتا ہے۔ **خَلْقٍ جَدِيْدٍ:** یعنی دوبارہ تخلیق۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ فرماتا ہے آدم کے بیٹے نے میری تکذیب کی اور یہ تکذیب اس کو سزاوار نہ تھی۔ اس نے مجھے گالی دی اور یہ اس کے لیے جائز نہیں تھا، تکذیب تو یہ کی کہ اس نے کہا: خدا نے پہلی مرتبہ جو مجھے پیدا کر دیا اب دوبارہ مجھے پیدا نہیں کر سکے گا۔

حالانکہ تخلیق اوّل میرے لیے تخلیق ثانی سے آسان نہیں تھی اور مجھے گالی اس نے اس طرح دی کہ (اس نے میرے لیے اولاد قرار دی اور) اس نے کہا کہ اللہ نے اپنے لیے صاحب اولاد ہونا اختیار کیا حالانکہ میں اکیلا ہوں، بے نیاز ہوں، نہ کسی کا والد ہوں، نہ مولود، نہ کوئی میرا ہمسر ہے۔ (رواہ البخاری عن ابی ہریرہ (رض) وابن عباس بحوالہ تفسیر مظہری)

علم الٰہی، انسانی اعمال اور ان کی سزا

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ {١٦}اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ{١٧}مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ{١٨}وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ {١٩}وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ{٢٠}وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ {٢١}لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ {٢٢} وَ قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ{٢٣}اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ {٢٤}مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ {٢٥}الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ {٢٦}قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ {٢٧}قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ {٢٨}مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ {٢٩}يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ{٣٠} ق.

جواب ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے دل میں جو خیالات

آتے ہیں، ان (تک) سے ہم خوب واقف ہیں، اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ اس وقت بھی جب (اعمال کو) لکھنے والے دو فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں۔ ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے۔ انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار۔ اور موت کی سختی سچ مچ آنے ہی والی ہے۔ (اے انسان) یہ وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔ اور صور پھونکا جانے والا ہے۔ یہ وہ دن ہو گا جس سے ڈرایا جاتا تھا۔ اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہو گا، اور ایک گواہی دینے والا۔ حقیقت یہ ہے کہ تو اس واقعے کی طرف سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تجھ سے وہ پردہ ہٹا دیا ہے جو تجھ پر پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ آج تیری نگاہ خوب تیز ہو گئی ہے۔ اور اس کا ساتھی کہے گا کہ: یہ ہے وہ (اعمال نامہ) جو میرے پاس تیار ہے۔ (حکم دیا جائے گا کہ) تم دونوں ہر اس شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کٹر کافر اور حق کا پکا دشمن تھا۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا رکھا تھا۔

لہٰذا اب تم دونوں اسے سخت عذاب میں ڈال دو۔ اس کا ساتھی کہے گا کہ: اے ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ: تم میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس عذاب کی دھمکی بھیج چکا تھا۔ میرے سامنے وہ بات بدلی نہیں جا سکتی اور میں بندوں پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ وہ وقت (یاد رکھو) جب ہم جہنم سے کہیں گے کہ: کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کہ: کیا کچھ اور بھی ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا، ہم اس کے دلی خیالات کو جانتے ہیں، وہ جو اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے ہم ان سے بھی آگاہ ہیں، ہم تو اس کی رگ حیات سے بھی قریب ہیں، رگ حیات انسانی گردن میں دل سے متصل ہوتی ہے، اس کے دائیں اور بائیں دو کاندھوں پر فرشتے اس کے اعمال نوٹ کرتے ہیں، جو اس کے دائیں کاندھے پر ہے وہ نیکیاں لکھتا ہے اور جو بائیں کاندھے پر ہے وہ انسان سے سرزد ہونے والی برائیاں لکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان جب کوئی لفظ بولتا ہے تو اس کے قریب ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اس

کی نگرانی کر رہا ہوتا ہے، اس کی باتوں کو لکھ رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس انسان پر اتمام حجت کے لیے فرشتوں کے ذریعے اس کے اعمال نوٹ کرواتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ انسانی دماغوں میں اٹھنے والے خیالات کو جانتا ہے، وہ انسانی دلوں کے نہان خانوں میں چھپے ہوئے خیالات سے واقف ہے، وہ اس کی ہر نقل و حرکت سے آگاہ ہے، صرف ایک انسان نہیں بلکہ اول انسان سے لے کر آخری انسان تک، کروڑوں، کھربوں انسانوں کی سرگرمیاں، حرکتیں وہ جانتا ہے، وہ ذروں کی مقدار، پانیوں کے قطرات، درختوں کی ٹہنیاں اور شاخیں، پتے، پھل اور پھول، دریاؤں، سمندروں، نہروں اور آبشاروں میں بہنے والے پانی کی مقدار اور قطرات سے آگاہ ہے، نوٹ اس لیے کرواتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو دکھا سکے کہ یہ تیرے اعمال تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرشتے وہی باتیں انسان کی لکھتے ہیں جن پر اسے جزا یا سزا دی جائے گی، مباح باتیں نہیں لکھتے، ایک فرمان یہ بھی ہے کہ فرشتے ساری باتیں لکھ لیتے ہیں، جمعرات کو اللہ کی بارگاہ میں انسان کے اچھے اور برے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، پھر وہ اعمال لکھے ہوئے رہنے دیے جاتے ہیں جو اچھے یا برے، یا جن پر جزا یا سزا دی جائے گی، اور ان کو مٹا دیا جاتا ہے جو مباح ہیں۔

چھوٹے بچوں کی نیکیاں لکھی جاتی ہیں، جو لوگ مجذوب اور مجنون ہوتے ہیں ان پر لکھنے والے فرشتے مقرر نہیں ہوتے۔ اسی طرح جنات کے اوپر بھی فرشتے مقرر ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے عبادت کا مکلف بنایا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے، مگر بعض حضرات جنات کے بارے میں فرشتوں کی نگرانی اور اعمال نوٹ کیے جانے والی بات کے بارے میں خاموش ہیں۔

انسانی اعمال اچھے ہیں یا برے ان کو لکھا جاتا رہے گا، پھر انسان کو وقت مقررہ پر موت کے جھٹکے آئیں گے، جس انسان کا جو وقت موت کا طے ہے اس طے شدہ وقت پر موت آئے گی، موت کی سختی آئے گی، جس سے کسی کو چھٹکارہ نہیں ہے، کوئی بھاگ نہیں سکے گا، انسان کو کہا جائے گا کہ انسان! یہ ہے وہ حقیقت جس سے تو دور بھاگتا تھا۔

ایک وقت آئے گا جب حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو سارے انسان جو اس وقت روئے زمین پر موجود ہوں گے موت کے منہ میں چلے جائیں گے، پھر جب دوبارہ صور پھونکیں گے تو انسان اٹھ کر میدان محشر کی طرف چلیں گے، جو بھی اٹھ کر میدان محشر کی طرف چلے گا اس کے ہمراہ دو فرشتے ہوں گے، ایک اسے محشر کے میدان کی طرف لے چلے گا اور دوسرا اس کے نیک اور برے اعمال جو اس نے دنیا میں کیے تھے ان کی گواہی دے گا۔ کہ انسان! جن چیزوں سے تو غافل تھا آج اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلے، ہم نے تیری آنکھوں سے تو پردہ اٹھادیا تھا لیکن دل تیرا پردے میں ڈھکا رہا، جسے آج ہم نے کھول دیا ہے، جس نے تیری غفلت کی دبیز چادریں پاش پاش کردی ہیں، آج تیری نگاہیں خوب اچھی طرح ہر چیز دیکھ رہی ہیں۔

جو فرشتہ دنیا میں انسان کے اعمال نوٹ کرتا تھا وہ آج اس پر گواہی دے گا اور کہے گا کہ یہ میرے پاس اس کے اعمال کا رجسٹر ہے، اس کے اعمال کا رجسٹر میرے پاس تیار شدہ، محفوظ اور حاضر ہے۔

اللہ تعالیٰ ان دو فرشتوں (اسے میدان حشر کی طرف لے جانے والے اور اس پر گواہی دینے والے) کو مخلوقات کے درمیان فیصلہ ہو جانے کے بعد ارشاد فرمائیں گے کہ ہر منکر کو دوزخ میں ڈال دو، جو اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا انکار کرتا تھا، جو بہت زیادہ کفر کرتا تھا، جو جھٹلاتا تھا، جو حق کا انکار کرتا تھا، جو مالی حقوق ادا کرنا اس پر لازم تھے ان کی ادائی سے باز رہتا تھا، یہ اللہ کے بندوں پر سرکشی کرتا تھا، اللہ کی حدود پھلانگتا تھا۔

یہ اللہ کے وعدوں اور اس کی وعیدوں پر شک کرتا تھا، جو اللہ نے اپنی ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں کے بارے میں فرمائی تھیں، یہ اللہ کی مخلوق میں سے اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتا تھا، اس لیے اسے جہنم کے سخت عذاب میں ڈالو۔

آیت ۲۳ میں قرین کا ذکر ہے، قرین وہی فرشتہ ہے جو دنیا میں اس کے اعمال لکھا کرتا تھا، جو قبر سے اس کے ساتھ میدان محشر میں آیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے تو یہ فرمایا کہ اس سے اس کی برائیوں کا لکھنے والا کاتب مراد ہے وہ

اپنے لکھے ہوئے صحیفہ کی طرف اشارہ کر کے کہے گا کہ یہ اس کے اعمال ناموں کا کتابچہ ہے جو میرے پاس لکھا ہوا تیار ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے وہ شیطان مراد ہے جو ہر انسان کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کا ایک ساتھی جنات میں اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے آپ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی اسی طرح تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی۔

جو شیطان انسان کو دنیا میں گمراہ کرتا تھا، انسان کو راہ راست سے ہٹاتا اور ورغلاتا تھا بروز محشر انسان کے اعمال سے برأت کرے گا اور کہے گا کہ اے ہمارے رب! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا، یہ تو بہت دور کے راستے میں پڑا ہوا تھا، راہ ہدایت سے بہت فاصلے پر تھا۔

مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ یہاں (ہم نشین) ساتھی سے مراد شیطان ہے، کیونکہ وہ بھی ہر وقت انسان کو بہکانے کے لئے اس کے ساتھ رہتا تھا، کافر لوگ چاہیں گے کہ اپنے حصے کی سزا یہ کہہ کر اپنے سرداروں پر اور خاص طور سے شیطان پر ڈالیں کہ اس نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اس کے جواب میں شیطان یہ کہے گا کہ میں نے گمراہ نہیں کیا، کیونکہ مجھے کوئی ایسا اختیار نہیں تھا کہ اسے زبردستی گمراہی کے راستے پر ڈالوں، زیادہ سے زیادہ میں نے انہیں ترغیب دی تھی۔ (توضیح القرآن)

حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر کا جو قرین ہو گا وہ بھی کافر ہی تھا وہ دوزخ سے بچ جائے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اس کے ماطغیتہ کہنے کا کیا مقصد ہو گا؟ اس کے بارے میں بعض اکابر نے فرمایا کہ وہ یہ چاہے گا کہ میری گمراہی کا اثر صرف مجھ پر پڑے اور مزید فرد جرم مجھ پر نہ لگے اور دوسروں کی گمراہی کی وجہ سے عذاب میں اضافہ نہ ہو، لیکن ایسا نہ ہو گا۔ دوسروں کو گمراہ کرنے کی سزا بھگتنی ہو گی۔ (تفسیر انوار البیان)

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج میرے سامنے ایک دوسرے سے جھگڑا کرنے کی اجازت نہیں ہے،

کیونکہ یہ جزا اور حساب گاہ ہے، یہاں اپنے کیے کے بارے میں تمہیں بتانا پڑے گا، آج بحث مباحثہ اور جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، دنیا میں میں نے ان لوگوں کو وعید سنائی تھی جو میری نافرمانی کریں گے اور میرا انکار کریں گے۔ کافر لوگ کوشش کریں گے کہ اپنی چالاکی اور مکاری سے اپنے جرائم دوسروں کے گلے پر لٹکائیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں بات تبدیل نہیں ہوتی، وہ کسی کے گناہ کے بدلے کسی کو سزا نہیں دے گا، جس نے کیا وہ خود ہی بھگتے گا، سزا دینے میں بھی اللہ جلدی نہیں کریں گے بلکہ اتمام حجت کے بعد سزا دیں گے۔

سورۃ ق کی آیت ۳۰ کی تفسیر میں حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ ان آیات میں جنت اور دوزخ کا حال بتایا ہے دوزخ کی وسعت اور لمبائی، چوڑائی اور گہرائی مجموعی حیثیت سے اتنی زیادہ ہو گی کہ کروڑوں افراد جنات میں سے اور انسانوں میں سے داخل کیے جانے کے بعد بھی خالی ہی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ کا سوال ہو گا هَلِ امْتَلَاْتِ (کیا تو بھر گئی) اس کا جواب ہو گا کیا کچھ اور بھی ہے ؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت اور دوزخ میں آپس میں مباحثہ ہوا دوزخ نے (فخر کے طور پر) کہا کہ تکبر والے اور تجبر والے میرے اندر داخل ہوں گے، اور جنت نے کہا کیا بات ہے کہ میرے اندر صرف کمزور لوگ اور گرے پڑے اور بھولے بھالے لوگ داخل ہوں گے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا تو میری رحمت ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں تیرے ذریعہ رحم کروں گا اور دوزخ سے فرمایا کہ تو میرا عذاب ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہوں عذاب دوں گا اور تم دونوں سے بھر دینے کا وعدہ ہے۔ (بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم میں برابر دوزخیوں کو ڈالا جاتا رہے گا اور وہ هل مِن مَّزِيد کہتی رہے گی یعنی یوں کہتی رہے گی کیا کچھ اور بھی ہے کیا کچھ اور بھی ہے۔ یہاں تک کہ رب العزت شانہٗ اس میں اپنا قدم رکھ دیں گے اور وہ سمٹ جائے گی اور کہے گی بس بس میں آپ کی عزت و کرم کا واسطہ دیتی ہوں۔ (تفسیر انوار البیان)

تذکرۂ جنت

سوال جنت کے داخلے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، وہ کون سی ہیں، قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں بیان فرمائیں۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ{۳۱}هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ{۳۲}مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ{۳۳}ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ {۳۴}ق.

جواب ترجمہ: اور پرہیز گاروں کے لیے جنت اتنی قریب کر دی جائے گی کہ کچھ بھی دور نہیں رہے گی۔ (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے یہ وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اللہ سے خوب لو لگائے ہوئے ہو، (اور) اپنی نگرانی رکھنے والا ہو۔ جو خدائے رحمن سے اسے دیکھے بغیر ڈرتا ہو، اور اللہ کی طرف رجوع ہونے والا دل لے کر آئے۔ تم سب اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ وہ دن ابدی زندگی کا دن ہو گا۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلے کے لیے دنیا میں ایک تو اللہ تعالیٰ شانہ کا خوف ضروری ہے، دوسرا قیامت کے دن انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ گناہوں سے توبہ تائب ہو کر ملاقات کرے تو اس کے لیے بخشش کا سامان اور جنت میں داخلے کا ذریعہ بن جائے گا۔

مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں اس کے بعد جنت کا تذکرہ فرمایا کہ وہ متقیوں سے قریب کر دی جائے گی کچھ دور نہ رہے گی پھر وہ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ نعمتوں اور لذتوں کی وہ جگہ ہے جس کا تم سے دنیا میں وعدہ کیا جاتا رہا، یہ وعدہ ہر اس شخص سے تھا جو اواب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف خوب رجوع کرنے والا ہے اور حفیظ یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر کا خاص دھیان رکھنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا رہتا تھا۔

اہل جنت کی مزید صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ بن دیکھے اللہ سے ڈرتے تھے۔ دنیا میں اس حالت پر رہے اور یہاں جو پہنچے تو قلب منیب لے کر آئے ان کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع

رہتا تھا اللہ کی یاد میں اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی فکر میں رہتے تھے اور متقیوں سے کہا جائے گا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ آج وہ دن ہے جس میں ہمیشگی کا فیصلہ کر دیا گیا یعنی تم لوگ اس جنت میں ہمیشہ کے لیے جا رہے ہو۔ (تفسیر انوار البیان)

مولانا لکھتے ہیں کہ اور جنت میں بھی برابر جگہ خالی بچی رہے گی اسے بھرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نئی مخلوق کو پیدا فرمائے گا اور اس خالی جگہ میں ان کو آباد فرما دے گا۔ یہ جو اللہ تعالیٰ شانہٗ کے قدم کا ذکر آیا ہے یہ متشابہات میں سے ہے اس کا معنیٰ سمجھنے کی فکر میں نہ پڑیں اللہ تعالیٰ شانہٗ اعضاء و جوارح سے پاک ہے۔ یہ جو جنت میں خالی جگہ بچنے کی وجہ سے نئی مخلوق پیدا کر کے بسائی جائے گی اس کے بارے میں بعض اکابر سے کہا گیا کہ وہی مزے میں رہے کہ پیدا ہوتے ہی جنت میں چلے گئے۔ انہوں نے فرمایا انہیں جنت کا کیا مزہ آئے گا انہوں نے دنیا نہیں بھگتی، تکلیف نہیں جھیلی، مصیبتیں نہیں کاٹیں، انہیں وہاں کے راحت و آرام کی کیا قدر ہو گی ؟ مزہ تو ہمیں آئے گا، آرام کی قدر ہم کریں گے جو دنیا کی تکلیفوں سے دوچار ہوئے اور مشقت و دکھ تکلیف کو دیکھا اور سہا، جھیلا اور بھگتا۔ (تفسیر انوار البیان)

جنت میں دیدارِ الٰہی: جنت میں داخل ہونے والوں کے لیے وہاں سب کچھ ہو گا جس کی انہیں خواہش اور چاہت ہو گی اور نہ صرف ان کی خواہش کے مطابق نعمتیں ملیں گی بلکہ ان کی خواہشوں سے زیادہ انہیں وہ وہ نعمتیں ملیں گی جہاں ان کی خواہش بھی نہ پہنچے گی۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مزید سے مراد باری تعالیٰ شانہٗ کا دیدار ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے جو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ سوال فرمائیں گے کیا تم اور کچھ چاہتے ہو جو میں تمہیں مزید دے دوں یہ سن کر اہل جنت کہیں گے کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں فرما دیئے کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا کیا آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی (ہمیں اور کیا چاہیے) اس کے بعد پردہ اٹھا دیا جائے گا پھر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار میں مشغول ہو جائیں گے اپنے رب کے دیدار سے بڑھ کر انہیں عطا کی گئی چیزوں میں سے کوئی چیز محبوب نہ ہو گی

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سورۂ یونس کی آیت کریمہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ تلاوت فرمائی۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ص ۵، بحوالہ تفسیر انوار البیان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر ان کا گزر ہوا۔ پھر فرمایا کہ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (سو کسی شخص کو علم نہیں جو ان لوگوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ (تفسیر انوار البیان)

ولدینا مزید کیا ہے؟

سوال اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی سورۃ ق میں فرماتے ہیں کہ

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ {۳۵} ق.

جواب اہل جنت کو جنت میں وہ کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس مزید بھی ہے، اس آیت میں ہمارے پاس مزید بھی ہے اس سے کیا مراد ہے؟

جواب حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ولدینا مزید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت والوں کے لیے اپنی تجلی فرمائیں گے۔ (تفسیر در منثور)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں چند روایات نقل فرمائی ہیں، جن سے ولدینا مزید کی مزید وضاحت ہوتی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قَالَ رَسُول اللہ صلی اللہ عَلَيْهِ وَسلم: أَتَانِي جِبْرِيل وَفِي يَده مِرْآةٌ بَيْضَاء فِيهَا نُكْتَةٌ سَوْدَاء فَقلت: مَا هٰذَا يَا جِبْرِيل قَالَ: هٰذِه الْجُمُعَة فضلت بهَا أَنْت وَأمتك فَالنَّاس لكم فِيهَا تبع الْيَهُود وَالنَّصَارَى وَلكم فِيهَا خير وفيهَا سَاعَة لَا يُوَافِقهَا مُؤمن يَدْعُو الله بِخَير إِلَّا اسْتُجِيبَ لَهُ وَهُوَ عندنَا يَوْم الْمَزِيد (کتاب الام للشافعی، البزار، ابو یعلیٰ، ابن ابی الدنیا، ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردویہ، آجری، بیہقی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور ان کے ہاتھ میں سفید شیشہ تھا جس میں کالا نکتہ تھا میں نے کہا اے جبریل! یہ کیا ہے؟ فرمایا، یہ جمعہ ہے اس کے ذریعہ آپ کو اور آپ کی امت کو فضیلت دی گئی اور تمہارے لئے اس میں لوگوں کا جمع ہونا اس لیے ہے تاکہ آپ اول رہیں اور یہود و نصاریٰ آپ کے بعد رہیں اور تمہارے لئے اس میں خیر ہے اور اس میں ایک ایسی گھڑی ہے جس میں مومن بندہ اللہ تعالیٰ سے جو بھی خیر بھلائی مانگے اسے قبول کرلیا جاتا ہے۔ اور یہی ہمارے نزدیک یوم المزید ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا يَا جِبْرِيلُ، وَمَا يَوْمُ الْمَزِيدِ؟ فَقَالَ: إِنَّ رَبَّكَ اتَّخَذَ فِي الْفِرْدَوْسِ، وَادِيًا أَفْيَحَ فِيهِ كُثُبٌ مِسْكٌ فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ أَنْزَلَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى مَا شَاءَ مِنْ مَلَائِكَتِهِ، وَحَوْلَهُ مَنَابِرُ مِنْ نُورٍ عَلَيْهَا مَقَاعِدُ النَّبِيِّينَ، وَالصِّدِّيقِينَ، وَحَفَّ تِلْكَ الْمَنَابِرَ بِمَنَابِرَ مِنْ ذَهَبٍ مُكَلَّلَةٍ بِالْيَاقُوتِ، وَالزَّبَرْجَدِ عَلَيْهَا الشُّهَدَاءُ، وَالصِّدِّيقُونَ فَجَلَسُوا مِنْ وَرَائِهِمْ عَلَى تِلْكَ الْكُثُبِ فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنَا رَبُّكُمْ قَدْ صَدَقْتُكُمْ، وَعْدِي فَسَلُونِي أُعْطِكُمْ فَيَقُولُونَ رَبَّنَا نَسْأَلُكَ رِضْوَانَكَ فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ رَضِيتُ عَنْكُمْ، وَلَكُمْ مَا تَمَنَّيْتُمْ، وَلَدَيَّ مَزِيدٌ فَهُمْ يُحَبَّوْنَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لِمَا يُعْطِيهِمْ فِيهِ رَبُّهُمْ مِنَ الْخَيْرِ، وَهُوَ الْيَوْمُ الَّذِي اسْتَوَى فِيهِ رَبُّكَ تَبَارَكَ اسْمُهُ عَلَى الْعَرْشِ، وَفِيهِ خُلِقَ آدَمَ، وَفِيهِ تَقُومُ السَّاعَةُ (کتاب الام للشافعی)

اے جبریل! وہ مزید کا دن کیا ہے؟ فرمایا بلاشبہ تیرے رب نے جنت الفردوس میں ایک وادی بنائی ہے اس میں کستوری کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں جب جمعہ کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ جسے چاہیں گے اتاریں گے اور ان کے ارد گرد سونے کی کرسیوں کے ساتھ گھیرے ہوں گے جو یاقوت اور زبرجد کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں گے ان پر شہداء اور صدیقین بیٹھیں گے پھر جنت والے آئیں گے اور ان کے پیچھے ان ٹیلوں پر بیٹھ جائیں گے۔ رب تبارک وتعالیٰ ان کے لئے تجلی فرمائیں گے یہاں تک کہ وہ ان کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں، تحقیق

میں نے تمہارے ساتھ سچ کر دیا ہے پس تم مجھ سے سوال کرو میں تم کو عطا کروں گا۔

وہ لوگ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم آپ سے آپ کی رضامندی کا سوال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں تم سے راضی ہو چکا مجھ سے اور مانگو پھر وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کچھ عرض کریں گے یہاں تک کہ ان کی رغبت ختم ہو جائے گی پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم خواہش کرو گے "وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ" اور مزید میرے پاس اور بھی ہے۔ پس وہ محبت کرتے ہیں جمعہ کے دن سے اور اسے پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں ان کا رب ان کو خیر و بھلائی عطا فرمائے گا اور یہی وہ دن ہے جس میں تمہارے رب نے عرش پر قرار پکڑا اور اس میں آدم کو پیدا کیا گیا اور اس میں قیامت قائم ہو گی۔

جار اللہ زمخشری فرماتے ہیں کہ ولدینا مزید سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ان جنتیوں کے دل پر کبھی کھٹکا نہیں تھا، اور جس کی کبھی انہوں نے امید بھی نہیں رکھی تھی۔ (کشاف) احمد بن مصطفی مراغی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مزید سے مراد وہ ہے جو ان کے دل پر کبھی کھٹکا نہیں، ان کی آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں اور ان کے کان نے کبھی سنا نہیں۔ (تفسیر مراغی) علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مزید سے مراد رب تعالیٰ کے چہرے کی طرف دیکھنا ہے۔ (تفسیر روح البیان) علامہ عبدالکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مزید سے مراد رویت ہے، اللہ کے چہرے کی طرف دیکھنا مراد ہے۔ (تفسیر قشیری) علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مزید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جمعہ کے دن جنت والوں کے لیے تجلی فرمائیں گے۔ (زادالمسیر)

امم سابقہ کی تباہی و بربادی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ {٣٦} اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ {٣٧} ق.

جواب ترجمہ: اور ان (مکہ کے کافروں) سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کی طاقت پر گرفت ان سے زیادہ سخت تھی، چنانچہ انہوں نے سارے شہر چھان مارے تھے۔ کیا ان کے

لیے بھاگنے کی کوئی جگہ تھی؟ یقیناً اس میں اس شخص کے لیے بڑی نصیحت کا سامان ہے جس کے پاس دل ہو، یا جو حاضر دماغ بن کر کان دھرے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ کفار تو کیا چیز ہیں؟ ان سے بہت زیادہ قوت وطاقت اور اسباب تعداد کے لوگوں کو اسی جرم پر ہم تہ وبالا کر چکے ہیں جنہوں نے شہروں میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں زمین میں خوب فساد کیا۔ لمبے لمبے سفر کرتے تھے ہمارے عذاب دیکھ کر بچنے کی جگہ تلاش کرنے لگے مگر یہ کوشش بالکل بے سود تھی اللہ کی قضاو قدر اور اس کی پکڑ دھکڑ سے کون بچ سکتا تھا؟ پس تم بھی یاد رکھو کہ جس وقت میرا عذاب آگیا بغلیں جھانکتے رہ جاؤ گے اور بھوسی کی طرح اڑادیئے جاؤ گے۔

ہر عقلمند کے لئے اس میں کافی عبرت ہے اگر کوئی ایسا بھی ہو جو سمجھ داری کے ساتھ دھیان لگائے وہ بھی اس میں بہت کچھ پاسکتا ہے یعنی دل کو حاضر کر کے کانوں سے سنے۔ (تفسیر ابن کثیر) علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی قوم سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا جب کہ ان سے زیادہ طاقت اور قوت والے تھے۔

فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ: وہ شہروں میں چلے تاکہ بھاگ جانے کی کوئی جگہ تلاش کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے شہروں میں اثرات چھوڑے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: انہوں نے سفر کیا اور چکر لگایا۔ نضر بن شمیل نے کہا: انہوں نے چکر لگایا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: انہوں نے طواف کیا۔ معرج نے کہا: وہ دور تک چلے گئے اسی معنی میں امراء القیس کا شعر ہے:

وَقَدْ نَقَّبْتُ فِي الْآفَاقِ حَتَّى ... رَضِيتُ مِنَ الْغَنِيمَةِ بِالْإِيَابِ

میں آفاق میں دور تک گیا یہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہو گیا۔

پھر یہ کہا گیا: انہوں نے تجارت کی غرض سے دور دراز شہروں میں چکر لگایا، کیا انہوں نے موت سے بچنے کی کوئی جگہ پائی۔ ایک قول یہ کیا گیا: انہوں نے شہروں میں چکر لگایا وہ موت سے بچنے کی کوئی پناہ چاہتے تھے۔ حارث بن حلزہ نے کہا: **نَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ مِنْ حَذَرِ الموت وَجَالُوا فِي الْأَرْضِ**

كُلَّ مَجَالٍ وہ موت کے ڈر سے شہروں میں گھومے پھرے اور زمین میں ہر جگہ چکر لگایا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے (فَنَقَبُوا) پڑھا ہے اس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو پھاڑنا اور اس کے اندر داخل ہو جانا۔ ایک قول یہ کیا گیا: نقب کا معنی پہاڑ میں راستہ ہے۔ یحییٰ بن یعمر نے (فَنَقِّبُوا) پڑھا ہے صیغہ امر کا ہے اور دھمکی کے لئے ہے یعنی شہروں میں گھومو پھرو اور اس میں چلو اور دیکھو۔

هَلْ مِنْ مَحِيصٍ: حضرت ثعلبی رحمہ اللہ نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ کیا موت سے بھاگ جانے کی کوئی جگہ ہے۔ قشیری نے اسے (فَنَقِبُوا) قاف کے کسرہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ اس میں زیادہ چلے یہاں تک کہ ان کی سواریوں کے پاؤں گھس گئے۔ جوہری نے کہا: نقب البعیر جب اس کے پاؤں گھس جائیں۔ انقب الرجل جب آدمی کے اونٹ کے پاؤں گھس جائیں۔

نقیب الخف الملبوس جب پہنا ہوا موزہ پھٹ گیا۔ محیص یہ حاص یحیص کا مصدر حیصاً، حیوصاً، محیوصاً، محاصاً اور حیصاناً بھی آتا ہے معنیٰ پھر جانا، بھٹک جانا، یہ جملہ کہا جاتا ہے: ماعنہ محیص یعنی کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں۔ انحیاص بھی اس کی مثل ہے حمایتیوں کے لئے کہا جاتا ہے: حاصوا عن العدو اور دشمنوں کے لئے کہا جاتا؛ انہزموا دونوں کا معنی بھاگ گئے۔ ان فی ذلك لذكرى یعنی اس صورت میں جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ نصیحت ہے۔ لمن كان له قلب یعنی جس کی عقل ہو جس کے ساتھ وہ سوچ و بچار کرے، قلب، عقل سے کنایہ ہے کہ دل عقل کی جگہ ہے: یہ معنی مجاہد اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے؛ جس کی زندگی اور امتیاز کرنے والا نفس ہو۔ زندہ نفس کو دل سے تعبیر کیا ہے کیونکہ دل نفس کا وطن اور زندگی کا معدن ہے؛ جس طرح امرأ القیس نے کہا:

أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِي ... وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ

تجھے میرے بارے میں اس چیز نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ تیری محبت قتل کرنے والی ہے اور تو دل کو جو حکم دے گی وہ کر گزرے گا۔

قرآن حکیم میں ہے: لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یسین :۷۰) یحییٰ بن معاذ نے کہا: دل دو قسم کے ہیں، (۱) قَلْبٌ مُحْتَشٍ بِأَشْغَالِ الدُّنْيَا حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَمْرٌ مِنَ الْأُمُورِ الْآخِرَةِ لَمْ يَدْرِ مَا يَصْنَعُ، جو دنیا کے مشاغل سے بھرا ہوتا ہے یہاں تک کہ جب امور آخرت میں سے کوئی امر اسے لاحق ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ (۲) وَقَلْبٌ قَدِ احْتَشَى بِأَهْوَالِ الْآخِرَةِ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَمْرٌ مِنْ أُمُورِ الدُّنْيَا لَمْ يَدْرِ مَا يَصْنَعُ لِذَهَابِ قَلْبِهِ فِي الْآخِرَةِ، اور دوسرا ایسا دل ہے جو آخرت کی ہولناکیوں سے بھرا ہوتا ہے جب امور دنیا میں سے کوئی اسے لاحق ہوتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے کیونکہ اس کا دل آخرت میں گم ہوتا ہے۔

أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ: یعنی اس نے پوری توجہ کے ساتھ قرآن سنا، عرب کہتے ہیں أَلْقِ إِلَيَّ سَمْعَكَ أَيِ اسْتَمِعْ یعنی میری بات سنو۔

وَهُوَ شَهِيدٌ: یعنی دل حاضر ہو۔ زجاج نے کہا: جو کچھ وہ سن رہا ہے اس کے لیے اس کا دل حاضر ہو۔ سفیان نے کہا: ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خود حاضر ہو اور دل غائب ہو۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل کتاب کے لئے ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں خاص ہے، محمد بن کعب اور ابو صالح نے فرمایا کہ یہ اہل قرآن کے بارے میں خاص ہے۔ (قرطبی)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امم سابقہ کی ہلاکت، تباہی اور بربادی میں ان لوگوں کے لیے سامان عبرت ہے جن کے پاس سمجھنے سوچنے والا دل موجود ہے، یا وہ اپنے کانوں کو سننے کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان کا دل بھی حاضر ہوتا ہے، غفلت اور لاپروائی سے کام نہیں لیتے۔

ارض وسماء کی تخلیق، طلوع وغروب آفتاب سے پہلے تسبیح وتحمید

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ {۳۸} فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ

{۳۹}ق

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں تھکن چھو کر نہیں گزری۔ تو جو وہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کیے ایئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے، سورج نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ: اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنی عظیم قدرت کو بیان فرما رہے ہیں کہ اس نے آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی تمام مخلوقات کو چھ دنوں میں پیدا کیا، اور اس عمل میں اللہ کو کوئی تھکاوٹ یا کمزوری (لغوب) نہیں پہنچی۔ "لغوب" کا معنی ہے: تھکاوٹ، ضعف یا عجز۔ یہ آیت یہود کے اس عقیدے کی تردید ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ اللہ نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ یا ضعف نہیں پہنچا، ہم اس سے منزہ ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "لغوب" یعنی "نصب" (تھکاوٹ)، یعنی اللہ کو کوئی تھکاوٹ نہیں پہنچی مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم کائنات مختصر وقت میں پیدا کی اور اس میں کوئی عجز یا ضعف نہیں آیا، اس لیے اس کی قدرت کامل ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں پوچھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ نے زمین کو اتوار اور پیر کے دن پیدا کیا، منگل کے روز پہاڑ اور ان کے اندر کی نفع بخش چیزیں پیدا کیں، بدھ کے روز درخت اور پانی پیدا کیا، جمعرات کے روز آسمان پیدا کیا، جمعہ کے روز ستارے سورج اور چاند پیدا کیے، یہود نے پوچھا اے محمد! اس کے بعد کیا کیا؟ آپ نے فرمایا کہ پھر اللہ عرش پر مستوی ہوا، یہود نے کہا کہ آپ نے درست کہا اگر آپ ثم استراح یعنی پھر اس نے آرام کیا کہہ کر بات مکمل کرتے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ: اس

آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہیں کہ کفار جو کچھ کہتے ہیں، اس پر صبر کریں اور اللہ کی تسبیح و حمد بیان کریں۔ "قبل طلوع الشمس" یعنی فجر کے وقت، "و قبل الغروب" یعنی عصر کے وقت۔ یعنی نماز فجر اور نماز عصر کے اوقات میں اللہ کی تسبیح اور حمد کریں۔ یہ آیت اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ مشکلات اور کفار کی ایذاء پر صبر کرنا چاہیے اور اللہ کی عبادت و تسبیح میں مشغول رہنا چاہیے۔ اس میں نمازوں کی اہمیت اور ذکر و تسبیح کی تلقین ہے۔

فرض نمازوں کے بعد تسبیحات کی مشروعیت

سوال ایسی آیت کریمہ بیان کیجیے جس میں نمازوں کے بعد تسبیح کی مشروعیت بیان کی گئی ہو۔

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ {۴۰} ق.

اور رات کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدوں کے بعد بھی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں ادبار السجود سے مراد یہ ہے کہ نمازوں کے بعد تسبیحات پڑھے۔ (ابن کثیر)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس بات کے ثبوت میں کہ یہاں ادبار السجود سے مراد نمازوں کے بعد والی تسبیحات ہیں ایک روایت بھی پیش فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جَاءَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلَى وَالنَّعِيمِ الْمُقِيمِ. فَقَالَ: وَمَاذَاكَ؟ قَالُوا: يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ وَلَا نَتَصَدَّقُ، وَيُعْتِقُونَ وَلَا نُعْتِقُ! قَالَ: أَفَلَا أُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا إِذَا فَعَلْتُمُوهُ سَبَقْتُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَلَا يَكُونُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ إِلَّا مَنْ فَعَلَ مِثْلَ مَا فَعَلْتُمْ؟ تُسَبِّحُونَ وَتُحَمِّدُونَ وَتُكَبِّرُونَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ. قَالَ: فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، سَمِعَ إِخْوَانُنَا أَهْلُ الْأَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا، فَفَعَلُوا مِثْلَهُ. قَالَ: ذَلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

مہاجرین فقراء نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کرنے لگے، یارسول اللہ! مال والے تو بڑے درجات اور ہمیشہ کی نعمتیں سمیٹ لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کیا؟ انہوں نے عرض کی کہ وہ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ اسی طرح روزے رکھتے ہیں جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں، لیکن وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم صدقہ نہیں کرتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کرتے، آپ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں کچھ ایسا نہ بتاؤں جب تم وہ کرو تو تم اپنے بعد والوں سے سبقت کر جاؤ گے، اور تم سے کوئی بھی افضل نہیں ہو گا، مگر وہ شخص جو تمہاری طرح عمل کرے، وہ عمل یہ ہے کہ تم تسبیح، تحمید اور تکبیر کہو ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمارے مالدار بھائیوں نے وہ بات سن لی جو ہم نے کیا، تو انہوں نے بھی اسی طرح کر لیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

بخاری شریف میں الفاظ کچھ اس طرح بھی موجود ہیں کہ وہ اسی طرح جہاد کرتے ہیں جس طرح ہم جہاد کرتے ہیں، وہ اپنے زائد اموال بھی خرچ کرتے ہیں جب کہ ہمارے پاس اموال نہیں ہیں، اس پر نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ أَفَلاَ أُخْبِرُكُمْ بِأَمْرٍ تُدْرِكُونَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، وَتَسْبِقُونَ مَنْ جَاءَ بَعْدَكُمْ، وَلاَ يَأْتِي أَحَدٌ بِمِثْلِ مَا جِئْتُمْ بِهِ إِلَّا مَنْ جَاءَ بِمِثْلِهِ؟ تُسَبِّحُونَ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلاَةٍ عَشْرًا، وَتَحْمَدُونَ عَشْرًا، وَتُكَبِّرُونَ عَشْرًا، کیا میں تمہیں ایسے کام کی خبر نہ دوں کہ تم اپنے سے پہلے والوں کو پالو گے اور اپنے سے بعد والوں سے آگے نکل جاؤ گے، اور کوئی شخص تمہاری طرح نہیں ہو گا سوائے اس کے جو تمہاری طرح کا عمل کرے؟ تم لوگ ہر نماز کے بعد دس دس بار تسبیح کر لیا کرو، دس دس بار تحمید کر لیا کرو، اور دس دس بار تکبیر کہہ لیا کرو۔

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ پانچ وقت کی نمازوں میں دس دس بار ان تسبیحات کو پڑھنے سے یہ زبان پر تو پچاس ہو گئیں، مگر میزان میں ایک ہزار پانچ سو ہو جاتی ہیں، اور جب تو سونے کے لیے بستر پر جائے تو سو بار زبان سے پڑھے گا تو میزان میں ہزار شمار ہوں

گی۔(ترمذی)ترمذی کی روایت میں چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ ان کی طرف ایسی بات لکھ کر بھیجیں جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنی ہو، چنانچہ حضرت مغیرہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ کر بھیجا کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد یوں فرمایا کرتے تھے لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ، حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھا کروں (یعنی قرآن کریم کی آخری دو سورتیں)(ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نمازوں کے بعد تسبیحات پڑھا کرتے تھے تو میں آپ ﷺ کو دیکھتا تھا کہ آپ ﷺ اپنی انگلیوں پر انہیں گن رہے ہوتے تھے۔(ترمذی)

حضرت مصعب بن سعد اور حضرت عمرو بن میمون دونوں فرماتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بچوں کو یہ کلمات اس طرح سکھاتے تھے جس طرح استاذ بچوں کو سکھاتا ہے اور فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ ان کلمات کے ذریعے ہر نماز کے بعد پناہ مانگا کرتے تھے، وہ دعائیہ کلمات یہ ہیں اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَعَذَابِ الْقَبْرِ (ترمذی) اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں بزدلی سے، آپ کی پناہ چاہتا ہوں بخل سے، آپ کی پناہ چاہتا ہوں ارذل العمر (جب انسان دوسروں کا محتاج بن جاتا ہے) اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں دنیا کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ يَا مُعَاذُ، وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، فَقَالَ: أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ لَا تَدَعَنَّ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُولُ: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ (ابوداؤد) اے معاذ! اللہ کی قسم مجھے آپ سے محبت ہے، اللہ کی قسم مجھے آپ سے محبت ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے

معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ تو ہر نماز کے بعد ان کلمات کو کہنا نہ چھوڑ، کہ اے میرے اللہ! میری اپنے ذکر پر مدد کر، میری اپنے شکر پر مدد کر، میری اپنی عمدہ اور اچھی عبادت پر مدد کر۔

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی ان کے ساتھ شادی کی تو ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر، ایک تکیہ، دو چکیاں، ایک مشکیزہ اور دو پیالے عنایت فرمائے، تو ایک دن میں نے فاطمہ سے کہا کہ آپ کے ابا (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لونڈیاں غلام آئے ہیں، آپ ان کے پاس چلی جائیں اور ان سے خدمت کے لیے مانگ لیں۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں کہ اللہ کی قسم! چکی چلا چلا کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں، اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا، اے پیاری بیٹی! کیسے آئی ہو؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوئی ہوں۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کرنے سے شرما گئیں، سوال کیے بغیر واپس چلی گئیں، واپسی پر حضرت علی نے پوچھا، تو نے کیا کیا؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ مجھے حیا آرہی تھی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کروں، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم دونوں مل کر آئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ! پانی کے مشکیزے اٹھا اٹھا کر میرا سینہ درد کر رہا ہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی چکی چلا چلا کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لونڈیاں غلام وسعت آگئی ہے، اس لیے ہمیں دیجیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی قسم! میں تم دونوں کو نہیں دوں گا، میں صفہ والوں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طالب علم) کو بلاؤں گا، بھوک کی وجہ سے ان کے پیٹ پیٹھ کے ساتھ لگ چکے ہیں، اور میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں ان طالب علموں پر خرچ کروں، لیکن میں ان لونڈیوں غلاموں کو بیچوں گا اور ان کی قیمت ان طالب علموں پر خرچ کروں گا۔

یہ بات سن کر دونوں (علی وفاطمہ) واپس چلے گئے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پاس تشریف

لائے، اور یہ دونوں اپنی چادر میں داخل ہو چکے تھے، جب یہ دونوں اپنا سر ڈھانکتے تو ان کے قدم کھل جاتے تھے، اور جب قدم ڈھانکتے تو ان دونوں کے سر ننگے ہو جاتے تھے، آپ ﷺ کو دیکھ کر یہ دونوں آپ ﷺ کی طرف لپکے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں اپنی جگہ پر رہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نماز کے بعد دس بار تسبیح، دس بار تحمید، دس بار تکبیر کہہ لیا کرو، اور جب تم دونوں اپنے بستر کی طرف آؤ تو تینتیس بار تسبیح، تنتیس بار تحمید، اور چونتیس بار تکبیر کہہ لیا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! میں نے ان کلمات کو اس کے بعد نہیں چھوڑا جب سے نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ سکھائے، کسی کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ میں نے صفین کے محاذ پر بھی یہ کلمات پڑھنا ترک نہیں کیے تھے۔ (مسند احمد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر یہ فرماتے تھے کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد ان چار فتنوں سے پناہ مانگا کرتے تھے اور یوں فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الفِتَنِ، مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْأَعْوَرِ الْكَذَّابِ (مسند احمد)

اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے، اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں دوزخ کی آگ سے، اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں فتنوں سے، ان سے جو ظاہر ہیں اور ان سے جو چھپے ہوئے ہیں، اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کانے جھوٹے (دجال) کے فتنے سے۔

حضرت مسلم بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ ہر نماز کے بعد یوں فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ، وَالْفَقْرِ، وَعَذَابِ الْقَبْرِ، اے میرے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں کفریہ کلمات سے، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں فقر سے، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے۔ (مسند احمد)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا من قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ فِي دبر كل صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ لَم يَمنَعهُ مِن دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا أَن يَمُوتَ (عمل الیوم واللیلہ للنسائی) جو

شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا اسے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے سوائے موت کے، یعنی مرتے ہی جنت میں جائے گا۔

منادی، یوم ندا، مکان قریب

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ جس دن منادی کی جائے گی یہ کیا دن ہے؟ منادی کون ہے؟ جس مکان قریب کا یہاں ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ نداء کیا ہوگی؟

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ {۴۱} ق.

جواب ترجمہ: اور ذرا توجہ سے سنو! جس دن ایک پکارنے والا ایک قریبی جگہ سے پکارے گا۔

جس دن پکارنے والا پکارے گا یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونک دیں گے، صور کی یہ آواز دور اور قریب سے سنی جائے گی یعنی ہر سننے والے کو ایسا معلوم ہوگا کہ یہیں قریب سے پکارا جارہا ہے۔ پوری زمین کے رہنے والے زندہ اور مردے سب کے سب یکساں سنیں گے۔

پہلے زمانہ میں تو لوگ اس کو سن کر کچھ تامل کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ ایک آواز کو پوری دنیا میں اور آسمانوں میں یکساں کیسے سنا جاسکتا ہے۔ لیکن آج کے حالات اور آلات نے بتادیا کہ اس میں کچھ بھی اشکال کی بات نہیں ہے، آلات تو بہت ہیں ایک ٹیلی فون ہی کو لے لو بآسانی اس کے ذریعہ ہلکی سی آواز بھی ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں سنی جاتی ہے دور اور نزدیک کے سننے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (انوارالبیان)

جس دن منادی کی جائے سے مراد قیامت کا دن ہے، منادی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں، جن کی ذمہ داری اور ڈیوٹی ہی یہ لگائی گئی ہے کہ وہ قیامت کے دن صور پھونکیں گے اور سب لوگ فنا ہوجائیں گے، حضرت اسرافیل علیہ السلام جب سے پیدا ہوئے تب سے اب تک اور اب سے تا قیام قیامت وہ نرسنگا ان کے منہ میں رکھا رہے گا، وہ عرش الٰہی کی طرف توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں کہ کب انہیں اشارہ ملے تو وہ صور پھونکیں، جب اشارہ ہوجائے گا تو پھر ان کے صور پھونکنے میں ذرا بھی دیر نہیں ہوگی، مکان قریب سے مراد یہاں صخرہ بیت المقدس ہے، یہ وہ زمین کا حصہ ہے جو بہ نسبت باقی زمین

کے آسمان سے زیادہ قریب ہے۔

یہاں ندا سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام کا فرمان ہے جب وہ صخرہ بیت المقدس کے اوپر کھڑے ہو کر فرمائیں گے۔ أَيَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِيَةُ، وَالْأَوْصَالُ الْمُتَقَطِّعَةُ، إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُنَّ أَنْ تَجْتَمِعْنَ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ، اے بوسیدہ ہڈیو! اے کٹے ہوئے اعضاء تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ قضا کے فیصلوں کے لیے جمع ہو جاؤ۔

قیامت کا ہنگامہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ {۴۲} اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ {۴۳} يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ {۴۴} نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ {۴۵} ق

جواب ترجمہ: جس دن لوگ سچ مچ اس پکار کی آواز سنیں گے، وہ قبروں سے نکلنے کا دن ہو گا۔ یقین رکھو ہم ہی ہیں جو زندگی بھی دیتے ہیں اور موت بھی اور آخر کار سب کو ہمارے پاس ہی لوٹنا ہے۔ اس دن جب زمین پھٹ کر ان کو اس طرح باہر کر دے گی کہ وہ جلدی جلدی نکل رہے ہوں گے۔ اس طرح سب کو جمع کر لینا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے اور (اے پیغمبر) تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔) لہٰذا قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرتے رہو جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔

يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ: یہ آیت قیامت کے دن کی منظر کشی کرتی ہے۔ **الصَّيْحَة** سے مراد قیامت کے دن صور کی وہ زوردار آواز ہے جس سے تمام مردے قبروں سے نکل آئیں گے۔ "بالحق" یعنی یہ آواز حق اور سچائی پر مبنی ہے، جس میں کوئی شک نہیں۔ "**ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ**" یعنی یہی وہ دن ہے جب لوگ قبروں سے نکل کر اللہ کے حضور جمع ہوں گے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ: اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو بیان فرماتے ہیں کہ وہی زندہ کرتا

ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ "وإلینا المصیر" یعنی سب کا لوٹنا اور انجام اللہ ہی کی طرف ہے، قیامت کے دن سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

یَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ: قیامت کے دن زمین پھٹ جائے گی اور مردے قبروں سے نکل کر تیزی سے محشر کی طرف دوڑیں گے۔ "سِرَاعًا" یعنی وہ سب جلدی جلدی اور تیزی سے نکلیں گے۔ "ذلک حشر علینا یسیر" یعنی یہ سب لوگوں کو جمع کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے، اس میں کوئی مشکل نہیں۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ: اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہیں کہ وہ کفار جو کچھ کہتے ہیں، اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ "وما أنت علیھم بجبار" یعنی اے نبی! آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں، آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، زبردستی ایمان لانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ "فذکر بالقرآن من یخاف وعید" یعنی قرآن کے ذریعے اس شخص کو نصیحت کریں جو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

۲۶ مئی ۲۰۱۸ء بمطابق ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ بروز ہفتہ، ۷ بجے علی الصبح

نظر ثانی۔ ۳۰ مئی ۲۰۱۸ء، بمطابق ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ بروز بدھ سوا ایک بجے شب

اضافات وترمیمات: ۲۲ جنوری ۲۰۲۶ء سوا ۳ بجے وقت التہجد

☼

سورۃ الذاریات (تعارف)

سوال سورۃ الذاریات کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الذاریات مکی سورت ہے اور اس میں ۶۰ آیات ہیں، یہ قرآن مجید کی ۵۱ویں سورت ہے، اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت، توحید، رسالت، آخرت کی جزا و سزا، سابقہ امتوں کے واقعات اور انسان کی تخلیق کے مقاصد کو بیان فرمایا ہے، سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں (خصوصاً ہواؤں) کی قسم سے ہوتی ہے اور آخر میں بھی رزق اور اللہ کی ربوبیت پر بات کی گئی ہے، جس سے سورت کے آغاز و انجام میں خوبصورت ربط پیدا ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام "الذاریات" ہے، جو اس کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، "الذاریات" سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو اللہ کے حکم سے گرد و غبار اور دیگر اشیاء کو اڑاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورت کے آغاز میں انہی ہواؤں کی قسم کھائی ہے، اسی نسبت سے اس سورت کو "الذاریات" کہا جاتا ہے۔

اہمیت وافادیت: اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کے وقوع، جزا و سزا، اور سابقہ امتوں (قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، فرعون وغیرہ) کے انجام کو بیان کر کے انسانوں کو عبرت دلائی ہے۔ سورت میں توحید اور اللہ کی ربوبیت پر دلائل دیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ رزق کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس سورت میں عبادت کی غرض و غایت کو بیان کیا گیا کہ میں نے جن و انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ سورت میں اہل ایمان کے اوصاف (رات کو کم سونا، سحر کے وقت استغفار کرنا، مال میں حق مقرر کرنا) بیان کیے گئے ہیں۔ (فتح البیان فی مقاصد القرآن)

نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کو صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سورت کی تلاوت سے انسان کے دل میں اللہ کی قدرت، توحید اور آخرت کا یقین مضبوط ہوتا ہے۔ سابقہ امتوں کے واقعات سے عبرت اور نصیحت ملتی ہے کہ اللہ کی نافرمانی کا انجام تباہی ہے۔ اس سورت میں رزق کے بارے میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ سورت میں عبادت کی اصل غرض بیان کر کے انسان کو اپنی زندگی کا مقصد یاد دلایا گیا ہے۔

امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے، جو شخص سورۃ الذاریات دن یارات میں پڑھے، اللہ اس کی روز میں وسعت دے گا اور اس کی قبر کو قیامت تک روشن رکھے گا۔ (الامثل فی تفسیر کتاب اللہ المنزل)

اللہ تعالیٰ کی قسمیں

سوال اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کن چیزوں کی قسم کھائی ہے؟

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾ الذاریات.

جواب ترجمہ: قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو گرد اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔ پھر ان کی جو (بادلوں کا) بوجھ اٹھاتی ہیں۔ پھر ان کی جو آسانی سے رواں دواں ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کی جو آسانی سے رواں دواں ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کی جو چیزیں تقسیم کرتی ہیں۔ جس کا تم سے وعدہ ہے وہ سچا ہو کر رہے گا۔ اور اعمال کا بدلہ یقینا مل کر رہے گا۔

مفسر قرآن امام الحسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں

وَالذَّارِيَاتِ ذَرْواً: اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو خاک اڑاتی ہیں۔ عربی محاورے میں یوں کہا جاتا ہے ذَرَتِ الرِّيحُ التُّرَابَ، ہوا نے خاک اڑائی۔

فَالْحَامِلَاتِ وِقْراً: یعنی وہ ہوائیں جو بادل کی صورت میں پانی کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔

فَالْجَارِيَاتِ يُسْراً: وہ کشتیاں جو پانی میں سہولت سے چلتی ہیں۔

فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْراً: وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق چیزوں کو مخلوق کے درمیان تقسیم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم اس لیے کھائی کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی صفت اور قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور اس قسم کا جواب ان آیات میں ہے، اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٍ، یعنی تم سے جو ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور گناہ گاروں کو جو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے وہ وعدہ اور وعید سچا ہے۔

وَاِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ: یعنی قیامت کے دن میدان حشر میں ضرور حساب و کتاب ہو گا۔ (معالم التنزیل)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر ابو الطفیل کا بیان نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں منبر پر چڑھ کر فرمایا: لَا تَسْأَلُونِي عَنْ آيَةٍ فِي كِتَابِ اللهِ، وَلَا عَنْ سُنَّةٍ عَنْ رَسُولِ اللهِ، إِلَّا أَنْبَأْتُكُمْ بِذَلِكَ، آپ لوگ مجھ سے کتاب اللہ کی کسی آیت اور سنت رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی سوال کرو گے تو میں تمہیں اس کے بارے میں جواب دوں گا۔ حضرت علی المرتضیٰ کی زبان سے یہ بات سن کر ابن الکوّاء اٹھا اور اس نے پوچھا کہ اے امیر المومنین! اس آیت کا کیا معنی ہے: الذّٰرِيَاتِ ذَرْواً ؟ آپ نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے: آندھی۔ اس نے پوچھا کہ: فَالْحَامِلَاتِ وِقْراً کا کیا معنیٰ ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے: بادل۔ اس نے پوچھا کہ: فَالْجَارِيَاتِ يُسْراً کا کیا معنیٰ ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے: کشتیاں۔ اس نے پوچھا کہ: فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْراً اس کا کیا معنیٰ ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا معنی ہے: فرشتے۔ (تفسیر ابن کثیر) (رزق تقسیم کرنے والے)

سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ صبیغ تمیمی حضرت عمر بن الخطاب کے پاس گیا اور حضرت عمر فاروق سے پوچھا کہ: یہ بتایئے: الذّٰرِيَاتِ ذَرْواً کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: آندھیاں ہیں اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کو نہ سنا ہوتا تو میں تم کو نہ بتاتا۔ اس نے پوچھا کہ: اچھا بتایئے: ”فالحاملات وقرا“۔ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ بادل ہیں اور اگر میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو میں تم کو نہ بتاتا۔ اس نے پوچھا کہ: اچھا یہ بتایئے کہ ”فالجاریت یسرا“ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کشتیاں ہیں اور اگر میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو میں تم کو نہ بتاتا۔ اس نے پوچھا کہ: اچھا ”فالمقسمات امرا۔“ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: اس سے مراد فرشتے ہیں اور اگر میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو میں تم کو نہ بتاتا۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی فراست سے جان لیا کہ اس شخص میں خبث باطن ہے اور یہ عناداً سوال کر رہا ہے اس لیے) آپ نے حکم دیا کہ اس کو سو درے مارے جائیں اور اس کو ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا جائے، پھر جب اس کے مارے کے زخم ٹھیک ہو گئے تو پھر اس کو سو درے مارنے کا حکم دیا اور اس کو اونٹ کے کجاوے پر سوار کرا کر انکال دیا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی طرف لکھا کہ لوگوں کو

اس سے بات کرنے سے منع کر دیں، پھر ایک عرصہ تک یونہی رہا، حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے لکھا کہ اب اس نے بہت پکی قسمیں کھا کر کہا کہ اب اس کے دل میں کوئی بغض اور عناد نہیں ہے، تب حضرت عمر نے ان کی طرف لکھا کہ میرا گمان ہے کہ اب اس کے دل میں کوئی عناد نہیں رہا، اب لوگوں کو اس سے بات کرنے کی اجازت دے دو۔ (مسند البزار بحوالہ ابن کثیر)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار وغیرہ کو اڑاتی ہیں پھر ان بادلوں کی جو بوجھ (یعنی بارش کو) اٹھاتے ہیں پھر ان کشتیوں کی جو نرمی سے چلتی ہیں پھر ان فرشتوں کی جو (حکم کے موافق اہل ارض میں) چیزیں تقسیم کرتے ہیں (مثلاً جہاں جس قدر بارش کا حکم ہوتا ہے جو مادہ ہے رزق کا وہاں بادلوں کے ذریعہ اسی قدر پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح حسب حدیث رحم مادر میں بچے کی صورت میں مذکر و مونث پوچھ کر بناتے ہیں اور سکینہ اور رعب بھی تقسیم کرتے ہیں۔

آگے ان قسموں کا جواب ہے کہ) تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور (اعمال کی) جزا (و سزا) ضرور ہونے والی ہے (ان قسموں میں اشارہ ہے استدلال کی طرف یعنی یہ سب تصرفات عجیبہ قدرت الٰہیہ سے ہونا دلیل ہے عظمت قدرت کی، پھر ایسی عظیم القدرت ذات کو قیامت کا واقع کرنا کیا مشکل ہے۔ (بیان القرآن)

حضرت مولانا محمد آصف قاسمی رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اصل میں وہ لوگ جو آخرت کا انکار کرتے تھے انسان کے مر جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت میں حساب کتاب کو عقل سے دور کی بات قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں آخرت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے منکرین کو یقین دلانے کے لئے چار چیزوں کی قسم کھائی ہے اور بتایا ہے کہ ان پر غور کر لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اور اس میں انقلابات اس کے گواہ ہیں کہ ایک دن اس نظام کو توڑ دیا جائے گا اور نئی زمین اور آسمان وجود میں آجائیں گی وہی آخرت اور حشر کا دن ہے۔

فرمایا تم نہیں دیکھتے کہ جب زمین گرمی اور خشکی سے گرد و غبار بن جاتی ہے ہر طرف دھول اڑانے والی ہوائیں چلتی ہیں تو اس گرمی سے بادل بنتے ہیں اور ہوائیں ان بھاری بادلوں کو اٹھا کر ایک خاص بلندی تک لے جاتی ہیں اور پھر جس جگہ اللہ کا حکم ہوتا ہے یہ بادل برس کر اس خشک زمین کو تر کر دیتے ہیں اور پھر اس میں ایک خاص رونق ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پانی پر کشتیاں چلتی ہیں جو اپنی نرم رفتار سے چل کر لوگوں تک رزق پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں اور پھر اللہ کے حکم سے اس کا رزق اس کی مخلوق میں تقسیم ہوتا ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح تم دیکھتے ہو کہ ایک خشک بنجر، سوکھی ہوئی مٹی پر پانی پڑتے ہی ایک دم نکھار آجاتا ہے اور مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح جب اللہ کے حکم سے صور پھونکا جائے گا تو ساری مخلوق مر جائے گی اور جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو اولین و آخرین کے تمام مردے اپنی اپنی جگہوں سے نکل کر میدان حشر کی طرف دوڑنا شروع کر دیں گے۔ (بصیرت قرآن)

اعمال کی جزاء و سزا مل کر رہے گی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ اس آیت کریمہ میں مذکور وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ کا کیا مطلب ہے؟

وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ {٦} الذاریات.

جواب ترجمہ: اور اعمال کا بدلہ یقیناً مل کر رہے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کی جزا یقیناً ملے گی، اللہ تعالیٰ نے اطاعت گزاروں سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے، توبہ تائب کرنے والوں سے اپنی محبت کا وعدہ کیا ہے، اپنے ولیوں سے قرب کا وعدہ کیا ہے، عارفین سے وصل الٰہی کا وعدہ فرمایا، طالبین کو وجدان عطا کرنے کا وعدہ فرمایا، ارباب مصائب و آلام کے لیے فرمایا کہ ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں گی۔

ایک حدیث قدسی میں رب تعالیٰ کے طلب گاروں کے لیے ارشاد ہے اَلَا مَنْ طَلَبَنِی وَجَدَنِی وَوَعْدُ اللّٰہِ وَاقِعٌ اَلْبَتَّۃَ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ، خبردار! جس نے مجھے تلاش کیا اس نے مجھے پالیا، اور اللہ کا وعدہ یقینی طور پر پورا ہونے والا ہے، اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرنے والا

کون ہے ؟(تفسیر روح البیان)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فاسقین سے دوزخ کا وعدہ فرمایا، جو گناہوں پر مصر رہیں گے ان کے ساتھ سخت ناراضی ہو گی، اللہ کے دشمن اللہ سے دور رہیں گے، جہلاء اور غافلوں سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک موقع پر اہل ایمان کی صفت بیان کی گئی کہ جب وہ جہلاء سے مخاطب ہوتے ہیں تو سلامتی کے ساتھ گزر جاتے ہیں، ان سے الجھتے نہیں، ان سے منہ نہیں لگاتے، ان سے الجھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

حضرت مولانا سعید احمد دہلوی رحمہ اللہ اس مقام پر فرماتے ہیں اور یقیناً اعمال کی جزا ضرور ملنے والی ہے۔ یعنی بارش سے پہلے جو بادلوں کو ابھارنے کے لئے تیز ہوا چلتی ہے جس سے خاک اور غبار اڑتا ہے اس کی قسم، پھر جب پانی سے بھرے ہوئے بادل اٹھ آتے ہیں ان بدلیوں کی قسم، اور ساز گار ہوا کے ساتھ جو نرم رفتار کے ساتھ کشتیاں چلتی ہیں ان کی قسم اور ان فرشتوں کی قسم جو ارزاق وغیرہ کی تقسیم پر موکل ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق مختلف علاقوں میں بارش کی تقسیم کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ چاروں قسمیں ہوا کی ہوں۔

مثلاً یوں ترجمہ کیا جائے قسم ہے ان ہواؤں کی جو اڑا کر بکھیرتی ہیں جن سے غبار اور خاک وغیرہ اڑتی ہے۔ پھر وہ ہوائیں جو بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں اور بدلیوں کی حامل ہوتی ہیں پھر وہ نرم رفتار ہوائیں جو بارش سے پہلے آہستہ اور سبک خرام ہوتی ہیں پھر ان ہواؤں کی قسم جو حکم الٰہی کے موافق پانی کو بانٹتی اور تقسیم کرتی ہیں ان تمام قسموں کا جواب قسم یہ ہے۔ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ (۵) وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ (۶) یعنی جس قیامت کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے اور جس بعث بعد الموت کا تم کو وعدہ دیا جا رہا ہے وہ بالکل سچ ہے اور اعمال کی جزا ضرور واقع ہونے والی ہے اور حساب اعمال کا ضرور ہونے والا ہے قیامت کے صدق پر ان چیزوں کی قسم کھائی۔

مناسبت ظاہر ہے کہ قیامت تمام عالم کو درہم برہم کر دے گی خواہ وہ عالم علوی ہو یا عالم سفلی ہو، یا خلا اور جو (فضا) ہو، فرشتے عالم علوی کے، کشتیاں عالم سفلی کی، ہوا اور بادل خلا اور جو (فضا) کے اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ حضرت حق تعالیٰ جو ان سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے اور جس نے یہ نظام ہواؤں کا

اور بدلیوں کا اور تقسیم امور کا قائم کیا ہے وہ اس سب کو فنا کرنے کی بھی طاقت اور قدرت رکھتا ہے اور ختم کرنے کے بعد پھر انسان کو دوبارہ پیدا بھی کر سکتا ہے۔ (تفسیر کشف الرحمٰن)

اور بیشک جزا و سزا وقوع پذیر ہو کر رہے گی۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کو تسلیم کرنے پر اس لیے اتنا زور دیا ہے کہ وہ پاکیزہ انسانی معاشرہ جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں۔ قانون کتنا سخت اور مکمل کیوں نہ ہو انسانی زندگی کے ایک محدود حصہ پر اپنی بالادستی قائم کر سکتا ہے۔ پھر اس قانون میں بھی تاویلات کے بے شمار امکانات ہیں۔ انسان کی جلوت و خلوت اسی وقت نفس اور شیطان کی دست درازیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے جب اسے یقین ہو کہ قیامت کے روز اسے اس ہستی کے سامنے جوابدہ ہونا ہے جو اس کے ظاہر و باطن سے پوری طرح آگاہ ہے اور جس سے اس کی کوئی بات مخفی نہیں۔

عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ انسان، جسے عقل و فہم کی نعمت بخشی گئی ہے، جسے بے پناہ وسائل کا مالک بنا دیا گیا ہے، جسے اختیار و ترک کی پوری آزادی دی گئی ہے، اس سے اس کے تمام اعمال کے بارے میں باز پرس کی جائے، ورنہ ایک حیوان اور انسان میں کوئی تفاوت باقی نہیں رہے گا۔ (ضیاء القرآن)

راستوں والے آسمان سے کیا مراد ہے؟

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں الْحُبُك کا کیا مطلب ہے؟

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ {۷} الذاریات.

جواب ترجمہ: قسم ہے راستوں والے آسمان کی۔

حُبُك، حَبِيكَه کی جمع ہے، کپڑے کی بناوٹ میں جو دھاریاں ہو جاتی ہیں ان کو حبک کہا جاتا ہے، وہ چونکہ راستہ اور سڑک کے مشابہ ہوتی ہیں اس لئے راستوں کو بھی حبک کہہ دیا جاتا ہے۔

بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی مراد لئے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے، راستوں سے وہ راستے بھی مراد ہو سکتے ہیں جن سے فرشتے آتے جاتے ہیں اور اس سے مراد ستاروں اور سیاروں کے راستے اور ان کے مدار بھی ہو سکتے ہیں جو دیکھنے والوں کو آسمان میں نظر آتے

ہیں اور چونکہ یہ بناوٹ کی دھاریاں کپڑے کی زینت اور حسن بھی ہوتی ہیں، اس لئے بعض حضرات مفسرین نے یہاں حبک کے معنی زینت اور حسن کے لیے ہیں کہ قسم ہے آسمان کی جو حسن وزینت والا ہے۔

یہ قسم جس مضمون کے لئے آئی ہے وہ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ میں مذکور ہے، بظاہر اس کے مخاطب مشرکین مکہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے متعلق مختلف اور متضاد باتیں کہا کرتے تھے، کبھی مجنون، کبھی جادوگر، کبھی شاعر وغیرہ کے لغو خطابات دیتے تھے اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کے مخاطب عام امت کے لوگ مسلم و کافر سب ہوں اور قول مختلف سے مراد یہ ہو کہ بعض تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاتے اور تصدیق کرتے ہیں، بعض انکار و مخالفت سے پیش آتے ہیں (تفسیر مظہری)

الْحُبُكِ کی تفسیر: الحبک کی تفسیر میں سات اقوال ہیں۔ ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس چیز کی ظاہری بناوٹ حسین و جمیل اور ہموار ہو۔

② عکرمہ نے کہا: جب کوئی کپڑا بننے والا عمدہ کپڑا بنے تو کہتے ہیں: حَبَكَ الثَّوب اى اَجَادَ سو ذَاتَ الْحُبُكِ کا معنی ہے: عمدگی والا۔ ③ ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا: ہر وہ چیز جس کو تم مضبوط اور خوب صورت بناؤ اس کے متعلق کہا جاتا ہے: اِحتَبَكتَهُ، یعنی حسن اور مضبوطی والا۔ ④ حسن بصری نے کہا، اس سے مراد ہے: میزان، ان کا دوسرا قول ہے: اس سے مراد ہے ستاروں والا آسمان۔

⑤ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد ہے: مختلف راستوں والا، جب ہوا چلنے سے ریگستان میں مختلف راستے بن جائیں تو کہتے ہیں: ذَاتَ الْحُبُكِ۔ ⑥ لوہے کی زرہ اور گھنگریالے بالوں کو بھی "حبک" کہتے ہیں۔ فراء نے کہا: ہر توڑنے والی چیز کو "حبک" کہتے ہیں۔ ⑦ جو چیز شدید الخلق ہو اس کو "حبک" کہتے ہیں "ذات الحبک" کا معنی ہوا جس کی بناوٹ شدید ہو۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الحبک کے معنیٰ میں چار اقوال ہیں، ① اچھی تخلیق کی ہوئی چیز۔ ② مضبوط بنیاد۔ ③ زینت والی چیز۔ ④ راستوں والی چیز۔ (تفسیر زاد المسیر) حبک: ان لہروں کو بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریت پر یا ساکن پانی میں پیدا ہوتی ہیں۔ حبک کا معنی طرق: راستے بھی ہے اور حبک کہکشاں کو بھی کہتے ہیں۔ نیز گھنگھریالے بالوں میں سلوٹیں ہوتی ہیں انہیں بھی حبک کہا

جاتا ہے (قرطبی) اکثر علماء نے اس سے مراد طرائق یعنی راستے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قسم کھا رہے ہیں۔ وہ آسمان جس میں ستاروں کی مختلف قسم کے حرکات کے باعث ان گنت راستے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو مختلف اور متباین سمتوں میں جا رہے ہیں۔ کہکشاں کا معنی بھی انسب ہے۔ اس کے باعث آسمان کا حسن دوبالا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں جدید تحقیقات نے حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں یعنی کہکشاں والے آسمان کی قسم۔ (ضیاء القرآن)

کافروں کی متضاد آراء

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ {۸} يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ {۹} قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ {۱۰} الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ {۱۱} الذاریات.

جواب ترجمہ: بے شک تم لوگ پڑے ہو ایک سخت ہی اختلاف والی بات میں۔ اس (آخرت کی حقیقت) سے وہی منہ موڑتا ہے جو حق سے بالکل ہی مڑا ہوا ہے۔ خدا کی مار ہو ان پر جو (عقیدے کے معاملے میں) اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے ہیں۔ جو غفلت میں ایسے ڈوبے ہیں کہ سب کچھ بھلائے بیٹھے ہیں۔

اے جھٹلانے والے کافرو! راستوں والے آسمان کی قسم! تمہاری کوئی رائے ایک نہیں ہے، تمہاری کوئی بات حتمی نہیں ہے، تم کسی ایک بات پر ٹھہرنے والے نہیں ہو۔ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے بارے میں کبھی تمہاری رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ شخص تو جادوگر ہے، کبھی تم یہ بات ہانکتے ہو کہ یہ آدمی تو کاہن ہے، کبھی جسارت کرتے ہو کہ یہ شخص مجنون ہے، کبھی تم لوگ ان پر شاعر ہونے کی پھبتی کستے ہو۔

اسی طرح اے کافرو، جھٹلانے والو! تم میری سچی کتاب قرآن کریم کے بارے میں ایک رائے نہیں رکھتے، تمہاری باتیں قرآن کے بارے میں بھی مختلف ہیں، کبھی تم اسے جادو کہتے ہو، کبھی اس کو شعر وشاعری کہتے ہو، تم میں جو زیادہ زبان دراز ہیں وہ یوں ہانکتے ہیں کہ جی یہ کتاب تو اساطیر الاولین (پرانے قصے کہانیاں) دکھائی دیتی ہے، جس میں پچھلے لوگوں کے قصے اور کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

اسی طرح اے کافرو، جھٹلانے والو! قیامت کے بارے میں بھی تمہاری آراء متضاد، مختلف اور حیرت انگیز ہیں، تم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسے عقل سے بہت دور کی بات سمجھتے ہیں، بعض تم میں ایسے ہیں جو تناسخ کے قائل ہیں، جتنے منہ اتنی باتیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگ دل ودماغ، فکر وسوچ کو کام میں لا کر بات نہیں کرتے ہو، اتنے سارے دلائل، اتنی ساری براہین جن کا کوئی توڑ نہیں ہے ان سے تم لوگ کوئی نتیجہ نکالنے کے لیے تیار نہیں ہو، بلکہ محض اندازے لگاتے ہو، اٹکل سے بات کرتے ہو، گمان کے گھوڑے دوڑاتے ہو، اپنے مفروضوں پر باتیں کرتے ہو۔

اس لیے یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ قرآن اور صاحب قرآن کے بارے میں ایمان وایقان سے ہٹی ہوئی باتیں جو لوگ کرتے ہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے دلائل کا انکار کیا ہے، انہوں نے براہین یقینیہ قطعیہ کا انکار کیا ہے، تو ایسے منکرین کو خیر کی توفیق نہیں دی جاتی، ایسے جھوٹوں اور جھوٹے گمان کرنے والے، اندازے لگانے والے، تخمینے لگانے والوں پر لعنت کی گئی ہے، ایسے لوگ جو کفر کی وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے ہیں، جو گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو غفلت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں، جو شکوک وشبہات میں گھسے ہوئے ہیں۔

آخرت کے بارے کافروں کا سوال

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ {۱۲} يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ {۱۳} ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ {۱۴} اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ {۱۵} اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ {۱۶} الذاریات

جواب ترجمہ: پوچھتے ہیں کہ: جزا وسزا کا دن کب ہو گا؟ اس دن ہو گا جب انہیں آگ پر تپایا جائے گا۔ کہ چکھو مزہ اپنی شرارت کا۔ یہی ہے وہ چیز جس کے بارے میں تم یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ جلدی آجائے۔ متقی لوگ بیشک باغوں اور چشموں میں اس طرح رہیں گے۔ کہ ان کا پروردگار انہیں جو کچھ دے گا، اسے وصول کر رہے ہوں گے۔ وہ لوگ اس سے پہلے ہی نیک عمل کرنے والے تھے۔

قرآن، صاحب قرآن، قیامت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے پر مزاح کرنے والے کافروں کی طرف سے پوچھا جاتا تھا کہ جی! قیامت کب آئے گی؟ یہ بات وہ لوگ بطور مزاح کرتے تھے، حقیقت دریافت کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے، فرمایا کہ یہ وہ دن ہو گا جس دن تمہیں آگ میں تپایا جائے گا، جس دن کے بارے میں تم کہتے پھرتے تھے کہ اگر یہ کچھ سچ ہے تو پھر ہمارے اوپر ابھی عذاب کیوں نہیں آجاتا؟

مکذبین کی سزا بتانے کے بعد مومنین متقین کا انعام بتایا اور فرمایا کہ متقی لوگ باغوں میں چشموں میں ہوں گے ان کے رب کی طرف سے انہیں وہاں جو کچھ دیا جائے گا اسے (بڑی خوشی سے) لینے والے ہوں گے، دنیا میں یہ حضرات گناہوں سے تو بچتے ہی تھے جس کی وجہ سے انہیں متقین کے لقب سے سرفراز فرمایا، اعمال صالحہ بھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور اس کی وجہ سے انہیں محسنین کے لقب سے ملقب فرمایا ان کے نیک کاموں میں ایک بڑا قیمتی عمل یہ تھا کہ رات کو بہت کم سوتے تھے نمازیں پڑھتے رہتے تھے دنیا سوتی رہتی اور یہ لوگ جاگتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے لو لگاتے تھے۔ (انوار البیان)

اہل ایمان و تقویٰ کی شان

سوال اس آیت کریمہ میں کیا ارشاد فرمایا گیا؟

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ {۱۷} الذاریات.

جواب ترجمہ: یہ لوگ رات کو کم سوتے تھے۔

يَهْجَعُوْن، هُجُوْعٌ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ رات کو سونے کے آتے ہیں، اس میں مومنین متقین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں، سوتے کم ہیں جاگتے زیادہ ہیں اور وقت نماز وعبادت میں گزارتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ متقین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ (معارف القرآن)

حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف ما کو اس میں نفی کے لئے قرار دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں بلکہ عبادت نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں، اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہو جاتے ہیں، جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کر لیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں، اسی لئے حضرت انس اور ابو العالیہ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا جو مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں اور امام ابو جعفر باقر نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوویں وہ بھی اس میں داخل ہیں (ابن کثیر بحوالہ تفسیر معارف القرآن)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے احنف بن قیس سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے عمل کا اہل جنت کے اعمال سے موازنہ کیا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو ہم سے بہت بلند وبالا اور ممتاز ہے وہ ایک ایسی قوم ہے کہ ہمارے اعمال ان کے درجہ تک نہیں پہنچتے کیونکہ وہ لوگ راتوں میں سوتے کم ہیں عبادت زیادہ کرتے ہیں، پھر میں نے اپنے اعمال کا اہل جہنم کے اعمال سے موازنہ کیا تو دیکھا کہ وہ اللہ ورسول کی تکذیب کرنے والے قیامت کا انکار کرنے والے ہیں (جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا) اس لئے ہمارے اعمال موازنہ کے وقت نہ اصل اہل جنت کے درجہ کو پہنچتے ہیں اور نہ (بحمد اللہ) اہل جہنم کے ساتھ ملتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ ہمارا درجہ عمل کے اعتبار سے وہ ہے جن کا قرآن کریم نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے، خَلَطُوا عَمَلاً صَالِحًا وَّآخَرَ سَيِّئًا یعنی وہ لوگ جنہوں نے اچھے برے اعمال خلط ملط کر رکھے ہیں، تو ہم میں بہتر آدمی وہ ہے جو کم از کم اس طبقے کی حدود میں رہے۔ (معارف القرآن)

اور عبد الرحمن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے والد سے کہا کہ اے ابو اسامہ ہم اپنے اندر وہ صفت نہیں پاتے جو اللہ تعالیٰ نے متقین کے لئے ذکر فرمائی ہے، یعنی كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ کیونکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ وَنَحْنُ وَاللهِ قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا نَقُوْمُ، یعنی رات میں بہت کم جاگتے اور عبادت کرتے ہیں، میرے والد نے اس کے جواب میں

فرمایا: طُوبَى لِمَنْ رَقَدَ إِذَا نَعَسَ، وَاتَّقَى اللهَ إِذَا اسْتَيْقَظَ (ابن کثیر) بشارت ہے اس شخص کے لئے جس کو نیند آوے تو سو جاوے مگر جب بیدار ہو تو تقویٰ اختیار کرے یعنی خلاف شرع کوئی کام نہ کرے۔

مطلب یہ ہے کہ مقبولیت عند اللہ صرف رات کو بہت جاگنے میں منحصر نہیں، جو شخص نیند سے مجبور ہو اور رات میں زیادہ نہ جاگے، مگر بیداری میں گناہ و معصیت سے بچے وہ بھی قابل مبارک باد ہے۔ (معارف القرآن)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَأَفْشُوا السَّلَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (ابن کثیر) اے لوگو! تم لوگوں کو کھانا کھلاؤ، رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو اور سلام ہر مسلمان کو کرو اور رات کو اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ إِنَّ فِي الْجَنَّةِ غُرَفًا يُرَى ظَاهِرُهَا مِنْ بَاطِنِهَا، وَبَاطِنُهَا مِنْ ظَاهِرِهَا. فَقَالَ أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ: لِمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: لِمَنْ أَلَانَ الْكَلَامَ، وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَبَاتَ لِلّٰهِ قَائِمًا، وَالنَّاسُ نِيَامٌ (مسند احمد) جنت میں ایک بالاخانہ ایسا ہے جس کا باہر اس کے اندر سے دیکھا جاسکتا ہے، اور اس کا اندر اس کے باہر سے دیکھا جاسکتا ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ بالاخانہ کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس شخص کے لیے ہے جو نرم گفتگو کرے، کھانا کھلائے، اور اللہ کے لیے کھڑے ہو کر رات گزارے جب کہ لوگ سو رہے ہوں۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ایک فرمان یہ ہے کہ كَانُوا كَثِيرًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يُصَلُّونَ، وہ لوگ رات کو بہت زیادہ نماز پڑھتے تھے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ صَلَاةِ اللَّيْلِ أَفْضَلُ قَالَ فِي نِصْفِ اللَّيْلِ وَقَلِيلٌ فَاعِلُهُ (روح البیان) میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ رات کی کون سی نماز افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدھی رات کی نماز لیکن اسے پڑھنے والے تھوڑے ہی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ إِذَا تَابَ العَبدُ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَحَسُنَت تَوبَتُه، وقَامَ باللَّيل يُنَاجِي رَبَّهُ، أَوقَدَتِ المَلَائِكَةُ سِرَاجًا مِّن نُور، وَعَلَّقَتهُ بَينَ السَّمَاءِ وَالأَرضِ، فَتَقُولُ المَلَائِكَةُ: مَا هٰذَا؟ فَيُقَالُ لَهُم: إِنَّ فَلَانَ بن فَلَان قَدِ اصطَلَحَ اللَّيلَةَ مَعَ مَولَاهُ، جب بندہ اللہ عزوجل کی طرف توبہ کرتا ہے اور اس کی توبہ اچھی ہوتی ہے اور وہ رات کو اٹھ کر اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے تو فرشتے نور کا ایک چراغ روشن کرتے ہیں، اور اسے آسمان وزمین کے درمیان لٹکا دیتے ہیں، دوسرے فرشتے ان چراغ روشن کرنے والے فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ اس پر انہیں بتایا جاتا ہے کہ بے شک فلاں جو فلاں کا بیٹا ہے اس نے آج کی رات اپنے رب سے صلح کرلی ہے۔ (کنز العمال)

حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا إِذَا قَامَ الْعَبْدُ بِاللَّيْلِ، تَبَاشَرتْ أَعْضَاؤُهُ، وَنَادَى بَعْضُهَا بَعْضًا: قَدْ قَامَ صَاحِبُنَا لِخِدْمَةِ اللهِ تَعَالَى (بحر الدموع لابن الجوزی) جب بندہ رات کو اٹھتا ہے تو اس کے اعضاء ایک دوسرے کو خوشخبری سناتے ہیں اور ایک دوسرے کو پکار کر کہتے ہیں کہ ہمارا ساتھی اللہ کی غلامی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

حضرت احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ کی خدمت میں گیا، میں نے انہیں روتے ہوئے دیکھا، تو میں نے ان سے پوچھا کہ اے میرے آقا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا، اے احمد! محبت والوں پر جب رات چھا جاتی ہے تو وہ اپنے قدم پھیلا دیتے ہیں اور رکوع اور سجدہ کی حالتوں میں ان کے رخساروں پر آنسو جاری رہتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ شانہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں

اے جبریل! وہ میرے سامنے ہے، جس نے میرے ساتھ کلام کرنے میں لذت پائی اور میرے ساتھ مناجات کر کرکے آرام وراحت محسوس کی، میں ان سے باخبر ہوں، ان کی بات کو سنتا ہوں، ان کے غم اور رونے کو دیکھتا ہوں، اے جبریل! ان کو آواز دے اور کہہ کہ یہ پریشانی کیوں ہے؟ جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا کسی مخبر نے تمہیں بتلایا ہے کہ دوست اپنے دوستوں کو آگ کے عذاب میں ڈالے گا،

کیا مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ میں ایک قوم کو رات کو ٹھکانہ دوں اور ان کو سوتے میں دوزخ کا حکم کر دوں؟ ایسا تو کسی برے آدمی کو بھی لائق نہیں ہے، مالک کریم کے مناسب کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ان کے سامنے اپنا ہدیہ ضرور پیش کروں گا مطلب یہ کہ میں اپنے چہرے سے پردہ ہٹاؤں گا، میں ان کی طرف دیکھوں گا اور وہ مجھے دیکھیں گے۔ (بحر الدموع)

وقت سحر استغفار کی اہمیت

سوال اس آیت میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ {۱۸} الذاریات

جواب ترجمہ: اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔

سحر رات کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو طلوع فجر سے پہلے پہلے ہوتا ہے، اس میں دعا وغیرہ کی قبولیت کی امید رکھی جاتی ہے، اس وقت کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس میں رات کو ڈیوٹی دینے والے فرشتے اور دن کی ڈیوٹی کے لیے آنے والے فرشتے جمع ہوتے ہیں، اس وقت استغفار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا ہے۔

بعض اہل علم یوں کہتے ہیں کہ سحر کے وقت جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ (طبری) رات کے آخری حصہ میں استغفار کرنے کو اس لیے پسند کیا گیا ہے کہ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب انسان پر نیند سوار ہوتی ہے، اس لیے اس وقت میں اس کا نماز پڑھنا اور اس میں استغفار کرنا رات کے دوسرے حصوں میں نماز اور استغفار کرنے سے زیادہ پسندیدہ عمل بتایا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا إِنَّ آخِرَ اللَّيْلِ فِي التَّهَجُّدِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَوَّلِهِ لِأَنَّ اللهَ يَقُولُ {وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ} (در منثور) رات کے آخری حصہ میں تہجد مجھے اس کے ابتدائی حصہ میں پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کرنے والوں کی تعریف میں سحر کا ذکر فرمایا ہے۔

اللہ والے لوگ اللہ کے ساتھ اتنی محبت رکھتے ہیں کہ شب بھر عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اپنے اس نیک عمل پر اتراتے اور تکبر نہیں کرتے، بلکہ وقت سحر اللہ کے حضور عاجزی وانکساری کا اظہار

کرتے ہوئے توبہ واستغفار کرتے ہیں، اس خیال سے کہ نہ جانے ہم سے اس عبادت، اس نیکی میں بھی کس قدر کوتاہیاں ہوتی ہوں گی، جن کے پیش نظر یہ نیک اعمال اللہ کے حضور پیش کرنے کے لائق ہی نہ ہوں، اس لیے وہ اپنی طویل ترین عبادت کے باوجود توبہ واستغفار کرتے تھے۔

عذر تقصیر خدمت آوردم... کہ ندارم بطاعت استظہار

عاصیان از گناہ توبہ کنند... عارفان از عبادت استغفار

خدمت میں کوتاہی اور کمی کا میں عذر لایا ہوں، کیونکہ میں ایسی اطاعت نہیں کر سکا جس کی بدولت مدد طلب کر سکوں، گناہ گار گناہ سے توبہ کرتے ہیں جب کہ عارف باللہ لوگ عبادت پر استغفار کرتے ہیں۔

امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل تقویٰ شب بھر عبادت کرتے ہیں اور استغفار کو سحری تک مؤخر کرتے ہیں، آخر میں استغفار کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

قرآن کریم کی سورۃ آل عمران میں اہل ایمان و تقویٰ کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بوقت سحر استغفار کرنے والے ہیں، اگر تو یہ استغفار نماز کے اندر ہو تو بہت ہی اچھی بات ہے، جب کہ روایات میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْأَخِيرِ، فَيَقُولُ: هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَأَتُوبَ عَلَيْهِ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ؟ هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَيُعْطَى سُؤْلَهُ؟ حَتَّى يَطْلُعَ الْفَجْرُ (مسلم)

اللہ تعالیٰ ہر رات میں اس وقت جب ثلث رات کا آخری حصہ باقی ہوتا ہے تو آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے معاف کر دوں؟ ہے کوئی سوالی کہ اس کو اس کے سوال پر دیا جائے؟ یہ صدا طلوع فجر تک جاری رہتی ہے۔

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! استغفار کیسے کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں کہو اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ، اے اللہ! ہماری بخشش فرما دیجیے، اور ہم پر رحم فرمائیے، ہماری توبہ قبول کیجیے، بے شک آپ توبہ قبول کرنے والے رحم

کرنے والے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تُوبُوا فَاِنِّی أَتُوبُ اِلَی اللّٰہِ فِی کُلِّ یَومٍ مائَۃَ مَرَّۃً اللہ سے توبہ کرو، کیونکہ میں اللہ کی بارگاہ میں روزانہ سو بار توبہ کرتا ہوں۔

ایک روایت میں تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نیک بندے کے درجات کو بلند فرماتے ہیں، تو وہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے رب! یہ میرے لیے کیسے ہوا؟ تو اللہ فرماتے ہیں کہ تیرے بیٹے کے تیرے لیے استغفار کرنے کی وجہ سے ہوا ہے، وہ اس طرح کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے معاف فرمادیجیے اور میرے والد کو معاف فرمادیجیے، بعض روایات میں تو یہاں تک آتا ہے کہ مجھے اپنے دوستوں میں مجھے وہ لوگ سب سے زیادہ محبوب ہیں جو سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں۔ (روح البیان)

شیخ عبد الکریم بن ہوازن قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ وہ لوگ اپنی تہجد اور دعاؤں کے ساتھ اپنے آپ کو سحر کے وقت گناہ گاروں کے مقام پر اتارتے ہیں، پھر وہ اپنے مرتبے اور مقام کو چھوٹا دکھانے کے لیے استغفار کرتے ہیں، اپنے فعل کو حقیر دکھانے کے لیے استغفار کرتے ہیں، اور رات کا جو یہاں ذکر ہے تو رات دوستوں کے لیے مناجات میں موانست کا ذریعہ ہے، گناہ گاروں کے لیے طلب نجات کا ذریعہ ہے، اور راتوں میں ان کا ہمیشہ جاگنا یا تو فرط افسوس کے لیے ہوتا ہے، یا کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے کف افسوس ملنے کے لیے ہوتا ہے، یا شوق ملاقات کے لیے ہوتا ہے، یا غم فراق کے لیے ہوتا ہے۔

کَم لَیلَۃٍ فِیکَ لَاصِبَاحَ لَھَا ... أَفنَیتُھَا قَابِضًا عَلَی کَبِدِی

قَد غُصَّتِ العَینُ بِالدُّمُوعِ وَقَد ... وَضَعتُ خَدِّی عَلَی بَنَانِ یَدِی

سَقَی اللّٰہُ عَیشًا قَصِیرًا مَضَی ... زَمَانُ الھَوَی فِی الصِّبَا وَالمَجُونِ

لَیَالِیہِ تَحکِی اِنسِدَادَ لَحَاظِ ... لِعَینِی عِندَ اِرتِدَادِ الجُفُونِ

ترجمہ: کتنی ہی ایسی راتیں تمہارے ساتھ گزریں جن کی کوئی صبح نہ تھی، میں نے انہیں اس حال میں کاٹ دیا کہ اپنا کلیجہ مضبوطی سے تھامے رہا۔ آنکھ آنسوؤں سے بھر کر بوجھل ہو گئی، اور میں نے اپنا رخسار اپنی ہی انگلیوں پر رکھ لیا (غم سے ٹیک لگالی)۔ اللہ سیراب کرے اُس مختصر زندگی کو جو گزر

چکی، وہ زمانہ جو لڑکپن میں محبت اور لہو ولعب میں بیتا۔ اس کی راتیں یوں بیان کرتی ہیں کہ نگاہیں بند ہو چکی تھیں، جب پلکیں پلٹ کر آنکھوں پر آگریں (یعنی غفلت اور بے خبری چھاگئی تھی)۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینے والوں کے بارے میں کسی شاعر کیا خوب کہا کہ

طُوبَىٰ لِمَنْ سَهِرَتْ بِاللَّيْلِ عَيْنَاهُ ... وَبَاتَ فِي قَلَقٍ مِنْ حُبِّ مَوْلَاهُ

وَقَامَ يَرْعَى نُجُومَ اللَّيْلِ مُنْفَرِدًا ... شَوْقًا إِلَيْهِ وَعَيْنُ اللهِ تَرْعَاهُ

ترجمہ: خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی آنکھیں رات بھر جاگتی رہیں، اور جو اپنے مولا کی محبت میں بے قراری کے ساتھ رات گزار دے۔ اور وہ تنہا کھڑا ہو کر رات کے ستاروں کو دیکھتا رہے، اس کے شوق میں (عبادت و دعا میں مشغول ہو)، جبکہ اللہ کی نگاہِ رحمت اس کی نگرانی کر رہی ہوتی ہے۔

رب تعالیٰ کے محبوب بندے جب رات چھا جاتی ہے تو اسی وقت سے اس کی بارگاہ میں حاضری کا عزم کر لیتے ہیں اور وہ زبان حال سے گویا ہوتے ہیں کہ

دَعُونِي أُنَاجِي مَوْلًى جَلِيلًا ... إِذَا اللَّيْلُ أَرْخَىٰ عَلَيَّ السُّدُولَا

نَظَرْتُ إِلَيْكَ بِقَلْبٍ ذَلِيلٍ ... لِأَرْجُوَ بِهِ يَا إِلٰهِيَ الْقَبُولَا

لَكَ الْحَمْدُ وَالْمَجْدُ وَالْكِبْرِيَاءُ ... وَأَنْتَ الْإِلٰهُ الَّذِي لَنْ يَزُولَا

وَأَنْتَ الْإِلٰهُ الَّذِي لَمْ يَزَلْ ... حَمِيدًا كَرِيمًا عَظِيمًا جَلِيلًا

تُمِيتُ الْأَنَامَ وَتُحْيِي الْعِظَامَ ... وَتُنْشِئُ الْخَلَائِقَ جِيلًا فَجِيلًا

عَظِيمُ الْجَلَالِ كَرِيمُ الْفِعَالِ ... جَزِيلُ النَّوَالِ تُنِيلُ السُّؤُولَا

حَبِيبُ الْقُلُوبِ غَفُورُ الذُّنُوبِ ... تُوَارِي الْعُيُوبَ تُقِيلُ الْجَهُولَا

وَتُعْطِي الْجَزِيلَ وَتُوَلِّي الْجَمِيلَ ... وَتَأْخُذُ مِنْ ذَا وَذَاكَ الْقَلِيلَا

خَزَائِنُ جُودِكَ لَا تَنْقَضِي ... تَعُمُّ الْجَوَادَ بِهَا وَالْبَخِيلَا

ترجمہ: مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے جلیل القدر مولا سے مناجات کروں۔ جب رات مجھ پر اپنے پردے گرا دیتی ہے۔ میں تیری طرف ایک عاجز دل کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ تاکہ اے میرے معبود! اسی کے

ذریعے تیری قبولیت کی امید رکھوں۔ تمام حمد، بزرگی اور کبریائی تیرے ہی لیے ہے۔ اور تو وہ معبود ہے جو کبھی زوال پذیر نہیں ہو گا۔ اور تو ہی وہ معبود ہے جو ہمیشہ سے ہے۔ سراپا تعریف کے لائق، نہایت کریم، عظیم اور جلیل۔ تو مخلوق کو موت دیتا ہے اور بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور نسل در نسل نئی مخلوقات کو وجود میں لاتا ہے۔ تو عظمتِ جلال والا، کرم والے افعال کا مالک۔ بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے، سوال کرنے والوں کو نوازتا ہے۔ تو دلوں کا محبوب، گناہوں کو بخشنے والا۔ عیوب کو چھپانے والا، اور جاہل کی لغزش سے درگزر کرنے والا ہے۔ تو بڑی عطائیں دیتا ہے، خوبصورت انجام عطا فرماتا ہے۔ اور اس سے بھی، اس سے بھی تھوڑا تھوڑا لے لیتا ہے۔ تیری سخاوت کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تو ان سے سخی کو بھی نوازتا ہے اور بخیل کو بھی۔

رات کے سناٹے میں، گھپ اندھیرے میں رب العالمین کے چاہنے والے، اس کی محبت میں ڈوبے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دیدار کے شائقین پکار اٹھتے ہیں کہ

أَمَولَایَ إِنِّي عَبْدٌ ضَعِيفٌ... أَتَيتُكَ أَرْغَبُ بِمَا لَدَيْكَ

أَتَيتُكَ أَشْكُو مُصَابَ الذُّنُوب... وَهَل يُشتَكَى الضُّرُ إِلَّا إِلَيْكَ

فَمَنَّ بِعَفْوِكَ يَا سَيِّدِي... فَلَيْسَ اعْتِمَادِي إِلَّا عَلَيْكَ

ترجمہ: اے میرے اللہ! میں کمزور بندہ ہوں، تیری بارگاہ میں آیا ہوں، جو کچھ تیرے پاس ہے اسے لینے کا شوق رکھتا ہوں۔ آپ کے پاس گناہ آلودہ ہو کر آپ کو دردمند بنانے آیا ہوں، اپنی بدحالی کی شکایت آپ ہی سے ہو سکتی ہے۔ اے میرے اللہ! آپ معاف فرما کر مجھ پر احسان فرمادیں، میرا سہارا آپ ہی تو ہیں۔

سائل اور محروم کا حق

سوال اس آیت میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ {۱۹} الذاریات

جواب ترجمہ: اور ان کے مال و دولت میں سائلوں اور محروم لوگوں کا (باقاعدہ) حق ہوتا تھا۔

سائل سے مراد تو وہ حاجت مند ہے جو زبان سے اپنی ضرورت کا اظہار کر دے، اور محروم سے مراد وہ ہے جو حاجت مند ہونے کے باوجود کسی سے کچھ مانگتا نہیں، اس آیت میں حق کا لفظ استعمال کر کے بتادیا گیا ہے کہ انسان ان لوگوں پر زکوٰۃ وغیرہ کی شکل میں جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق ہے جو انہیں پہنچانا ہی چاہیے تھا، کیونکہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور اس کا یہ حکم ہے کہ اس میں حاجت مند لوگوں کا بھی حصہ ہے۔ (توضیح القرآن)

متقین اور محسنین کی مزید علامات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حق کو پہچانتے اور اس کی یاد میں کوشاں رہتے ہیں اسی طرح وہ بندوں کے حقوق کو پہچاننے والے بھی ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں کے حوالے سے جو فرائض عائد کیے ہیں وہ صرف ان کو ادا کر کے نہیں رہ جاتے بلکہ ان کے علاوہ بھی وہ اپنے مال میں سائل اور محروم کا حق سمجھتے ہیں۔ یعنی جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس کوئی سوال کرنے والا اپنی جائز ضروریات کا صحیح طریقے سے ذکر کر رہا ہے وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کی جن ناگزیر ضروریات کا حوالہ دے رہا ہے اور جس طرح وہ اپنے امراض اور اپنے متعلقین کا رونا رو رہا ہے میرے لیے ضروری ہے کہ میں اس سلسلے میں اس کی مدد کروں اور یہ مدد وہ خیرات کے طور پر نہیں کرتے جس پر وہ شکریئے کے طالب ہوں بلکہ وہ سوال کرنے والے کا اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں اور اسے فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

اور مزید یہ کہ ان کا یہ احساس صرف سائلوں تک محدود نہیں بلکہ وہ اپنے مالوں پر ان لوگوں کا بھی حق سمجھتے ہیں جو خود سائل بن کر ان کے پاس نہیں آتے۔ لیکن کسی طرح ان کے علم میں یہ بات آجاتی ہے کہ یہ شخص کل تک اچھے حالوں میں تھا لیکن اب حالات کی ستم ظریفی نے انھیں دوسروں کا محتاج کر دیا ہے۔ مثلاً جس طرح کوئی یتیم بچہ باپ کا سایہ اٹھ جانے سے بے سہارا ہو جاتا ہے، کوئی صحت مند اچانک اپنی صحت کھو بیٹھتا ہے، کوئی برسر روزگار، روزگار چھن جانے سے نادار ہو جاتا ہے یہ لوگ ایسے شخص کو خود تلاش کر کے اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اسے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

اہل یقین کے لیے زمین میں نشانیاں

سوال اس آیت کریمہ میں کیا بیان گیا ہے؟

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ {۲۰} الذاریات

جواب ترجمہ: اور ان کے لیے جو یقین کرنے والے ہوں، زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

خلاصہ تفسیر: نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آخرت کے امکان اور اس کے وجوب و لزوم کی شہادت دے رہی ہیں۔ زمین کا اپنا وجود اور اس کی ساخت، اس کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر اور ایک خاص زاویئے پر رکھا جانا، اس پر حرارت اور روشنی کا انتظام، اس پر مختلف موسموں کی آمد و رفت، اس کے اوپر ہوا اور پانی کی فراہمی، اس کے پیٹ میں طرح طرح کے بیشمار خزانوں کا مہیا کیا جانا، اس کی سطح پر ایک زرخیز چھلکا چڑھایا جانا، اس میں قسم قسم کی بے حد و حساب نباتات کا اگایا جانا، اس کے اندر خشکی اور تری اور ہوا کے جانوروں کی بیشمار نسلیں جاری کرنا، اس میں ہر نوع کی زندگی کے لیے مناسب حالات اور موزوں خوراک کا انتظام کرنا، اس پر انسان کو وجود میں لانے سے پہلے وہ تمام ذرائع و وسائل فراہم کر دینا جو تاریخ کے ہر مرحلے میں اس کی روزافزوں ضروریات ہی کا نہیں بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا ساتھ بھی دیتے چلے جائیں، یہ اور دوسری ان گنت نشانیاں ایسی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والا جس طرف بھی زمین اور اس کے ماحول میں نگاہ ڈالے وہ اس کا دامن کھینچ لیتی ہیں۔

جو شخص یقین کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہو اس کی بات تو دوسری ہے وہ ان میں اور سب کچھ دیکھ لے گا، بس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی ہی نہ دیکھے گا۔ مگر جس کا دل تعصب سے پاک اور سچائی کے لیے کھلا ہوا ہے وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہرگز یہ تصور قائم نہ کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ ہے جو کئی ارب سال پہلے کائنات میں اچانک برپا ہوا تھا، بلکہ اسے یقین آجائے گا کہ یہ کمال درجے کی حکیمانہ صنعت ضرور ایک قادر مطلق اور دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے، اور وہ خدا جس نے یہ زمین بنائی ہے نہ اس بات سے عاجز ہو سکتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ

پیدا کرے، اور نہ ایسا نادان ہو سکتا ہے کہ اپنی زمین میں عقل و شعور رکھنے والی ایک مخلوق کو اختیارات دے کر بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دے۔

اختیارات کا دیا جانا آپ سے آپ محاسبے کا تقاضا کرتا ہے جو اگر نہ ہو تو حکمت اور انصاف کے خلاف ہو گا۔ اور قدرت مطلقہ کا پایا جانا خود بخود اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کا کام ختم ہونے کے بعد اس کا خالق جب چاہے محاسبے کے لیے اس کے تمام افراد کو زمین کے ہر گوشے سے جہاں بھی وہ مرے پڑے ہوں، اٹھا کر لا سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

انسانی وجود میں قدرت کی نشانیاں

سوال اس آیت کریمہ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ {۲۱} الذاریات

جواب ترجمہ: اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟

خلاصہ تفسیر: یعنی باہر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں، خود اپنے اندر دیکھو تو تمہیں اسی حقیقت پر گواہی دینے والی بیشمار نشانیاں مل جائیں گی۔ کس طرح ایک خوردبینی کیڑے اور ایسے ہی ایک خوردبینی انڈے کو ملا کر ماں کے ایک گوشۂ جسم میں تمہاری تخلیق کی بناڈالی گئی۔

کس طرح تمہیں اس تاریک گوشے میں پرورش کر کے بتدریج بڑھایا گیا۔ کس طرح تمہیں ایک بینظیر ساخت کا جسم اور حیرت انگیز قوتوں سے مالا مال نفس عطا کیا گیا۔ کس طرح تمہاری بناوٹ کی تکمیل ہوتے ہی شکم مادر کی تنگ و تاریک دنیا سے نکال کر تمہیں اس وسیع و عریض دنیا میں اس شان کے ساتھ لایا گیا کہ ایک زبردست خودکار مشین تمہارے اندر نصب ہے جو روز پیدائش سے جوانی اور بڑھاپے تک سانس لینے، غذا ہضم کرنے، اور اندر سے پیدا ہونے والی یا باہر سے آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے اور نقصانات کی تلافی کرنے، حتیٰ کہ تھکاوٹ کے بعد تمہیں آرام کے لیے سلا دینے تک کا کام خود بخود کیے جاتی ہے بغیر اس کے کہ تمہاری توجہات اور کوششوں کا کوئی حصہ زندگی کی ان بنیادی ضروریات پر صرف ہو۔

ایک عجیب دماغ تمہارے کاسہ سر میں رکھ دیا گیا ہے جس کی پیچیدہ تہوں میں عقل، فکر، تخیل، شعور، تمیز، ارادہ، حافظہ، خواہش، احساسات و جذبات، میلانات و رجحانات اور دوسری ذہنی قوتوں کی ایک انمول دولت بھری پڑی ہے۔

بہت سے ذرائع علم تم کو دیئے گئے ہیں جو آنکھ، ناک، کان اور پورے جسم کی کھال سے تم کو ہر نوعیت کی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان اور گویائی کی طاقت تم کو دے دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور پھر تمہارے وجود کی اس پوری سلطنت پر تمہاری اَنا کو ایک رئیس بنا کر بٹھا دیا گیا ہے کہ ان تمام قوتوں سے کام لے کر رائیں قائم کرو اور یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں کن راہوں میں اپنے اوقات، محنتوں اور کوششوں کو صرف کرنا ہے، کیا چیز رد کرنی ہے اور کیا قبول کرنی ہے، کس چیز کو اپنا مقصود بنانا ہے اور کس کو نہیں بنانا۔

اب کیا کوئی شخص جس کی آنکھیں بالکل پھوٹ نہ گئی ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی ایک ہستی زمین پر اتفاقاً وجود میں آگئی ہے؟ کوئی حکمت اور کوئی منصوبہ اس کے پیچھے کار فرما نہیں ہے؟ زمین پر اس کے ہاتھوں یہ سارے ہنگامے جو برپا ہو رہے ہیں سب بے مقصد ہیں اور بے نتیجہ ہی ختم ہو جانے والے ہیں؟ کسی بھلائی کا کوئی ثمرہ اور کسی بدی کا کوئی پھل نہیں؟ کسی ظلم کی کوئی داد اور کسی ظالم کی کوئی باز پرس نہیں؟ اس طرح کی باتیں ایک عقل کا اندھا تو کہہ سکتا ہے یا پھر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے سے قسم کھائے بیٹھا ہے کہ تخلیقِ انسان کے پیچھے کسی حکیم کی حکمت کو نہیں ماننا ہے۔

مگر ایک غیر متعصب صاحب عقل آدمی یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کو جس طرح، جن قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اس دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور جو حیثیت اس کو یہاں دی گئی ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑا حکیمانہ منصوبہ ہے اور جس خدا کا یہ منصوبہ ہے اس کی حکمت لازماً یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس ہو اور اس کی قدرت کے بارے میں یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ جس انسان کو وہ ایک خوردبینی خلیے سے شروع کر کے اس مرتبے تک پہنچا چکا ہے اسے پھر وجود میں نہ لا سکے گا۔ (تفہیم القرآن)

آسمان میں مخلوقات کا رزق

سوال اس آیت کریمہ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ{۲۲}الذاریات

جواب ترجمہ: اور آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمہیں وعید سنائی جارہی ہے۔

خلاصہ تفسیر: اس آیت میں آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اس سلسلے میں صرف دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ اس میں تمہارا رزق ہے، اس صورت میں بعض اہل علم نے اس سے عالم بالا مراد لیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں بادل بھی شامل ہیں اور آسمان بھی اور رزق سے مراد بارش ہے۔ یعنی عالم بالا سے تم پر بارش اترتی ہے اور وہ زمین سے رزق اگنے کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح سبب بول کو مسبب مراد لیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر آسمان سے بارش نہ اترے تو زمین اپنی ان تمام تر قوت روئیدگی کے باوجود کوئی چیز نہ اگا سکے اور اگر کوئی چیز اگے بھی تو وہ برگ وبار نہ لا سکے۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور مَا تُوْعَدُوْنَ وعید سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عالم بالا سے تمہارے لیے رزق اترتا ہے اسی طرح وہیں سے اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو قیامت کے لیے دلیل بنایا گیا ہے کہ تم خود دیکھتے ہو کہ جب بارش اترتی ہے تو خشک اور مردہ زمین نہ صرف زندہ ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت روئیدگی برسرکار آجاتی ہے۔

اسی طرح قوموں کی نافرمانی اور سرکشی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا جب عذاب آتا ہے تو قومیں تباہ کر دی جاتی ہیں۔ پہلی صورت میں زندگی اور دوسری صورت میں تباہی اور ہلاکت، یہ ہمیشہ تم آسمان سے اسے اترتا ہوا دیکھتے ہو۔ اور یہ بھی دیکھتے ہو کہ بارش اگر رحمت کا نمونہ ہے تو عذاب نقمت کا۔

لیکن ان دونوں چیزوں کے لیے اللہ تعالیٰ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا، بجز اس کے کہ وہ دونوں باتوں کے

لیے حکم دیتا ہے اور کلمہ کُن سے ہر چیز وجود میں آجاتی ہے۔ تو جس پروردگار کی یہ شانیں ہیں اس کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ نوع انسانی کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا اور کائنات کی بساط کو دوبارہ نہیں بچھا سکتا، سراسر احمقانہ بات ہے۔ (روح المعانی)

یوم جزا کا وقوع یقینی ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ {۲۳} الذاریات.

جواب ترجمہ: لہٰذا آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم! یہ بات یقیناً ایسی ہی سچی ہے جیسے یہ بات کہ تم بولتے ہو۔

اس آیت میں انہ کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں علامہ محمود آلوسی بغدادی لکھتے ہیں کہ یہ رزق کی طرف یا نبی کریم ﷺ کی طرف یا قرآن کی طرف یا دین (جزاء) کی طرف راجع ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ابتداء سورت سے لے کر یہاں تک جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے سب حق ہے لیکن ثواب اور عقاب کی طرف راجع ہونا زیادہ اوفق اور اظہر ہے۔ ان دونوں کا تعلق چونکہ یوم جزا سے ہے اس لیے ان کے مراد لینے سے یوم الدین کے واقع ہونے کا تذکرہ مزید مؤکد ہو جاتا ہے جس کے وقوع کا مخاطبین انکار کرتے تھے۔ (روح المعانی)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ بات یقینی ہے کہ تم بول رہے ہو، اسی طرح آخرت کی جو بات کہی جارہی ہے، وہ بھی اتنی ہی یقینی ہے، کیونکہ اس کائنات کے خالق نے بتلائی ہے۔ (توضیح القرآن)

فرشتے ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ {۲۴} اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ {۲۵} فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ {۲۶} فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا

تَاْكُلُوْنَ{۲۷}الذاریات

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب) کیا ابراہیم کے معزز مہمانوں کا واقعہ آپ تک پہنچا ہے؟ جب وہ ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے سلام کہا۔ ابراہیم نے بھی سلام کہا۔ (اور دل میں سوچا کہ) یہ کچھ انجان لوگ ہیں۔ پھر چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹا سا بچھڑا لے آئے۔ اور اسے ان مہمانوں کے سامنے رکھا۔ کہنے لگے: کیا آپ لوگ کھاتے نہیں؟

خلاصہ تفسیر: یہ وہ قصہ ہے جو یہاں ہمارے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان فرشتوں کے درمیان پیش آنے والے واقعے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جو ان کے پاس ان کے بیٹے اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دینے اور قومِ لوط کی ہلاکت کی اطلاع دینے کے لیے آئے تھے۔ یہ واقعہ اس سے پہلے سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اس قصے کا آغاز استفہامی انداز میں کیا گیا ہے:

هَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ: اس اسلوب کا مقصد اس قصے کی اہمیت جتانا، اس کے مقام کو بلند کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اس کی معرفت صرف وحی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں **هَلْ** کا معنی **قَدْ** یعنی یقیناً کے معنیٰ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے: اے رسولِ کریم! کیا آپ کو ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کا حال پہنچا ہے؟ ہم نے جو قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے، اس میں ہم آپ کو ان کا قصہ بالکل حق کے ساتھ سناتے ہیں، جس میں کسی باطل کی آمیزش نہیں، تاکہ آپ کے دل کو تقویت ملے اور آپ کو تسلی حاصل ہو۔

ضَيْف: دراصل مصدر ہے، جس کے معنی میلان کے ہیں، عرب کہتے ہیں **:ضَافَ فُلَانٌ فُلَانًا**، یعنی دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہوئے۔ یہ لفظ واحد اور جماعت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں اس سے مراد فرشتوں کی وہ جماعت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئی تھی اور جن کے سردار حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

الْمُكْرَمِيْنَ: ان فرشتوں کو مکرمین اس لیے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے عزت بخشی اور اس لیے بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بڑی عزت کی

اور ان کے سامنے عمدہ اور لذیذ کھانا پیش کیا۔ روح المعانی میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں کی تعداد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بارہ فرشتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین فرشتے تھے: جبریل، اسرافیل اور میکائیل علیہم السلام، انہیں ضیف اس لیے کہا گیا کہ وہ مہمانوں کی صورت میں آئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی انہیں مہمان ہی سمجھا، اس لیے نام بھی ظاہری صورت اور گمان کے مطابق رکھا گیا۔ قصۂ ابراہیم علیہ السلام کو یہاں قصۂ عاد سے پہلے ذکر کیا گیا، حالانکہ زمانی اعتبار سے وہ بعد میں ہے، کیونکہ یہ قصہ تسلی کے مقصد کے اعتبار سے زیادہ مؤثر ہے۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ کا ظرف لفظ حدیث سے متعلق ہے، یعنی: کیا آپ کو ان کا وہ حال معلوم ہوا جو ان کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس داخل ہونے کے وقت پیش آیا؟ یا اس میں ایک محذوف فعل ہے، یعنی: یاد کیجیے وہ وقت جب وہ ان کے پاس داخل ہوئے۔

فَقَالُوا سَلَامًا: فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: ہم آپ کو سلام کہتے ہیں۔

قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو جواب دیا، تم پر سلام ہو، تم لوگ مجھے اجنبی معلوم ہوتے ہو، میں تمہیں پہلے نہیں جانتا تھا۔

صاحبِ کشاف کہتے ہیں: ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس لیے اجنبی کہا کہ ان کا سلام مسلمانوں کے معروف سلام جیسا نہیں تھا، یا وہ ان کے جان پہچان والوں میں سے نہ تھے، یا عام انسانوں جیسے معلوم ہوتے تھے، یا ان کی حالت وہئیت انسانوں سے مختلف تھی، یا یہ بات سوالیہ انداز میں کہی گئی، گویا انہوں نے کہا: تم کون لوگ ہو؟ اپنا تعارف کراؤ۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات دل ہی دل میں کہی تھی، کیونکہ انہوں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نکتہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "سلام" کو رفع کے ساتھ کہا تاکہ دوام اور ثبات کا مفہوم ادا ہو اور اس لیے بھی کہ انہوں نے ان کے سلام کا جواب بہتر انداز میں دیا، جو ان کے حسنِ ادب کی دلیل ہے۔

فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ: یعنی وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لے آئے، جو گوشت اور چربی سے بھرپور تھا۔ عربی میں کہتے ہیں رَاغَ فُلَانٌ إِلَى كَذَا، یعنی

کوئی شخص خاموشی اور تیزی کے ساتھ کسی کام کی طرف مائل ہوا۔

فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ: یعنی انہوں نے اسے لاکر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔

اَلَا تَاْكُلُوْنَ: یعنی نہایت نرمی اور محبت سے انہیں کھانے کی دعوت دی، جو ایک کریم میزبان کا شیوہ ہے۔

علامہ ابن کثیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ان آیات میں مہمان نوازی کے آداب جمع ہو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کو خبر دیے بغیر جلدی سے کھانا تیار کیا، ان پر کوئی احسان جتائے بغیر بہترین کھانا پیش کیا، خود جا کر ان کے سامنے رکھا، یہ نہیں کہا کہ آگے آؤ، اور نہ ہی حکم کے انداز میں کہا بلکہ نہایت نرمی سے فرمایا: کیا آپ کھائیں گے؟ لیکن اس حسنِ سلوک اور کھلے دل کی مہمان نوازی کے باوجود مہمانوں نے کھانا نہ کھایا۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں جس غلام علیم کی فرشتہ کے ذریعے خوشخبری دی گئی تھی وہ کون سا غلام علیم تھا؟

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ {۲۸} الذاریات.

جواب ترجمہ: اس سے ابراہیم نے ان کی طرف سے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔ انہوں نے کہا: ڈریے نہیں، اور انہیں ایک لڑکے کی خوشخبری دی جو بڑا عالم ہو گا۔

خلاصہ تفسیر: فرشتے چونکہ کچھ کھاتے نہیں ہیں، اس لیے انہوں نے کھانے سے پرہیز کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس علاقے کی عادت کے مطابق یہ سمجھے کہ یہ کوئی دشمن ہیں۔ پھر جب انہوں نے اپنے بیٹے کی خوشخبری دی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ (توضیح القرآن)

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اس وقت خوف پیدا ہوا جب ان کی مہمان نوازی کے باوجود مہمانوں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانے کی طرف ہاتھ تک نہیں بڑھایا، مہمانوں نے، کھانے سے اعراض کیا تھا۔ اس موقع پر فرشتوں نے اپنی حقیقت ظاہر کی اور کہا:

لَا تَخَفْ: ڈریے نہیں، ہم اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں،

وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ: اور فرشتوں نے انہیں ایک علم والے لڑکے کی خوشخبری دی، یعنی اسحاق علیہ السلام کی، جو بڑے ہو کر علم والا ہو گا۔

بڑھاپے میں اولاد باعث تعجب

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ {۲۹} الذاریات.

جواب ترجمہ: اس پر ان کی بیوی زور سے بولتی ہوئی آئیں، اور انہوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا اور کہنے لگیں (کیا) ایک بانجھ بڑھیا (بچہ جنے گی؟)

خلاصہ تفسیر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صرۃ کا معنی چیخ اور شور ہے، اسی سے صریر الباب ہے، جس کا معنیٰ دروازے کی آواز ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اوہ کا کلمہ کہنا ہے۔ یہاں اقبال سے مراد ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا نہیں۔ فراء نے کہا؛ یہ تیرے اس کا قول کی طرح ہے أَقْبَلَ يَشْتُمُنِي وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: وہ عورتوں کی ایک جماعت میں آئیں تاکہ فرشتوں کی گفتگو سنیں۔ جوہری نے کہا: صرہ کا معنی شوروغل کرنا اور چیخنا ہے اور صرہ کا معنی جماعت اور صرہ کا معنی سخت مصیبت ہے۔

امراء القیس نے کہا،

فَأَلْحَقَهُ بِالْهَادِيَاتِ وَدُونَهُ ... جَوَاحِرُهَا فِي صَرَّةٍ لَمْ تَزَيَّلِ

یہ گھوڑا جب جنگلی گائیوں کے ابتدائی حصہ تک پہنچا اس کے پیچھے والی گائیاں جماعت میں تھیں جو بکھری نہیں۔ یہ شعر تینوں مذکورہ وجوہ کا احتمال رکھتا ہے۔ صرۃ القیظ سے مراد اس کی گرمی کی شدت ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سارہ نے بشارت کو سنا تو اپنے چہرے پر ضرب لگائی یعنی جس طرح عورتوں کی عادت ہوتی ہے وہ تعجب کے وقت اپنے چہرے پر ہاتھ مارتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صَكَّتْ وَجْهَهَا لَطَمَتْهُ اس نے اپنے منہ پر طمانچہ مارا۔

صک کا اصل معنیٰ مارنا ہے۔ صکہ اس نے اسے مارا۔ راجز نے کہا یَا کَرَوَانًا صُكَّ فَاكْبَأَنَّا، کرون بھورے رنگ کا پرندہ جو رات کو نہیں سوتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ نے جب فرشتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ محو کلام ہوتے اور بیٹے کی خوشخبری دیتے ہوئے سنا تو وہ حیرانی کے عالم میں اپنے چہرے پر ہاتھ مارتے ہوئے وہاں آموجود ہوئیں، اور ان کی بات سن کر فرمانے لگیں کہ ایسا کیونکر ہو گا، میں بوڑھی بانجھ عورت ہوں، بوڑھی بانجھ عورتیں تو بچے جننے کے لائق نہیں ہوتیں، اولاد تو عالم شباب میں ہوتی ہے، حضرت سارہ کو جوانی میں بھی اولاد نہیں ہوئی تو بڑھاپے میں اولاد کا سن کر انہیں تعجب ہونے لگا تھا۔

اس خوشخبری کے مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال تھی، حضرت سارہ کی عمر اس وقت ننانوے سال تھی، تاریخوں میں چند سالوں کا فرق کہیں کہیں بیان کیا گیا ہے، کہیں چھیاسی سال اور کہیں چھیانوے سال بھی لکھا ہوا دیکھا ہے۔

ملائکہ کی اطمینان دہانی

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا۔

قَالُوا كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ {۳۰} الذاریات

جواب ترجمہ: مہمانوں نے کہا: تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ یقین جانو وہی ہے جو بڑی حکمت کا، بڑے علم کا مالک ہے۔

خلاصہ تفسیر: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ نے تعجب کے ساتھ کہا کہ میں تو بوڑھی اور بانجھ ہوں، میرے ہاں اولاد کیسے ہو گی؟ تو فرشتوں نے جواب دیا:

كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ: یعنی : ایسا ہی ہو گا جیسا کہا جا رہا ہے، یہ کوئی اندازہ یا گمان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔

إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ: یعنی: اللہ تعالیٰ ہر کام کو حکمت کے ساتھ انجام دیتا ہے، اس کے فیصلوں

میں کوئی عبث یا بے مقصد بات نہیں، اور وہ ہر حال، ہر سبب اور ہر مصلحت کو خوب جاننے والا ہے، اس لیے عمر کا زیادہ ہونا یا ظاہری اسباب کا نہ ہونا، اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں فرشتوں کا یہ جواب دراصل حضرت سارہ کے تعجب کو ختم کرنے کے لیے تھا کہ جس ذات نے بغیر باپ کے آدم کو پیدا کیا، وہ بوڑھی عورت کو اولاد دینے پر بھی قادر ہے یہ سب اللہ کے علم اور حکمت کے تحت ہے۔ تفسیر طبری میں ہے، "کذلک" کا معنی یہ ہے کہ یہ بات اللہ کے علمِ ازلی اور اس کے فیصلے کے مطابق طے ہو چکی ہے، اس میں کسی انسانی اندازے یا قدرت کا دخل نہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مومن کو اللہ کے وعدے پر تعجب نہیں بلکہ یقین اور تسلیم اختیار کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ کے افعال اس کی حکمت سے صادر ہوتے ہیں، چاہے وہ انسانی عقل سے بالا تر ہوں۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ جواب اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب کے محتاج نہیں، بلکہ اسباب اس کے حکم کے تابع ہیں۔

مٹیالے پتھروں کی بارش

سوال ان آیات کا ترجمہ کیجیے اور تفسیر بیان فرمائیے، نیز یہ بتائیے کہ یہاں لفظ مُسَوَّمَةً کا کیا معنیٰ ہے؟

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ {۳۱} قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ {۳۲} لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ {۳۳} مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ {۳۴} الذاریات.

جواب ترجمہ: ابراہیم نے کہا: اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس مہم پر ہو؟ فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم (یعنی قوم لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں، تاکہ ہم ان پر پکی مٹی کے پتھر برسائیں۔ جن پر حد سے گزرے ہوئے لوگوں کے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے خاص نشان بھی لگا ہو گا۔

خلاصہ تفسیر: جب عذاب کے فرشتوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا کہ اے فرشتو! تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے؟ تو فرشتوں نے جواب دیا ہم ایک مجرم قوم (یعنی قوم لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں، ہم ان پر سنگ باری کر کے ان کو تہس نہس کرنے پر متعین ہوئے ہیں، جو مجرم جس پتھر سے ہلاک ہونے والا ہے اس پر اس کا نام بھی لکھا ہے، ان پتھروں پر خدا کی طرف سے ایک خاص مہر لگی

تھی، جس سے وہ دنیا کے پتھروں سے الگ پہچانے جاتے تھے اور جس کنکری پر جس مجرم کا نام لکھا تھا وہ کنکری اس مجرم کا تعاقب کرتی تھی، پس پہلے بستی کو الٹ دیا گیا، پھر پتھراؤ کیا گیا۔ (خزائن القرآن)

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مٹیالے پتھر، تیار شدہ اور نشان زدہ تھے اور اللہ نے ان کو مسرفین کے لئے تیار کیا تھا اور یہ مسرف قوم لوط کے لوگ تھے جنہوں نے حدود سے تجاوز کر لیا تھا، وہ فطرت کی راہ سے تجاوز کر کے غیر فطری عمل کرتے تھے، جو حق اور دین کے خلاف راستہ تھا۔ ان پتھروں کے بارے میں کوئی بات اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ آتش فشانی کے عمل کے نتیجے میں برسنے والے پتھر ہوں کیونکہ گرم لاوا جب ہوا میں اڑتا ہے تو وہ پتھر بن جاتا ہے اور یہ رب تعالیٰ کی طرف سے مسلط ہوتا ہے اور اس کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق کام کرتا ہے اور اسی شخص پر جا کر پڑتا ہے جس کے بارے میں حکم الٰہی ہو اور ہر پتھر کے لئے اللہ نے اپنے علم سے زمان و مکان مقرر کر دیا ہے کہ اس نے اس جگہ فلاں کو گھیر لینا ہے اور ہر پتھر کو فرشتوں کے ذریعہ اللہ نے پھینکنا طے کر دیا ہے پھر ہمیں فرشتوں کی حقیقت کا بھی تو پوری طرح علم نہیں ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اس کائنات کے ساتھ فرشتوں کا تعلق کیا ہے پھر جن قوتوں کو ہم جانتے ہیں اور جن کے انکشافات ہمارے سامنے ہوتے رہتے ہیں اور ہم ان قوتوں کے اپنی جانب سے نام رکھتے رہتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟

ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اللہ کی اس اطلاع پر اعتراض کریں کہ اس نے اپنی بعض قوتوں کو بعض مسرفین پر مسلط کر دیا اور کسی خاص جگہ ایسا کر دیا، ہمیں بہر حال اللہ تعالیٰ کی اس اطلاع پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، اس لئے کہ اس کائنات کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں اور مفروضوں پر مبنی ہیں بلکہ وہ نظریات ہیں اور بالکل ان چیزوں کی سطحی تاویلات ہیں، ابھی تک بہت کم معلومات ہیں جو حقائق بن سکے ہیں۔ غرض یہ آتش فشانی کے عمل میں پتھر ہوں یا اور پتھر ہوں۔ بہر حال وہ دست قدرت کا کرشمہ تھے، ان کی تخلیق کا عمل تھے اور وہ کیسے تھے یہ بھی ایک غیب ہے۔ (فی ظلال القرآن)

مُسَوَّمَةً: (جن پر نشان بھی ہے) یہ السومۃ سے لیا گیا ہے۔ اور سومہ علامت و نشان کو کہتے ہیں۔ ہر ایک پتھر پر اس کا نام تھا جس نے اس سے ہلاک ہونا تھا۔ عِنْدَ رَبِّكَ (آپ کے رب کے پاس سے) اس کی ملکیت و سلطنت میں۔ لِلْمُسْرِفِيْنَ (حد سے گزرنے والوں کے لئے) ان کو مسرفین فرمایا۔ جیسا کہ ان کو عَادِين کا لقب دیا، کیونکہ وہ اپنے عمل میں حد سے بڑھنے والے اور زیادتی کی انتہاء تک پہنچنے والے تھے، اس لئے کہ انہوں نے مباحات پر قناعت نہ کی۔

حضرت شاہ عبد الغنی پھولپوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ قوم لوط الٹا عمل کیا کرتے تھے یعنی غیر فطری عمل کرتے تھے، اس لیے اسی مناسبت سے ان کی بستی الٹ دی گئی، حضرت لوط علیہ السلام نے بہت سمجھایا مگر یہ ماننے کے بجائے اپنے نبی کو ایذا دینے لگے، بالآخر یہ چار لاکھ آدمی ایک دم ہی ہلاک کر دیے گئے، اس فعل کے مرتکبین کو مجرمین فرمایا گیا۔ (خزائن القرآن ۳۳۵)

کفار کی بستی میں مسلمانوں کا ایک گھر

سوال کیا حضرت لوط علیہ السلام پر ان کے گھر والوں کے علاوہ ان کی قوم میں سے کوئی شخص ایمان لایا تھا؟ ان آیات کی روشنی میں تفسیر فرمائیے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ {۳۵} فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ {۳۶} الذاریات

جواب ترجمہ: پھر ہوا یہ کہ اس بستی میں جو کوئی مومن تھا اس کو ہم نے وہاں سے نکال لیا۔ اور اس میں ایک گھر کے سوا ہم نے کسی اور گھر کو مومن نہیں پایا۔

خلاصہ تفسیر: یہ آیات قومِ لوط کے واقعے کے بیان میں آئی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے ایمان والوں کو اس بستی سے نکال لیا گیا تاکہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں۔ یہاں "فیہا" سے مراد لوط علیہ السلام کی بستی (سدوم) ہے۔

ایمان اور اسلام میں فرق: ان آیات میں پہلے "مؤمنین" (ایمان والے) اور پھر "مسلمین" (مسلمان) کا ذکر آیا ہے، اس پر مفسرین نے بحث کی ہے کہ یہاں دونوں الفاظ سے کیا مراد ہے۔ بعض

علماء کے نزدیک یہاں دونوں الفاظ ایک ہی گروہ کے لیے استعمال ہوئے ہیں، یعنی لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیاں، اور اس میں تکرار سے بچنے کے لیے ایک بار "مؤمنین" اور دوسری بار "مسلمین" کہا گیا۔ بعض مفسرین نے فرق بیان کیا ہے کہ "ایمان" دل کا تصدیق کرنا اور "اسلام" ظاہری اطاعت ہے، اس لیے "مؤمنین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو دل سے ایمان لائے اور "مسلمین" میں لوط کی بیوی بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر مسلمان تھی مگر دل سے کافر تھی، اس لیے وہ عذاب سے نہ بچ سکی۔ (شرح عقیدہ طحاویہ)

نجات یافتگان کی تعداد: اکثر مفسرین کے مطابق اس بستی میں صرف ایک ہی گھرانہ ایمان والا تھا، یعنی لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیاں، بعض روایات میں تعداد تین (لوط اور دو بیٹیاں) اور بعض میں تیرہ بھی بیان ہوئی ہے، لیکن زیادہ تر کے نزدیک صرف لوط اور ان کی بیٹیاں ہی نجات پانے والوں میں شامل تھیں۔

عبرت و نصیحت: اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو بطور نشانی اور عبرت کے بیان کیا کہ ایمان والوں کو اللہ عذاب سے بچالیتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی کم ہوں اور یہ بھی سبق ہے کہ ایمان اللہ کے ہاں محفوظ ہے، اس کے اہل کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن)

زبان واسلوب: فَاَخْرَجْنَا اور فَمَا وَجَدْنَا کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل کو بیان کیا کہ عذاب سے پہلے اہل ایمان کو نکال لیا گیا اور پھر پوری بستی میں صرف ایک ہی گھر ایمان و اسلام پر قائم تھا (المجتبیٰ من مشکلات اعراب القرآن)

لوط علیہ السلام کی بیوی: قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیوی ظاہری طور پر تو ان کے ساتھ تھی، مگر دل سے ایمان نہیں لائی تھی، اس لیے وہ عذاب میں ہلاک ہو گئی، اس لیے "مسلمین" میں اس کا شمار ظاہری طور پر ہوا، مگر "مؤمنین" میں نہیں (شرح العقیدۃ الطحاویہ)

ایمان کی اہمیت: اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل اہمیت ایمان کی ہے۔ اگر پوری بستی میں صرف ایک گھر ایمان پر قائم ہو تو اللہ اس گھر کو عذاب سے بچالیتا ہے۔

تفسیر روح البیان کے مطابق لوط علیہ السلام کی بیس سالہ محنت کے بعد یہی کوئی تیرہ لوگ ان پر ایمان

لائے تھے، جن کو نجات دی گئی، باقی سب اللہ کی طرف سے برسنے والے عذاب کی نذر ہو گئے تھے، ان سرکشوں، امر دپرستوں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔

اہل علم و عرفاں فرماتے ہیں کہ قیامت کا ہنگامہ خیز دن ہو گا، جب ایک نبی تشریف لائیں گے تو ان کے ہمراہ ان کی امت ہو گی، ایک نبی تشریف لائیں گے تو ان کے ہمراہ ان کی قوم ہو گی، ایک نبی تشریف لائیں گے تو ان کے ہمراہ ان کا قبیلہ ہو گا، ایک نبی تشریف لائیں گے تو ان کے ہمراہ ان کا بیٹا ہو گا، ایک نبی تشریف لائیں گے تو ان کے ہمراہ ایک شخص ہو گا، کوئی نبی ایسا قیامت کے دن آئے گا کہ باوجود مکمل کوشش، جدوجہد اور کاوش کے اس کا کوئی بھی پیروکار نہیں ہو گا، اس کی دعوت پر کسی نے لبیک نہیں کہا ہو گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا انتخاب چونکہ رب العالمین کی طرف سے ہوتا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام عرش بریں کے نمائندے بن کر تشریف لاتے ہیں، پورے خلوص، پوری دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیغام اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاتے ہیں، اس لیے ہمارے عقیدے کے مطابق جس نبی کے ساتھ کروڑوں انسان ہوں گے وہ بھی کامیاب و کامران تھا اور جس کے ساتھ ایک بھی پیروکار نہیں ہو گا وہ بھی کامیاب و کامران اس دنیا سے گیا، کسی کو ہم اس وجہ سے ناکام نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ساتھ چونکہ پیروکار، اتباع اور جانثار زیادہ نہیں تھے اس لیے وہ ناکام ہوا۔

عبرت کی نشانی

سوال اس آیت میں کیا بیان کیا گیا، اس کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ {۳۷} الذاریات

جواب ترجمہ: اور ہم نے اس بستی میں ان لوگوں کے لیے (عبرت کی) ایک نشانی چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کی تباہی کے بعد کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ اس بستی کو عبرت کی نشانی بنا دیا، اس بستی میں اللہ نے ایک واضح علامت یا نشانی چھوڑ دی جو ہر اس شخص کے لیے سبق ہے

جو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ یہ نشانی ان کے عذاب کی باقیات، تباہ شدہ بستی، اور وہ آثار ہیں جو آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں، جیسے کہ بحرِ مردار (Dead Sea) کے کنارے پر واقع وہ علاقے جہاں قومِ لوط آباد تھی، یہ آثار اور باقیات ہر دیکھنے والے کے لیے عبرت اور نصیحت ہیں کہ اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا سوائے ایمان والوں کے۔ (التفسیر المنیر)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام دیا ہے کہ جن لوگوں کے دل نرم ہیں اور جو اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، وہ ان نشانیوں سے سبق حاصل کریں گے، جبکہ غافل اور سخت دل لوگ ان سے عبرت نہیں پکڑتے۔

فرعون کی غرقابی کا عبرت ناک منظر

سوال اللہ تعالیٰ نے فرعون کی گرفت کرنے اور اسے سمندر میں ڈالنے کا ذکر فرمایا ہے، آیت میں ملیم کا کیا مطلب ہے؟

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ {۳۸} فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ {۳۹} فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ {۴۰} الذاریات.

جواب ترجمہ: اور موسیٰ (کے واقعے) میں بھی (ہم نے ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی) جب ہم نے انہیں ایک کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ تو فرعون نے اپنی قوت بازو کے بل پر منہ موڑا، اور کہا کہ: یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے اور اس کے لشکر کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا، اور وہ تھا ہی ملامت کے لائق۔

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: اور موسیٰ کے واقعہ میں بھی نشانیاں اور عبرت ہے، جب ہم نے اسے فرعون کی طرف واضح دلیل (معجزات، جیسے عصا اور یدِ بیضا) کے ساتھ بھیجا۔ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد وہ روشن حجتیں اور معجزات ہیں جو ہر دیکھنے والے کے لیے حق کو واضح کر دیں۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ: فرعون نے اپنی طاقت، لشکر اور قوم کے سہارے حق سے

منہ موڑ لیا اور موسیٰ کو ساحر یا مجنون کہا۔ "برکنہ" سے مراد اس کی قوت، لشکر اور وہ سب کچھ ہے جس پر وہ بھروسہ کرتا تھا، اس نے اپنی قوم کو دھوکہ دینے کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو ساحر یا مجنون کہا، حالانکہ یہ دونوں صفات جمع نہیں ہو سکتیں (اعراب القرآن)

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ: پھر ہم نے فرعون اور اس کے لشکر کو پکڑ لیا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ تھا، نَبَذْنَاهُم یعنی انہیں ذلت کے ساتھ سمندر میں پھینک دیا گیا، اور مُلِيمٌ یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کو ضائع کرنے والا اور قابلِ ملامت تھا۔ (تفسیر من وحی القرآن) صاحب تدبر قرآن رقم طراز ہیں کہ "یہاں فوجوں کا ذکر اس کے سرمایہ غرور کی حیثیت سے ہوا ہے، اس لئے کہ انہی کا اعتماد اس کے اشکبار کا اصل سبب تھا" (تدبر القرآن)

نافرمانوں کے لیے اللہ کی پکڑ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ {۴۱}مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ {۴۲}وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ {۴۳}فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ {۴۴}فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ {۴۵}وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ {۴۶} الذاریات

جواب ترجمہ: نیز قوم عاد میں (بھی ہم نے ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی) جب ہم نے ان پر ایک ایسی آندھی بھیجی جو ہر بہتری سے بانجھ دی۔ وہ جس چیز پر بھی گزرتی، اسے ایسا کر چھوڑتی، جیسے وہ گل کر چورا چورا ہو گئی ہو۔ اور ثمود میں بھی (ایسی ہی نشانی تھی) جب ان سے کہا گیا تھا کہ: تھوڑے وقت تک مزے اڑالو۔ (پھر سیدھے نہ ہوئے تو عذاب آئے گا) اس پر بھی انہوں نے اپنے پروردگار کا حکم ماننے سے سرکشی اختیار کی تو انہیں کڑک نے آپکڑا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو ان میں یہ سکت رہی کہ کھڑے ہو سکیں اور نہ وہ اس قابل تھے کہ اپنا بچاؤ کرتے۔ اور اس سے بھی پہلے نوح کی قوم کو بھی ہم نے پکڑ میں لیا تھا۔ یقین جانو وہ بڑے نافرمان لوگ تھے۔

وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ : اور (عبرت ہے) قومِ عاد میں، جب ہم نے ان پر "ریح عقیم" (بانجھ ہوا) بھیجی، ریح عقیم سے مراد وہ ہوا ہے جس میں کوئی بھلائی یا برکت نہیں، نہ بارش لاتی ہے، نہ درختوں کو بارآور کرتی ہے، بلکہ صرف ہلاکت اور تباہی کا سبب بنتی ہے۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ: یہ ہوا اتنی شدید تھی کہ جس چیز پر گزرتی، اسے بوسیدہ اور تباہ شدہ (رَمِیمٌ) بنا دیتی، یعنی جیسے پرانا، بوسیدہ، ٹوٹا ہوا، یا خاکستر ہو جائے۔ (الوسیط فی التفسیر القرآن الکریم)

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِیْنٍ: اور (عبرت ہے) قومِ ثمود میں، جب ان سے کہا گیا کہ کچھ وقت تک فائدہ اٹھالو۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں تین دن کی مہلت دی تھی، لیکن انہوں نے اللہ کے حکم سے سرکشی کی، نافرمانی کی اور عذاب کو دعوت دی۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ: انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی، سرکشی کی تو اس وجہ سے انہیں صاعقہ نے پکڑ لیا، صاعقہ سے مراد سخت آواز یا بجلی کا عذاب ہے، جو انہیں اس حال میں آیا کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ: عذاب اتنا شدید تھا کہ وہ نہ بھاگ سکے، نہ اٹھ سکے، نہ کسی نے ان کی مدد کی، سب بے بس ہو گئے۔ (تفسیر ابن زمنین)

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ: اور قومِ نوح اس سے پہلے، وہ بھی نافرمان اور سرکش قوم تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی ان کی سرکشی اور فسق کی وجہ سے ہلاک کر دیا، یہاں "فسق" سے مراد اللہ کی نافرمانی، حد سے تجاوز اور گناہوں میں مبتلا ہونا ہے۔ (تفسیر البیضاوی)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین قوموں کی سرکشی، ان پر آنے والے عذاب اور ان کے انجام کو عبرت کے طور پر بیان کیا ہے، قومِ عاد کو تباہ کن ہوا سے ہلاک کیا گیا، قومِ ثمود کو بجلی کی کڑک اور سخت آواز سے ہلاک کیا گیا، قومِ نوح کو طوفان سے ہلاک کیا گیا، ان سب کا انجام اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی اور سرکشی میں حد سے بڑھ گئے، یہ آیات انسان کو خبردار کرتی ہیں کہ

اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا، سوائے ایمان اور اطاعت کے راستے پر چلنے کے۔

قدرت کی کاریگری اور توحید

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ {۴۷} وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ {۴۸} وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ {۴۹} فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ {۵۰} وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ {۵۱} الذاریات

جواب ترجمہ: اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا ہے، اور ہم یقیناً وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے فرش بنایا، چنانچہ ہم کیا خوب بچھانے والے ہیں۔ اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ لہٰذا دوڑو اللہ کی طرف یقین جانو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے صاف صاف خبر دار کرنے والا (بن کر آیا) ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بناؤ۔ یقین جانو میں اس کی طرف سے تمہارے لیے صاف صاف خبر دار کرنے والا (بن کر آیا) ہوں۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمان کو اپنی قوت اور قدرت سے بنایا۔ "بأید" کا مطلب ہے "قوت" یعنی اللہ نے آسمان کو اپنی عظیم طاقت سے بلند اور مضبوط بنایا۔ لَمُوْسِعُوْنَ کے کئی معانی ہیں: ہم آسمان کو وسعت دینے والے ہیں، یعنی اس کی حدود اور پھیلاؤ بہت وسیع ہے۔ ہم اپنی قدرت سے اس سے بھی زیادہ پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے رزق کی وسعت بھی مراد لی ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر رزق کو وسیع کرتا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے زمین کو بچھایا، یعنی اسے انسانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے رہنے اور چلنے کے قابل بنایا۔ فَرَشْنٰهَا یعنی زمین کو بچھا دیا، ہموار اور قابلِ سکونت بنایا۔ فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ یعنی اللہ بہترین بچھانے والا ہے، اس نے زمین کو اس طرح بنایا کہ انسان اس پر آرام سے رہ سکے۔ (تفسیر المراغی)

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ زَوْجَيْنِ سے مراد ہے: ہر مخلوق میں دو قسمیں، جیسے نر و مادہ، دن و رات، خوشی و غم، موت و زندگی۔ (تفسیر العز بن عبد السلام) اس میں انسان، حیوانات، پودے، حتیٰ کہ اشیاء اور صفات بھی شامل ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اللہ کی قدرت اور وحدانیت کو پہچانیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ (عیون التفاسیر)

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے دین پر ایمان لانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے میں جلدی کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ناراضگی سے اس کی رحمت کی طرف بھاگیں، اس پر ایمان لا کر، اس کے رسول ﷺ پر ایمان لا کر، اس کے احکامات کی پیروی کر کے اور اس کے احکامات پر اطاعت کرتے ہوئے۔

شیخ عبد الکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرو، چونکہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک حالت انسان کی یہ ہوتی ہے کہ اسے کسی چیز کی طرف شوق اور میلان و رجحان ہوتا ہے، اور ایک حالت اس کی کسی چیز سے ڈرنے کی ہے، یا تو وہ پر امید ہو گا یا خوف زدہ ہو گا، یا اس پر ایسی حالت ہو گی جو نفع کو کھینچ رہی ہو گی یا ایسی حالت ہو گی جو نقصان کو دور کر رہی ہو گی، دونوں حالتوں میں اس کے لیے مناسب بات یہی ہے کہ وہ اللہ کی طرف بھاگے، اس لیے کہ نفع دینے والا اور نقصان دینے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس کا فرار اللہ کی طرف درست ہو گا اس کا قرار بھی اللہ کے ساتھ درست ہو گا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہالت سے علم کی طرف کوچ کرے، خواہشات نفسانیہ سے تقویٰ و طہارت کی طرف کوچ کرے، شک سے یقین کی طرف کوچ کرے، شیطان سے رحمان کی طرف کوچ کرے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اس فعل سے جو اسے آزمائش و ابتلاء میں ڈال رہا ہے سے اس فعل کی طرف کوچ کرے جو اس کی کفایت کر رہا ہو، اور اس وصف سے بھاگے جو اس کی ناراضگی کا باعث ہو اس وصف کی طرف جو اس کی

رحمت کا باعث ہو۔

بعض حضرات یوں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کی بجائے اس کی توحید کی طرف بھاگو، کیونکہ اس کا فرمان عالی شان ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود اورالٰہ نہ بناؤ۔ شیخ ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ جن چیزوں کی طرف اللہ نے تمہیں بلایا ہے ان کی طرف بھاگو نہ کہ ان چیزوں کی طرف جن سے اس نے تمہیں منع کیا ہے، جیسے ارشاد ربانی ہے کہ اللہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، یعنی وہ ذات تمہیں برے اعمال کی بجائے نیک اعمال کی طرف دعوت دیتی ہے۔ (تفسیر ماتریدی)

حکیم اختر صاحب رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک مفکر اعظم صاحب نے سوال کیا کہ اگر آپ میرے ایک سوال کا جواب دے دیں تو میں آپ کی نبوت کو تسلیم کرلوں، فرمایا کہو، اس نے کہا کہ اگر کسی کمان سے مسلسل تیروں کی بارش ہورہی ہو تو اس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ شانہ سے اس کے جواب کا انتظار فرمایا، وحی الٰہی سے جواب عطا ہوا کہ اس سے کہہ دیجیے کہ تیر چلانے والے کے پاس بھاگ کر کھڑا ہو جائے، آہ! یہی راز ہے ارشاد باری تعالیٰ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ کا، اے لوگو! بھاگو اللہ کی طرف، اسی مضمون کو حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمہ اللہ نے اپنے شعر میں خوب ادا کیا ہے

بلائیں تیر اور فلک کماں ہے، چلانے والا شہ جہاں ہے
اسی کے زیر قدم اماں ہے، بس اور کوئی مفر نہیں ہے

پس عاقل وہ ہے جو حق تعالیٰ کی رضاجوئی میں جیتا ہے اور اسی میں مرتا ہے اور بے وقوف وہ ہے جو خود سراپا محتاج و محکوم غلام ہونے کے باجود اپنے بااختیار مولیٰ کو ناراض کیے ہو۔ (خزائن القرآن ۳۳۵)

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ: اہل علم نے اس آیت کو توحید کی اصل دلیل کے طور پر بیان کیا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر شرک سے منع فرمایا ہے اور صرف اپنی عبادت اور اپنی الوہیت کو ثابت کیا ہے، یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، نہ عبادت

میں، نہ دعا میں، نہ نذر و نیاز میں، نہ کسی اور عمل میں، اس میں ہر قسم کے شرک کی نفی ہے، چاہے وہ شرک جلی ہو یا خفی، یہ آیت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر واضح دلیل ہے، توحید کی بنیاد یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ: میں تمہیں اس (شرک) کے انجام سے واضح طور پر ڈراتا ہوں، اس میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور اِنذار کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں جو شرک کرنے والوں پر آتا ہے۔ توحید کا اصل مقصد اللہ کی عبادت میں اخلاص ہے اور شرک سے مکمل اجتناب ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکید کے ساتھ شرک سے منع فرمایا اور اس کے انجام سے خبر دار کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو تسلی

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ {۵۲} اَتَوَاصَوۡا بِہٖ ۚ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ {۵۳} فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ {۵۴} وَّذَکِّرۡ فَاِنَّ الذِّکۡرٰی تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ {۵۵} الذاریات

جواب ترجمہ: اسی طرح ان سے پہلے جو لوگ تھے ان کے پاس بھی کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کے بارے میں انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ: جادو گر ہے، یا دیوانہ ہے۔ کیا یہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے چلے آئے ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں۔ لہٰذا (اے حبیب) آپ ان سے بے رخی اختیار کریں، کیونکہ آپ قابل ملامت نہیں ہیں۔ اور نصیحت کرتے رہیے، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کو فائدہ دیتی ہے۔

کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو تسلی دی ہے کہ کفارِ مکہ کا رسول کو جادو گر یا مجنون کہنا کوئی نئی بات نہیں، بلکہ یہ رویہ پچھلی امتوں میں بھی عام تھا، ارشاد فرمایا اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس

جب بھی کوئی رسول آیا، انہوں نے اسے جادو گر یا مجنون کہا، یہ کفار کی عادت رہی ہے کہ وہ رسولوں کی دعوت کو جھٹلاتے اور ان پر بے بنیاد الزامات لگاتے تھے۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ: کیا انہوں نے آپس میں اس بات کی وصیت کی ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔ یعنی یہ الزام تراشی کوئی باہمی مشورہ یا وصیت نہیں، بلکہ ان سب میں سرکشی اور حد سے تجاوز کرنے کی عادت مشترک ہے۔ (الوسیط فی تفسیر القرآن المجید)

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ: پس آپ ان سے اعراض کریں، آپ پر کوئی ملامت نہیں، یعنی اے نبی! آپ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں، اب ان کی ضد اور انکار پر آپ کو ملامت نہیں کی جائے گی۔

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور نصیحت کرتے رہیں، کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو فائدہ دیتی ہے، یعنی دعوت اور نصیحت کا فائدہ انہی کو ہوتا ہے جو ایمان لانے والے ہیں، اس لیے آپ تبلیغ جاری رکھیں۔

جنات اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد

سوال انسانوں اور جنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس آیت کریمہ کی روشنی میں بتایئے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ {٥٦} الذاریات.

جواب ترجمہ: اور میں نے جن اور انس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔

قرآنی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے، دنیوی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انہیں اللہ کی بندگی اور عبادت کو ہی سب سے اولین حیثیت دینا چاہیے، جیسے اللہ کے رسولوں اور نبیوں نے ہمیں خبردار کیا ہے۔

انسانوں کی طرح جنات بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور ہر ایک مخلوق کا دائرہ عمل اپنا اپنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن جنات اور مومن انسانوں کی پیدائش کا بنیادی مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت و بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو کسی طرح شریک نہ کریں۔

عبادت یہ ہے کہ اللہ و رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اللہ اور بندوں کے تمام حقوق

کو احسن طریقے سے پورا کیا کریں۔ نہ حقوق اللہ میں کمی کریں نہ حقوق العباد میں، اللہ کا بندوں پر حق ہے کہ وہ ایک اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے تمام احکامات کی پابندی کریں، اس کے سوا کسی کے سامنے اپنی پیشانی کو نہ جھکائیں، کسی دوسرے کے لئے بھوکے نہ رہیں، اس کے سوا کسی اور کے نام کی نذر و نیاز نہ کریں۔ نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ کو سمجھیں اس کے سوا کسی کو نفع نقصان کا مالک نہ سمجھیں۔ اللہ کے سوا کسی سے مدد طلب نہ کریں۔ دعا کے لئے صرف اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اسی بے نیاز ذات کو ساری کائنات کا، خالق ومالک سمجھیں وغیرہ وغیرہ۔

بندوں کے حقوق یہ ہیں کہ ایک دوسرے پر جتنے حقوق ہیں ان کو احسن طریقے پر بجالائیں، اولاد پر والدین کے حقوق ہیں اسی طرح والدین پر اپنی اولاد کو بہترین تربیت کے ذریعہ ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا اور معاشرہ کا بہترین فرد بنانا بیوی بھائی بہن رشتہ دار اور غریبوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اللہ نے جو ان کے حقوق مقرر کئے ہیں ان کو ادا کرنا۔ اگرچہ حقوق انسان کی تو ایک طویل فہرست ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے تمام حقوق ادا کرنا عبادت و بندگی ہے۔ کسی کے حق میں کمی نہ کرنا یہی کمال بندگی ہے۔ جنات اور انسانوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ تمہیں عطا کیا ہے جو تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ اللہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہے ساری مخلوق بھی اس کی بندگی چھوڑ دے تو اس کی کائنات میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر اللہ ہی ان سے رخ پھیر لے تو وہ ہر سعادت سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ (تفسیر بصیرت قرآن للقاسمی)

عبادت سے یہاں مراد فقہ کی کتاب العبادات والی عبادت پنجگانہ مراد نہیں، بلکہ اپنے وسیع وعام مفہوم میں طلب رضاء الٰہی کے مرادف مراد ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری عبادتوں کا خلاصہ صرف دو چیزیں ہیں ایک امر الٰہی کی تعظیم، دوسرے خلق اللہ پر شفقت، دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ کی ادائی، حقوق العباد کی ادائی، مَا الْعِبَادَةُ الَّتِي خُلِقَ الْجِنُّ وَالْإِنْسُ لَهَا؟ قُلْنَا: التَّعْظِيمُ لِأَمْرِ اللهِ وَالشَّفَقَةُ عَلَى خَلْقِ اللهِ، فَإِنَّ هٰذَيْنِ النَّوْعَيْنِ لَمْ يَخْلُ شَرْعٌ مِنْهُمَا، (مفاتیح الغیب) مخلوقات میں یہ دو قسمیں ایسی ہیں جن میں خالق نے پورا احساس ذمہ داری

رکھ دیا ہے اور ان کے اندر ابتلاء واختیار دونوں کی صلاحیتیں جمع کر دی ہیں۔ بخلاف فرشتوں کے جو ابتلاء سے خالی رکھے گئے ہیں۔ اور بخلاف حیوانات کے جنہیں اختیار کی پوری قوت نہیں دی گئی ہے۔ پوری طرح پر ذمہ دار ہستیاں بنا کر یہی دو مخلوق دنیا میں بھیجی گئی ہیں۔

ان کی اپنی تکمیل ذات کے لئے یہ لازمی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کریں عبادت ہی کی راہ سے کریں، کھائیں پئیں، بولیں چالیں، چلیں، پھریں، کمائیں، خرچ کریں، ہر فعل ہر عمل سے مقصود اصلی رضاء الٰہی کا حصول ہی رکھیں۔

اپنے وجود کی علت غائی اسی کو سمجھیں، یہی معنی ہیں ان کی عبادت کے، عبدیت وعبادت سے خود انسانیت ہی کو پورے نشوونما کا موقع ملتا ہے۔ اور جتنی اس میں کمی رہ جائے گی، اسی نسبت سے انسان کا منشائے تکمیل ناتمام رہے گا۔ (تفسیر ماجدی)

اللہ طلب گار رزق نہیں بلکہ رزق عطا کرنے والا ہے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ {۵۷} اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ {۵۸} الذاریات

جواب ترجمہ: میں ان سے کسی قسم کا رزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ وہ ہے جو خوب رزق دینے والا ہے قوت والا ہے، نہایت ہی قوت والا ہے۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں (اپنے بندوں سے) نہ رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی بے نیازی اور غنا کو بیان فرما رہے ہیں، اللہ بندوں سے کسی قسم کا رزق یا فائدہ نہیں چاہتا، نہ اپنی ذات کے لیے اور نہ کسی اور کے لیے، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں اور جنات کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، نہ اس لیے کہ وہ اللہ کے لیے رزق یا کھانا مہیا کریں، مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ اس طرح نہیں جیسے دنیا کے مالکان اپنے غلاموں سے کام لیتے ہیں

اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ تو خود سب کو رزق دینے والا ہے، اس کو کسی کی حاجت نہیں۔(الکشاف)

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ: اللہ ہی رزق دینے والا ہے، قوت والا، مضبوط ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان کی ہیں الرزاق یعنی اللہ ہی سب کو رزق دینے والا ہے، اس کے رزق میں کمی نہیں آتی، وہ سب کو برابر عطا کرتا ہے۔ "رزاق" مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت زیادہ رزق دینے والا۔(لقاء الباب المفتوح)

" ذو القوۃ المتین" یعنی اللہ قوت والا اور مضبوط ہے، اس کی قدرت کامل ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔(الاعراب القرآن)المختصر: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی، رزق دینے کی صفت اور کامل قوت کو بیان کیا ہے، انسانوں اور جنات کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اللہ کو ان سے کسی قسم کا فائدہ یا رزق مطلوب نہیں، اللہ ہی سب کو رزق دیتا ہے اور وہی کامل قوت والا ہے، اس لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت کو بنائیں اور اس کی بے نیازی کو سمجھیں۔

ظالموں کا انجام

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ{۵۹}فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ{۶۰}الذاریات.

جواب ترجمہ: اب تو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کی بھی ایسی ہی باری آئے گی جیسے ان کے (پچھلے) ساتھیوں کی باری آئی تھی، اس لیے وہ مجھ سے جلدی (عذاب لانے) کا مطالبہ نہ کریں۔ غرض جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، ان کی اس دن کی وجہ سے بڑی خرابی ہوگی جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت نبی کریم ﷺ کو جھٹلا کر ظلم کا ارتکاب کیا ہے ان کے

لیے اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہونے والا ہے، جو ان کا حصہ ہے، جس طرح ان سے پہلے گزر جانے والے لوگوں کا حصہ تھا، اس لیے یہ جلدی عذاب نہ مانگیں وہ یقیناً انہیں پہنچ کر رہے گا، پھر ان کی تباہی، بربادی، ہلاکت اور شقاوت ہو گی، جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ کا انکار کیا، یہ سب کچھ ان کے ساتھ بروز محشر ہونے والا ہے جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، عذاب انہیں پہنچ کر رہے گا۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذَنُوْبًا لفظ ذنوب بفتح الذال اصل میں بڑے ڈول کو کہا جاتا ہے اور بستی کے عام کنوؤں پر پانی بھرنے کے لئے بغرض سہولت بھرنے والوں کے نمبر اور باری مقرر کرلی جاتی ہے، ہر ایک پانی بھرنے والا اپنی باری میں پانی بھرتا ہے، اس لئے یہاں لفظ ذنوب کے معنی باری اور حصہ کے لئے گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کو اپنے اپنے وقت میں عمل کرنے کا موقع اور باری دی گئی جن لوگوں نے اپنی باری میں کام نہیں کیا وہ ہلاک و برباد اور گرفتار عذاب ہوئے، اسی طرح موجودہ مشرکین کی بھی باری اور وقت مقرر ہے، اگر اس وقت تک یہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو خدا کا عذاب ان کو کبھی تو اسی دنیا میں اور نہیں تو آخرت میں ضرور پکڑے گا، اس لئے ان کو فرما دیجئے کہ اپنی جلد بازی سے باز آجاؤ یعنی یہ کفار جو بطور تکذیب و انکار کے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم واقعی مجرم ہیں اور مجرمین پر عذاب آنا آپ کے قول سے ثابت ہے تو پھر ہم پر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ ان کا جواب یہ ہے کہ عذاب اپنے مقررہ وقت پر اور اپنی باری پر آتا ہے، تمہاری باری بھی آنے والی ہے جلد بازی نہ کرو۔ (معارف القرآن)

الحمد للہ ثم الحمد للہ، بعون اللہ آج سورۃ الذاریات کے چیدہ چیدہ مقامات کی تفسیر مکمل ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی رضا کے لیے قبول فرمالے، اسے میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میری آل واولاد کے لیے، میرے اساتذہ ومشائخ کے لیے، میرے اعزہ اقربا کے لیے، میرے مساعدین ومعاونین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (کان اللہ لہ)

۳ جولائی ۲۰۱۸ء مطابق ۱۸ شوال ۱۴۳۹ھ بروز منگل، بوقت سوا چھ بجے شام

نظر ثانی واضافات: ۱۰ جنوری ۲۰۲۶ء بروز ہفتہ پونے ۲ بجے شب

سورۃ الطور (تعارف)

سوال سورۃ الطور کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الطور مکی سورتوں میں سے ہے، اس میں دو رکوع، انچاس آیتیں، تین سو بارہ کلمات اور ایک ہزار پانچ سو حروف ہیں، یہ سورت قرآن کریم میں ترتیب تلاوت کے اعتبار سے ۵۲ ویں نمبر پر ہے اور ترتیب نزول میں ۷۵ ویں نمبر پر ہے، سورۃ الطوران سورتوں میں سے ہے جن میں اسلامی عقیدہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ توحید، رسالت، بعث و جزا اس سورت کے اہم موضوعات ہیں۔

وجہ تسمیہ: سورۃ مبارکہ کا نام "سورۃ الطور" ہے، چونکہ پہلی آیت ہی میں اللہ تعالیٰ نے طور کی قسم اٹھائی ہے جو کہ ایک پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کیا تھا، یہ پہاڑ انوار و تجلیات اور فیوضات کا محور ہے اور دنیا کے تمام پہاڑوں پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

مضامین: سورت کی ابتدا قیامت کی ہولناکیوں اور شدائد کے بیان سے کی گئی ہے جن کا سامنا کفار کو کرنا پڑے گا۔ چنانچہ قسمیں اٹھا کر اس امر کو یقینی بتایا گیا ہے کہ کفار پر عذاب نازل ہو کر رہے گا، اس امر کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے پانچ قسمیں اٹھائی گئی ہیں۔

اس کے بعد پرہیز گار لوگوں کے متعلق بات ہوئی ہے کہ وہ جنت میں عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے، تختوں پر براجمان آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہر طرح کی سعادت سے نوازیں گے، ان کے پاس جنت کی عورتیں، اولاد، بیٹے، عیش و عشرت، لذات، انواع و اقسام کے کھانے، مشروبات، میوہ جات، طرح طرح کے گوشت، الغرض ہر طرح کی نعمتیں انہیں میسر ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں کھٹکیں۔

اس کے بعد رسول کریم محمد بن عبداللہ ﷺ کی رسالت پر بات کی گئی ہے، آپ کے فریضہ کی تعیین کی گئی ہے کہ وعظ کرنا اور ڈر سنانا آپ کا کام ہے۔ محمد ﷺ کاہن و مجنون نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت و رسالت عطا کی ہے۔

سورۃ کریمہ کے آخر میں کافروں اور ان کے خداؤں پر تہکم کیا گیا ہے اور یہ اسلوب بطور توبیخ اپنایا گیا

ہے، کفار کے عناد و طغیان کی شدت بیان کی گئی ہے، اس کے مقابلہ میں رسول کریم ﷺ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔ (صفوۃ التفاسیر)

یہ ان سورتوں میں سے ہے جن کی رسول اللہ ﷺ نمازوں میں تلاوت کیا کرتے تھے، ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے بیت اللہ شریف کے بازو میں آپ ﷺ کو نماز پڑھنے کے دوران سورۃ طور پڑھتے ہوئے سنا (بخاری، کتاب التفسیر)

نیز حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں کچھ قیدیوں کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ اس وقت فجر کی نماز ادا کر رہے تھے اور سورۃ طور کی تلاوت میں مشغول تھے، جب آپ ﷺ آیت نمبر: ۷، ۸ پر پہنچے تو عذاب نازل ہونے کے خوف سے میں نے اسلام قبول کر لیا اور جب آپ ﷺ نے اس سورۃ کی آیت نمبر: ۳۵، ۳۶ پڑھی تو ایسا لگا کہ میرا کلیجہ اڑ جائے گا۔ (الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴: ۴۱۲، آسان تفسیر مولانا رحمانی)

طور پہاڑ

سوال سورۃ طور کے شروع میں طور کا ذکر کیا گیا ہے، یہ طور کیا ہے؟

وَالطُّوْرِ {۱} الطور

جواب ترجمہ: قسم ہے طور کی۔

خلاصہ تفسیر: طور کلام عرب میں "پہاڑ" کو کہتے ہیں، بعض اہل لغت کہتے ہیں طور کو اس وقت تک طور نہیں کہا جاتا جب تک اس پر درخت نہ ہوں، خالی پہاڑ کو طور نہیں کہا جاتا، طور کو طور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نسبت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے بطور بن اسماعیل کی طرف ہے، اس سے باء کو ثقل کی وجہ سے ہٹا دیا گیا، چونکہ بطور بن اسماعیل کی یہاں حکومت تھی اس لیے ان کی طرف اسے منسوب کیا گیا، اہل تاریخ کہتے ہیں کہ تمام بلاد شام کو طور کہا جاتا ہے۔

بعض جانکاروں کا یہ کہنا ہے کہ طور نابلس کے اوپر ایک اونچی پہاڑی ہے، اسی لیے سامرہ اس کا حج کیا کرتے تھے، یہودیوں کا اس پہاڑ کے بارے میں بڑا اعتقاد ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسی پہاڑ

پر اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، حالانکہ ان کے ہاں تورات میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔

اہل تاریخ کہتے ہیں کہ مصر کے قریب ایک جگہ ہے جسے مدین کہا جاتا ہے، اس پر موجود پہاڑ کو طور کہا جاتا ہے، یہ نیک لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہا، اس کے پتھروں کو جیسے بھی توڑا جائے اس میں سے علیق نامی درخت کی شکل نکلتی ہے، اسی پہاڑی پر موسیٰ علیہ السلام کو دوسری بار مخاطب کیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلیں۔

نبطی زبان میں ہر پہاڑ کو طور ہی کہا جاتا ہے، جب اس پہاڑ کے اوپر جڑی بوٹیاں اور سبزہ ہو تو اسے طور سینا کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان شہاب الدین یاقوت حموی)

طور بڑی فضیلت والا پہاڑ ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے، جس نے اس پہاڑ کو عظمت عطا فرمائی، باقی پہاڑوں پر بہر حال اس پہاڑ کو فضیلت حاصل ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں سے فرمایا کہ میں تمہاری طرف اپنا امر یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور نبوت اتارنے والا ہوں، اس پر سب پہاڑوں نے مہلت طلب کی، جب کہ طور پہاڑ نے مہلت نہیں مانگی بلکہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک گیا، اور طور پہاڑ کہنے لگا کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم طور پر اتارا۔

فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَالِكَ إِذْ بَعَثَ اللهُ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ، فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ، بَيْنَ مَهْرُودَتَيْنِ، وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلَى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ، إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ، وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ، فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفَسِهِ إِلَّا مَاتَ، وَنَفَسُهُ يَنْتَهِي حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ، فَيَطْلُبُهُ حَتَّى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ، فَيَقْتُلُهُ، ثُمَّ يَأْتِي عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ قَوْمٌ قَدْ عَصَمَهُمُ اللهُ مِنْهُ، فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ، فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَالِكَ إِذْ أَوْحَى اللهُ إِلَى عِيسَى: إِنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِي، لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ، فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ وَيَبْعَثُ اللهُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَهُمْ مِنْ كُلِّ

حَدَبٍ يَنْسِلُونَ (مسلم، باب ذکر الدجال)

دجال کے انہی افعال کے دوران اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجے گا، وہ دمشق کے مشرق میں سفید منارے کے پاس زرد رنگ کے حلے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے جب وہ اپنے سر کو جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اپنے سر کو اٹھائیں گے تو اس سے سفید موتیوں کی طرح قطرے ٹپکیں گے اور جو کافر بھی ان کی خوشبو سونگھے گا وہ مرے بغیر رہ نہ سکے گا اور ان کی خوشبو وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر جائے گی۔ پس حضرت مسیح علیہ السلام (دجال کو) طلب کریں گے، اسے باب لد پر پائیں گے تو اسے قتل کر دیں گے، پھر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے پاس وہ قوم آئے گی جسے اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا تھا، پس عیسیٰ علیہ السلام ان کے چہروں کو صاف کریں گے اور انہیں جنت میں ملنے والے ان کے درجات بتائیں گے۔ پس اسی دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ رب العزت وحی نازل فرمائیں گے کہ تحقیق میں نے اپنے ایسے بندوں کو نکالا ہے کہ کسی کو ان کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں۔ پس آپ میرے بندوں کو حفاظت کے لئے طور کی طرف لے جائیں اور اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا اور وہ ہر اونچائی سے نکل پڑیں گے۔

شہر ایلہ سے بیت المقدس تک چھ مراحل ہیں، اور جس طور پہاڑ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اس کی مسافت ایلہ سے ایک دن اور ایک رات ہے۔ (الروض المعطار فی خبر الاقطار)

طور پہاڑ ناصرہ شہر کے مشرق میں واقع ہے، جس کی اونچائی سطح سمندر سے ۵۶۲ میٹر ہے، فلسطین کے شمال میں جن خوبصورت مناظر پر انسانی نگاہ پڑتی ہے وہ جبل شیخ، مشرقی اردن کے پہاڑ، بحیرہ طبریہ، بحر متوسط، طور زیتون واقع ہیں۔ (المعالم الاثیرہ فی السنۃ والسیرۃ)

طور پہاڑ ہی وہ پہاڑ ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی گئی تھی، اسی کو طور سیناء بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ طور سیناء وہ پہاڑ ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے آخری پارے میں قسم کھائی ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے مبارک پہاڑ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے خوبصورت،

دونوں مفسر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حبشی زبان ہے، کیونکہ اہل حبشہ کسی خوبصورت چیز کے لیے یہ لفظ بولتے ہیں، سیناء کا معنٰی ہے درختوں والا پہاڑ۔

ابن نجیح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طور کا معنٰی پہاڑ ہے، جب کہ سیناء کا معنٰی پتھر ہے، جس کی اضافت ونسبت پہاڑ کی طرف کی گئی ہے، ابراہیم بن سری کہتے ہیں کہ سیناء کی سین پر فتح ہے، سیناء صحراء کے وزن پر ہے۔ (معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع)

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں کہ طور اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اٹھائی اس کی شرافت کو ظاہر کرنے کے لئے، اس کی کرامت کو ظاہر کرنے کے لئے اور اس میں جو نشانیاں ہیں انہیں یاد دلانے کے لئے۔ یہ جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چار پہاڑ جنت کے پہاڑوں میں سے ہیں، چار دریا جنت کے دریاؤں میں سے ہیں، چار میدان جنگ جنت کے میدانوں میں سے ہیں۔ پوچھا گیا: پہاڑ کون سے ہیں؟ فرمایا: جبل احد جو ہم سے محبت کرتا ہے، جودی پہاڑ جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سریانی زبان میں طور سے مراد پہاڑ ہے اس سے مراد طور سیناء ہے۔ حضرت مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ طور دو ہیں، ان میں سے ایک کو طور سیناء اور دوسرے کو طور زیتا کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں پہاڑ انجیر اور زیتون کو اگاتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے، یہ مدین میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام زَبیر ہے۔ زبیر وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ حضرت امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدین ارض مقدسہ میں ہے یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا گاؤں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ طور سے مراد ہر وہ پہاڑ ہے جو کسی چیز کو اگائے اور جو کسی چیز کو نہ اگائے طور نہیں ہے۔ (تفسیر قرطبی)

قسمیں اور جواب قسم

سوال ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کی قسم کھائی ہے اور جواب قسم کیا ہے؟

وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ الطور.

جواب ترجمہ: قسم ہے اس کتاب کی جو ایک کھلے ہوئے۔ صحیفے میں لکھی ہوئی ہے۔ اور قسم ہے بیت معمور کی۔ اور بلند کی ہوئی چھت کی۔ اور اس جوش مارتے ہوئے سمندر کی۔ کہ تمہارے پروردگار کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس کو روک سکے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے ان چیزوں کی قسم کھا کر جو اس کی عظیم الشان قدرت کی نشانیاں ہیں فرماتا ہے کہ اس کا عذاب ہو کر ہی رہے گا جب وہ آئے گا کسی کی مجال نہ ہو گی کہ اسے ہٹا سکے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں طور پہاڑ کی قسم کھائی، طور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر درخت ہوں جیسے وہ پہاڑ جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا اور جو خشک پہاڑ ہو اسے جبل کہا جاتا ہے طور نہیں کہا جاتا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کتاب مسطور کی قسم کھائی، کتاب مسطور سے مراد یا تو لوح محفوظ ہے یا اللہ کی اتاری ہوئی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو انسانوں پر پڑھی جاتی ہیں اسی لئے ساتھ ہی فرمادیا کھلے ہوئے اوراق میں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المعمور کی قسم کھائی، بیت المعمور کی بابت معراج والی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ساتویں آسمان سے آگے بڑھنے کے بعد مجھے بیت المعمور دکھلایا گیا جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے جاتے ہیں، دوسرے دن اتنے ہی اور لیکن جو آج گئے ان کی باری پھر قیامت تک نہیں آتی، جس طرح زمین پر کعبۃ اللہ کا طواف ہوتا ہے اسی طرح آسمان والوں کے طواف کی اور عبادت کی جگہ وہ ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت المعمور ساتویں آسمان والوں کا کعبہ ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ بیت المعمور سے کمر لگائے بیٹھے ہیں اس میں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ چونکہ خلیل اللہ بانی بیت اللہ تھے جن کے ہاتھوں زمین میں کعبۃ اللہ بنا تھا تو انہیں وہاں بھی اس کے کعبے سے لگے ہوئے آپ نے دیکھا۔ تو گویا اس عمل کی

جزا اسی جیسی پروردگار نے اپنے خلیل کو دی، یہ بیت المعمور ٹھیک خانہ کعبہ کے اوپر ہے اور ہے ساتویں آسمان پر، یوں تو ہر آسمان میں ایک ایسا گھر ہے جہاں اس آسمان کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں پہلا آسمان جو اسی جگہ ہے اس کا نام بیت العزت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ بیت المعمور کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا بَيْتٌ فِي السَّمَاءِ يُقَالُ لَهُ: "الضُّرَاح" وَهُوَ بِحِيَالِ الْكَعْبَةِ مِنْ فَوْقِهَا، حُرْمَتُهُ فِي السَّمَاءِ كَحُرْمَةِ الْبَيْتِ فِي الْأَرْضِ، يُصَلِّي فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ، لَا يَعُودُونَ فِيهِ أَبَدًا (ابن جریر) وہ آسمان میں ایک گھر ہے، اسے " ضراح" کہا جاتا ہے کعبہ کے ٹھیک اوپر ہے جس طرح زمین کا کعبہ حرمت کی جگہ ہے اسی طرح وہ آسمانوں میں حرمت کی جگہ ہے، ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں لیکن جو آج گئے ہیں ان کی باری قیامت تک دوبارہ نہیں آتی۔ اس لیے کہ فرشتے بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔

ایک روایت میں ہے یہ پوچھنے والے ابن کواء تھے، ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ عرش کے محاذ میں ہے ایک مرفوع روایت میں ہے کہ صحابہ کو ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

هَلْ تَدْرُونَ مَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ؟ قَالُوا: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّهُ مَسْجِدٌ فِي السَّمَاءِ بِحِيَالِ الْكَعْبَةِ، لَوْ خَرَّ لَخَرَّ عَلَيْهَا، يُصَلِّي فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ، إِذَا خَرَجُوا مِنْهُ لَمْ يَعُودُوا آخِرَ مَا عَلَيْهِمْ، بیت المعمور کو جانتے ہو ؟ انہوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول جانتے ہیں، فرمایا وہ آسمانی کعبہ ہے اور زمینی کعبہ کے بالکل اوپر ہے ایسا کہ اگر وہ گرے تو اسی پر گرے اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں جن کی باری قیامت تک پھر نہیں آتی۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ يُعَمِّرُهُ طَائِفَةٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُقَالُ لَهُمْ: الجن مِنْ قَبِيلَةِ إِبْلِيسَ، اسے آباد رکھنے والے یہ فرشتے ابلیس کے قبیلے کے جنات میں سے ہیں۔ (تفسیر طبری)

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ: اونچی چھت سے مراد آسمان ہے جیسے دوسری جگہ ہے {وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ

سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ} (الْأَنْبِيَاءِ: ۳۲) اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا، اور وہ لوگ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرتے ہیں۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ: بحر مسجور سے مراد وہ پانی ہے جو عرش تلے ہے جو بارش کی طرح برسے گا جس سے قیامت کے دن مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے، جمہور کہتے ہیں یہی دریا مراد ہیں انہیں جو (مسجور) کہا گیا ہے یہ اس لئے کہ قیامت کے دن ان میں آگ لگادی جائے گی جیسے دوسری جگہ پر ہے {وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ} (التَّكْوِيرِ: ٦) جبکہ دریا بھڑکا دیئے جائیں، اور ان میں آگ لگ جائے گی جو پھیل کر تمام اہل محشر کو گھیر لے گی۔

حضرت علاء بن بدر کہتے ہیں کہ إِنَّمَا سُمِّيَ الْبَحْرُ الْمَسْجُورَ لِأَنَّهُ لَا يُشْرَبُ مِنْهُ مَاءٌ، وَلَا يُسْقَى بِهِ زَرْعٌ، وَكَذَلِكَ الْبِحَارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ابن ابی حاتم) بھڑکتے ہوئے دریا اس لیے کہا گیا کہ نہ اس کا پانی پینے کے کام میں آئے اور نہ کھیتی کو دیا جائے، یہی حال قیامت کے دن دریاؤں کا ہو گا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ البحر المسجور کا معنیٰ ہے دریا بہتا ہوا۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ البحر المسجور کا معنیٰ ہے دریا پانی سے بھرا ہوا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مسجور سے مراد فارغ یعنی خالی ہے، کوئی لونڈی پانی لینے کو جائے پھر لوٹ کر آئے اور یوں کہے کہ حوض مسجور ہے اس سے مراد یہی ہے کہ خالی ہے۔ (ابن مردویہ) مسند احمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لَيْسَ مِنْ لَيْلَةٍ إِلَّا وَالْبَحْرُ يُشْرِفُ فِيهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَسْتَأْذِنُ اللهَ أَنْ يَنْفَضِخَ عَلَيْهِمْ، فَيَكُفُّهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ، ہر رات تین مرتبہ دریا اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو تمام لوگوں کو ڈبو دوں لیکن اللہ تعالیٰ اسے روک دیتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ ایک بزرگ مجاہد رحمہ اللہ جو سمندر کی سرحد کے لشکروں میں تھے وہ جہاد کی تیاری میں وہیں رہتے تھے فرماتے ہیں ایک رات میں چوکیداری کے لئے نکلا اس رات کوئی اور پہرے پر نہ تھا میں گشت کرتا ہوا میدان میں پہنچا اور وہاں سے سمندر پر نظریں ڈالیں تو ایسا معلوم ہوا

کہ گویا سمندر پہاڑ کی چوٹیوں سے ٹکرا رہا ہے بار بار یہی نظارہ میں نے دیکھا۔ تفسیر ابن کثیر)

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ : ان قسموں کے بعد اب جس چیز پر قسمیں کھائی گئی تھیں ان کا بیان ہو رہا ہے جواب قسم آرہا ہے کہ کافروں کو جو عذاب الٰہیہ ہونے والا ہے وہ یقینی طور پر آنے والا ہی ہے جب وہ آئے گا کسی کے بس میں اس کا روکنا نہ ہو گا۔

ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک رات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہر کی دیکھ بھال کے لئے نکلے تو ایک مکان سے کسی مسلمان کی قرآن خوانی کی آواز کان میں پڑی وہ سورۃ والطور پڑھ رہے تھے، آپ نے سواری روک لی اور کھڑے ہو کر قرآن سننے لگے جب وہ اس آیت پر پہنچے تو زبان سے نکل گیا کہ رب کعبہ کی قسم سچی ہے پھر اپنے گدھے سے اتر پڑے اور دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے، چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی، دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد جب ہوش و حواس ٹھکانے آئے وہ اپنے گھر پہنچے لیکن اللہ کے کلام کی اس ڈراؤنی آیت کے اثر سے دل کی کمزوری کی یہ حالت تھی کہ مہینہ بھر تک بیمار پڑے رہے اور ایسے کہ لوگ بیمار پرسی کو آتے تھے گو کسی کو معلوم نہ تھا کہ بیماری کیا ہے ؟(تفسیر ابن کثیر)ایک روایت میں ہے آپ کی تلاوت میں ایک مرتبہ یہ آیت آئی اسی وقت ہچکی بندھ گئی اور اس قدر قلب پر اثر پڑا کہ بیمار ہو گئے چنانچہ بیس دن تک عیادت کی جاتی رہی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قیامت کی ہولناکی اور دوزخ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ {۹} وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا {۱۰} فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ {۱۱} الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ {۱۲} يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا {۱۳} هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ {۱۴} اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ {۱۵} اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۱۶} الطور

جواب ترجمہ: جس دن آسمان تھر تھرا کر لرز اٹھے گا۔ اور پہاڑ ہول ناک طریقے سے چل پڑیں گے۔ تو اس دن بڑی خرابی ہو گی ان کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں۔ جو بے ہودہ باتوں میں ڈوبے ہوئے کھیل

رہے ہیں۔ اس دن جب انہیں دھکے دے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔ (کہ) یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ بھلا کیا یہ جادو ہے یا تمہیں (اب بھی) کچھ نظر نہیں آرہا؟ داخل ہو جاؤ اس میں، پھر تم صبر کرو، یا نہ کرو، تمہارے لیے برابر ہے۔ تمہیں انہی کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا: قیامت کے دن آسمان شدید اضطراب اور حرکت میں آ جائے گی۔ "مور" کے معنی ہیں تیز حرکت، اضطراب اور تردد۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان اس دن اس طرح ہلے گا جیسے چکی گھومتی ہے یا جیسے کشتی سمندر میں ہچکولے کھاتی ہے۔

وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا: اس دن پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑیں گے، زمین سے جدا ہو کر ہوا میں منتشر ہو جائیں گے اور ہباء منثور (غبار) بن جائیں گے۔ (البحر المدید)

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ: اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت اور تباہی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو قیامت اور اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ (محاسن التاویل)

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ: وہ لوگ جو شک و شبہ اور باطل میں پڑے رہتے ہیں اور دین کے معاملات میں کھیل تماشہ کرتے ہیں، سنجیدگی اختیار نہیں کرتے بلکہ مذاق اور استہزاء کرتے ہیں۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا: اس دن انہیں جہنم کی طرف سختی اور زبردستی کے ساتھ دھکیلا جائے گا۔ (محاسن التاویل)

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ: (ان سے کہا جائے گا) یہ وہی آگ ہے جسے تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔ (محاسن التاویل)

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ: یعنی کیا یہ (عذاب) جادو ہے یا تمہیں نظر نہیں آرہا؟ یہ کفار کے طعن کا جواب ہے کہ اب حقیقت سامنے آگئی ہے، اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ (محاسن)

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اب اس آگ میں داخل ہو جاؤ، چاہے صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے برابر ہے، تمہیں وہی بدلہ ملے گا جو تم

عمل کرتے تھے، یعنی اب پچھتاوے اور صبر کا کوئی فائدہ نہیں، یہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔

المختصر: ان آیات میں قیامت کے دن کی ہولناکی، آسمان وزمین کی تبدیلی، کفار کی حالت، ان کے جہنم میں زبردستی داخل کیے جانے اور ان کے انجام کا ذکر ہے، یہ آیات انسان کو اللہ کی قدرت، قیامت کی حقیقت اور اعمال کے انجام کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

اہل تقویٰ کے لیے جنت اور نعمت ہائے جنت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ {۱۷} فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ {۱۸} كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ {۱۹} مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ {۲۰} الطور

جواب ترجمہ: متقی لوگ بیشک باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ ان کے پروردگار نے انہیں جس طرح نوازا اور ان کے پروردگار ہی نے انہیں دوزخ کے عذاب سے جس طرح بچایا، اس کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) خوب مزے سے کھاؤ پیو، ان اعمال کے صلے میں جو تم کیا کرتے تھے۔ وہ ایک قطار میں لگی ہوئی اونچی نشستوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ان کا بیاہ کر دیں گے۔

ان آیات میں متقیوں کے لیے جنت کی نعمتیں، خوشی، عذابِ جہنم سے نجات، خوشگوار کھانا پینا، آرام دہ تخت اور پاکیزہ بیویاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے نیک اعمال کے صلے میں عطا ہو گا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ: بے شک متقی لوگ (اللہ سے ڈرنے والے) جنتوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں "جنات" سے مراد وہ باغات ہیں جن میں ہر قسم کی نعمتیں اور راحتیں ہوں گی، اور "نعیم" سے مراد ہر وہ خوشی اور آسائش ہے جو انسان کو مطلوب ہو، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ متقیوں کے لیے جنت میں ہر قسم کی نعمتیں اور راحتیں جمع کر دی گئی ہیں، جو کفار کے عذاب کے بالکل برعکس ہے۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: وہ اس نعمت سے خوش ہوں گے جو ان کے رب نے انہیں دی، اور ان کے رب نے انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لیا۔ علامہ رازی رحمہ اللہ کے مطابق "فاکھین" کے معنی ہیں خوش و خرم، لذت اٹھانے والے، یعنی جنتی لوگ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے خوش ہوں گے اور اس بات پر بھی خوش ہوں گے کہ اللہ نے انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھا، یہ دوہری نعمت ہے: نعمتِ جنت اور عذابِ جہنم سے نجات۔ (ابن کثیر)

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: (ان سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو خوشگوار طریقے سے، یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جنت میں کھانا پینا دنیا کی طرح نہیں ہو گا، وہاں نہ کوئی بیماری، نہ تھکن، نہ کوئی تکلیف ہو گی۔ هَنِيْٓـًٔا کے معنی ہیں ایسا کھانا پینا جس میں کوئی نقصان یا تکلیف نہ ہو اور یہ سب کچھ ان کے نیک اعمال کی وجہ سے ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ: وہ قطار میں لگے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم نے انہیں بڑی آنکھوں والی حوروں سے جوڑ دیا۔ علامہ رازی رحمہ اللہ کے مطابق سُرُرٌ مَّصْفُوْفَةٌ سے مراد جنت کے تخت ہیں جو ترتیب سے لگے ہوں گے، جن پر جنتی آرام سے بیٹھیں گے۔ حُوْرٌ عِيْنٌ سے مراد جنت کی پاکیزہ بیویاں ہیں، جن کی آنکھیں بڑی اور خوبصورت ہوں گی۔ یہ جنت کی مزید نعمتوں اور راحتوں کی طرف اشارہ ہے۔

نیک اولاد قیمتی اثاثہ

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ {۲۱} الطور.

جواب ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ہے تو ان کی اولاد کو ہم انہی کے ساتھ شامل کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے۔ ہر انسان کی جان اپنی کمائی کے بدلے رہن رکھی ہوئی ہے۔

امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے فضل و کرم اور لطف و رحم اپنے احسان اور انعام کا بیان فرماتا ہے کہ جن مومنوں کی اولاد بھی ایمان میں اپنے باپ دادا کی راہ میں لگ جائے لیکن اعمال صالحہ میں اپنے بڑوں سے کم ہو پروردگار ان کے نیک اعمال کا بدلہ بڑھا چڑھا کر انہیں ان کے بڑوں کے درجے میں پہنچا دے گا تاکہ بڑوں کی آنکھیں چھوٹوں کو اپنے پاس دیکھ کر ٹھنڈی رہیں اور چھوٹے بھی اپنے بڑوں کے پاس ہشاش بشاش رہیں ان کے عملوں کی بڑھوتری ان کے بزرگوں کے اعمال کی کمی سے نہ کی جائے گی بلکہ محسن و مہربان اللہ انہیں اپنے بھرپور خزانوں میں سے عطا فرمائے گا۔

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ إِنَّ اللهَ لَيَرْفَعُ ذُرِّيَّةَ الْمُؤْمِنِ فِي دَرَجَتِهِ، وَإِنْ كَانُوا دُونَهُ فِي الْعَمَلِ، لِتَقَرَّ بِهِمْ عَيْنُهُ (تفسیر ابن کثیر) اللہ تعالیٰ مومن بندے کی اولاد کا درجہ اس کے درجے میں بلند کر دے گا، اگرچہ عملی لحاظ سے اولاد کا مقام و مرتبہ والدین کے درجہ سے کم ہو تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ الْجَنَّةَ سَأَلَ عَنْ أَبَوَيْهِ وَزَوْجَتِهِ وَوَلَدِهِ، فَيُقَالُ: إِنَّهُمْ لَمْ يَبْلُغُوا دَرَجَتَكَ. فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، قَدْ عَمِلْتُ لِي وَلَهُمْ. فَيُؤْمَرُ بِإِلْحَاقِهِمْ بِهِ، جب جنتی شخص جنت میں جائے گا اور اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کو نہ پائے گا تو دریافت کرے گا کہ وہ کہاں ہیں؟ جواب ملے گا کہ وہ تمہارے مرتبہ تک نہیں پہنچے، یہ کہے گا باری تعالیٰ میں نے تو اپنے لئے اور ان کے لئے نیک اعمال کئے تھے چنانچہ حکم دیا جائے گا اور انہیں بھی ان کے درجے میں پہنچا دیا جائے گا۔ (معجم طبرانی کبیر، ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کا مطلب یوں بیان فرماتے ہیں کہ وَالَّذِينَ أَدْرَكَ ذُرِّيَّتَهُمُ الْإِيمَانُ فَعَمِلُوا بِطَاعَتِي، أَلْحَقْتُهُمْ بِإِيمَانِهِمْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَأَوْلَادُهُمُ الصِّغَارُ تَلْحَقُ بِهِمْ، ایمان نے جن لوگوں کی اولاد کا ادراک کر لیا، پھر انہوں نے میری اطاعت کرتے ہوئے عمل کیا، میں ان کے ایمان کے سبب انہیں جنت میں داخل کر دوں گا، اور ان کی چھوٹی اولاد (جو بچپن میں فوت

ہو گئی) کو ان کے ساتھ ملا دوں گا۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت خدیجہ نے نبی ﷺ سے اپنے دو بچوں کی نسبت دریافت کیا جو زمانہ جاہلیت میں مرے تھے تو آپ نے فرمایا هُمَا فِي النَّارِ وہ دونوں جہنم میں ہیں۔ پھر جب آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ کو غمگین دیکھا تو فرمایا لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَأَبْغَضْتِهِمَا اگر تم ان کی جگہ دیکھ لیتیں تو تمہارے دل میں ان کا بغض پیدا ہو جاتا، حضرت خدیجہ نے پوچھا یا رسول اللہ! فَوَلَدِي مِنْكَ میرا بچہ جو آپ سے ہوا وہ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنت میں ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمُشْرِكِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ مومن اپنی اولاد سمیت جنت میں ہیں، اور مشرکین اپنی اولاد سمیت دوزخ میں ہوں گے۔ پھر حضرت نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ تو والدین کے اعمال کی برکت سے اولاد پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ذکر تھا، اب اولاد کی دعاؤں کی وجہ سے والدین پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إِنَّ اللهَ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، أَنَّى لِي هٰذِهِ؟ فَيَقُولُ: بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ (مسند احمد) اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کا درجہ جنت میں بڑھائے گا تو وہ پوچھے گا کہ اے میرے رب! میرا یہ درجہ کیسے بڑھ گیا؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ تیری اولاد نے تیرے لئے استغفار کیا اس بنا پر میں نے تیرا درجہ بڑھا دیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ (مسلم) ابن آدم کے مرتے ہی اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں لیکن تین عمل ایسے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچاتے رہتے ہیں۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علم دین جس سے نفع پہنچتا ہے، تیسرا نیک اولاد جو والدین کے مرنے کے بعد دعائے خیر کرتی رہے۔

چونکہ یہاں بیان ہوا تھا کہ مومنوں کی اولاد کے درجے بے عمل بڑھا دیئے گئے تھے تو ساتھ ہی

ساتھ اپنے اس فضل کے بعد اپنے عدل کا بیان فرماتا ہے کہ کسی کو کسی کے اعمال میں پکڑا نہ جائے گا بلکہ ہر شخص اپنے اپنے عمل میں رہن ہو گا باپ کا بوجھ بیٹے پر اور بیٹے کا باپ پر نہ ہو گا جیسے دوسری جگہ ہے كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ (الْمُدَّثِّرِ: ۳۸ -۴۱) ہر شخص اپنے کئے ہوئے کاموں میں گرفتار ہے، مگر وہ جن کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پہنچے وہ جنتوں میں بیٹھے ہوئے گنہگاروں سے دریافت کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ یعنی نیک لوگوں کی اولاد اگر مومن ہو تو اگرچہ وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے جنت میں اس اونچے درجے کی مستحق نہ ہو جو اس کے والد کو ملا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ والد کو خوش کرنے کے لئے اولاد کو بھی وہی درجہ دے دیں گے اور والد کے درجے میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔

رہن اس سامان کو کہتے ہیں جو کسی ادھار دینے والے نے اپنے ادھار کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر مقروض سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا ہو، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، وہ انسان کے پاس ادھار ہیں، یہ ادھار اسی صورت میں اتر سکتا ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان صلاحیتوں کو استعمال کرے جس کا مظاہرہ دنیا میں ایمان لانے اور نیک عمل کرنے سے ہوتا ہے، اس ادھار کے لئے ہر انسان کی جان اس طرح رہن رکھی ہوئی ہے، اگر وہ ایمان اور نیک عمل کے ذریعے اپنا ادھار اتار دے گا تو آخرت میں اس کی جان کو آزادی حاصل ہو گی، اور وہ جنت میں اطمینان سے خوش حالی کے ساتھ رہے گا، اور اگر اس نے یہ قرض نہ اتارا تو پھر اس کو دوزخ میں قید رہنا ہو گا۔

اس فقرے کو یہاں لانے کا مطلب یہ ہے کہ جن ایمان والوں کے متعلق اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انہیں ثواب ملے گا اور ان کی مومن اولاد بھی ان کے ساتھ ہو گی، انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کر کے اپنا اُدھار اتار دیا، اور اپنی جان کو آزاد کر الیا ہے۔

لیکن اگر کسی کی اولاد مومن ہی نہ ہو تو اسے اپنے ماں باپ کا ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے گا، کیونکہ اس نے وہ مطالبہ پورا نہیں کیا جس کے لئے اس کی جان رہن رکھی ہوئی تھی، اس لئے اسے

دوزخ میں جا کر قید رہنا ہو گا۔

نیز اس فقرے کا یہاں ایک اور مطلب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ باپ کی نیکی کی وجہ سے اس کی مومن اولاد کا درجہ بڑھا دیا جائے گا، لیکن اولاد کی بد عملی کی کوئی سزا باپ کو نہیں ملے گی، کیونکہ ہر شخص کی جان خود اپنی کمائی کے لئے رہن ہے دوسرے کی کمائی کے لئے نہیں۔ (توضیح القرآن)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ والا بن کر دنیا سے چلا جائے اور اس کی اولاد صرف فرض، واجب، سنت مؤکدہ ادا کرے، زیادہ تہجد اور نوافل اپنی نالائقی، غفلت اور سستی سے نہ کر سکے لیکن پھر بھی وہ ان ہی کے ساتھ لاحق کر دی جائے گی، یہ اس اللہ والے کا دل خوش کرنے کے لیے ہو گا۔ (خزائن القرآن ۳۳۶، مطبوعہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کراچی)

حکیم الامت نے بیان القرآن میں، اور علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں یہ تفسیر کی ہے کہ یہ ذریت کیا ہے؟ یہ ان کی اولاد ہے، کون سی اولاد؟ جو بڑی ہو چکی اور چھوٹی اولاد کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنے اللہ والے آباء سے ملا دی جائے گی اور ان کے عمل میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی، یہ نہیں کہ ان کا عمل تہجد و نوافل وغیرہ کاٹ کر ان سستوں اور کاہلوں کو دے دیا جائے، نہیں، کچھ کمی نہیں کی جائے گی، محض ان کے اعزاز و اکرام کے لیے ان کی اولاد کو ان کے ساتھ لاحق کر دیں گے، تاکہ ان کو تسلی ہو اور ان کا دل خوش ہو جائے۔ (بیان القرآن بحوالہ خزائن القرآن)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں جو احادیث ہیں، ان میں ایک حدیث میں ذریات کے بعد اولاد کو عطف کیا گیا ہے تو معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ضروری ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے علاوہ بھی کوئی ذریات ہے یعنی ذریت سے مراد مطلق توابع ہیں، لہذا اس میں ان شاء اللہ شاگرد، مریدین اور احباب بھی شامل ہو جائیں گے، تلامذہ اور مریدین یہ دونوں محبت اور اطاعت کا تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے بھی داخلہ کی گنجائش ہے۔ (بیان القرآں)

جنتی پھل اور کھانے

سوال اس آیت شریفہ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ{۲۲}الطور

جواب ترجمہ: اور ہم انہیں ایک کے بعد ایک پھل اور گوشت، جو بھی ان کا دل چاہے گا، دیے چلے جائیں گے۔

اس آیت میں اَمْدَدْنٰهُمْ مذکور ہے، اس کا مادہ " مد" ہے "مد" کا معنی ہے، کھینچنا "امداد" کا استعمال اکثر پسندیدہ چیزوں میں ہوتا ہے اور " مد" کا استعمال ناپسندیدہ چیزوں میں ہوتا ہے۔(تفسیر روح البیان علامہ اسماعیل حقی)

علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " امداد" کا معنیٰ ہے، موت کو مؤخر کرنا، کسی دوسری جماعت سے تمہاری مدد کرنا، عطا کرنا۔(القاموس المحیط)

اس کے بعد اس آیت میں فَاكِهَة کا لفظ ہے، اس کا معنیٰ ہے، ہر قسم کے پھل اور میوے لَحْم اس کا معنی ہے، گوشت۔یعنی خواہ وہ صراحتاً طلب نہ کریں، مگر جن کھانے پینے کی چیزوں کی ان کو خواہش ہو گی وہ ہم ان کو عطا کرتے رہیں گے اور ہم ان کو وقتاً فوقتاً ہر قسم کی نعمتیں عطا کرتے رہیں گے

اس سے پہلے فرمایا تھا کہ ہم ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کریں گے، اس سے یہ وہم ہو سکتا تھا کہ شاید ان کو بہ قدر استحقاق اجر ملتا رہے گا اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا: ہم ان کو بہت زیادہ اجر دیتے رہیں گے جو ان کے اعمال سے کہیں زیادہ ہو گا ان کو بہ کثرت پھل عطا کریں گے، وہ ایک پھل کھا چکیں گے تو اس کی جگہ دوسرا پھل لگ جائے گا اور ہر پھل کا ذائقہ الگ الگ ہو گا۔

علامہ اسماعیل حقی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے اِنَّكَ لَتَشْتَهِي الطَّيْرَ فِي الْجَنَّةِ فَيَخِرُّ بَيْنَ يَدَيْكَ مَشْوِيًّا، جب تم جنت میں کسی پرندے کو کھانے کی خواہش کرو گے تو وہ بُھنا ہوا پرندہ تمہارے سامنے آن گرے گا۔ایک قول یہ ہے کہ يَقَعُ الطَّائِرُ بَيْنَ يَدَيِ الرَّجُلِ فِي الْجَنَّةِ فَيَأْكُلُ مِنْهُ قَدِيدًا وَّمَشْوِيًّا ثُمَّ يَطِيرُ إِلَى النَّهْرِ (روح البیان) وہ پرندہ اس کے سامنے گر جائے گا وہ اس کا بھنا ہوا گوشت کھائے گا، پھر وہ پرندہ اڑتا ہوا دریا میں چلا جائے گا۔

شراب طہور کے چھلکتے جام شیریں اور غلمان

سوال کیا اہل جنت شراب سے لطف اندوز ہوں گے؟ اس آیت کی روشنی میں بتایئے۔

يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ {۲۳} وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ {۲۴} الطور

جواب ترجمہ: وہاں وہ ایسے جام شراب پر (دوستانہ) چھینا جھپٹی کر رہے ہوں گے جس میں نہ کوئی بے ہودگی ہوگی، اور نہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور ان کے ارد گرد نوجوان پھر رہے ہوں گے جو انہی (کی خدمت) کے لیے مخصوص ہوں گے، ایسے (خوبصورت) جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔

خلاصہ تفسیر: جی ہاں، اہل جنت جنت میں شراب طہور سے لطف اندوز ہوں گے، لیکن اس جہاں کی شراب کا دنیا کی شراب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا، وہ شراب اس دنیا کی شراب سے بہت مختلف ہوگی، اس شراب کو پینے سے عقل انسانی میں خلل نہیں پڑے گا، اس شراب کے پینے سے کوئی بے ہودہ گوئی زبان سے نہیں ہوگی، اس شراب کو پینے سے جنتی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالے گا جس میں کوئی گناہ ہو یا کوئی معصیت و نافرمانی کی بات ہو۔

شراب طہور کے چھلکتے ہوئے جام ایک دوسرے کو پلا رہے ہیں جس کے پینے سے سرور اور کیف لطف حاصل ہوتا ہے لیکن بد زبانی بے ہودہ گوئی نہیں ہوتی ہذیان نہیں بکتے بیہوش نہیں ہوتے سچا سرور اور پوری خوشی حاصل بک جھک سے دور گناہ سے غافل باطل و کذب سے دور غیبت و گناہ سے نفور۔ دنیا میں شرابیوں کی حالت دیکھی ہوگی کہ ان کے سر میں چکر پیٹ میں درد عقل زائل بکواس بہت بو بری چہرے بے رونق اسی طرح شراب کے بد ذائقہ اور بدبو یہاں جنت کی شراب ان تمام گندگیوں سے کوسوں دور ہے، یہ رنگ میں سفید، پینے میں خوش ذائقہ، نہ اس کے پینے سے حواس معطل ہوں نہ بک جھک ہو نہ بہکیں نہ بھٹکیں نہ مستی ہو نہ اور کسی طرح ضرر پہنچائے، ہنسی خوشی اس پاک شراب کے جام پلا رہے ہوں گے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ: ان کے غلام کمسن نو عمر بچے جو حسن و خوبی

میں ایسے ہیں جیسے مروارید ہوں اور وہ بھی ڈبے میں بند رکھے گئے ہوں کسی کا ہاتھ بھی نہ لگا ہو اور ابھی ابھی تازے تازے نکالے ہوں ان کی آبداری صفائی چمک دمک روپ رنگ کا کیا پوچھنا؟ لیکن ان غلمان کے حسین چہرے انہیں بھی ماند کر دیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (الواقعة :۱۷) یعنی ہمیشہ نو عمر اور کمسن رہنے والے بچے ان پر چکر لگائیں گے۔

آبخورے آفتابے اور ایسی شراب صاف کے جام کہ جن کے پینے سے نہ سر میں درد ہو نہ بہکیں اور جس قسم کا میوہ یہ پسند کریں اور جس پرند کا گوشت یہ چاہیں ان کے پاس بار بار لانے کے لئے چاروں طرف کمربستہ چل رہے ہیں اس دور شراب کے وقت آپس میں گھل مل کر طرح طرح کی باتیں کریں گے دنیا کے احوال یاد آئیں گے کہیں گے کہ ہم دنیا میں جب اپنے والوں میں تھے تو اپنے رب کے آج کے دن کے عذاب سے سخت لرزاں و ترساں تھے الحمد للہ رب نے ہم پر خاص احسان کیا اور ہمارے خوف کی چیز سے ہمیں امن دیا ہم اسی سے دعائیں اور التجائیں کرتے رہے اس نے ہماری دعائیں قبول فرمائیں اور ہمارا قول پورا کر دیا یقیناً وہ بہت ہی نیک سلوک اور رحم والا ہے۔

اہل جنت کو بیش بہا نعمتیں ملنے کی وجہ

سوال اہل جنت کو اس قدر بیش بہا نعمتوں سے مالا مال کیا جائے گا اس کی وجہ اور سبب کیا ہو گا؟

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ{۲۵}قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ {۲۶}فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ {۲۷}اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ {۲۸}الطور.

جواب ترجمہ: اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ کہیں گے کہ ہم پہلے جب اپنے گھر والوں (یعنی دنیا) میں تھے تو ڈرے سہمے رہتے تھے۔ آخر اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا، اور ہمیں جھلسانے والی ہوا کے عذاب سے بچا لیا۔ ہم اس سے پہلے اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے جو بڑا محسن، بہت مہربان ہے۔

اہل جنت دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرتے تھے، قیامت کے دن اس کے عذاب وعقاب سے خوف زدہ رہا کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور توفیق کے ساتھ ان پر احسان کیا، انہیں دوزخ کے گرم تھپیڑوں کے عذاب سے بچایا، اس کی حرارت اور گرمی سے انہیں محفوظ رکھا، وہ اس وقت کے آنے سے پہلے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، اسی اکیلے رب کی عبادت وپرستش کرتے تھے، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، جو انہیں دوزخ کے ہولناک تھپیڑوں سے بچا کر جنت کی بیش بہا نعمتوں کی طرف اسے پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں سنتا اور قبول کرتا تھا، ان کے سوالوں پر انہیں نوازتا تھا، وہ ذات بر اور رحیم ہے، اس کا فضل واحسان اس کی طرف سے ان کے لیے یہ ہے انہیں اس کی رضا مل جائے اور جنت مل جائے، اور اس کی ناراضگی اور دوزخ کی آگ سے بچ جائیں۔

مبلغین کو اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے

سوال اس آیت کریمہ کا کیا مطلب ہے؟

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ{۲۹}اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ {۳۰}قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ{۳۱}الطور.

جواب ترجمہ: لہٰذا (اے پیغمبر) آپ نصیحت کرتے رہیں، کیونکہ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہیں، نہ مجنون۔ بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ: یہ صاحب شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں؟ کہہ دیجیے کہ: کر لو انتظار، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قریش جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بارے میں دار الندوہ میں مشورہ کے لیے جمع ہوئے تو ان میں سے کسی نے کہا کہ ان کو نعوذ باللہ مضبوط زنجیروں میں باندھ دو پھر ان کی موت کا انتظار کرو تاکہ یہ بھی اسی طرح ہلاک ہو جائیں جیسا کہ پہلے شعراء میں سے زہیر اور نابغہ ہلاک ہو گئے کیونکہ یہ بھی ان ہی کی طرح ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی۔ (ابن جریر)

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما

رہے ہیں کہ آپ قرآن کریم کی روشنی میں وعظ ونصیحت کا سلسلہ خیر جاری وساری رکھیے، آپ اپنے رب کی نعمت ورحمت کے باعث کاہن اور مجنون نہیں ہیں۔ شیخ ابو سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ قرآنی نصائح کے مطابق نصیحت کا کام جاری رکھیے، آپ الحمدللہ کاہن ومجنون نہیں ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کو اس بات کی نصیحت کیجیے جو اللہ نے اہل ایمان متقی لوگوں کے لیے تیار کی ہے اور جو گمراہوں اور کافروں کے لیے تیار کی ہے، آپ اللہ کی نعمت کے سبب کاہن ومجنون نہیں ہیں، آپ کاہنوں جیسی باتیں نہیں کرتے بلکہ آپ تو وہ بولتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے قلب اطہر پر وحی کی جاتی ہے۔ کاہن: اس انسان کو کہا جاتا ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ غیبی چیزوں کی خبریں دیتا ہے۔ مجنون: وہ انسان ہے جس کی عقل سلب ہوگئی ہو۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ: کفار، معاندین اپنی چوپال (دارالندوہ) میں بیٹھ کر تخیلات کے گھوڑے دوڑاتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ یہ شخص جس طرح کی سخنوری کرتا ہے یہ شاعر لگتا ہے جو اپنے پاس سے باتیں بنا کر ہمیں سناتا ہے، یہ باتیں کہنے والوں میں ولیدہ بن مغیرہ، ابو جہل اور ان کے رفقاء سر فہرست تھے۔

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفار جب یہ سوچتے کہ ہم کیسے بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ چنانچہ پھر پہلو بدلتے ہیں اور کہتے ہیں یہ شاعر ہے۔ حالانکہ ان سے بڑھ کر اس حقیقت سے اور کون واقف ہے کہ جو کلام بلاغت نظام یہ پیش کرتے ہیں اس کا شاعری کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال وہ اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے یہ کہا کرتے یہ شاعر ہے، بہت جلد اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا اور اس کے بعد دنیا اسے اور اس کے اقوال کو فراموش کر دے گی جس طرح دوسرے نامی گرامی شعراء کا حال ہوا ہے اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلکان مت کرو، بس انتظار کی چند گھڑیاں ہیں، انہیں گزار لو، معاملہ خود ہی رفع دفع ہو جائے گا۔

اس آیت میں رَیۡبَ الۡمَنُوۡن کا لفظ غور طلب ہے۔ مَنُوۡن زمانہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے شب و

روز زندگی کو کاٹتے رہتے ہیں، ریب مصدر ہے یہ کسی کو بے چین کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد حوادثات ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ریب المنون کا معنیٰ موت ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ریب المنون کا معنیٰ حوادث زمانہ ہیں، علامہ قتیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ریب المنون کا معنیٰ حوادث زمانہ، زمانے کی تکالیف اور مصائب ہے، وہ یہ کہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد جوانی میں فوت ہوگئے تھے، یہ بدبخت لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے، انہیں یہاں دھمکایا گیا کہ تم انتظار کرتے رہو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے رہیں گے، تفسیر بحر العلوم میں لکھا ہوا ہے کہ یہ ہرزہ سرائی کرنے والے بکواسی لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے موت کے منہ میں پہنچ گئے تھے، علامہ سمرقندی رحمہ اللہ نے یہاں كُلُّهُمْ (سارے کے سارے) کا لفظ استعمال فرمایا۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مخالفین، معاندین اور کفار سے علی سبیل التہدید فرمادیجیے کہ تم لوگ میری زندگی کے خاتمے کا انتظار کرتے ہو تاکہ تمہیں راحت وسکون مل جائے تو تم لوگ انتظار کرتے رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں، تمہارا انجام کیا ہوگا۔ متربصین تربص سے ہے، تربص کا معنیٰ انتظار کرنا۔

کافر کا ذہن ہوتا ہے مگر عقل نہیں

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ أَحْلَامُهُم کا کیا معنیٰ ہے؟

أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ{۳۲} الطور.

جواب ترجمہ: کیا ان کی عقلیں ان کو یہی کچھ کرنے کو کہتی ہیں، یا وہ ہیں ہی سرکش لوگ؟

خلاصہ تفسیر: مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ احلام سے مراد ان کے عقول ہیں۔ ھذا سے مراد آپ کی ذات پر جھوٹ بولنا ہے۔ ام ھم قوم طاغون، یا بغیر عقل کے وہ سرکشی کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ام بل کے معنیٰ میں ہے۔ بلکہ انہوں نے سرکشی کرتے ہوئے کفر کیا اگرچہ ان کے لئے حق ظاہر ہوا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا گیا، کیا وجہ ہے کہ آپ کی قوم ایمان نہیں لائی؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت دانشمند ہونے سے بیان کی ہے؟ فرمایا: وہ ایسی عقلیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق نصیب نہیں فرمائی۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے، اَحْلَامُهُمْ سے مراد ان کے اذہان ہیں کیونکہ عقل کافر کو نہیں دی جاتی اگر اس کے پاس عقل ہوتی تو وہ ایمان لے آتا، کافر کو ذہن دیا جاتا ہے تو پس یہ ذہن اس پر حجت ہوتا ہے، ذہن عموماً علم کو قبول کرتا ہے، عقل علم میں تمیز پیدا کرتی ہے اور امر و نہی کی حدود کی مقادیر کا اندازہ لگاتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! فلاں نصرانی کتنا دانشمند ہے؟ فرمایا، مَهْ إِنَّ الْكَافِرَ لَا عَقْلَ لَهُ ایسا کہنے سے رک جا، کافر کے پاس عقل نہیں ہوتی، کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (الملک) اور انہوں نے کہا کہ اگر ہم سنتے، سمجھتے ہوتے تو دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جو حکیم ترمذی نے نقل فرمائی ہے اس میں تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہنے والے کو ڈانٹتے ہوئے یوں فرمایا کہ مَهْ فَإِنَّ الْعَاقِلَ مَنْ يَعْمَلُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ، ایسا کہنے سے رک جا کیونکہ عقل مند وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ اہل تفسیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا انتظار کر رہے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔ (روح البیان)

کفار اور مشرکین کا آپریشن

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ{۳۰}قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ {۳۱}اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ {۳۲}اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ {۳۳}فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ {۳۴}اَمْ خُلِقُوْا

مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ {۳۵}اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ {۳۶}اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ {۳۷}اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ {۳۸} اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ {۳۹} اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ{۴۰}اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ {۴۱}اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ {۴۲}اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ {۴۳}وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ {۴۴}الطور

جواب ترجمہ: بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ: یہ صاحب شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں؟ کہہ دیجیے کہ: کر لو انتظار، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں ان کو یہی کچھ کرنے کو کہتی ہیں، یا وہ ہیں ہی سرکش لوگ؟ ہاں کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ: ان صاحب نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ (ضد میں) ایمان نہیں لا رہے۔ اگر یہ واقعی سچے ہیں تو اس جیسا کوئی کلام (گھڑ کر) لے آئیں۔ کیا یہ لوگ بغیر کسی کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے، یا یہ خود (اپنے) خالق ہیں؟ یا کیا آسمان اور زمین انہوں نے پیدا کیے ہیں؟ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا تمہارے پروردگار کے خزانے ان کے پاس ہیں، یا وہ داروغہ بنے ہوئے ہیں؟ یا ان کے کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ (عالم بالا کی باتیں) سن لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان میں سے جو سنتا ہو وہ کوئی واضح ثبوت تو لائے۔ کیا اللہ کے حصے میں تو بیٹیاں ہیں اور بیٹے تمہارے حصے میں آئے ہیں؟ اور کیا تم ان سے کوئی اجرت مانگ رہے ہو جس کی وجہ سے یہ تاوان کے بوجھ میں دبے جا رہے ہیں؟ یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ لیتے ہوں؟ کیا یہ کوئی مکر کرنا چاہتے ہیں؟ تو درحقیقت جو کافر ہیں، مکر تو انہی پر پڑے گا۔ کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی اور خدا ہے؟ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتے ہوئے بھی دیکھ لیں تو یہ کہیں گے کہ یہ کوئی گہرا بادل ہے۔

کفار کے اس آپریشن سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ کو تسلی اور اطمینان دلایا

اوراپنا مشن جاری رکھنے کا حکم دیا کہ اے رسول! ان لوگوں کو نصیحت کیجیے جن کی طرف آپ ﷺ کو قرآن کریم دے کر بھیجا گیا ہے، آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اللہ کا فضل و کرم ہے، اللہ نے آپ کو نبوت عطاء فرمائی ہے، آپ ﷺ کوئی کاہن، نجومی نہیں ہیں جو لوگوں کو بغیر علم غیب کی خبریں دیں، نہ ہی آپ ﷺ مجنون ہیں جنہیں اپنی کہی ہوئی بات کا پتہ ہی نہ چلے جیسے یہ مخالفین، منکرین، معاندین اور کفار دعویٰ کرتے ہیں، یہ الزام تراشی کرتے ہیں کہ آپ کاہن اور شاعر ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں دندان شکن اور مسکت جواب دیا کہ کیا ان کی عقلیں ہیں جو انہیں آپ ﷺ کے بارے میں متضاد اور متناقض باتوں کا حکم دیتی ہیں، کیونکہ کہانت، شعر وشاعری اور جنون کا آن واحد میں ایک جگہ پر جمع ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

کیا یہ مشرکین یوں کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے قرآن کریم اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، یا یہ مشرکین پیدا کرنے والے کے علاوہ کسی نے پیدا کیے ہیں، جو ان کا خالق اور موجد ہے، یا انہوں نے اپنی جانوں کو خود ہی پیدا کر لیا ہے؟ یا ان لوگوں نے زمین وآسمان کو اس صنعت بدیع پر پیدا کیا ہے؟ یا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں جن میں یہ تصرف کرتے ہیں؟ یا یہ لوگ جبار اور متسلط ہیں جو اللہ کی مخلوق پر قہر وغلبہ کے ذریعے مسلط ہیں؟ یا ان کے لیے آسمان کی طرف چڑھنے کا کوئی ذریعہ یا وسیلہ ہے جہاں چڑھ کر یہ وحی سن لیتے ہیں، جس میں یہ ہو کہ یہ لوگ حق پر ہیں؟

کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے ہیں، جیسے تم اللہ پر افترا اور جھوٹ باندھتے ہوئے دعویٰ کرتے ہو اور زبانوں سے کہتے پھرتے ہو؟ یا آپ ان مشرکین سے رسالت کی تبلیغ پر اجرت مانگتے ہیں، جس کے باعث یہ لوگ اس کی ادائیگی کو مشقت خیال کرتے اور تاوان سمجھتے ہیں؟

یا ان کے پاس غیب کا علم ہے، جسے وہ لوگوں کے لیے لکھتے اور انہیں اس کی خبر دیتے ہیں؟ یا وہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کے ساتھ کوئی دھوکہ فریب کرنا چاہتے ہیں، یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مکر وفریب کرنے والوں کا مکروہ وفریب انہی کے خلاف پڑتا ہے۔ یا ان کے پاس اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو مستحق عبادت ہے؟ اللہ تعالیٰ تو مشرکوں کے شریکوں سے منزہ اور بلند ہے۔

یہ مشرکین، یہ معاندین، یہ کفار اس قدر ہٹ دھرم، ضدی اور نافرمان ہیں کہ اپنے منہ مانگے عذاب کو اگر دیکھ لیں، آسمان کی طرف سے اپنے اوپر برستے کسی عذابی ٹکڑے کو دیکھ لیں تو اپنے افکار وخیالات سے ہٹنے، اپنے جرائم سے باز آنے، اپنے مشرکانہ خیالات کو تج دینے، اپنی ہفوات اور ہرزہ سرائیوں کو چھوڑ دینے کی بجائے یہ کہیں گے کہ یہ تو ہم پر تہہ بہ تہہ بادل برس رہے ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ مشرکوں اور کافروں کے عناد کا بیان ہو رہا ہے کہ یہ اپنی سرکشی ضد اور ہٹ دھرمی میں اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اللہ کے عذاب کو محسوس کر لینے کے بعد بھی انہیں ایمان کی توفیق نہ ہو گی یہ اگر دیکھ لیں گے کہ آسمان کا کوئی ٹکڑا اللہ کا عذاب بن کر ان کے سروں پر گر رہا ہے تو بھی انہیں تصدیق ویقین نہ ہو گا بلکہ صاف کہہ دیں گے کہ غلیظ ابر ہے جو پانی برسانے کو آرہا ہے۔

جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ (الحجر: ۱۴) اگر ہم ان کے لئے آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور یہ وہاں چڑھ جائیں تب بھی یہ تو یہی کہیں گے کہ ہماری آنکھیں باندھ دی گئی ہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے یعنی معجزات جو یہ طلب کر رہے ہیں اگر ان کی چاہت کے مطابق ہی دکھا دیئے جائیں بلکہ خود انہیں آسمانوں پر چڑھا دیا جائے جب بھی یہ کوئی بات بنا کر ٹال دیں گے اور ایمان نہ لائیں گے۔ (ابن کثیر)

مولانا امین احسن اصلاحی ان آیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جب ان کی ساری سخن سازیاں محض چال اور فریب کی نوعیت کی ہیں تو ان کو مطمئن کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ان کو دلیلوں سے قائل کرنا تو درکنار اگر یہ اس عذاب کو بھی آسمان سے نازل ہوتا دیکھ لیں جس سے تم ان کو آگاہ کر رہے ہو تو اس کو بھی یہ تہ بہ تہ بادل کہیں گے اور اپنے کو مطمئن کر لیں گے کہ یہ ابر کرم بن کر ان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے والا ہے۔

اس فقرے میں ثمود کے تاریخی واقعہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کو جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا جب وہ ان کے سروں پر آدھمکا تب بھی انہوں نے اس کا یقین نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اپنے

آپ کو مطمئن کر لیا کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف:۲۴) یہ تو ہمیں سیر اب کرنے والا بادل ہے) مطلب یہ ہے کہ اسی طرح یہ لوگ عذاب کو دیکھ کر بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اسی وقت مانیں گے جب عذاب ان کو پامال کر دے گا، لیکن اس وقت ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو گا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی کو قائل کرنے کی توقع اسی حد تک کی جاسکتی ہے جب تک گمان ہو کہ اس کے ذہن میں فی الواقع کچھ شبہات واعتراضات ہیں جو اس کے لیے قبول حق میں حجاب بنے ہوئے ہیں۔

اس وقت تک ایک داعی کا فرض ہے کہ اس کے شبہات دور اور اس کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کرے لیکن جب یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے کہ اس کی ساری دلیل بازی محض ایک چال (کید) اور مکر ہے جس کے پردے میں چھپ کر وہ حقیقت سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر اس پر وقت ضائع کرنا بالکل بے سود ہے، پھر اس کا معاملہ اللہ ہی کے حوالے کرنا چاہیے۔ (تدبر قرآن)

سرکشوں اور سازشیوں کے لیے شکنجہ تیار

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ{۴۵}يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ{۴۶}الطور

جواب ترجمہ: لہٰذا (اے حبیب) آپ انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے، یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن سے جا ملیں جس میں ان کے ہوش جاتے رہیں گے۔ جس دن ان کی مکاری ان کے کچھ کام نہیں آئے گی، اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ: آیات گزشتہ میں کفار، مشرکین، معاندین اور مخالفین اسلام کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور ہرزہ سرائیوں کا پوسٹ مارٹم اور آپریشن کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ آپ ﷺ انہیں چھوڑ دیجیے، یہ چھوڑنے کی بات جواب شرط ہے جو یہاں مقدر ہے، مطلب یہ کہ جب ان مشرکین کا یہ حال ہے جیسا ہم نے ان آیات میں ذکر کیا ہے تو پھر میرے حبیب! انہیں ان کی سرکشی میں کھلا چھوڑ دیجیے، تاکہ یہ سرگرداں

رہیں، یہاں تک کہ وہ دن آن پہنچے جس دن ان کے ہوش وحواس اڑ جائیں گے، انہیں آپ کھل کھیلنے دیجیے، یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس دن یہ موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے، ہلاکت کی وادی میں اتر جائیں گے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں یُصعَقُونَ کا معنٰی ہے جس دن وہ مر جائیں گے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بدر کا دن ہے جس میں کفار و مشرکین کو سبق سکھایا گیا تھا، بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نفخہ اولیٰ (پہلی بار صور کا پھونکا جانا) ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے قیامت کا دن مراد ہے، جس میں انہیں ایسا عذاب دیا جائے گا جس سے ان کی عقلیں ختم ہو جائیں گی۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ: یہ وہ دن ہو گا جس دن انہیں کوئی چیز کچھ بھی کام نہیں آئے گی، اس لیے آپ تسلسل کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے کام میں مگن رہیے، یہ جتنے مکر و دجل سے کام لے رہے ہیں وہ دن آئے گا تو ان کے مکر و فریب کے سب تانے بانے ایک ایک کر کے بکھر جائیں گے۔ یہ لوگ جب ہمارے عذاب کے شکنجے میں آئیں گے تو اس سے انہیں لوگوں میں سے کوئی بچا نہیں سکے گا اور نہ ہی کسی جہت سے ان کی مدد و نصرت کی جائے گی۔

ہر سازشی کو، ہر مکار کو، ہر دغاباز کو، ہر ظالم کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دنیا فانی ہے، یہاں بہت محدود عرصہ کے لیے ہم نے رہنا ہے، اس لیے آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزاری جائے۔

قیامت سے پہلے عذاب

سوال کیا کافروں کو روز محشر کے عذاب سے پہلے عذاب ہو گا؟ اس آیت کی روشنی میں بتایئے۔

وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ {۴۷} الطور.

اور اس سے پہلے بھی ان ظالموں کے لیے ایک عذاب ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔

جواب جی ہاں، ان ظالموں کو روز محشر کے عذاب سے پہلے دنیا میں عذاب دیا جائے گا، یہ قتل ہوں گے، یہ گرفتار ہوں گے، اور اس کے علاوہ عذاب برزخ سے دوچار ہوں گے۔

امام تفسیر علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عذاباً دون ذلک: ایک قول یہ کیا گیا ہے، ان کی موت

سے قبل انہیں عذاب ہو گا۔ ابن زید نے کہا، مراد دنیا کے مصائب ہیں یعنی درد، بیماریاں، آزمائشیں، مال اور اولاد کا چلا جانا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، اس سے مراد بھوک اور سات سال تک خشک سالی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا، مراد قتل ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے: مراد عذاب قبر ہے، یہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ دون کا معنیٰ غیر ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: مراد ایسا عذاب ہے جو آخرت کے عذاب سے خفیف ہو گا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر یہ نہیں جانتے کہ ان پر عذاب نازل ہو گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے: ان میں سے اکثر نہیں جانتے کہ ان کا ٹھکانہ کیا ہو گا۔ (قرطبی)

ثنائے رب جلیل کا حکم

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ {۴۸} وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ {۴۹} الطور.

جواب ترجمہ: اور تم اپنے پروردگار کے حکم پر جمے رہو، کیونکہ تم ہماری نگاہوں میں ہو، اور جب تم اٹھتے ہو اس وقت اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیا کرو۔ اور کچھ رات کو بھی اس کی تسبیح کرو، اور اس وقت بھی جب ستارے ڈوبتے ہیں۔

امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں پھر فرماتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ صبر کیجئے ان کی ایذاء دہی سے تنگ دل نہ ہو جایئے ان کی طرف سے کوئی خطرہ بھی دل میں نہ لایئے، سنیے! آپ ہماری حفاظت میں ہیں، آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، آپ کی نگہبانی کے ذمہ دار ہم ہیں، تمام دشمنوں سے آپ کو بچانا ہمارے سپرد ہے۔

پھر حکم دیتا ہے کہ جب آپ کھڑے ہوں تو اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تعریف بیان کیجئے اس کا ایک مطلب یہ کیا گیا ہے کہ جب رات کو جاگیں، دونوں مطلب درست ہیں چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ نماز کو شروع کرتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں دعا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ

اسْمُكَ، وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ، یعنی اے اللہ تو پاک ہے، تمام تعریفوں کا مستحق ہے، تیرا نام برکتوں والا ہے، تیری بزرگی بہت بلند و بالا ہے۔ تیرے سوا معبود برحق کوئی اور نہیں۔ (مسلم)

حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو جاگے اور کہے

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ (مسند احمد) پھر خواہ اپنے لئے بخشش کی دعا کرے، خواہ جو چاہے طلب کرے، اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے، پھر اگر اس نے پختہ ارادہ کیا اور وضو کر کے نماز بھی ادا کی تو وہ نماز قبول کی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری، سنن)

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ کی تسبیح اور حمد کے بیان کرنے کا حکم ہر مجلس سے کھڑے ہونے کے وقت ہے، حضرت ابو الاحوص رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ جب مجلس سے اٹھنا چاہے یہ پڑھے دعا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر اس مجلس میں نیکی ہوئی ہے تو وہ اور بڑھ جاتی ہے اور اگر کچھ اور ہوا ہے تو یہ کلمہ اس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

جامع عبد الرزاق میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو تعلیم دی کہ جب کبھی کسی مجلس سے کھڑے ہو تو دعا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ پڑھو۔ اس کے راوی حضرت معمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ قول اس مجلس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے وہاں کچھ بک جھک ہو اور کھڑا ہونے سے پہلے ان کلمات کو کہہ لے تو اس مجلس میں جو کچھ ہوا ہے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے (ترمذی) حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ اپنی آخری عمر میں جس مجلس سے کھڑے ہوتے ان کلمات کو کہتے بلکہ ایک شخص نے پوچھا بھی کہ یا رسول اللہ! آپ اس سے پہلے تو ایسے نہیں کہتے تھے؟ آپ نے فرمایا مجلس میں جو کچھ ہوا ہو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ کلمات ایسے ہیں کہ جو انہیں مجلس سے اٹھتے وقت تین مرتبہ کہہ لے اس کے لئے یہ کفارہ ہو جاتے ہیں مجلس خیر اور مجلس ذکر میں انہیں کہنے سے یہ مثل مہر

کے ہو جاتے ہیں (ابو داؤد وغیرہ) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ رات کے وقت اس کی یاد اور اس کی عبادت تلاوت اور نماز کے ساتھ کرتے رہو جیسے فرمان ہے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ، رات کے وقت تہجد پڑھا کرو یہ تیرے لئے نفل ہے ممکن ہے تیرا رب تجھے مقام محمود پر اٹھائے۔ (سورۃ الاسراء ۷۹)

ستاروں کے ڈوبتے وقت سے مراد صبح کی فرض نماز سے پہلے کی دو رکعتیں ہیں کہ وہ دونوں ستاروں کے غروب ہونے کے لئے جھک جانے کے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرفوع حدیث میں ہے ان سنتوں کو نہ چھوڑو گو تمہیں گھوڑے کچل ڈالیں۔ اسی حدیث میں ہے دن رات میں پانچ نمازیں ہیں سننے والے نے کہا کیا مجھ پر اس کے سوا اور کچھ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفل ادا کرے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل میں سے کسی نفل کی بہ نسبت صبح کی دو سنتوں کی زیادہ پابندی اور ساری دنیا سے اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بہتر ہیں۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج بفضل اللہ و بنصرۃ اللہ و بعون اللہ سورۃ الطور کے چیدہ اور چنیدہ مقامات کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لیے، ہمارے والدین کے لیے، ہمارے اساتذہ کے لیے، ہمارے مشائخ کے لیے، ہمارے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اس کار خیر کو ہماری نجات کا ذریعہ بنائے، اسے ہماری فلاح و نجات کا سبب بنائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

حدوٹ، مری

۱۱ جولائی ۲۰۱۸ء مطابق ۲۶ شوال المکرم ۱۴۳۹ھ بروز بدھ ساڑھے بارہ بجے دن

نظر ثانی و اضافات جدیدہ: ۱۰ جنوری ۲۰۲۶ء بروز ہفتہ بعد نماز عشاء

☆☆☆☆

سورۃ النجم (تعارف)

سوال سورۃ النجم کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ النجم مکی سورت ہے، اس سورت کا یہ نام اس کی پہلی آیت میں موجود ہے، اس سورت میں تین رکوع، باسٹھ آیتیں، ۳۶۰ کلمے اور ۱۴۰۵ حروف ہیں۔ اس میں رسالت اور بعث ونشور پر ایمان لانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ (صفوۃ التفاسیر)

وجہ تسمیہ: سورۃ کا آغاز والنجم سے کیا گیا ہے، النجم عربی زبان میں ستارے کو کہتے ہیں، اس سورت کا آغاز "ستارہ" کی قسم کھانے سے ہوتا ہے، یہاں ایسے ستارہ کی قسم کھائی گئی ہے، جو ڈوبنے کے قریب ہو کیوں کہ ایسے ہی ستارہ سے سمت معلوم کی جاسکتی ہے اور اس کے ذریعہ سمندری اور ریگستانی سفر میں لوگ اپنا راستہ متعین کرتے ہیں، جب ستارہ بیچ آسمان میں ہوتا ہے، اس سے چلنے والوں کو سمت سفر کا علم نہیں ہوتا اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام "والنجم" ہے۔

سورۃ النجم کا زمانہ نزول: سورۃ النجم سورۃ الاخلاص کے بعد نازل ہوئی، اس سورۃ کا نزول حبشہ کی طرف پہلی ہجرت کے بعد ہوا تھا، حبشہ کی طرف پہلی ہجرت بعثت نبوی ﷺ کے ساتویں سال ہوئی تھی، جب یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی تو اس وقت ایک جھوٹ ہر طرف پھیل گیا تھا وہ جھوٹ یہ تھا کہ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى (۱۹) وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى (۲۰) کے بعد اہل مکہ کے بتوں کے بارے میں تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى، وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى نازل ہوئی، یہ جھوٹی خبر بھی نشر ہوگئی کہ قریش مکہ اس بناء پر مسلمان ہوگئے ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کے بتوں کی شفاعت کو تسلیم کرلیا ہے، ان افواہوں کی وجہ سے مہاجرین حبشہ واپس لوٹ آئے تھے، یہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ مشرکین مکہ تو اب بھی اپنے پرانے کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں، تو سورۃ النجم ان سورتوں میں سے ہے جو ہجرت الی الحبشہ اور واقعہ معراج کے درمیان نازل ہوئی ہے۔

سورۃ النجم کے شروع میں معراج النبی ﷺ کا واقعہ بالاختصار بیان کیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے سفر اسراء اور معراج میں جو عجائب وغرائب دیکھے ان کا اس سورت میں اختصار سے بیان موجود ہے، یہ

ایسا حیرت انگیز واقعہ تھا جو انسانی عقلوں میں آنے والا نہیں تھا اس لیے اس کی تاکید کی گئی کہ اس کے بارے میں نزاع، جھگڑا اور بحث ومباحثہ سے گریز لازم ہے، بس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے۔

مضامین سورۃ النجم: سورۃ النجم میں مشرکین کے معبودوں اور بتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن کی وہ پوجا کیا کرتے تھے، بت پرستی کو باطل قرار دیا گیا ہے، غیر خدا کی بندگی بجالانا باطل قرار دیا گیا ہے، بت ہو، پتھر ہو، درخت ہو یا کوئی دوسری چیز، اس کی عبادت کرنا حرام ہے، عبادت اور بندگی صرف ایک ہستی کی بجالائی جاسکتی ہے جسے اللہ کہتے ہیں، جو زمین اور آسمان کا مالک ہے۔

اس سورت کے مضامین میں یہ بات نمایاں دکھائی دیتی ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل وسعی کرتا جائے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ سورۃ النجم میں قیامت کے دن کا ذکر ہے جس میں کوئی جان کسی جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، مجرم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے گی، کسی دوسرے شخص کو اس کی سزا نہیں دی جائے گی۔ سورۃ النجم میں ایک نمایاں موضوع سابقہ امتوں کے حالات واحوال ہیں، ان کے کرتوتوں پر انہیں ملنے والے عذاب کا ذکر ہے، قوم عاد، قوم ثمود، قوم نوح اور قوم لوط پر برسنے والے عذاب کا ذکر ہے، یہ واقعات یہاں بیان کرنے کا مقصد اہل مکہ کو سمجھانا تھا کہ تم لوگ ہنسی مزاق کرتے ہو، ٹھٹھا تمسخر کرتے ہو، تم اپنی گمراہی اور عناد میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہو، تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس سرکشی، عناد اور گمراہی سے نکل کر اللہ کے حضور سجدہ ریزی کرو، اسی کی بندگی بجالاؤ، اس کا دین قبول کرو، اللہ کی عبودت اور محمد عربی ﷺ کی رسالت کا اقرار کرو۔

نبوت، وحی اور معراج النبی ﷺ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى

{۷}ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی {۸}فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۚ {۹}فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی {۱۰}مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی {۱۱}اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی {۱۲}وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی {۱۳}عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی {۱۴}عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی {۱۵}اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی {۱۶}مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی {۱۷}لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی {۱۸}النجم.

جواب ترجمہ: قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔ (اے مکہ کے باشندو) یہ تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب نہ راستہ بھولے ہیں، نہ بھٹکے ہیں، اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ انہیں ایک ایسے مضبوط طاقت والے (فرشتے) نے تعلیم دی ہے۔ جو قوت کا حامل ہے، چنانچہ وہ سامنے آگیا۔ جبکہ وہ بلند افق پر تھا۔ پھر وہ قریب آیا، اور جھک پڑا۔ یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر آگیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک، اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا، دل نے اس میں کوئی غلطی نہیں کی۔

کیا پھر بھی تم ان سے اس چیز کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے وہ دیکھتے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس (فرشتے) کو ایک اور مرتبہ دیکھا ہے۔ اس بیر کے درخت کے پاس جس کا نام سدرۃ المنتہی ہے۔ اسی کے پاس جنت الماوی ہے۔ اس وقت اس بیر کے درخت پر وہ چیزیں چھائی ہوئی تھیں جو بھی اس پر چھائی ہوئی تھیں۔

(پیغمبر کی) آنکھ نہ تو چکرائی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بہت کچھ دیکھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ستاروں کے ڈوبنے اور غروب ہونے کے وقت کی قسم کھائی ہے، کہ حضرت محمد ﷺ راہ ہدایت اور راہ حق سے نہیں ہٹے، راہ ہدایت سے نہیں نکلے، بلکہ وہ انتہائی استقامت، میانہ رو اور درستگی کی راہ پر ہیں، ان کی طرف سے نفسانی خواہشات کے مطابق ایک نقطہ بھی صادر نہیں ہوتا، قرآنی آیات ہوں یا سنت نبوی ہو وہ وحی ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کی

طرف کی، حضرت محمد ﷺ کو سخت قوت والے فرشتے نے سکھایا، جو خوبصورت منظر والا ہے، اس فرشتے کا نام جبریل امین ہے، جو اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں افق اعلیٰ پر ظاہر ہوئے، یہ افق اعلیٰ طلوع آفتاب کے وقت ہوا، پھر جبریل نبی کریم ﷺ کے قریب ہوئے، پھر یہ قرب اور زیادہ ہو گیا، ان کا یہ قریب ہونا دو کمانوں کی مقدار جتنا تھا، یا اس سے بھی زیادہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اپنے بندے محمد ﷺ کی طرف جبریل کے واسطے سے وحی کی، حضرت محمد ﷺ کے قلب مبارک نے اس بات کو نہیں جھٹلایا جو ان کی آنکھ مبارک نے دیکھا، تو کیا تم محمد ﷺ کو جھٹلاتے ہو؟ پھر اس بارے میں جھگڑتے ہو جو کچھ انہوں نے دیکھا اور اپنے رب کی آیات ونشانیوں کا مشاہدہ کیا؟

حضرت محمد ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا، سدرۃ ایک بیری کا درخت ہے، جو ساتویں آسمان میں ہے، زمین سے جو چیزیں اوپر جاتی ہیں ان کی انتہاء یہی مقام ہے اور جو چیزیں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں ان کی انتہاء بھی یہی مقام ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے، جس کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے، جب اللہ کے امر سے ایک بڑی چیز سدرہ کو ڈھانپ لیتی ہے، اس کا وصف اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، حضرت نبی کریم ثبات اور طاعت کے عظیم وصف پر فائز تھے، آپ ﷺ کی نگاہ دائیں اور بائیں مائل نہیں ہوئی اور نہ ہی اس سے تجاوز کیا جس کو دیکھنے کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا، حضرت نبی کریم ﷺ نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کی قدرت عالیہ پر دلالت کرنے والی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں، آپ ﷺ نے جنت کی سیر کی اور دوزخ کو دیکھا۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَى: ستارے کے گرنے سے مراد اس کا غائب ہونا ہے، اس سورت کا اصل موضوع حضور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنا ہے، اس لئے سورت کے شروع میں آپ پر نازل ہونے والی وحی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک قابل اعتماد فرشتہ آپ کے پاس لے کر آتا ہے، شروع میں ستارے کی قسم کھانے سے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح ستارہ روشنی کی ایک علامت ہے اور عرب کے لوگ اس سے صحیح راستے کا پتہ لگاتے تھے، اسی طرح حضور اقدس ﷺ

لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت کا پیکر ہیں، اس کے علاوہ ستارے کے سفر کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو راستہ مقرر فرمایا ہے وہ اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا، اور نہ اس سے بھٹکتا ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بارے میں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ وہ نہ راستہ بھولے ہیں، نہ بھٹکے ہیں، پھر جب ستارہ غائب ہونے والا ہوتا ہے تو اس کے ذریعے راستہ زیادہ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ مسافروں کو اس کا زبان حال سے یہ پیغام ہوتا ہے کہ میں رخصت ہونے والا ہوں مجھ سے راستہ معلوم کرنے میں جلدی کرو، اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ دنیا میں زیادہ عرصہ مقیم نہیں رہیں گے، اس لئے آپ سے ہدایت حاصل کرنے والوں کو جلدی کرنی چاہیے۔ (توضیح القرآن)

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى: تمہارے ساتھ رہنے والے صاحب سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں اور آپ کے لئے یہ لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا ہے کہ آپ نے کہیں باہر سے آکر نبوت کا دعوی نہیں کر دیا، بلکہ وہ شروع سے تمہارے ساتھ رہتے ہیں، اور ان کی پوری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، اور نہ کبھی کسی کو دھوکہ دیا ہے، اس کے برعکس آپ صادق اور امین کے لقب سے مشہور ہیں، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ عام زندگی میں تو جھوٹ سے اتنا پرہیز کریں اور اللہ تعالیٰ پر اتنا بڑا بہتان لگادیں۔ (توضیح القرآن)

ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى: اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو آنحضرت ﷺ کے پاس وحی لے کر تشریف لاتے تھے، ان کی اطاعت کا خاص طور سے ذکر فرما کر اس بات کی تردید کی گئی ہے جو کافروں کے دل میں آسکتی تھی کہ اگر کوئی فرشتہ ہی وحی لاتا ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ درمیان میں کوئی شیطانی تصرف نہیں ہوا؟ آیت نے بتایا کہ وحی لانے والا فرشتہ اتنا طاقت ور ہے کہ کوئی دوسرا اسے اپنے مشن سے نہیں ہٹا سکتا۔

وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى: کافروں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جو فرشتہ وحی لاتا ہے وہ انسان ہی کی شکل میں آتا ہے، اس لئے آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ فرشتہ ہی ہے، ان آیتوں میں

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس فرشتے کو کم از کم دو مرتبہ اپنی اصل صورت میں بھی دیکھا ہے، ان میں سے ایک واقعے کا اس آیت میں تذکرہ فرمایا گیا ہے، اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی اصلی صورت میں آپ کے سامنے آئیں، چنانچہ وہ اپنی اصلی صورت میں افق پر ظاہر ہوئے، اور آپ نے انہیں دیکھا۔ (توضیح القرآن)

قَابَ قَوْسَيْنِ: یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ جب دو آدمی آپس میں دوستی کا عہد کرتے تھے تو اپنی کمانیں ایک دوسرے سے ملا لیتے تھے۔ اس وجہ سے جب زیادہ قرب بیان کرنا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر قریب آگئے۔ (توضیح القرآن)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى: یعنی ایسا نہیں ہوا کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہو، دل نے اس کے سمجھنے میں غلطی کر دی ہو۔ (توضیح القرآن)

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى: ساتویں آسمان میں بیری کا درخت ہے، جس کو سدرۃ کہا جاتا ہے، اسی درخت کے پاس جنت ہے، جسے جنت الماویٰ کہا جاتا ہے، ماویٰ کا معنیٰ ہے ٹھکانہ، اس کو جنت الماویٰ کا یہ نام اسی لیے دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کا ٹھکانہ ہے۔

إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ: یہ آیت بھی ایک عربی محاورے کے مطابق ہے جس کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ اس کے صحیح تاثر کے ساتھ بہت مشکل ہے، مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں اس بیر کے درخت پر چھائی ہوئی تھیں وہ بیان سے باہر ہیں، احادیث میں حضور نبی کریم ﷺ نے اس واقعہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاتعداد فرشتے سونے کے پروانے کی شکل میں اس درخت پر آنحضرت ﷺ کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ (توضیح القرآن)

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى: یعنی نہ تو نگاہ نے دیکھنے میں کوئی دھوکا کھایا، اور نہ وہ اس حد سے آگے بڑھی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرما دی تھی کہ اس سے آگے نہ دیکھے۔ (توضیح القرآن)

لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى: آیات کبریٰ سے مراد ہیں۔ عجائب ملکوتی جن کی سیر رسول اللہ

ﷺ نے شب معراج میں دوران آمد ورفت کی تھی، براق ، آسمان، انبیاء، ملائکہ، سدرۃ المنتہیٰ سب کا شمار عجائب ملکوت میں ہے۔ مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیت: لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى پڑھی اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا کہ ان کے چھ سو پنکھ (پَر) تھے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیت: لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى پڑھی اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے سبز رفرف کو دیکھا۔ جس نے افق کو بند کر رکھا تھا۔ (مظہری)

عجائب ملکوت کو آیات کبریٰ کہنے کی خصوصیت اس بناء پر ہے کہ مذکورہ آیات قدرت برکت و رحمت کی فروگاہ تھیں اور انوار و تجلیات کی خصوصی بارش ان پر ہو رہی تھی، ورنہ ہر ممکن وجود صانع کی روشن برہان اور واضح دلیل ہے، کسی مصنوع قدرت کو حقیر نہیں قرار دیا جاسکتا، اللہ نے فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ، ایک مکھی بھی حقیر نہیں بلکہ ضعیف و خلقت کے لحاظ سے اتنی عظیم الشان ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی طاقت بھی ایک مکھی کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ (مظہری)

بت اور بتکدے

سوال ان آیات کی روشنی میں قریش کے بتوں پر تبصرہ کیجیے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى {١٩} وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى {٢٠} النجم.

جواب ترجمہ: بھلا کیا تم نے لات اور عزی (کی حقیقت) پر بھی غور کیا ہے ؟ اور اس ایک اور تیسرے پر جس کا نام منات ہے؟

قریش کے وہ معبود جن کی وہ پوجا کیا کرتے تھے ان کے نام لات، منات اور عزیٰ تھے۔ قرآن کریم میں ان کا تذکرہ سورۃ النجم میں کیا گیا ہے۔ لات، عزی اور منات تینوں بتوں کے نام جو عرب کے مختلف قبائل نے مختلف جگہوں پر بنا رکھے تھے، اور ان کو خدا مان کر ان کی عبادت کی جاتی تھی، قرآن کریم فرماتا ہے کہ ان کی حقیقت بے جان پتھروں کے سوا کیا ہے، پھر ان کو خدا ماننا کتنی بڑی جہالت کی

بات ہے۔(توضیح القرآن)

مشرکین عرب کے بت جن کی وہ پرستش کرتے تھے بیشمار ہیں، مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں، اور ان کی عبادت پر عرب کے بڑے بڑے قبائل لگے ہوئے تھے، لات، عزی، منات، لات قبیلہ ثقیف (اہل طائف) کا بت تھا، عزی قریش کا اور منات بنی ہلال کا، ان بتوں کے مقامات پر مشرکین نے بڑے بڑے شاندار مکانات بنا رکھے تھے، جن کو کعبہ کی حیثیت دیتے تھے، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ (ﷺ) نے ان سب کو منہدم کرادیا (قرطبی)

امام تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ مشرکین کو ڈانٹ رہا ہے کہ وہ بتوں کی اور اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتے ہیں اور جس طرح خلیل اللہ نے بحکم اللہ بیت اللہ بنایا ہے یہ لوگ اپنے اپنے معبودان باطل کے پرستش کدے بنا رہے ہیں۔ لات ایک سفید پتھر منقش تھا جس پر قبہ بنا رکھا تھا غلاف چڑھائے جاتے تھے مجاور محافظ اور جاروب کش مقرر تھے اس کے آس پاس کی جگہ مثل حرم کی حرمت و بزرگی والی جانتے تھے اہل طائف کا یہ بت کدہ تھا قبیلہ ثقیف اس کا پجاری اور اس کا متولی تھا۔ قریش کے سوا باقی اور سب پر یہ لوگ اپنا فخر جتایا کرتے تھے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان لوگوں نے لفظ اللہ سے لفظ لات بنایا تھا گویا اس کا مؤنث بنایا تھا اللہ کی ذات تمام شریکوں سے پاک ہے ایک قرأت میں لفظ لات "ت" کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی گھولنے والا اسے لات اس معنی میں اس لئے کہتے تھے کہ یہ ایک نیک شخص تھا موسم حج میں حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا اس کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس کی قبر پر مجاورت شروع کر دی رفتہ رفتہ اسی کی عبادت کرنے لگے۔

اسی طرح لفظ عزیٰ لفظ عزیز سے لیا گیا ہے مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں یہ ایک درخت تھا اس پر بھی قبہ بنا ہوا تھا چادریں چڑھی ہوئی تھیں قریش اس کی عظمت کرتے تھے۔

ابو سفیان نے احد والے دن بھی کہا تھا ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا نہیں جس کے جواب میں حضور ﷺ نے کہلوایا تھا اللہ ہمارا والی ہے اور تمہارا کوئی نہیں صحیح بخاری میں ہے مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِي

حَلِفِهِ: وَاللَّاتِ وَالْعُزَّى، فَلْيَقُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ. وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِهِ: تَعَالَ أُقَامِرْكَ، فَلْيَتَصَدَّقْ، جو شخص لات عزیٰ کی قسم کھا بیٹھے اسے چاہیے کہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ لے اور جو اپنے ساتھی سے کہہ دے کہ آ جوا کھیلیں اسے صدقہ کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں چونکہ اسی کی قسم کھائی جاتی تھی تو اب اسلام کے بعد اگر کسی کی زبان سے اگلی عادت کے موافق یہ الفاظ نکل جائیں تو اسے کلمہ پڑھ لینا چاہیے۔

حضرت سعد بن وقاص ایک مرتبہ اسی طرح لات وعزیٰ کی قسم کھا بیٹھے جس پر لوگوں نے انہیں متنبہ کیا یہ حضور ﷺ کے پاس گئے آپ نے فرمایا دعا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ پڑھ لو اور تین مرتبہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر اپنی بائیں جانب تھوک دو اور آئندہ سے ایسا نہ کرنا۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان قدید کے پاس مشلل میں مناۃ تھا۔ قبیلہ خزاعہ، اوس، اور خزرج جاہلیت میں اس کی بہت عظمت کرتے تھے یہیں سے احرام باندھ کر وہ حج کعبہ کے لئے جاتے تھے اسی طرح ان تین کی شہرت بہت زیادہ تھی اس لئے یہاں صرف ان تین کا ہی بیان فرمایا۔ ان مقامات کا یہ لوگ طواف بھی کرتے تھے قربانیوں کے جانور وہاں لے جاتے تھے ان کے نام پر جانور چڑھائے جاتے تھے باوجود اس کے یہ سب لوگ کعبہ کی حرمت وعظمت کے قائل تھے اسے مسجد ابراہیم مانتے تھے اور اس کی خاطر خواہ توقیر کرتے تھے۔

سیرۃ ابن اسحاق میں ہے کہ قریش اور بنو کنانہ عزیٰ کے پجاری تھے جو نخلہ میں تھا، اس کا نگہبان اور متولی قبیلہ بنو شیبان تھا جو قبیلہ سلیم کی شاخ تھا اور بنو ہاشم کے ساتھ ان کا بھائی چارہ تھا اس بت کے توڑنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا جنہوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہتے جاتے تھے

يَا عُزَّ، كُفْرَانَكِ لَا سُبْحَانَكِ ... إِنِّي رَأَيْتُ اللهَ قَدْ أَهَانَكِ

اے عزیٰ میں تیرا منکر ہوں تیری پاکی بیان کرنے والا نہیں ہوں میرا ایمان ہے کہ تیری عزت کو اللہ

نے خاک میں ملا دیا۔

یہ ببول کے تین درختوں پر تھا، کاٹ ڈالے گئے اور قبہ ڈھا دیا اور واپس آکر حضور ﷺ کو اطلاع دی، آپ نے فرمایا تم نے کچھ نہیں کیا لوٹ کر پھر دوبارہ جاؤ، حضرت خالد کے دوبارہ تشریف لے جانے پر وہاں کے محافظ اور خدام نے بڑے بڑے مکر و فریب کئے اور خوب غل مچا مچا کر یا عزیٰ یا عزیٰ کے نعرے لگائے، حضرت خالد نے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ننگی عورت ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور اپنے سر پر مٹی ڈال رہی ہے آپ نے تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کیا اور واپس آکر حضور ﷺ کو خبر دی آپ نے فرمایا عزیٰ یہی تھی۔

لات قبیلہ ثقیف کا بت تھا جو طائف میں تھا۔ اس کی تولیت اور مجاورت بنو معتّب میں تھی یہاں اس کے ڈھانے کے لئے نبی ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابو سفیان صخر بن حرب کو بھیجا تھا جنہوں نے اسے معدوم کر کے اس کی جگہ مسجد بنا دی، مناۃ اوس و خزرج اور اس کے ہم خیال لوگوں کا بت تھا یہ مشلل کی طرف سے سمندر کے کنارے قدید میں تھا یہاں بھی حضور ﷺ نے حضرت ابو سفیان کو بھیجا اور آپ نے اس کے ریزے ریزے کر دیئے۔

بعض کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں یہ کفرستان فنا ہوا۔ ذوالخلصہ نامی بت خانہ دوس اور خشعم اور بجیلہ کا تھا اور جو لوگ اس کے ہم وطن تھے یہ تبالہ میں تھا اور اسے یہ لوگ کعبہ یمانیہ کہتے تھے اور مکہ کے کعبہ کو کعبہ شامیہ کہتے تھے یہ حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے فنا ہوا، فلس نامی بت خانہ قبیلہ طے اور ان کے آس پاس کے عربوں کا تھا یہ جبل طے میں سلمیٰ اور اجا کے درمیان تھا اس کے توڑنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مامور ہوئے تھے آپ نے اسے توڑ دیا اور یہاں سے دو تلواریں لے گئے تھے ایک رسوب دوسری مخذم آنحضرت ﷺ نے یہ دونوں تلواریں انہی کو دے دیں۔

قبیلہ حمیر اہل یمن نے اپنا بت خانہ صنعاء میں ریام نامی بنا رکھا تھا مذکور ہے کہ اس میں ایک سیاہ کتا تھا اور وہ دو حمیری جو تبع کے ساتھ نکلے تھے انہوں نے اسے نکال کر قتل کر دیا اور اس بت خانہ کی اینٹ

سے اینٹ بجادی اور رضا نامی بت کدہ بنو ربیعہ بن سعد کا تھا اس کو مستوغر بن ربیعہ بن کعب بن اسد نے اسلام میں ڈھایا۔

وَلَقَدْ شَدَدْتُ عَلَى رُضَاءٍ شَدَّةً ... فَتَرَكْتُهَا قَفْرًا بِقَاعٍ أَسْحَمَا

ابن ہشام کہتے ہیں کہ یہ تین سو تیس سال تک زندہ رہا

وَلَقَدْ سَئِمْتُ مِنَ الْحَيَاةِ وَطُولِهَا ... وَعُمِّرْتُ مِنْ عَدَدِ السِّنِينَ مِئِينَا

مِائَةً حَدَّثْتُهَا بَعْدَهَا مِائَتَانِ لِي ... وَازْدَدْتُ مِنْ عَدَدِ الشُّهُورِ سِنِينَا

هَلْ مَا بَقِيَ إِلَّا كَمَا قَدْ فَاتَنَا ... يَوْمٌ يَمُرُّ وَلَيْلَةٌ تَحْدُونَا

ذوالکعبات نامی صنم خانہ وائل کے دو بیٹوں بکر اور تغلب کا تھا، اور ایاد قبیلے کا سند اد میں تھا۔ (ابن کثیر)

مشرکین عرب کی ٹیڑھی تقسیم

سوال اس آیت کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ ضِیزَی کا کیا معنٰی ہے؟

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى {۲۱} تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى {۲۲} النجم.

جواب ترجمہ: کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں، اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ تب تو یہ بڑی ہی ٹیڑھی (اور بے ڈھنگی) تقسیم ہے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اول تو یہ گمراہی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کر دی، پھر جو اولاد تجویز کی تو بیٹیاں تجویز کر دیں اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتادیا حالانکہ اپنے لیے بیٹے پسند کرتے تھے اسی کو سورۃ الاسراء میں فرمایا اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا کیا تمہارے رب نے تمہیں بیٹیوں کے ساتھ خاص کر دیا اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا؟ بیشک تم بڑی بات کہتے ہو)۔

سورۃ الصافات میں فرمایا فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ، سو ان لوگوں سے پوچھئے کہ کیا اللہ کے

لیے بیٹیاں اور تمہارے لیے بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے تھے۔ خوب سن لو کہ وہ لوگ اپنی سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں پسند کیں تم لوگوں کو کیا ہو گیا، کیسا حکم لگاتے ہو۔ (انوار)

پھر اللہ تعالیٰ مشرکین عرب کی ٹیڑھی اور غلط تقسیم کا یہاں ذکر فرما رہے ہیں، فرماتا ہے کہ تمہارے لئے لڑکے ہوں اور اللہ کی لڑکیاں ہوں؟ کیونکہ مشرکین اپنے زعم باطل میں فرشتوں کو اللہ کی لڑکیاں سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم آپس میں تقسیم کرو اور کسی کو صرف لڑکیاں اور کسی کو صرف لڑکے دو تو وہ بھی راضی نہ ہو گا اور یہ تقسیم نا منصفی کی سمجھی جائے گی چہ جائیکہ تم اللہ کے لئے لڑکیاں ثابت کرو اور خود تم اپنے لئے لڑکے پسند کرو۔

مشرکین کے نام نہاد معبود

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى {۲۳} اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى {۲۴} فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى {۲۵} النجم

جواب ترجمہ: ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی ثبوت نازل نہیں کیا، در حقیقت یہ (کافر) لوگ محض وہم و گمان اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان کو ہر اس چیز کا حق پہنچتا ہے جس کی وہ تمنا کرے؟ (نہیں) کیونکہ آخرت اور دنیا تو تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔

مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مشرکین نے جو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا رکھے تھے خود ہی تجویز کیے تھے خود ہی ان کے نام رکھے تھے اسی کو فرمایا اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ یہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نام رکھ لیے ہیں اور

انہیں معبود تجویز کرلیا ہے، یہ مستحق عبادت ہو ہی نہیں سکتے غیر معبود کو تم معبود کہنے لگے مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ، اللہ تعالیٰ نے ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ، یہ لوگ صرف بے اصل خیالات اور محض گمان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور نفسوں کی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں، جو جی میں آیا کہہ دیا اور تجویز کرلیا اور جو اصحاب اہواء نے بتادیا، جن میں ان کے باپ دادا بھی ہیں) اس کو مان لیا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى: اور حال یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے، اپنی اٹکل پر اور نفس کی تجویز پر ضد کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو واقعہ اور یقینی ہدایت آئی ہے اس کو نہیں مانتے، ہدایت ربانی سے اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اللہ کے رسول ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ نے بتادیا ہے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس سے منحرف ہو رہے ہیں۔ (انوار البیان)

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى: کیا انسان کے لیے وہ سب کچھ ہے جس کی وہ تمنا کرے، یہ استفہام انکاری ہے اور مطلب یہ ہے کہ انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوتی مشرکین نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہم جن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں ان سے دنیا میں ہماری حاجتیں پوری ہوں گی اور آخرت میں یہ معبود ہماری سفارش کر دیں گے اور بخشوا دیں گے یہ ان کی صرف اپنی آرزو اور تمنا ہے جو پوری ہونے والی نہیں، دنیا میں خود دیکھتے ہیں کہ ہر ایک انسان کی ہر تمنا پوری نہیں ہوتی پھر اس بات کا یقین کیسے کئے بیٹھے ہیں کہ ان معبودوں سے فائدہ پہنچے گا جب کہ انہیں خود ہی معبود تجویز کرلیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں نازل کی گئی۔ (انوار البیان)

فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى: اللہ ہی کے لیے آخرت ہے اور اولیٰ ہے، اُولی دنیا اور آخرہ سے آخرت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو کچھ بھی تجویز کرنے اور طے کرنے کا اختیار نہیں، دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی بادشاہت ہے اور آخرت میں بھی اس کی بادشاہت ہوگی، وہ اپنے قوانین تشریعیہ اور تکوینیہ کے مطابق فیصلہ فرمائے گا، کافروں کی سب امیدیں اور آرزوئیں ضائع ہیں اور رائیگاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت

سوال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کرنے کی کیا شرائط ہیں؟ اس آیت کی روشنی میں بتایئے۔

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئاً إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَى {٢٦} النجم.

جواب ترجمہ: اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کچھ بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اس کے بعد ہی کام آسکتی ہے کہ اللہ جس کے لیے چاہے اجازت دیدے، اور اس پر راضی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالیہ میں شفاعت کی شرائط میں سے ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو شفاعت کی اجازت عطا فرمائے، اور اس کے بعد جس کے لیے شفاعت کی جائے گی اس کے لیے شفاعت کو پسند بھی کرے، اس آیت میں اسی طرف اشارہ دیا جارہا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ اَنْ یَّاْذَنَ اللہ: کہ اللہ شفاعت کی اجازت دے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ لِمَنْ یَّشَآءُ یعنی جس فرشتے کو شفاعت کرنے کی یا جس آدمی کے لیے شفاعت کرنے کی اجازت دے، تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وَیَرْضٰی اور اس کے لیے شفاعت کو پسند بھی کرے۔

مطلب یہ ہے کہ فرشتے باوجودیکہ اللہ کے معزز و مقرب بندے ہیں پھر بھی اللہ کی اجازت کے بغیر وہ شفاعت نہیں کریں گے۔ پس کس طرح یہ لوگ بتوں کی شفاعت کی آس لگائے ہوئے ہیں۔ مشرک کہتے تھے کہ اللہ سے یہ بت ہماری سفارش کریں گے، اس آیت سے ان کے اس قول کی تردید ہوگئی۔ (تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ)

امام تفسیر بغوی نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بہت سے وہ فرشتے جن کی یہ لوگ پوجا کرتے ہیں اور ان سے یہ شفاعت کی امید لگائے ہوئے ہیں، وہ ان کی شفاعت (اللہ کی اجازت کے بغیر) نہیں کرسکتے (اور اللہ کی اجازت مشرکوں کے لیے ہوگی نہیں)

پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کفار کی اس غلط فہمی کو دور کیا جارہا ہے جس میں وہ بری طرح مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی یہ دیویاں اور دیو قیامت کے روز ان کی شفاعت کریں گے اور عذاب جہنم سے انہیں بچالیں گے۔ انہیں بتایا جارہا ہے کہ ان بے چارے بتوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے کہ وہ ہماری جناب میں ان مشرکوں کی شفاعت کے لیے لب کشائی کی جرات کر سکیں۔

فرشتے جو نورانی مخلوق ہیں اور ہر وقت ہماری عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں، ان کی بھی یہ مجال نہیں کہ جس کی چاہیں خود بخود شفاعت کریں اور اس کو بخشوا کر جنت میں پہنچادیں، بلکہ فرشتے بھی اس وقت شفاعت کریں گے جب ہم انہیں اس کی اجازت دیں گے اور فقط ان کے لیے شفاعت کریں گے جو شفاعت کے اہل ہوں۔ جن بدبختوں کی موت کفر پر ہوگی، وہ تو اس قابل ہی نہیں کہ ان کی شفاعت کی جائے۔ شفاعت تو گناہ گار اہل ایمان کے لیے ہے۔ جب فرشتے بھی کفر و شرک پر مرنے والوں کی شفاعت نہیں کرسکتے تو یہ بت تمہاری نجات کا سبب کیونکر بن سکتے ہیں؟ (ضیاء القرآن)

منکرین آخرت، ان کا مبلغ علم، ان کے عقائد باطلہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ {٢٧} وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا {٢٨} فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا {٢٩} ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ {٣٠} وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَىٰ {٣١} النجم

جواب ترجمہ: جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو زنانے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اس بات کا ذرا بھی علم نہیں ہے، وہ محض وہم و گمان کے پیچھے چل رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ وہم و گمان حق کے معاملے میں بالکل کارآمد نہیں۔ لہٰذا (اے حبیب) آپ ایسے آدمی کی فکر نہ کریں جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑ لیا ہے، اور دنیوی زندگی کے سوا وہ کچھ

اور چاہتا ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے علم کی پہنچ بس یہیں تک ہے۔ تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹک چکا ہے، اور وہی خوب جانتا ہے کون راہ پا گیا ہے۔ اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ بھی اور زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جنہوں نے برے کام کیے ہیں، وہ ان کو ان کے عمل کا بھی بدلہ دے گا، اور جنہوں نے نیک کام کیے ہیں، ان کو بہترین بدلہ عطا کرے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی: ایک حماقت تو ان کی یہ ہے کہ انہوں نے بے اختیار فرشتوں کو جو بغیر اجازت سفارش کرنے کا اختیار نہیں رکھتے معبود بنا لیا ہے، اس پر مزید حماقت یہ کہ وہ انہیں عورت سمجھتے ہیں اور انہیں خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں ان ساری جہالتوں میں ان کے مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت نہیں مانتے اور ملائکہ کے متعلق انہوں نے یہ عقیدہ کچھ اس بناء پر اختیار نہیں کیا ہے کہ انہیں کسی ذریعہ علم سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں، بلکہ انہوں نے محض اپنے قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لی ہے، حالانکہ یہ اصول اور عقیدہ کا مسئلہ ہے اس میں تو علم قطعی کی ضرورتی ہوتی ہے، گمان غالب مسائل فرعیہ عملیہ میں تو کام آسکتا ہے نہ کہ مسائل اعتقادیہ میں۔ (جلالین)

وَمَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا: فرشتوں کو مؤنث قرار دینا، پھر اللہ کی بیٹیاں قرار دینا، پھر ایک یا کسی خاص فرشتے کو نہیں بلکہ تمامی ملائکہ کے بارے میں وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے، حالانکہ ملائکہ تو محض اللہ کی بندگی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، ان کے بارے میں ان کے خیالات وعقائدیہ محض تخیلاتی گھوڑے تھے، ان کے پاس اس عقیدے و نظریے پر کوئی دلیل نہیں تھی، فرشتوں کے بارے میں یہ خیالات ان کا ظن و گمان تھا، باطل خیال تھا، اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ ظن باطل اور اعتقاد خاطی اللہ کے ہاں کچھ مفید نہیں ہے۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا: اللہ تعالیٰ مشرکین کے خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ کو بیان کرنے کے بعد اپنے حبیب ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ آپ ﷺ ان پلید

لوگوں سے دور رہیے، جن کے عقائد اس طرح کے ہیں، یہ ہماری یاد وذکر سے روگردانی کیے ہوئے ہیں، آپ ﷺ ان کے پیچھے نہ جائیں کہ یہ ایمان لے آئیں، ان تک آپ کا پیغام حق پہنچ چکا ہے، یہ ماننے والے نہیں ہیں، یہ اسی قبیل کے لوگ ہیں جس کے بارے میں اللہ نے کئی بار فرمایا کہ ان کی آنکھوں پر پردے، ان کے دلوں پر مہر اور کانوں پر ڈاٹ ہے، یہ دنیا کے بھوکے اور طلب گار ہیں، انہیں آخرت نہیں چاہیے، اس لیے آپ ﷺ انہیں چھوڑ دیجیے۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۡ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى : اس میں نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی واطمینان کا سامان کیا جارہا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کو ان لوگوں کی طرف سے اذیت وتکلیف پہنچی تھی، ان کی طرف سے انکار قرآن ودنیاوی زندگی کو ترجیح دینا یہ نبی کریم ﷺ کے لیے باعث اذیت تھا، یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی مادی چیزوں کا علم کتنا بھی بڑھ جائے، اس سے انسان آخرت کی کامیابی کا نسخہ نہیں جان سکتا: کیونکہ اس علم کی انتہاء صرف مادی نفع ونقصان ہے، آخرت کے نفع ونقصان کے لیے وہ علم ضروری ہے، جو انبیاء کے ذریعہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ (آسان تفسیر رحمانی)

یہ ان لوگوں پر تبصرہ ہے جو بس اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور آخرت کا انہیں کوئی خیال ہی نہیں ہے کہ ان بیچاروں کی رسائی بس یہیں تک ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ (توضیح القرآن) آیت کے اگلے حصے میں نبی کریم ﷺ کے لیے ایک اور تسلی ہے کہ اللہ ہدایت یافتہ اور گمراہوں کو خوب جانتا ہے، آپ ﷺ اپنا کام کیے جائیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى: قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے، انجام کار یہ ہے کہ برے کام کرنے والوں کو ان کے کیے (ہوئے برے کاموں) کی سزا دے گا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے بدلہ میں اچھی جزا دے گا، وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ: یعنی سارے جہان کا خالق اور مالک اللہ ہی ہے، وہ معبود برحق ہے، جو

چاہتا اور جیسا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے ویسا کرتا ہے۔ (مظہری)

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا: اس نے ساری کائنات کو پیدا کیا اور گمراہوں سے ہدایت یافتہ لوگوں کو الگ کر دیا اور ان کے اچھے، برے احوال کو محفوظ رکھا تاکہ مشرکوں اور گناہ گاروں کو ان کے کیے کی سزا دے اور مخلص نیکوکاروں کو اچھا ثواب یعنی جنت عطا کرے یا بالحسنیٰ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے سب سے اچھے عمل یعنی اخلاص کی جزا دے۔ (مظہری)

کبائر سے اجتناب، اپنی بڑائی سے گریز

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى {۳۲} النجم.

جواب ترجمہ: ان لوگوں کو جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، البتہ کبھی کبھار پھسل جانے کی بات اور ہے۔

یقین رکھو تمہارا پروردگار بہت وسیع مغفرت والا ہے، وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے، لہٰذا تم اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ، وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ میں نے لمم کے سلسلے میں اس سے بڑھ کر مناسب بات نہیں سنی جس کی روایت حضرت ابو ہریرہ نے حضور ﷺ سے کی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللهَ تَعَالَى كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ وَزِنَا اللِّسَانِ النُطقُ وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَشْتَهِي وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَلِكَ كُلَّهُ أَوْ يُكَذِّبُهُ (مسند احمد، ابن کثیر، احکام القرآن للجصاص) اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زناکاری کی جو صورت لکھ دی ہے اس کا ارتکاب وہ لامحالہ کرکے رہے گا۔ آنکھوں کی زناکاری غلط نظر ہے اور

زبان کی زناکاری گفتگو ہے۔ انسان کا نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش رکھتا ہے اور پھر اس کی شرمگاہ ان تمام باتوں کی تصدیق یا تکذیب کر دیتی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ أَنَّهُ النَّظْرَةُ وَالْغَمْزَةُ وَالْقُبْلَةُ وَالْمُبَاشَرَةُ فَإِذَا مَسَّ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَهُوَ الزِّنَا۔ لمم سے مراد نظر بازی، آنکھوں سے اشارہ اور بوس و کنار اور جسم کا جسم کے ساتھ ملنا ہے لیکن جب مرد و عورت کی شرمگاہیں ایک دوسرے کو چھو لیں تو یہ زناکاری ہے اور اس سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

تفسیر طبری میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے زِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَا الشَّفَتَيْنِ التَّقْبِيلُ، وَزِنَا الْيَدَيْنِ الْبَطْشُ، وَزِنَا الرِّجْلَيْنِ الْمَشْيُ، وَيُصَدِّقُ ذَلِكَ الْفَرْجُ أَوْ يُكَذِّبُهُ، فَإِنْ تَقَدَّمَ بِفَرْجِهِ كَانَ زَانِيًا، وَإِلَّا فَهُوَ اللَّمَمُ (ابن جریر، تفسیر طبری، ابن کثیر) آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، ہونٹوں کا زنا بوس و کنار کرنا ہے، دونوں ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے، دونوں پاؤں کا زنا چلنا ہے، اس کی تصدیق و تکذیب شرم گاہ کرتی ہے، پھر اگر اپنی شرم گاہ کے ساتھ وہ آگے بڑھتا ہے تو وہ زناکار ہے، ورنہ وہ لمم ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ لمم نکاح کو کہتے ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ إِنَّ اللَّمَّةَ مِنَ الزِّنَا ثُمَّ يَتُوبُ فَلَا يَعُودُ لمہ زنا میں سے ہے۔ اس کا مرتکب توبہ کر لیتا ہے اور پھر کبھی یہ حرکت نہیں کرتا۔ (احکام القرآن للجصاص)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت ہے کہ اللَّمَمُ مَا بَيْنَ الْحَدَّيْنِ حَدِّ الدُّنْيَا وَحَدِّ الْآخِرَةِ، لمم دو حدوں کے درمیان ہے یعنی دنیا اور آخرت کی حدوں کے درمیان۔ ان سے ایک اور روایت ہے کہ هُوَ الَّذِي يُلِمُّ بِالْمَرْأَةِ لمم سے وہ شخص مراد ہے جو عورت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ عطاء کا قول ہے اللَّمَمُ مَا دُونَ الْجِمَاعِ ہم بستری سے کم تمام باتیں لمم کہلاتی ہیں۔ مجاہد کا قول ہے کہ أَنْ تُصِيبَ الذَّنْبَ ثُمَّ تَتُوبَ لمم کا مفہوم یہ ہے کہ تم کسی گناہ کا ارتکاب کرو اور پھر توبہ کر لو۔

عمرو بن دینار نے عطاء سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا کرتے تھے اللَّهُمَّ إِنْ تَغْفِرْ تَغْفِرْ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ لَا أَلَمَّا اگر تو معاف کرے گا تو بہت زیادہ معاف کرے گا تیرا کون سا ایسا بندہ ہے جس سے چھوٹے موٹے گناہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔

ایک قول یہ ہے کہ إِنَّ اللَّمَمَ هُوَ الْهَمُّ بِالْخَطِيئَةِ مِنْ جِهَةِ حَدِيثِ النَّفْسِ بِهَا مِنْ غَيْرِ عَزْمٍ عَلَيْهَا لمم نفس کی خواہش کے تحت گناہ کے ارادے کا نام ہے جبکہ گناہ کا عزم نہ ہو۔ ایک قول کے مطابق إِنَّ اللَّمَمَ مُقَارِبَةُ الشَّيْءِ مِنْ غَيْرِ دُخُولٍ فِيهِ لمم کسی چیز کے قریب پہنچ جانے کو کہتے ہیں بغیر اس کے کہ اس میں داخل ہو جائے۔ جب انسان کسی چیز کے قریب جا پہنچے تو اس وقت یہ فقرہ کہا جاتا ہے أَلَمَّ بِالشَّيْءِ إِلْمَامًا ایک قول کے مطابق إِنَّ اللَّمَمَ الصَّغِيرُ مِنَ الذُّنُوبِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (احکام القرآن للجصاص) لمم چھوٹے موٹے گناہوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قول باری ہے اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے باز رہو گے جن سے تمہیں روکا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے موٹے) گناہوں کو معاف کر دیں گے)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَهَذَا اسْتِثْنَاءٌ مُنْقَطِعٌ؛ لِأَنَّ اللَّمَمَ مِنْ صَغَائِرِ الذُّنُوبِ وَمُحَقَّرَاتِ الْأَعْمَالِ، الا اللمم یہ مستثنیٰ منقطع ہے، کیونکہ لمم چھوٹے چھوٹے گناہوں اور حقیر کاموں کو کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مراد یہ ہے کہ زنا سے نزدیکی ہونے کے بعد توبہ کرے اور پھر نہ لوٹے چوری کے قریب ہو جانے کے بعد چوری نہ کی اور توبہ کر کے لوٹ آیا اسی طرح شراب پینے کے قریب ہو کر شراب نہ پی اور توبہ کر کے لوٹ گیا یہ سب الممام ہیں جو ایک مومن کو معاف ہیں۔ (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مراد اس سے شرک کے علاوہ گناہ ہیں۔ ابن زبیر فرماتے ہیں دو حدوں کے درمیان حد زنا اور عذاب آخرت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر وہ چیز جو دو حدوں کے درمیان حد دنیا اور حد آخرت، نمازیں اس کا کفارہ بن جاتی ہیں اور وہ ہر واجب کر دینے والی سے کم ہے، حد دنیا تو وہ ہے جو کسی گناہ پر اللہ نے دنیاوی سزا مقرر کر دی ہے اور اس کی سزا

دنیا میں مقرر نہیں کی۔

تیرے رب کی بخشش بہت وسیع ہے ہر چیز کو گھیر لیا ہے اور تمام گناہوں پر اس کا احاطہ ہے جیسے فرمان ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر :۵۳) اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر اسراف کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے اور وہ بڑی بخشش والا اور بڑے رحم والا ہے۔

پھر فرمایا هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ وہ تمہیں دیکھنے والا اور تمہارے ہر حال کا علم رکھنے والا اور تمہارے ہر کلام کو سننے والا اور تمہارے تمام تر اعمال سے واقف ہے جبکہ اس نے تمہارے باپ آدم کو زمین سے پیدا کیا اور ان کی پیٹھ سے ان کی اولاد نکالی جو چیونٹیوں کی طرح پھیل گئی پھر ان کی تقسیم کر کے دو گروہ بنا دیئے ایک جنت کے لئے اور ایک جہنم کے لئے اور جب تم اپنی ماں کے پیٹ میں بچے تھے اس کی مقرر کردہ فرشتے نے روزی عمر عمل نیکی بدی لکھ لی بہت سے بچے پیٹ سے ہی گر جاتے ہیں۔ بہت سے دودھ پینے کی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں، بہت سے دودھ چھٹنے کے بعد بلوغت سے پہلے ہی چل بستے ہیں بہت سے عین جوانی میں دار دنیا خالی کر جاتے ہیں۔ اب جبکہ ہم تمام منازل کو طے کر چکے اور بڑھاپے میں آگئے جس کے بعد کوئی منزل موت کے سوا نہیں اب بھی اگر ہم نہ سنبھلیں تو ہم سے بڑھ کر غافل کون ہے؟

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ: خبردار! تم اپنے نفس کو پاک نہ کہو اپنے نیک اعمال کی تعریفیں کرنے نہ بیٹھ جاؤ، اپنے آپ کو سراہنے نہ لگو جس کے دل میں رب کا ڈر ہے اسے رب ہی خوب جانتا ہے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (النسآء ۴۹) کیا تو نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جو اپنے نفس کی پاکیزگی آپ بیان کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہ اللہ کے ہاتھ ہے جسے وہ چاہے برتر اعلیٰ اور پاک صاف کر دے کسی پر کچھ بھی ظلم نہ ہو گا۔

محمد بن عمرو بن عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اپنی لڑکی کا نام برہ رکھا تو مجھ سے حضرت زینب بنت ابو سلمہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اس نام سے منع فرمایا ہے خود میرا نام بھی برہ تھا جس پر آپ نے فرمایا تم خود اپنی برتری اور پاکی آپ نہ بیان کرو تم میں سے نیکی والوں کا علم پورے طور پر اللہ ہی کو ہے لوگوں نے کہا پھر ہم اس کا کیا نام رکھیں؟ فرمایا زینب نام رکھو۔ (مسلم، ابن کثیر)

حضور ﷺ کے سامنے ایک آدمی نے کسی آدمی کی بہت تعریفیں بیان کیں آپ نے فرمایا وَيْلَكَ! قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ افسوس تو نے اس کی گردن ماری، کئی مرتبہ یہی فرما کر ارشاد فرمایا کہ إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ مَادِحًا صَاحِبَهُ لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ: أَحْسَبُ فُلَانًا وَاللهُ حَسِيبُهُ، وَلَا أُزَكِّي عَلَى اللهِ أَحَدًا، أَحْسَبُهُ كَذَا وَ كَذَا، إِنْ كَانَ يَعْلَمُ ذَلِكَ، اگر کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں فلاں کو یوں گمان کرتا ہوں، میں کسی کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا، میں فلاں کو ایسا ایسا گمان کرتا ہوں، اگر وہ اسے جانتا ہے تو اس طرح کہے۔ (مسند احمد، ابن کثیر)

ایک شخص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے حضرت عثمان کے سامنے ان کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں، اس پر حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ اس کے منہ میں مٹی بھرنے لگے اور فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ إِذَا لَقِينَا الْمَدَّاحِينَ أَنْ نَحْثُوَ فِي وُجُوهِهِمُ التُّرَابَ (مسلم، ابو داؤد) تعریفیں کرنے والوں کے منہ مٹی سے بھر دیں۔

آپ ﷺ نے جن کے منہ میں مٹی بھرنے کا ذکر فرمایا یہ خوشامدی کے قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جو ہر دور میں پائے جاتے ہیں، چاپلوسی کر کے اپنی مطلب براری کرنے والے لوگ کسی دور میں اچھے نہیں سمجھے گئے، اس لیے آپ ﷺ نے ان کے منہ میں مٹی ٹھونسنے کا ذکر فرمایا ہے، آپ ﷺ نے چاپلوسی اور خوشامد کی مذمت کی ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ چاپلوسی اور خوشامد اور چیز ہے جب کہ حوصلہ افزائی کرنا، تشجیع کرنا اور دوسروں کی ہمت بڑھانا یہ اور چیز ہے، کسی کی خوبی پر تعریف وستائش کسی مقام پر منع نہیں ہے، اللہ کے قرآن میں اچھے لوگوں کی تعریف وستائش موجود ہے، نبی کریم ﷺ نے خود کئی مواقع پر اچھے

لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔

ولید بن مغیرہ کے بارے میں آیات

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی {۳۳}وَاَعۡطٰی قَلِیۡلًا وَّاَکۡدٰی {۳۴}اَعِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡغَیۡبِ فَہُوَ یَرٰی {۳۵}النجم.

جواب ترجمہ: (اے پیغمبر) بھلا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا جو (حق سے) منہ موڑ گیا۔ اور جس نے تھوڑا سا دیا، پھر رک گیا، کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے جو وہ دیکھ رہا ہو؟

مجاہد اور ابن زید نے کہا: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، اس نے رسول اللہ ﷺ کے دین کی اتباع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تو بعض مشرکوں نے اس کو عار دلایا اور ملامت کی اور کہا: کیا تم اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ رہے ہو اور ان کو گم راہ قرار دے رہے ہو اور یہ گمان کر رہے ہو کہ وہ دوزخ میں ہوں گے، حالانکہ تم پر لازم تھا کہ تم ان کے دین کی مدد کرتے۔

ولید نے کہا: اگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تو مجھے اللہ کے عذاب کا خطرہ ہے، اس شخص نے کہا: اگر تم پر عذاب ہوا تو اس کو میں برداشت کروں گا بشرطیکہ تم مجھے اس قدر مال دو، ولید نے کہا: میں تم کو اتنا مال دوں گا، اس کے عوض تم میرا عذاب برداشت کر لینا، پھر ولید اپنے شرک پر برقرار رہا، پھر ولید نے اس سے جتنے مال کا وعدہ کیا تھا اس میں سے کچھ مال اس کو دیا اور پھر بخل کیا اور باقی مال دینے سے رک گیا، تو اس کی مذمت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ تفسیر بغوی)

عطاء بن یسار نے کہا: یہ آیت اس شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے جس نے اپنے گھر والوں سے کہا: میں اس شخص کے پاس جا کر اسلام لاتا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، جب وہ روانہ ہوا تو اس کو ایک کافر ملا اور اس نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: محمد ﷺ کے پاس، شاید مجھے اس اقدام سے خیر ملے گی، اس کافر نے کہا: مجھے یہ سامان دے دو، اس کے عوض اسلام نہ لانے سے تمہیں جو عذاب ہو گا اس کو میں برداشت کروں گا، وہ شخص مان گیا پھر اس نے اس کافر کو کچھ سامان دیا اور باقی سامان

دینے سے بخل کیا اور رک گیا۔

محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت ابو جہل کے متعلق نازل ہوئی ہے، اس نے کہا تھا کہ (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں، پھر اس نے آپ کے بعض اوصاف کریمہ بیان کیے، پھر بخل کی وجہ سے باقی اوصاف بیان کرنے سے رک گیا۔

یہاں "اکدی" کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے: وہ پتھر کی طرح سخت نکلا، یہ لفظ "کدیہ" سے بنا ہے، اس کا معنی ہے: سخت زمین، جب کنواں کھودا جائے اور اس میں کوئی ایسا پتھر نکل آئے جو کھودنے سے عاجز کر دے تو اس وقت کہتے ہیں: "قد اکدی" پھر اس کا استعمال اس شخص کے متعلق ہونے لگا جو کچھ مال دے کر رک جائے اور پورا مال نہ دے۔ فراء نے کہا: اس کا معنی ہے: دینے سے رک جانا اور عطاء کو منقطع کر دینا۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى: شان نزول میں جو قصہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آخرت کا تیرا عذاب میں اپنے سر لے کر تجھ کو بچا دوں گا، اس احمق نے اس کا یقین کیسے کر لیا، کیا اس کو علم غیب حاصل ہے؟ جس سے وہ دیکھ رہا ہے کہ بیشک کفر کی صورت میں وہ جس عذاب کا مستحق ہو گا وہ عذاب یہ ساتھی اپنے سر لے لے گا اور مجھے بچا دے گا، جو ظاہر ہے کہ سراسر دھوکہ ہے نہ اس کو علم غیب ہے نہ کوئی دوسرا آدمی کسی کا عذاب آخرت اپنے سر لے کر اس کو بچا سکتا ہے۔

اور اگر اس قصہ سے قطع نظر کی جائے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کرتا رک گیا ہے اور خرچ کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ موجودہ مال خرچ کر دوں گا تو پھر کہاں سے آئے گا۔

اس خیال کی تردید میں فرمایا کہ کیا اس کو غیب کا علم ہے جس کے ذریعہ گویا وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ مال ختم ہو جائے گا اور اس کے بجائے اور مال اس کو نہ مل سکے گا، یہ غلط ہے، کیونکہ نہ اس کو غیب کا علم ہے اور نہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ**

يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سبا ۳۹) یعنی تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا بدل تمہیں دیدیتے ہیں اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والے ہیں۔

انسان غور کرے تو قرآن کا یہ ارشاد صرف مال اور پیسہ کے معاملہ میں نہیں، بلکہ ہر قوت و توانائی جو وہ دنیا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدن میں اس کا بدل ما یتحلل پیدا کرتے رہتے ہیں، ورنہ انسان کے بدن کا ایک ایک عضو اگر فولاد کا بھی بنا ہوتا تو ساٹھ ستر سال کام لینے سے کبھی کا گھس گھسا کر برابر ہو جاتا، جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کے تمام اعضاء میں جو کچھ محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے خود کار مشین کی طرح اس کا بدل اندر سے پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح مال کا بھی معاملہ یہی ہے کہ انسان خرچ کرتا رہتا ہے اس کا بدل آتا رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو فرمایا: أَنْفِقْ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا یعنی بلال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور عرش والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا خطرہ نہ رکھو کہ وہ تمہیں مفلس کر دے گا۔ (حلیۃ الاولیاء، معجم طبرانی، ابن کثیر)

صحیفہ ابراہیمی و موسوی کا پیغام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى {۳۶} وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى {۳۷} اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى {۳۸} وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى {۳۹} وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى {۴۰} ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى {۴۱} وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى {۴۲} النجم.

جواب ترجمہ: کیا اسے ان باتوں کی خبر نہیں ملی جو موسیٰ کے صحیفوں میں درج ہے۔ اور ابراہیم کے صحیفوں میں بھی، جو مکمل وفادار رہے؟ یعنی یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اور یہ کہ انسان کو خود اپنی کوشش کے سوا کسی اور چیز کا (بدلہ لینے کا) حق نہیں پہنچتا۔ اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اس کا بدلہ اسے پورا پورا دیا جائے گا۔ اور یہ کہ آخر کار (سب کو) تمہارے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے۔

اَمۡ لَمۡ يُنَبَّاۡ بِمَا فِىۡ صُحُفِ مُوۡسٰى : کیاوہ (منکر) جاہل ہے کہ اسے اس بات کی خبر ہی نہیں دی گئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے؟یعنی اسے ان باتوں کی اطلاع نہیں دی گئی جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں درج ہیں، اس سے مراد تورات کے اسفار ہیں۔

صحیفہ کسے کہتے ہیں؟ علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں: صحیفہ ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، جیسے چہرے کا صحیفہ اور وہ کاغذ بھی جس پر لکھا جاتا ہے، اس کی جمع صحائف اور صُحُف آتی ہے۔ اور مصحف اسے کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے صحیفوں کو جمع کر دیا جائے۔ قہستانی کہتے ہیں: لفظ مصحف میں میم کو تینوں طرح (فتحہ، کسرہ، ضمہ) کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے، اور اس سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں قرآن جمع کیا گیا ہو۔

وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓى: اور (اسی طرح) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی یہ موسیٰ علیہ السلام پر عطف ہے، یعنی اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں، جو پورا اترنے والے تھے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام احکام اور آزمائشوں کو پورا پورا ادا کیا جن میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مبتلا کیا تھا، یا وہ ہر اس حکم کو پورا کرنے والے تھے جو اللہ نے دیا، بغیر کسی کمی یا کوتاہی کے۔

عربی میں کہا جاتا ہے أَوفَاهُ حَقَّهُ یعنی اس کا پورا حق ادا کر دیا، اور وَفَّاهُ کا معنی بھی مکمل طور پر دینا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ وَفّٰى میں تشدید مبالغہ اور کثرت کے لیے ہو، یعنی انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو انتہائی درجے میں پورا کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس صفت کے ساتھ خاص اس لیے کیا گیا کہ انہوں نے وہ آزمائشیں برداشت کیں جو دوسروں سے ممکن نہ تھیں، مثلاً: نمرود کی آگ پر صبر کرنا، یہاں تک کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: کیا آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہے؟ تو فرمایا: تم سے نہیں۔ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہونا۔ ہجرت کرنا۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ دینا۔ اور روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روزانہ ایک فرسخ چل کر مہمان تلاش کرتے تھے، اگر مہمان مل جاتا تو اس کی خوب مہمان نوازی کرتے، اور اگر کوئی نہ ملتا تو روزہ رکھنے کی نیت کر لیتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناقب میں بہت خوب کہا گیا ہے: انہوں نے اپنا جسم آگ کے لیے، دل رحمٰن کے لیے، بیٹے کو قربانی کے لیے، اور مال کو بھائیوں کے لیے وقف کر دیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روزانہ چار رکعتیں ادا کرتے تھے اور یہ نمازِ چاشت تھی اور حدیثِ قدسی میں ہے، اے ابنِ آدم! دن کے آغاز میں میرے لیے چار رکعتیں ادا کر، میں دن کے آخر تک تیری کفایت کروں گا۔

اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ اللہ نے ابراہیم کو خلیل اور وفا کرنے والا کیوں کہا؟ اس لیے کہ وہ صبح وشام یہ دعا پڑھتے تھے **سُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ**، یہاں تک کہ پوری دو آیتیں مکمل کرتے تھے۔

آسمان سے نازل ہونے والی کتب: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک سو چار کتابیں، آدم علیہ السلام پر دس صحیفے، شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے، ادریس علیہ السلام پر تیس صحیفے، اور ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل فرمائے اور پھر تورات، انجیل، زبور اور فرقان نازل کیے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ فرمایا: ان میں مثالیں تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی: اے آزمائش میں مبتلا، دھوکے میں پڑے بادشاہ! میں نے تجھے اس لیے نہیں بھیجا کہ تو دنیا کو جمع کرتا پھرے، بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تو مظلوم کی دعا کو رد نہ کرے، کیونکہ میں اسے رد نہیں کرتا، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

اور ان میں یہ مثالیں بھی تھیں، عقل مند کے لیے ضروری ہے کہ جب تک اس کی عقل مغلوب نہ ہو، اس کے اوقات تقسیم ہوں، ایک وقت اپنے رب سے مناجات کا، ایک وقت نفس کا محاسبہ کرنے کا، ایک وقت حلال رزق سے اپنی ضروریات پوری کرنے کا، عقل مند کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو پہچانے، اپنے کام میں مشغول رہے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے اور جو یہ جان لے کہ اس کا کلام بھی اس کے اعمال میں شمار ہوتا ہے، وہ بلا ضرورت کم بولے گا۔ (روح البیان) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے اس لیے کیا گیا کہ ان کے صحیفے یعنی تورات، مخاطبین میں زیادہ مشہور اور معروف تھے۔

صحف موسیٰ وابراہیم کا پیغام: ان چار آیات میں تمام آسمانی صحائف کا مشترکہ اور بنیادی پیغام بیان ہوا ہے ①: فردی ذمہ داری: ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ② عمل کی بنیاد: انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے خود کوشش کی، نسب، دعویٰ یا تعلق نجات کی ضمانت نہیں۔ ③ اعمال کا ظہور: ہر کوشش اور ہر عمل اللہ کے سامنے ظاہر کیا جائے گا۔ ④ کامل جزا و سزا: ہر عمل کا پورا اور عادلانہ بدلہ آخرت میں دیا جائے گا۔ ⑤ انجام اللہ کی طرف: زندگی، موت، حساب اور فیصلہ، سب کا آخری انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

شیخ محمد امین بن عبد اللہ ہروی شافعی رحمہ اللہ نے یہاں ان چیزوں کا خلاصہ بیان فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ ① ان میں ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کے گناہ میں دوسرے کو نہیں پکڑتا۔ ② دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے عمل کا ہی اجر و ثواب ملتا ہے۔ ③ تیسری بات یہ ہے کہ عمل کرنے والا شخص اپنے اچھے یا اپنے برے عمل کو اپنی میزان عمل میں دیکھ لے گا۔ ④ چوتھی بات یہ ہے کہ نیکیوں کا اجر دگنا کر کے سات سو تک بڑھا کر دے گا، جب کہ گناہوں کی سزا اسی کے مطابق ہو گی۔

⑤ پانچویں بات یہ ہے کہ ساری مخلوقات قیامت کے دن اپنے رب کی طرف لوٹیں گی، اور اپنے اپنے اعمال کا بدلہ دی جائیں گی۔ ⑥ چھٹی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ہنسنے اور رونے کو، خوشی اور غم کو پیدا کیا ہے۔ ⑦ ساتویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکر اور مؤنث کو ایک گندے پانی سے پیدا کیا ہے جو رحموں میں ٹپکایا جاتا ہے۔ ⑧ آٹھویں بات یہ ہے اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کو پیدا کیا ہے۔

⑨ نویں بات یہ ہے کہ فقر و غنا عطا کرنے والا اللہ ہی ہے، فقر و غنا دونوں ہی اللہ کے ہاتھ میں اور اس کے قبضے میں ہیں۔

⑩ دسویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شعریٰ ستارے کا رب ہے، خزاعہ قبیلہ کے لوگ اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ⑪ گیارہویں بات یہ ہے کہ اللہ نے ہی عاد اولیٰ کو ہلاک کیا تھا، عاد اولیٰ ہی وہ پہلی قوم

تھی جسے قوم نوح کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔ ⑫ بارہویں بات یہ ہے کہ اللہ ہی نے قوم ثمود کو ہلاک کیا تھا، انہیں باقی نہیں چھوڑا تھا، انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا گیا تھا۔ ⑬ تیرہویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عاد اور ثمود سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا، جنہوں نے ظلم کیا تھا، جنہوں نے سرکشی کی تھی۔ ⑭ چودھویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے الٹائی گئی بستیوں کو ہلاک کیا تھا، یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں تھیں، انہیں ان کے باشندوں سمیت الٹایا گیا تھا، ان پر نشان زدہ پتھر برسائے گئے تھے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: مفسر قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یعنی کسی شخص کو دوسرے کے گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا۔ بغوی نے بوساطت عکرمہ، حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جو لوگ مجرم کے جرم کی پاداش میں غیر مجرم کو پکڑ لیتے تھے اور اگر کسی کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا بیوی یا غلام نے قتل کیا ہو تو اس کے عوض اس شخص کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو اس حرکت سے روکا اور اللہ کا حکم پہنچایا کہ کسی کے جرم کا بار دوسرے پر نہ ڈالا جائے۔ (تفسیر مظہری)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا رواج کوئی شرعی قانون نہیں تھا بلکہ ایک جاہلی رواج تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قبائل اوس و خزرج کا رواج تھا، ایک قبیلہ جب دوسرے قبیلہ سے زیادہ باعزت اور مالدار ہوتا تھا اور اس کی کسی عورت کو حریف قبیلہ مار ڈالتا تھا تو شریف قبیلہ والے کمزور قبیلہ کے کسی مرد کو مقتول عورت کے عوض قتل کرتے تھے اور غلام مارا جاتا تھا تو دوسرے قبیلے کے کسی آزاد مرد کو قتل کرتے تھے اور ایک مرد مارا جاتا تھا تو انتقام میں دو آدمیوں کو قتل کرتے تھے۔ اس رواج کو منسوخ کرنے کے لیے آیت: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

عارف باللہ حضرت قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ یہاں ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں، شبہ یہ ہے کہ ایک اور آیت آئی ہے، كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا بظاہر آیت: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اس آیت کے

مخالف ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا، وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْتَقَصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ، جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا، تو اس جاری کرنے والے پر اس کا گناہ ہو گا، اور اس کا بھی اس پر گناہ ہو گا جس نے اس کے بعد اس پر عمل کیا ہو گا، قطع نظر اس کے کہ ان کے گناہوں میں سے کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ یہ حدیث بھی آیت لَا تَزِرُ کے خلاف ہے۔ اس شبہ کو ذکر کرنے کے بعد قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

آیت مَنْ قَتَلَ نَفْسًا اور حدیث مَنْ سَنَّ سُنَّةً، کا مقصد یہ ہے کہ مرتکب قتل اور سنت سیئہ کا موجد خود تو گناہگار ہوتا ہی ہے لیکن اس کا فعل چونکہ دوسروں کے مجرم اور گناہگار بننے کا سبب ہوتا ہے، اس لیے اس کا جرم دوگنا ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آنے والے مجرموں کا جرم اس پر ڈال دیا جائے گا اور ان کو گناہ سے آزاد کر دیا جائے گا) اسی لیے حدیث کے آخر میں فرمایا ہے: من غیر ان ینقص من اوزارھم شیئًا (بغیر اس کے کہ آئندہ اس طریقہ قبیحہ پر چلنے والوں کے بارے میں کوئی تخفیف کی جائے) ایک اور آیت آئی ہے وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۲۵) الانفال، اُس عذاب سے ڈرو جو صرف ظالموں پر ہی نہیں آئے گا بلکہ عمومی ہو گا ظالم اور غیر ظالم سب پر آئے گا۔

اسی طرح ایک حدیث مبارک میں آیا ہے جب اللہ کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو (اچھے، برے) جو لوگ بھی اس کے اندر ہوتے ہیں سب پر وہ عذاب آتا ہے۔ پھر قیامت کے دن ان کے اعمال کے موافق (الگ، الگ) ان کو اٹھالیا جائے گا۔ (رواہ البخاری و مسلم من حدیث ابن عمر) حضرت ابو بکر کی روایت سے اصحاب السنن الاربعہ نے ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ظالم کو ظلم کرتے دیکھ کر جب لوگ اس کا ہاتھ نہیں پکڑیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کا عذاب سب پر عموماً آجائے۔ (مظہری)

ان دونوں حدیثوں کا اور آیت: وَاتَّقُوا فِتْنَةً کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے خود تو گناہوں

کا ارتکاب نہیں کیا لیکن امر بالمعروف کو ترک کر دیا اور مجرموں کو گناہ سے نہیں روکا وہ بھی عذاب کے دائرے میں آجائیں گے۔ (مظہری)

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى: اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح کوئی دوسرے کا عذاب اپنے سر نہیں لے سکتا، اسی طرح کسی کو یہ بھی حق نہیں کہ کسی دوسرے کے عمل کے بدلے خود عمل کر لے اور وہ اس عمل سے سبکدوش ہو جائے، مثلاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے نماز فرض ادا کر دے یا دوسرے کی طرف سے فرض روزہ رکھ لے اور وہ دوسرا اپنے فرض نماز و روزے سے سبکدوش ہو جائے، یا یہ کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے ایمان قبول کر لے اور اس سے اس کو مومن قرار دیا جائے۔ آیت مذکورہ کی اس تفسیر پر کوئی فقہی اشکال اور شبہ عائد نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ شبہ حج اور زکوۃ کے مسئلہ میں یہ ہو سکتا ہے کہ ضرورت کے وقت شرعاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے یا دوسرے کی زکوۃ اس کی اجازت سے ادا کر سکتا ہے، مگر غور کیا جائے تو یہ اشکال اس لیے صحیح نہیں کہ کسی کو اپنی جگہ حج بدل کے لیے بھیج دینا اور اس کے مصارف خود ادا کرنا، یا کسی شخص کو اپنی طرف سے زکوۃ ادا کر دینے کے لیے مامور کر دینا بھی در حقیقت اس شخص کے اپنے عمل اور سعی کا جز ہے، اس لیے لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن)

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى: یعنی صرف ہر شخص کی ظاہری سعی کافی نہیں، اللہ تعالیٰ کے دربار میں سعی کی اصل حقیقت بھی دیکھی جائے گی کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے کی ہے یا دوسری اغراض دنیویہ اس میں شامل ہیں، جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، یعنی صرف صورت عمل کافی نہیں، عمل میں نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیل حکم کی ہونا ضروری ہے۔ (معارف القرآن للمفتی)

ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى: ہر شخص کو اس کے اعمال اور اس کی مساعی کی پوری پوری جزا دی جائے گی، اگر وہ زندگی بھر نفس کی خواہشات کی تکمیل میں لگا رہا، کبھی اپنے رب کی یاد اور عبادت کا اسے خیال نہ آیا تو اس کا بدلہ ملے گا اور جو شخص اپنے کریم پروردگار کی رضا حاصل کرنے کے لیے مصروف

رہا۔ مصائب وآلام کی پروا کیے بغیر تسلیم ورضا کی راہ پر قدم بڑھاتا رہا تو اس کی جو پذیرائی ہو گی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ (ضیاء القرآن)

وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی: اور یہ کہ تیرے رب کے پاس پہنچنا ہے، اس دنیا میں جتنی بھی زندگی گزار لے آخر مرنا ہے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونا ہے حسنات اور سیئات کا حساب دینا ہے یہ آیت کی ایک تفسیر ہے، دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ، کی مخلوقات میں غور کریں ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے بارے میں غور نہ کریں کیونکہ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ (انوار البیان)

ہنسانے اور رلانے والا کون؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى {۴۳} النجم.

جواب ترجمہ: اور یہ کہ وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم پر سے گزرے جو ہنس رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت روتے اور تھوڑا ہنستے جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وانه هُوَ اَضْحَكَ وَاَبكى، بلاشبہ وہ ہنساتا ہے اور رلاتا ہے، پھر آپ ان کی طرف لوٹے اور فرمایا میں چالیس قدم نہیں چلا تھا کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو وَاَنَّهُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبكى۔ (ابن مردویہ، تفسیر در منثور)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام جنت سے سفید یاقوت کے ساتھ اترے کہ جس سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے تھے پھر فرمایا آدم علیہ السلام جنت (کی جدائی) پر چالیس سال روئے جبریل علیہ السلام نے ان سے فرمایا اے آدم! آپ کیوں روتے ہیں؟ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی طرف تسلی دینے والا بنا کر بھیجا ہے (یہ سن کر) آدم علیہ السلام ہنس پڑے اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى یعنی آدم علیہ السلام ہنسے تو آپ کی اولاد بھی ہنستی ہے آدم علیہ السلام روئے تو آپ کی اولاد بھی روتی ہے۔(ابن مردویہ، العظمت)

ابن شیبہ نے جارالطائی سے روایت کیا کہ میں مصعب بن زبیر کی ماں کے جنازہ میں حاضر ہوا، اس میں ابن عباس بھی تھے ہم نے نوحہ کرنے کی آوازیں سنیں میں نے کہا ابن عباس یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور آپ یہاں ہیں تو انہوں نے فرمایا اے جبار! ہم کو چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہنساتا اور رلاتا ہے۔(ابن ابی شیبہ، تفسیر درمنثور) حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یَعنی أَضحَكَ المُطِيعَ بِالرَّحمَةِ، وَأَهلَكَ العَاصِي بِالسَّخَطِ، وَأَضحَكَ قُلُوبَ العَارِفِينَ بِنُورِ مَعرِفَتِهِ، وَأَبكَى قُلُوبَ أَعدَائِهِ بِظُلمَاتِ سَخَطِهِ (تستری) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اطاعت گزاروں کو رحمت سے ہنساتا ہے، گناہ گاروں، نافرمانوں کو ناراضگی سے ہلاک کرتا ہے، عارفین کے دلوں کو اپنی معرفت کے نور سے ہنساتا ہے، اپنے دشمنوں کے دلوں کو اپنی ناراضگی کے اندھیروں سے رلاتا ہے۔

شیخ عبدالکریم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے رونے اور ہنسنے سے متعارف رونا اور ہنسنا ہے جو لوگوں کے درمیان جاری ہے اور جس پر ان کی تخلیق ہوئی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے زمین کو جڑی بوٹیوں کے ساتھ ہنسایا، اور آسمان کو بارش سے رلایا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل جنت کو جنت کے ذریعے ہنسایا، جہنم والوں کو جہنم کے ذریعے رلایا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو آخرت میں ہنسائے گا اور انہیں دنیا میں رلایا، اور کافر کو دنیا میں ہنسایا جب کہ آخرت میں انہیں رلائے گا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں بظاہر ہنساتا ہے اور ان کے دلوں کو رلاتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ مومن کو اپنی بخشش کے ساتھ ہنسائے گا اور کافر کو جہنم میں گرا کر رلائے گا، یہ بھی کہا جاتا ہے عارفین کے دلوں کو رضا کے ساتھ ہنسائے گا اور ان کی آنکھوں کو فراق کے خوف سے رلائے گا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں اپنی رحمت سے ہنسائے گا اور اپنے دشمنوں کو اپنی ناراضگی سے رلائے گا۔(تفسیر قشیری)

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں وَفِي هٰذَا تَنبِيهٌ عَلَى أَنَّ جَمِيعَ

الأَعمَال بقَضَاءِ اللهِ وَقَدرِهِ حَتَّى الضَّحكُ وَالبُكَاءُ، اس میں اس بات پر خبر دار کرنا ہے کہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کی تقدیر سے ہیں، یہاں تک کہ ہنسنا اور رونا بھی۔ (زادالمسیر)

بحر العلوم ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَأَبْكَى أَهلَ النَّارِ فِي النَّارِ وَيُقَالُ: أَضْحَكَ فِي الدُّنيَا أَهلَ النِّعمَةِ، وَأَبْكَى أَهلَ الشِّدَّةِ، وَالمَعصِيَةِ (تفسیر بحر العلوم) دوزخ والوں کو دوزخ میں رلائے گا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل نعمت کو دنیا میں ہنساتا ہے اور شدت اور معصیت والوں کو رلاتا ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں فِيهِ ثَلَاثَةُ أَوجُهٍ: أَحَدُهَا: قَضَى أَسبَابَ الضِّحكِ وَالبُكَاءِ. اَلثَّانِي: أَنَّهُ أَرَادَ بِالضِّحكِ اَلسُّرُورُ، وَبِالبُكَاءِ اَلحُزنُ. وَالثَّالِثُ: أَنَّه خَلَقَ قُوَّتَي اَلضِّحكُ وَالبُكَاءُ, فَإِنَّ اللهَ مَيَّزَ الإِنسَانَ بِالضِّحكِ وَالبُكَاءِ مِن بَينِ سَائِرِ الحَيوَانِ فَلَيسَ فِي سَائِرِ الحَيوَانِ مَا ضحك وَيَبكِي غَيرَ الإِنسَانِ وَقِيلَ إِنَّ القِرَدَ وَحدَهُ يَضحَكُ وَلَا يَبكِي وَإِنَّ الإِبلَ وَحدَهَا تَبكِي وَلَا تَضحَكُ. وَيَحتَمِلُ وَجهاً رَابِعاً: أَن يُّرِيدَ بِالضِّحكِ وَالبُكَاءِ اَلنِّعَمِ وَالنِّقَمِ (تفسیر ماوردی)

اس میں تین وجوہ ہیں، ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہنسنے اور رونے کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، دوسری یہ کہ ہنسنے سے مراد خوشی ہے اور رونے سے مراد غم ہے، تیسری یہ کہ اس نے ہنسنے اور رونے کی دو قوتیں پیدا کی ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو باقی سارے جانوروں سے ہنسنے اور رونے میں ممتاز بنایا ہے، انسان کے علاوہ کوئی جانور ہنستا اور روتا نہیں ہے، یہ کہا گیا ہے کہ ایک بندر ہے جو ہنستا ہے مگر روتا نہیں ہے، اونٹ واحد جانور ہے جو روتا ہے اور ہنستا نہیں ہے، چوتھی وجہ کا احتمال بھی ہے کہ ہنسنے اور رونے سے مراد نعمت اور سزا ہے۔

ہنسنا دل کی خوشی کے اثر سے ہوتا ہے، اور رونا غم کے اثر کی وجہ سے ہوتا ہے، ہنسنا اور رونا یہ دونوں ہی انسانی خواص میں سے ہیں، دونوں ہی قدرت کی عجیب تخلیق ہیں، جو دل کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان غم وخوشی ہر دو حال سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے کہ جب غم وحزن نہیں ہوگا تو انسان

مسرور ہو گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خوشی اور انشراح دونوں کو پیدا فرمایا جو انسان کے ساتھ اس کے مزاج کی سلامتی اور ادراک کی وجہ سے لازم ہیں، کیونکہ انسان کا مزاج درست ہو گا تو اس کے اعصاب میں نشاط پیدا ہو گا، یہی نشاط اس کے اندر فی الجملہ مسرت پیدا کرے گا، اگرچہ وہ ضعف و قوت میں مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

اس لیے ہنسنا اور رونا یہ انسانی احوال کو اختصار کے ساتھ گھیرنے میں مفید ہے، جو فرح و حزن کے اسباب کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور حکمت والی ذات، جو ان کو پیدا کرنے والا ہے کی یاد دلاتا ہے، اور اس بات کی خوشخبری سناتا ہے کہ وہی ذات انسان میں تصرف کرتی ہے، اس لیے کہ اسی نے اس کی خوشی اور غم کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، اسی نے اسے خوشی اور غم کو کھینچنے کے اسباب پیدا فرمائے ہیں۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت، فرمانبرداری اور اس کی بارگاہ میں تضرع وعاجزی کے ساتھ متوجہ ہونے کی راہنمائی ہے تاکہ وہ ذات انسانوں کے لیے فرحت و مسرت کے اسباب مہیا کرے، اور ان سے حزن وملال، رنج و کرب، دکھ اور تکلیف، مصیبت والم کے اسباب کو دور کرے، اس مقام کی مناسبت کے لحاظ سے اس چیز کا ذکر کیا گیا ہے، تاکہ انسانوں کی مکمل مساعی کی بدولت انہیں مکمل جزا وصلہ ملے، ان میں سے کسی کے لیے تو خوشی کی خبر ہو گی اور کسی کے لیے غم ناک خبر ہو گی۔

اس میں فاعلیت کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے کہ ہنسانے اور رلانے والی ذات اللہ کی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ تصرف کا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اس سے شرک فی الالوہیت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں اور شرکت باطل قرار پاتی ہے، یہاں اِفراد و فردیت کے اوپر انحصار ہے، کیونکہ مقصود غیر اللہ کے تصرف کی نفی ہے، کیونکہ دھریہ لوگ کہتے ہیں کہ کائنات ہستی اور نظام ہستی خود بخود ہی چل رہا ہے، اس لیے اس کی نفی ضروری ہے کیونکہ کوئی چیز چلانے والے کے بغیر نہیں چل سکتی۔

ہنسانے اور رلانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کی وجہ واضح ہے کہ ہنسنے اور رونے کی دو طاقتیں انسان میں رکھنے والا اور پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے، یہ عجیب و غریب تخلیق ہے، کیونکہ موجودات کی طبیعتیں پیدا کرنے والا اللہ ہے جو ہنسنے اور رونے کے اسباب خوشی اور غم سے کھینچتی ہیں۔

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ کسی چیز کی تخلیق اور اس کی ضد دونوں کو پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان حکمت و قدرت کار فرما ہے۔ کیونکہ ہنسنا اور رونا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، مگر ایک ہی وجود میں رکھی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کاریگری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا {۴۴} وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى {۴۵} مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى {۴۶} وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى {۴۷} النجم

جواب ترجمہ: اور یہ کہ وہی ہے جو موت بھی دیتا ہے اور زندگی بھی۔ اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کے دو جوڑے پیدا کیے ہیں۔ (وہ بھی صرف) ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ دوسری زندگی دینے کا بھی اسی نے ذمہ لیا ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا: اور یہ کہ وہی (اللہ) مارتا ہے اور وہی زندہ کرتا ہے۔ اس آیت میں توحیدِ افعال کو واضح کیا گیا ہے، حقیقی طور پر زندگی دینا اور موت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، کوئی سبب، دوا، ڈاکٹر یا فرشتہ مستقل فاعل نہیں، بلکہ سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں، یہ رد ہے ان مشرکانہ عقائد کا جو کسی اور کو حیات و موت کا مالک سمجھتے تھے۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى: اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ، دونوں جوڑے پیدا کیے، اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی نسل کو دو جنسوں (مرد و عورت) میں پیدا فرمایا، یہ تخلیق خود بخود نہیں بلکہ حکمت و قدرتِ الٰہی کا مظہر ہے، اس میں انسان کے غرور کو توڑا گیا کہ وہ اپنی پیدائش پر فخر نہ کرے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى: ایک حقیر نطفے سے، جب وہ رحم میں ڈالا جاتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ انسان کی اصل حقیقت بیان کی گئی ہے، ایک کمزور اور حقیر پانی کی بوند، اس سے مقصود یہ جتلانا ہے کہ جو ذات ایک نطفے سے کامل انسان بنا سکتی ہے، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیسے ناممکن ہو سکتا ہے؟

وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى: اور یہ کہ دوبارہ اٹھانا (دوسری پیدائش) بھی اسی کے ذمے ہے، یہ

آیت قیامت اور بعث بعد الموت پر قطعی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلی پیدائش خود کی، لہٰذا دوسری پیدائش (قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنا) بھی اسی کے ذمہ اور اسی کی قدرت میں ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس نے ابتدا میں پیدا کیا، وہ اعادہ پر زیادہ قادر ہے۔

مالداری اور مفلسی

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتایئے کہ یہاں وَأَقْنَى کا کیا معنیٰ ہے؟

وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَى وَأَقْنَى {۴۸} النجم.

جواب ترجمہ: اور یہ کہ وہی ہے جو مال دار بناتا اور دولت کو محفوظ کراتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اموال کے ساتھ مالدار کیا، انہیں ان مالوں کا مالک بنایا ہے، یہی اموال کے اصول ہیں، وہ ان مالوں کو کفایت کے بعد ذخیرہ کرتے ہیں، بعض حضرات کا یوں کہنا ہے کہ اس سے مراد سونا اور چاندی اور اموال کی مختلف اصناف اور اقسام ہیں، جنہیں وہ کفایت کے بعد ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔

اقنیٰ کا معنیٰ یہ کیا گیا ہے اس نے انہیں اونٹ، گائیں اور بکریاں عطا فرمائیں، بعض حضرات کا کہنا یوں ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں خدام عطا کیے، حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اغنیٰ اور اقنیٰ کا مطلب یہ ہے کہ انہیں عطا کیا اور اس کے بعد راضی کیا، بعض حضرات کا کہنا یوں ہے کہ ان کی حاجت پوری کی اور انہیں کسی چیز کا محتاج نہیں چھوڑا، اس لیے کہ مالداری فقر و مفلسی کی ضد ہے، اور اقنیٰ کا مطلب یہ ہے کہ انہیں زیادہ عطا کیا جو کہ مالداری سے اوپر والا درجہ ہے۔

کتب لغت میں اقناہ کا معنیٰ ہے اس نے اسے راضی کیا، القِنیٰ کا معنیٰ راضی ہونا ہے، اہل عرب کہتے ہیں کہ جسے سو بھیڑیں دی گئیں وہ قنیٰ دیا گیا، جسے سو دنبیاں دی گئیں اسے مالدار کیا گیا، جسے سو اونٹ دیے گئے اس کی آرزو پوری کر دی گئی، یوں بھی کہا جاتا ہے کہ اغناء اللہ واقناہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا کیا جس سے اسے سکون حاصل ہوتا ہے۔

مال و دولت کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں، چاہے تو کسی کو مالامال کر دے اور اسے

بے حساب رزق عطا فرمادے اور چاہے تو کسی کو مفلس اور کنگال کر دے، جیسے قرآن کریم میں بھی اس بارے میں آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ جسے چاہے تو کشادہ رزق عطا کرے اور جسے چاہے اس کا رزق تنگ کر دے، وہ پارۂ نان کے لیے ترستا رہے اور اسے وہ بھی نصیب نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کرشمے ہیں۔ ان میں جو اسرار پنہاں ہیں ان کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے۔

شِعرَی ستارے کا رب

سوال اس آیت میں الشِّعْرَی کا کیا معنٰی ہے؟

وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَى {۴۸} النجم.

جواب ترجمہ: اور یہ کہ وہی ہے جو شعری ستارے کا پروردگار ہے۔

خلاصہ تفسیر: صاحب ضیاء القرآن لکھتے ہیں ایک نہایت روشن ستارہ ہے جو جوزاء کے بعد طلوع ہوتا ہے۔ اس کو شعری کہتے ہیں۔ شعری نام کے دو ستارے ہیں، ایک کو شعری عبور اور دوسرے کو شعری غمیصاء کہتے ہیں، اساطیر عرب میں ہے کہ یہ دونوں سہیل ستارہ کی بہنیں ہیں، بعض عربی خراجات میں یوں مذکور ہے کہ سہیل اور شعری دونوں میاں بیوی تھے۔ سہیل نیچے کی طرف ڈھل آیا اور یمانی ہو گیا۔ شعری اس کی بیوی کہکشاں کو عبور کر کے اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گئی، اس لیے اسے الشعری العبور کہتے ہیں اور دوسری وہیں رک گئی اس لیے اس کو الشعری الغمیصاء کہتے ہیں، اس کا دوسرا نام کلب الجبار بھی ہے، کیونکہ یہ جوزاء جسے جبار کہا جاتا ہے، اس کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح چلتا ہے۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ تمام ستاروں کا رب ہے، لیکن اسے خصوصیت سے رب لشعری کہا گیا ہے، کیونکہ بقول سدی حمیر اور خزاعہ کے قبیلے اس کی عبادت کیا کرتے تھے، سب سے پہلے جس نے اس کی عبادت شروع کی اس کا نام ابو کبشہ ہے۔ عرب کے دوسرے قبائل اگرچہ اس کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی عزت و تکریم کرنے میں سب شریک تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ شئونِ کائنات میں یہ بہت موثر کردار ادا کرتا ہے۔

شِعرَی ستارے کے انگریزی میں کئی نام ہیں۔ اسے CANIS MAJORIS اور DOG STAR,

SIRIUS بھی کہا جاتا ہے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں SIRIUS کے عنوان کے ضمن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے: یہ ستارہ مجموعہ نجوم میں روشن ترین ستارہ ہے۔ سورج سے بھی اس کی روشنی اکیس گنا زیادہ ہے اور حجم میں بھی یہ سورج سے بڑا ہے۔ اس کی سطح کا درجۂ حرارت بھی کافی زیادہ ہے۔ زمین سے اس کا فاصلہ آٹھ اعشاریہ چھ (۸.۶) نوری سال ہے۔ قدیم مصری اس کو بہت مقدس مانتے تھے، کیونکہ یہ جس موسم میں طلوع ہوتا اس وقت دریائے نیل میں سیلاب کی آمد آمد ہوتی۔ تمام علاقہ سیر اب ہو کر سر سبز و شاداب ہو جاتا۔ مصریوں کا عرصہ دراز تک یہی عقیدہ رہا کہ شعری ستارہ کے طلوع کے باعث مصر میں خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے، اس لیے وہ اسے ہر قسم کی سر سبزیوں اور شادابیوں کا خالق یقین کرتے تھے اور اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۲۰) ہو سکتا ہے کہ اہل عرب میں اس کی عبادت کا تصور مصر ہی سے آیا ہو۔ (ضیاء القرآن)

علامہ کیلانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں شعری ستارہ اور اس کے پجاری:۔ مشرکین عرب تین مشہور دیویوں لات، منات اور عزیٰ کے علاوہ آسمان کے دیوتاؤں میں سے شعریٰ ستارہ کی بھی پرستش کرتے تھے۔ یہ سیارہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے اور اس کا زمین سے فاصلہ ۸ نوری سال سے بھی زیادہ ہے۔ (واضح رہے کہ سورج ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے اور اس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ۸ منٹ میں ہم تک پہنچتی ہے۔ گویا ہماری زمین اور سورج کا فاصلہ ۸ نوری منٹ ہے۔ اسی سے ۸ نوری سال کا حساب لگا لیجئے)

لہذا یہ سورج سے بہت چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہل مصر اس کی پرستش کرتے تھے کہ اسی سیارہ کے طلوع کے زمانہ میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا۔ اور اہل مصر یہ سمجھتے تھے کہ اسی سیارہ کے طلوع ہونے کا فیضان ہے۔ اہل عرب میں سے خصوصاً قریش اور خزاعہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ باطلہ کی تردید کی اور فرمایا تمہاری قسمتوں کا مالک شعریٰ نہیں بلکہ وہ اللہ ہے جو شعریٰ کا بھی مالک ہے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "شعریٰ" ایک بہت بڑا ستارہ ہے جس کو بعض عرب پوجتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عالم کے احوال میں اس کی بہت بڑی تاثیر ہے۔ یہاں بتلا دیا کہ "شعریٰ" کا رب بھی اللہ ہے۔ دنیا کی تمام الٹ پھیر اسی کے دست قدرت میں ہیں۔ "شعریٰ" غریب بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح اس کا حکم بجالاتا ہے۔ اس میں مستقل تاثیر کچھ بھی نہیں۔ (عثمانی)

قوم ھود علیہ السلام

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ عاد اولیٰ سے کیا مراد ہے؟

وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ {۵۰} النجم.

جواب اور یہ کہ وہی ہے جس نے پچھلے زمانے کی قوم عاد کو ہلاک کیا۔

عاد اولیٰ سے مراد عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح کی اولاد ہے۔ اسے اولیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کی غرقابی کے بعد سب سے پہلے اس قبیلے پر عذاب نازل ہوا۔ ان کی طرف ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا، لیکن جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر زور دار جھکڑ بھیجا جس نے ان کو برباد کر کے رکھ دیا۔ ان میں سے فقط وہی لوگ بچے جو حضرت ہود پر ایمان لائے تھے۔ انہیں کی اولاد کو عاد الآخرہ کہا جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

عبرت ناک مناظر

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

وَثَمُودَا فَمَا أَبْقَىٰ {۵۱} وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ {۵۲} وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ {۵۳} فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ {۵۴} النجم.

جواب ترجمہ: اور ثمود کو بھی، اور کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور اس سے پہلے نوح کی قوم کو بھی (ہلاک کیا)۔ بیشک وہ سب سے زیادہ ظالم اور سرکش تھے۔ اور جو بستیاں اوندھی گری تھیں۔ ان کو بھی اسی نے اٹھا پھینکا تھا۔ پھر جس (خوفناک) چیز نے انہیں ڈھانپا، وہ انہیں ڈھانپ کر ہی رہی۔

وَثَمُودَا فَمَا أَبْقَىٰ: یعنی اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کو ہلاک کر دیا اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا، قوم

ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، جنہوں نے اللہ کے معجزے (اونٹنی) کو قتل کیا اور نافرمانی کی، تو اللہ نے انہیں سخت عذاب (صیحہ) سے ہلاک کر دیا، اس آیت میں فَمَآ اَبْقٰی سے مراد ہے کہ اللہ نے ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا، سب کو فنا کر دیا۔ یہ کفار قریش کے لیے تنبیہ ہے کہ اگر وہ بھی نافرمانی کریں گے تو ان کا انجام بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى : یعنی اللہ نے قوم نوح کو بھی اس سے پہلے ہلاک کر دیا تھا، اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى یعنی وہ سب سے زیادہ ظالم اور سرکش تھے، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تقریباً نو سو پچاس سال تک دعوت دی، لیکن وہ ایمان نہ لائے، بلکہ ہر نسل اپنے بچوں کو نوح علیہ السلام سے دور رہنے کی وصیت کرتی تھی، اس لیے اللہ نے انہیں طوفان کے ذریعے ہلاک کر دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ قوم نوح اپنی سرکشی اور ظلم میں سب سے بڑھ کر تھی، اس لیے ان کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ (عیون التفاسیر)

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى : یہ قوم لوط کی طرف اشارہ ہے۔ مُؤْتَفِكَة کی تحقیق لسان العرب میں یہ بیان ہوئی ہے۔ " موتفکات " سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو زمین کو بالکل تلپٹ کر دیتی ہیں جس طرح جوتنے والا کھیت کی زمین کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے اور وہ زمین پر مٹی اور ریت کی نئی تہہ جما دیتا ہے تو اس کو بھی مُؤْتَفِكَة کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو تند طوفانی ہوا زمین کو ریت اور کنکر سے ڈھانک دیتی ہے وہ بھی مُؤْتَفِكَة ہے۔

قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو تند ہو کر بالآخر حاصب یعنی کنکر پتھر برسانے والی طوفانی ہوا بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (العنکبوت ۴۰) (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسا دینے والی آندھی بھیجی ہے) نیز فرمایا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ (۸۲) هود، پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر سنگ گل

کی بارش کی۔(تدبر قرآن)

امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى اور الٹی ہوئی بستیوں کو پھینک مارا یعنی جبریل علیہ السلام نے اس اوندھی بستی کو آسمان کی طرف اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔(در منثور)

حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى سے مراد ہے لوط علیہ السلام کی قوم کہ ان کے ساتھ زمین کو الٹ دیا گیا بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان کی طرف اٹھایا پس ان کے ساتھ قیامت کے دن تک دھنستی رہے گی۔(عبد بن حمید، در منثور)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى سے مراد ہے قوم لوط کی بستیاں فَغَشَّهَا مَا غَشَّى (پھر ان بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے گھیر لیا یعنی پتھروں نے ان کو گھیر لیا۔ (عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، در منثور)

فَغَشَّهَا مَا غَشَّى: یعنی ان پر وہ چیز چھا گئی جو چھا گئی، اس میں ابہام ہے تا کہ اس عذاب کی شدت اور ہولناکی کو بیان کیا جائے، اکثر مفسرین کے مطابق اس سے مراد آسمان سے نازل ہونے والے پتھروں کا عذاب ہے، جو ان پر اس طرح چھا گیا کہ سب کو تباہ کر دیا گیا، (مختصر تفسیر البغوی)

امام بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اللہ نے ان پر نشان زدہ پتھروں کا عذاب نازل کیا اسی طرح قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غَشَّاهَا الْحِجَارَةُ یعنی ان پر پتھروں کا عذاب چھا گیا، اس ابہام کا مقصد عذاب کی عظمت اور شدت کو اجاگر کرنا ہے۔(لقاء الباب المفتوحہ) اس آیت میں قوم لوط کی بستیوں پر نازل ہونے والے ہولناک عذاب (پتھروں کی بارش) کی طرف اشارہ ہے، اور اس کو مبہم انداز میں بیان کر کے اس کی شدت اور خوفناکی کو واضح کیا گیا ہے۔

اللہ کی کون کون سی نعمت میں شک کرو گے؟

سوال اس آیت کا کیا مفہوم ہے؟

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ {۵۵} النجم.

جواب ترجمہ: لہذا (اے انسان) تو اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں میں شک کرے گا؟

یعنی اے انسان! اللہ تعالیٰ نے تجھے ان عذابوں سے بچا کر جن نعمتوں میں رکھا ہوا ہے، پھر تیری ہدایت کے لئے یہ قرآن کریم جن مختلف طریقوں سے تجھے متنبہ کر رہا ہے اور حضور نبی کریم ﷺ جس محبت سے تجھے سمجھا کر تجھے عذاب سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان عظیم نعمتوں میں سے کس کس نعمت میں شک کرے گا۔ (آسان ترجمہ قرآن للشیخ الاسلام عثمانی)

قوموں کی تباہی، بربادی اور عبرت ناک انجام کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھ رہے ہیں کہ اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اے مخاطب! اپنے خالق اور پالنہار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے جو اس نے تم پر کی ہیں؟ تَتَمَارٰی سے یہاں مراد انکار ہے، جھٹلانا بھی مراد ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ، اے انسان! تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے دھوکے میں ڈالا ہے؟

اسی طرح اس انسان کو زیادہ جھگڑالو قرار دیا گیا ہے، ارشاد فرمایا وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا، انسان جھگڑے کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ، پس اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (حدائق الروح والریحان)

شیخ محمد امین بن عبد اللہ ہروی شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں نعمتوں سے مراد وہ ہیں جو اس سے پہلے شمار کی ہیں، یہ ساری چیزیں نعمت ہیں، بعض ان میں سے نعمت نہیں سزا ہیں، جو کہ مواعظ اور عبرت حاصل کرنے والے انبیاء اور اولیاء کے لیے سامان عبرت ہیں۔ یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں، اس کی ربوبیت کی علامت اور نشانی ہیں، ان میں سے کس کس میں آپ شک وشبہ کا اظہار کریں گے، یہ جھٹلانے والے انسانوں کو خطاب کیا جا رہا ہے، یعنی اے جھٹلانے والے انسان اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں میں شک وشبہ کا اظہار کرتا رہے گا؟

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو ہے مگر اس سے مراد آپ ﷺ کے علاوہ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے شرک کے بارے میں آپ ﷺ کو خطاب فرمایا ہے، مگر اس بات کا سنانا دوسروں کو مقصود ہے، {لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ} اگر آپ بھی شرک

کریں گے تو آپ کے سارے عمل ضائع ہو جائیں گے۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ جو امور یہاں شمار کیے گئے ہیں باوجود یکہ ان میں سے بعض تو عذاب وسزا ہیں، مگر وہ نعمت بھی ہیں، وہ اس طرح جیسے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات مومنین کی مدد اور نصرت اور ان کی خاطر بدلہ لینا، اس میں نصیحت وعبرت کا عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے سامان بھی ہے۔

بحر العلوم میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی ہلاکت اور ان کی صحبت اور شر سے نجات، ان کے مکر وفریب سے بچاؤ اہل ایمان تک پہنچنے والی اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں میں سے ہیں۔ جیسے متنبی کا شعر ہے

وَمِنْ نَكَدِ الدُّنْيَا عَلَى الْحُرِّ أَنْ يَرَى ... عَدُوًّا لَهُ مَا مِنْ صَدَاقَتِهِ بُدُّ

اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں نوح علیہ السلام کو حمد وستائش کا حکم فرمایا کہ {فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ} آپ فرمادیجیے کہ تمام کامل تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ظالم لوگوں سے ہمیں نجات عطا فرمائی ہے۔

پھر ایک مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی حمد وتعریف فرمارہے ہیں، جو کہ اس کے بندوں کی تعلیم کے لیے ہے، ارشاد فرمایا {فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۴۵) اس طرح جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی، اور تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میدان بدر میں اپنے چچا ابو جہل کا کٹا ہوا سر دیکھا تو اللہ کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا۔

نذیر سے مراد کون ہے؟

سوال اس آیت میں النذیر سے کون مراد ہے؟

هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى {۵۶} النجم

جواب ترجمہ: یہ (پیغمبر) بھی پہلے خبر دار کرنے والے پیغمبروں کی طرح ایک خبر دار کرنے والے ہیں۔

یہاں نذیر سے مراد کون ہے؟ اس کا مصداق کیا ہے؟ اس بارے میں حضرات مفسرین کرام کے ارشادات کی روشنی میں تین چیزیں مراد ہیں۔

حضرت محمد ﷺ: ابن جریج اور محمد بن کعب وغیرہ کے نزدیک یہاں "نذیر" سے مراد خود رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی آپ ﷺ بھی اسی طرح ڈرانے والے ہیں جیسے پہلے انبیاء اپنی قوموں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے تھے۔ اگر لوگ آپ کی بات مان لیں تو فلاح پائیں گے، ورنہ ان پر بھی وہی عذاب آسکتا ہے جو پچھلی امتوں پر آیا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن)

قرآن مجید: بعض مفسرین جیسے قتادہ کے نزدیک یہاں "نذیر" سے مراد قرآن ہے، یعنی یہ قرآن بھی اسی طرح ڈرانے والا ہے جیسے پچھلی کتابیں اپنی امتوں کے لیے تھیں۔ (الجامع لاحکام القرآن)

عمومی انذار: بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ خبریں اور واقعات ہیں جو پچھلی امتوں کے عذاب کے بارے میں بیان کیے گئے، تاکہ اس امت کو بھی ڈرایا جائے کہ اگر وہ بھی نافرمانی کریں گے تو ان پر بھی عذاب آسکتا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن)

قیامت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۸﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ النجم

جواب ترجمہ: جو گھڑی جلد آنے والی ہے، وہ قریب آپہنچی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جو اسے ہٹا سکے۔

اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ: قریب آگئی ہے قریب آنے والی (یعنی قیامت) یہاں آزِفَة سے مراد قیامت ہے، اور اَزِفَتِ یعنی اس کا وقت قریب آگیا ہے، اس میں لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت اب دور نہیں رہی بلکہ بہت قریب ہے، جیسا کہ دیگر آیات میں بھی فرمایا گیا اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ یعنی قیامت قریب آگئی ہے۔ (تفسیر بغوی)

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ: اس (قیامت) کو اللہ کے سوا کوئی ظاہر کرنے والا نہیں، اس کا

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت اور اس کے وقوع کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، نہ کوئی فرشتہ، نہ کوئی نبی، نہ کوئی اور مخلوق اس کو ظاہر کر سکتی ہے یا اس کے وقت کو جان سکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ یعنی اس کا وقت صرف اللہ ہی ظاہر کرے گا۔ (تفسیر البغوی)

هٰذَا الْحَدِيْثِ سے مراد کیا ہے؟

سوال اس آیت میں من ھذا الحدیث سے کیا مراد ہے؟

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ {۵۹} النجم.

جواب تو کیا تم اسی بات پر حیرت کرتے ہو؟

هٰذَا الْحَدِيْثِ سے مراد "قرآن مجید" ہے۔ مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا تم اس قرآن سے تعجب کرتے ہو، یعنی اس کی سچائی اور اس میں بیان کردہ حقائق کو ماننے کے بجائے اس پر تعجب اور انکار کرتے ہو؟ "حدیث" سے مراد یہاں "قرآن" ہے، جو پچھلی آیات میں بیان کردہ واقعات اور نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ (بحر العلوم)

منکرین و مخالفین قرآن کو پیغام ربانی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ {۶۰} وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ {۶۱} فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا {۶۲} النجم

جواب ترجمہ: اور (اس کا مذاق بنا کر) ہنستے ہو، اور روتے نہیں ہو۔ جبکہ تم تکبر کے ساتھ کھیل کود میں پڑے ہوئے ہو؟ اب (بھی) جھک جاؤ اللہ کے سامنے اور اس کی بندگی کرلو۔

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ: تم (کفار مکہ) قرآن سن کر ہنستے ہو، مذاق اور استہزاء کرتے ہو، اور اس میں جو وعید اور نصیحت ہے اس پر روتے نہیں، حالانکہ تم پر لازم تھا کہ اس کے سننے پر خشوع و خضوع کے ساتھ روتے اور نصیحت حاصل کرتے۔ (بحر العلوم)

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ: تم غافل ہو، کھیل کود اور لہو میں مشغول ہو، یا تکبر اور غرور کے ساتھ قرآن سے

منہ موڑ لیتے ہو۔ بعض مفسرین کے مطابق "سامدون" کا مطلب ہے: غافل، لاپرواہ، یا گانے بجانے میں مشغول ہونا، جیسا کہ اہل یمن کی زبان میں "سمود" کا مطلب گانا ہے۔ (بحر العلوم)

عکرمہ کا بیان ہے کہ یہ اہل یمن کی زبان ہے جب یمنی تغن (تو گا) کہنا چاہے گا تو اس کے لئے "اسمد" بولے گا۔ اور امام بخاری اپنی صحیح میں عکرمہ سے ناقل ہیں کہ سامدون کے معنی حمیری زبان میں گانیوالوں کے ہیں۔ عبد الرزاق نے ایک طریق سے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس سے اس کے معنی کھیل کرنے والوں کے اور بروایت معمر قتادہ سے غافل ہونے والوں کے روایت کئے ہیں۔ اور ابن مردویہ بروایت سعد بن جبیر حضرت ابن عباس سے روگردانی کرنے والوں کے معنی نقل کرتے ہیں۔ (لغات القرآن: ص:۱۵۹: ج:۳، بحوالہ معارف الفرقان)

سمد سے مراد ایسی غفلت ہے جس کے ساتھ رنگ رلیاں بھی ہوں۔ صالح ابو خلیل کہتے ہیں کہ جب سے یہ آیت اتری رسول اللہ ﷺ کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا یہاں تک کہ آپ دنیا سے یہ رخصت ہو گئے۔ (فتح القدیر لشوکانی)

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا: اللہ کے سامنے جھک جاؤ، اس کی عبادت کرو، اس کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ یہاں سجدہ سے مراد اللہ کے لیے عاجزی اور عبادت ہے، اور بعض کے نزدیک یہ سجدہ تلاوت بھی ہے۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ، حمداً کثیراً طیباً مبارکاً، آج سورۃ النجم کی چیدہ اور چنیدہ آیات کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کار خیر کو میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ ومشائخ کے لیے، میرے معاونین ومساعدین کے لیے، میرے اعزہ واقارب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، اسے ہماری نجات کا ذریعہ ووسیلہ بنائے اور اس تفسیری کام کا فیضان ہنگامہ یوم النشور تک باقی رہے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی کان اللہ لہ

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء، بمطابق ۲ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ بروز پیر بوقت ۲ بجے شب

نظر ثانی، اضافات وترمیمات جدیدہ: ۱۲ جنوری ۲۰۲۶ء بروز پیر قبیل صلوٰۃ العصر